

اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن اور احکاماتِ محمدیہ کی خصوصیت میں سے ہے، دونوں قول کی تطبیق یہ ہے کہ اللہ کے نام سے شروع کرنا تو تمام آسمانی کتابوں میں مشترک ہے، مگر الفاظ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن کی خصوصیت ہے، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ابتدا میں ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کے لئے بسم اللہ کہتے اور جھڑکتے تھے، جب آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن کی نزول ہوئی تو رضی اللہ عنہ کو سخت مبار فرمایا، اور ہمیشہ کے لئے یہ سنت جاری ہوگئی کہ قرآن کی روح اللہ کی قرآن کریم میں جا بجا اس کی جا بیت ہے کہ ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کیا جائے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر کام پر بسم اللہ سے شروع کیا جائے ورنہ برکت دیتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ تمھارا دروازہ بند کر دو تو بسم اللہ کہو، جیسا کہ محل کر دو تو بسم اللہ کہو، برتن ڈھکو تو بسم اللہ کہو، کھانا کھا لے، پانی پیئے، دھو کر لے، سواری پر سوار ہو کر اور اترنے کے وقت بسم اللہ پڑھئے کہ روایات قرآن و حدیث میں بار بار آیا ہے (قرئیں) ہر کام کو بسم اللہ سے اسلام نے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کی جا بیت لے کر انسان کی پوری زندگی کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح پھیر دیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اس طاعت و عبادت کی تہذیب کرتا ہے کہ میرا دروازہ اور میرا کوئی کام بغیر اللہ تعالیٰ کی شیئت و ارادے اور اس کی اجازت کے نہیں ہو سکتا جس لئے اس کی ہر شے و حرکت اور تمام ماعاشی اور موریہ کاموں کو بھی ایک عبادت بناتا ہے یعنی بسم اللہ سے کہ اس میں کوئی وقت خرچ نہ ہوتا ہے نہ سختی، اور قاعدہ کشا کی یاد دلاؤ اور پتھر کو دنیا میں دین ہی مٹی، ایک کام فرمیں کھا پیتا ہے اور ایک مسلمان بھی اگر مسلمان اپنے لئے سے پہلے بسم اللہ کہہ کر یا اشتراک کرتا ہے کہ یہ قدر زمین سے پیدا ہوئے ہے لیکن کب کر تیار ہوئے تک آسمان زمین اور سیاروں اور ہوا و فضا کی مخلوق کی طاعت کی غلطیوں پر واکوں انسانوں کی محنت و توفیق پر تیار ہوا ہے، اس کا حاصل کرنا میرے میں نہیں، نہ فضا، اللہ ہی کی ذات ہے جس نے اس تمام معاملے سے گزار کر یہ امر اچھوت جیسے عطا فرمایا ہے، مومن کو کار و دونوں سوئے جائے بھی ہیں، چلے پھرتے بھی ہیں، مگر ہر مومن جو سے پہلے بسم اللہ پڑھوئے کے وقت اللہ کا نام لے کر اللہ کے ساتھ اس طرح اپنے رابطے کی تہذیب کرتا ہے جس سے تمام دنیاوی اور مادی ضروریات و فرائض و امور مادی کیسے بھی جاتی ہیں، مومن سواری پر سوار ہوئے ہوئے بسم اللہ کہہ کر گیا وہ نہایت دیتا ہے کہ اس سواری کا پیدار یا بیکار یا پھر اس کو میرے قبضے میں دینا انسان کی قدرت ہے! ہر چیز ہے رب العزت ہی کے ہاتھ سے ہے لہذا تمھارا کام کہ تم کو کہیں کی کوئی کام کہیں کی گفت و دعائیں انہیں کے کارگر کہیں کے چلانے والے سب سے

ہر شے قدرت میں لگے ہوئے ہیں، چند بے خرچ کرنے سے اپنی بڑی خلقی عداوت کو کم اپنے کام میں لائے گئے، اور وہ بے خرچ نہیں لپٹے ساتھ کہیں سے نہیں لائے گئے، بلکہ اس کے حاصل کرنے کے تمام اسباب بھی اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں مگر یہ کہ اسلام کی ہر بات اسی کی ہی مختصر تعلیم نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اس لئے یہ کہنا بالکل بیجا ہے کہ بسم اللہ ایک نوا کسے جو جس سے تائے کا نہیں، بلکہ ناک کا سرمایہ بنتا ہے، فذلک الحمد علی دین الاسلام و تعلیمہ۔

مسئلہ - قرآن کی تلاوت شروع کرنے کے وقت اولاً اُخُوذُ بِاللّٰهِ مِّنَ الْقَبْضِ الرَّحْمٰنِ اور پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم شروع کرنا سنت ہے، اور درمیان تلاوت میں سورۃ براءت کے علاوہ ہر صورت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔

اس تہجد کے بعد آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر دیجئے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم - پہلے بین الفلق سے مرکب ہو، ایک حرف آء، دوسرے استم، تیسرے اللہ، حرف آء، حرف زین میں بہت سے مائل کے لئے استعمال ہوتی ہے، جن میں سے جن میں مناسب مقام ہیں، ان میں سے ہر ایک مٹی اس جگہ لگنے چاہئے ہیں:

اَوَّلُ، و معاًجبت، یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے حاصل ہونا، وخرشے، استقامت، یعنی کسی چیز سے مدد مان کرنا، بحرث، یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

لَفْظُ اِسْمِ میں نفی اور عیسیٰ تفصیلات بہت ہیں، جن کا جاننا علم کے لئے ضروری نہیں، انتساباً کہنا کافی ہے کہ اگر دو میں مگر تہذیب قائم نہ کیا جائے۔

لَفْظُ اللّٰہِ، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے، اور بعض علماء نے اسی کو اہم عظیم کہا ہے، اور یہ نام اللہ کے ناموں میں سب سے بڑا ہے، اس لئے اس لفظ کا تہذیب اور تہذیب نہیں آئے، کیونکہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، غلام ہے کہ اللہ نام ہے اس موجود کو کا جو تمام صفات کمال کا جامع اور صفت پرہیز کے ساتھ مصحف، یکساں اور بے مثال ہو۔ اس لئے مگر بسم اللہ کے معنی حرفت، اس کے ذکر وہ جن معنی کی ترتیب ہے ہوئے:

اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کی مدد سے، اللہ کے نام کی ترتیب سے ہوئے:

لیکن یہی صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ یہ کلام نامکمل ہے، جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کے نام کی تہذیب سے کرنا مقصود ہے، اس لئے غرضی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مناسب مقام مفرد نہ ہو سکتا، لہذا شروع کرتا ہوں یا پڑھتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ۔ اور مناسب ہے کہ یہ فعل میں بعد میں مفرد نہ لانا جائے، تاکہ حقیقت شروع اسم اللہ ہی سے ہو، وہ فعل مفرد بھی اسم اللہ سے پہلے نہ آئے، صرف حرفت آگے کا اسم اللہ سے پہلے آنا ہی زیادہ

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

اٰیٰتُهَا سَبْعٌ ۝ سُوْرَةٌ قَاصَّةٌ ۝ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۝ وَكَوْنُهَا وَاحِدٌ ۝
اس میں سات آیتیں ہیں، سورۃ قاصہ نماز میں نازل ہوئی اور ایک رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِکِ
سب تعریفیں اللہ کے ہیں جو پالنے والا مگر بے نیاز، مہربان نہایت رحم والا، مالک

یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْذُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ
روزِ حساب کا، تیری ہی کم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، ہمارے لیے راستہ

السَّیِّدِ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۝ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ
سید، وہ ان لوگوں کی ہیں پر تو نے فضل فرمایا، جو نہ تیرا غضبہ ہوا

عَلِیْمٍ وَلَا الضَّالِّیْنَ ۝

اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔

علامہ تفسیر

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں اور تعریف و ثناء پر
الغالبین، سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مہربان ہیں ہر مہربان کے، مخلوقات، اگلی جنس
ایک ایک عالم کہلاتا ہے، مثلاً عالم ملائکہ، عالم انسان، عالم جن، الرحمن اللہ عظیم جو بڑے
مہربان نہایت رحم والے ہیں، عظیم بڑا، اللہ ہی جو مالک ہیں روزِ جزا کے، مراد قیامت کا دن ہے
جس میں ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پائے گا، اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْذُ ہم آپ ہی کی عبادت

کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں، اِیَّاكَ نَعْبُدُ اِلٰہ اللہ عظیم و بڑا
ہم کو رستہ سیدھا و مراد و نیکار سہستہ ہے، بستر اِلٰہی میں آئیں اللہ تعالیٰ ہم پر رحمت فرمائے
ہیں پر آپ کے عالم فرمایا (مراد دین کا انجام ہے) عَظِیْمُ الْمُشْكُوْفُ عَلَیْکُمْ تُوْفِیْقُ الْعٰلَمِیْنَ ذرستہ
ان لوگوں کا ہیں پر آپ کا غضبہ ہوا، اور دان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے دروازہ ہدایت چھوٹے
کی دوجہ ہو گئی ہیں، ایک توفیق کہ اس کی پوری تحقیق ہی ذکر ہے، مثلاً تعین سے ایسے لوگ مراد ہیں
دوسری وجہ یہ ہے کہ تحقیق پوری ہونے کے باوجود اس پر عمل نہ کرے، مَشْكُوْبُ عَلَیْکُمْ سے ایسے لوگ
مراد ہیں، کیونکہ جان پر وجہ خلاف کرنا زیادہ ناراضی کا سبب ہوتا ہے۔

معارف مسائل

سورۃ فاتحہ ساتیاں | سورۃ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے جن میں سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ
کی حمد و ثناء ہو، اور آخری تین آیتوں میں انسان کی مخلوق سے دعا، و درخواست کا مضمون ہے جو رب تعالیٰ
نے اپنی رحمت سے خود ہی انسان کو نبھایا ہے، اور دریا کی ایک آیت میں دونوں چیزیں مشترک
ہیں، کچھ حمد و ثناء کا پہلو ہے کچھ دعا، و درخواست کا۔

صحیح مسلم میں روایت حضرت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر
حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز میں سورۃ فاتحہ میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم
کر دینی ہے، نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے، اور جو کچھ بندہ اگلتا ہے وہ اس کا کچھ
پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تو اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی ہے، اور جب وہ کہتا ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف و ثناء بیان کی ہے، اور جب بندہ کہتا ہے مُلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ
تو اللہ تعالیٰ منہ ماس کے کہ میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے، اور جب بندہ کہتا ہے اِیَّاكَ
نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْذُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے اور میرے بندے کے درمیان مشترک
ہے، کیونکہ اس میں ایک پہلو حق تعالیٰ کی حمد و ثناء کا ہے اور دوسرا پہلو بندے کی دعا، و درخواست کا، اس کے
ساتھ یہی ارشاد ہوا کہ میرے بندے کو وہ چیز ملے گی جس نے مانگی، پھر جب بندہ کہتا ہے:
اِیَّاكَ نَعْبُدُ اِلٰہ اللہ عظیم و بڑا، تو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے کے لئے ہے،
اور اس کو وہ چیز ملے گی جس نے مانگی (منہ ماس)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنی یہ ہیں کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، یعنی دنیا میں چاہا کہیں کہیں
چیز کی تعریف کی جائے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہی کیونکہ اس چاہا رنگ و روپ میں چاہا

اور پھر یہ اصرار کیا کہ ہم نہیں بتلایا جاسکتا کہ غلام کی وصیت کتنی اور کہاں تک ہو۔

شرع کے اس مختصر پیرے کے ساتھ اب تمام عالم اور اس کی کائنات پر نظر ڈالئے اور کچھ عرصت دیکھئے کہ حق تعالیٰ نے قرابت، مالک کا کیا مضبوط اور محکم (یعقول) نظام بنایا ہے، اٹھائیس لے کر مائیکروسکوپ، سیارات و نجوم سے لے کر ذرات تک ہر چیز اس مسئلہ نظام میں بندھی ہوئی اور کچھ مطلق کی خاص ملکیت، اللہ کے اہانت پر جواز دینے کے کام میں مصروف ہے، ایک فقر جو انسان کے مذہب تک پہنچتا ہے، اگر اس کی پیروی حقیقت پر انسان خود کو رکھے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد میں آسمان اور زمین کی تمام قوتیں اور درکاروں انسان اور جانوروں کی تخلیق شامل ہیں، سامنے عالم کی قوتیں بیحد مصروف خدمت رہیں جب یہ فقر تیار ہوا، اور یہ سب کچھ اس کے لیے کہ انسان اس میں غور و فکر کرے کام لے اور کچھ کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لے کر زمین تک اپنی تمام مخلوقات کو اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے، تو جس ہستی کو اس نے خود ہم کائنات بنارکھا ہے وہ بھی بیکار و بیہودہ نہیں ہو سکتی، اس کا بھی کوئی کام ہوگا، اس کے ذمے بھی کوئی خدمت ہوگی۔

اور باد و خورشید و فلک و درکارانہ تازانے بگت آری و منتقل بخوری
بہر از ہر و سرگشتہ و منبرا و نیر و دار
شرط انصاف باشد کہ تو قرآن نیری
قرآن حکم کنے انسانی آفرینش اور اس کے مقصد حیات کو اس آیت میں واضح منسرایا ہے،
وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

﴿الْقِسْمَةُ ۱۷﴾ | نہیں بنایا کسی دوسرے مقصد کے لیے
تقریباً مذکورہ مسلم ہو کہ قرأت القرآن ایک حیثیت سے پہلے پہلے اَلْخَلْقُ لِلَّهِ کی دلیل ہو کہ جب تمام کائنات کی قرابت و پرورش کی ذمہ دار صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو وہ دشار کی معنیت میں جس میں ہر چیز جو حق ہے، اس سے پہلے آیت اَلْخَلْقُ لِلَّهِ قرابت القرآن میں حشر کے ساتھ ایمان کے سبب پہلے رکھ کر توحید باری تعالیٰ کا بیان بھی ہر فقرہ میں آگیا۔

دوسری آیت میں یہ صفت رحمت کا ذکر بلحاظ صفت و تحقیق کر دیا گیا ہے، یہ اذون عینے ہمارے کہ جس میں رحمت خداوندی کی دست و کثرت اور کمال کا بیان ہے، اس صفت کے ذکر کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کر یہ تمام کائنات و مخلوقات کی قرابت و پرورش کی ذمہ داری جو حق تعالیٰ نے اپنے زود رکھی ہے، وہی اپنی ضرورت یاد آؤ اور مجبور سے نہیں، بلکہ ہر سب کچھ اس کی صفت رحمت کا تقاضا ہے، اگر ہر آدمی کائنات مذہب کو اس کا کچھ نقصان نہیں، اور ہو جائے تو اس پر کچھ ہائیں۔

نہایتی ہر کلمہ خالقیت نمود + نہ چوں کہ وہ شہر ہو تو رحمت فرمود

مَلَائِكَةٍ يُؤْمِنُونَ لِقَاءَ رَبِّكَ فَلَمْ يَكُنْ مِنْهُمْ مَعْشَرٌ يَسْتَفْتُونَ
تفسیر کہ اس میں تعزیر کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو (تو اس) لفظ جنت کے معنی جسزاد و بنا
مَلَائِكَةٍ يُؤْمِنُونَ لِقَاءَ رَبِّكَ کا مطلق ترجمہ ہو "مالک و راجع" کا "یعنی روز جزاء میں ملکیت رکھنے والا" وہ ملکیت کہ جس پر سب پر ہوگی! اس کا ذکر نہیں کیا گیا، تفسیر کثرت میں ہے کہ اس میں اشارہ عموم کی طرف ہے، یعنی روز جزاء میں تمام کائنات، اور تمام امور کی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی (کائنات، روز جزاء کی حقیقت، اسباب چند ہیں قابل غور ہیں،
اور خلف اس کی طرف)

آؤں یہ کہ روز جزاء کس دن کا نام ہے، اور اس کی کیا حقیقت ہے!
دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت تمام کائنات پر جس طرح روز جزاء میں ہوگی ایسے ہی آج بھی ہے، پھر روز جزاء کی کیا خصوصیت ہے!

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ روز جزاء اس دن کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نیک و بد اعمال کا بدلہ دینے کے لیے مقرر فرمایا ہے، لفظ روز جزاء سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ دنیا تک یہ اعمال کی جزاء و منزلت کا جگہ نہیں، بلکہ ایک دارا عمل فرض ادا کرنے کا دفتر ہے، خواہ با صلہ وصول کرنے کا جگہ نہیں، اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں کسی کو عیش و عشرت، دولت و راحت سے مالا مال دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول و محبوب ہے، یا کہ کوئی وصیت میں مبتلا ہو کر نہیں استراہا یا سنا کہ وہ اللہ کے نزدیک محبوب و مقبول ہے جس طرح دنیا کے دفتر میں اور کھانا کھا کر کسی کو اپنا فرض ادا کرنے میں مصروف نہ دیکھا جائے تو کوئی عقلمند اس کو مصیبت نہیں ٹھہرے کہتا، اور نہ وہ اپنی شفقت کے دروازہ آپ کو کھول کر دیکھ کر مصیبت سمجھتا ہے، بلکہ وہ اس نعمت و شفقت کو اپنی سب سے بڑی کامیابی تصور کرتا ہے، اور کوئی کہہ نہیں اس کو اس شفقت سے بیکار و بیکار چاہے تو وہ اپنا تجربہ، جس خیال کرتا ہے، ہو کر کہ وہ اس میں روز جزاء کے لیے ہر وہ آس راحت کو دیکھ رہا ہے جو اس کو نفع و کامیابی میں ملنے والی ہے۔

یہی وجہ کہ اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے بعد اولیاء اللہ سب سے زیادہ مصیبت بلا میں مبتلا رہے ہیں، اور یہ اپنی اس حالت پر نہایت مطمئن اور بدعات سرور نظر کرتے ہیں۔
فانور نصیب جس کو شہر و ملک قیامت
سیر و مستان سلامت کو تو خبر آرزوئی

ان فرض دنیا کی عیش و عشرت حق و صداقت کی اور حج و مصیبت، بھل کی یقین علامت نہیں کہ
ان میں کسی بھی کسی عمل کی جزاء سزا یا عطا سزا نہیں ملے گی بلکہ سزا یا عطا سزا ہے، وہ اس کا بدلہ دے گا
نہیں ہوں، محض متنبہ کرنے کے لیے ایک نمونہ ہوا ہے، اس کے متعلق شرع کا ارشاد ہے،

کا بیان بھی بت دین کے آگیا، اب جو حق آیت کا بیان آتا ہے،

وَالَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ مُسْتَعِينُونَ اس آیت میں ایک پہلو دیکھنا کہ اور دوسرا دعا، درود خواہ ہے، عِبَادَتِ عِبَادَتِ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی کی انتہائی تعظیم و محبت کی وجہ سے اس کے ساتھ اپنی انتہائی عاجزی اور سسرمانہ راداری کا اظہار، مُسْتَعِينَات سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی سے مدد مانگنا، آیت کا ترجمہ ہے کہ تم میری ہی عبادت کرتے ہو اور صرف تمہاری مدد مانگتے ہو۔ انسان پر یہی حالت گزرتے ہو، ماضی، حال، مستقبل، پچھلے میں آج میں سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اور اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم انسان کو اس پر مضبوط کر دیا گیا کہ وہ اپنے ماضی اور حال میں صرف اللہ تعالیٰ کا قنا ہے، کہ اس کو ماضی میں ابھرتے ہو دیا اور اس کو تمام کائنات سے زیادہ بہترین شکل و صورت اور عقل و بصیرت عطا فرمائی، اور حال میں اس کی پرورش اور تربیت کا سلسلہ جاری ہے، اور عِبَادَتِ یُقِيمُونَ اللہ تعالیٰ میں یہ بتا دیا کہ مستقبل میں بھی وہ خدا کا قنا ہے کہ وہ درخشاں ہیں اس کے سوا کسی کو قنا کی دہ دیا نہیں ہو سکتا، اور جب اپنا آئینوں نے یہ واضح کر دیا کہ انسان اپنی زندگی کے تینوں ذریعہ ماضی، حال و مستقبل میں صرف اللہ تعالیٰ سے وابستہ رہنا چاہیے، اور عقلی تقاضا یہ ہو کہ عبادت بھی صرف اسی کی کی جائے، کیونکہ عبادت جو انتہائی تعظیم و محبت کے ساتھ اپنی انتہائی عاجزی اور تذلل کا نام ہے، وہ کسی دوسری ہستی کے لائق نہیں، اس کا نتیجہ لازمی ہے کہ ایک مائل انسان پکارے کہ میرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، اسی مشتقا سے طبع کو یَقِیْمُونَ عِبَادَتِ میں ظاہر فرما دیا گیا ہے، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ عبادت دراصل ایک ہی ذات اللہ تعالیٰ کے ہے تو افسانے عقلی طبع سے کہہ لے کہ اس کے ماضی، حال و مستقبل میں صرف اسی سے مانگنا چاہئے، اسی افسانے عقلی طبع کو یَقِیْمُونَ عِبَادَتِ میں ذکر فرما دیا گیا ہے۔ درود انتہائی پاک

فوز اس حق آیت میں ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے کہ عبادت و امانت کے لائق صرف وہی ہے، اور دوسری حیثیت سے انسان کی دعا، درخواست ہے کہ عبادت میں مدد فرمائے اور میری حیثیت اور بھی ہے کہ اس میں انسان کو اس کی تسلیم دینی چاہیے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے، اور حقیقی طور پر اللہ کے سوا کسی کو عبادت نہ دے، وہ ذبح، اور کسی کے سلتے دست سوال درواز نہ کرے، کسی بھی راوی و دفعہ کو وسیلہ قرار دے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اس کے ناشافی نہیں۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابل غور کہ اگر شادی ہے کہ بچہ بچہ سے مدد مانگتے ہیں جس کا میں مدد مانگتے ہیں اس کا ذکر نہیں، یہود و مسیحی نے کہا ہے کہ اس کا ذکر نہ کرنے میں عیسیٰ کی عبادت کا اشارہ ہے کہ ہم اپنی عبادت اور پروائی و ذمہ داری کا کام اور مقصد میں صرف کپ کی مدد چاہتے ہیں۔ پھر عبادت صرف غار و دے کا نام نہیں، امام غزالی نے اپنی کتاب اربعین میں عبادت

وہی نہیں بھی، غنا، زکوٰۃ، روزہ، حج، عبادت قرآن، ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرنا، سلاطین و دہلیز کے لئے کوشش کرنا، پڑوسی اور سہیلی کے حقوق ادا کرنا، لوگوں کو نیکی کا عمل کا حکم کرنا اور ہر سے کاموں سے منع کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنا۔ اس لئے عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے کہ منہ پر ہونے لگے کہ کسی کی محبت اللہ تعالیٰ کے برابر ہو، نہ کسی کا خوف اس کے برابر ہو، نہ کسی سے امید اس کی طرح ہو، نہ کسی پر بھروسہ اللہ کے مثل ہو، نہ کسی کی اطاعت و خدمت اور کام کا ستارہ و سید جیسے جتنا اللہ تعالیٰ کی جلالت کو اللہ تعالیٰ کی طرح کسی کی تذلل و سستی ماننے، نہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی دوسرے کے سامنے اپنی محل محبت میں اور تذلل کا اظہار کرے، نہ وہ افعال کسی دوسرے کے لئے کرے جو انتہائی تذلل کی علامات ہیں، جیسے دگر و بچہ۔

آخری تین آیتیں میں انسان کی دعا، درخواست کا مضمون ہے اور ایک خاص دعا کی تلقین کرتے ہیں، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم عِبَادَتِ یُقِيمُونَ اللہ تعالیٰ میں یہ بتا دیا کہ عبادت دراصل ایک ہی ذات اللہ تعالیٰ کے ہے تو افسانے عقلی طبع سے کہہ لے کہ اس کے ماضی، حال و مستقبل میں صرف اسی سے مانگنا چاہئے، اسی افسانے عقلی طبع کو یَقِیْمُونَ عِبَادَتِ میں ذکر فرما دیا گیا ہے۔ درود انتہائی پاک

ان تینوں آیت میں اپنے قابل غور ہے، کیا پہلی بات قابل غور ہے کہ ہر مرد و مستقیم کی ہدایت کے لئے دعا جو اس آیت میں تعلیم فرمائی گئی ہے اس کے عجب خاص طریق تمام انسانی اور دعا و سز میں ہیں، اسی طرح اولیاء و اولاد اور حضرات انبیاء و علیہم السلام بھی اس کے ماحور ہیں، جو بلاشبہ ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہیں، پھر اس ماحول شدہ چیز کی بار بار دعا مانگنے کا کیا مطلب ہے! اس کا جواب ہدایت کی پوری حقیقت معلوم کرنے پر موقوف ہے، اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے، جس سے سوال مذکور کے علاوہ ان تمام شکاوت کا بھی جواب معلوم ہو جائیگا جو معلوم ہدایت کے متعلق مشرک کریم کے ہیبت سے معاملات میں ہوا، پیش آتے ہیں، اور ہدایت کی حقیقت سے آگاہی قرآن کی بہت سی آیات میں باقی تھا و اختلاف محسوس کرنے لگے۔

لفظ جاتی ہے کہ بہترین شیخ امام غزالی نے مفرقات القرآن میں تحریر فرمائی ہے کہ جس کا شکار ہے کہ ہدایت کے معنی ہیں کسی شخص کو سزا کی غرض سے کسی کی طرف ہدایت کے ساتھ رہنا، کہ اگر دعا ہدایت کا معنی ہے، تو اللہ تعالیٰ ہی کا مثل ہے، جس کے مختلف درجات ہیں، ایک درجہ ہدایت کا عام ہے، جو کائنات و مخلوقات کی تمام اقسام جاودات، نباتات،

مطلوع مستقیم کو مشیق کرنے کے لئے اپنے مقبول بندوں کی قربت دینا اس کی دلیل ہے کہ بعض کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کے لئے کافی نہیں، بلکہ کسی ماہر سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

معلوم ہو کہ انسان کی صلاح و فلاح کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک کتاب اللہ پر ایمان لانا اور دوسری اس کے ہر شے سے متعلق احکام کو ملحوظ رکھنا، دوسرے رجال اللہ ہیں اللہ والے، ان سے استفادے کی صورت یہ ہے کہ کتاب اللہ کے معارف اصول پر رجال اللہ کو پکھا جائے، جو اس میں لکھا ہے، ان کو رجال اللہ ہی نہ سمجھا جائے، اور جب رجال اللہ صحیح معنی میں حاصل ہو جائیں، تو ان سے کتاب اللہ کا مفہوم سمجھنے اور عمل کرنے کا کام لیا جائے۔

فرقہ وارانہ اختلافات ابھی سے کچھ دو گھنٹے سے صرف کتاب اللہ کو لے لیا، رجال اللہ سے قبل نظر کا پڑا ایسا

کر لی، ان کی تفسیر و تعلیم کو کوئی حیثیت نہ ہو، اور کچھ دو گھنٹے سے صرف رجال اللہ کو ملاحظہ میں لیا، اور کتاب اللہ سے کچھ بند کر لی، اور ان دونوں طریقوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ

سورۃ فاتحہ کے متعلق احکام و مسائل

سورۃ فاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء، پھر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کا اقرار اور اس کا اہتمام ہے کہ چاہے سوا کسی کو اپنا ماہر و راہنہ سمجھے، یہ گویا عبادت و فاداری کو جو اللہ ہی اپنے رب کے ساتھ کرتا ہے، اس کے بعد کچھ ایسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں جو تمام انسانی مقاصد و ضروریات پر مادی اور اس میں بہت سے فوائد اور مسائل ضمنی آتے ہیں، ان میں سے چند ہم مسائل کو لکھ چکا ہے۔

دعا کرنے کا طریقہ (۱) اس خاص اسلوب کلام کے ذریعہ انسان کو تعلیم دی گئی ہے کہ جب اللہ جل شانہ سے کوئی دعا و درخواست کرنا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کی حمد و ثناء کا فرض پورا کر پھر ملحق و فاداری اس بات کا کہ وہ اس کو اس کی کوئی عبادت سمجھتے ہیں، اور کسی کو حقیقی معنی میں شک کا اور حاجت روا مانتے ہیں، اس کے بعد اپنے مطلب کی دعا کر دے اس طریقہ سے جو دعا کی جائے اس کے قبول ہونے کی قوی امید ہے (۲) احکام چھتاس

اور دعا کی یہی ایسی حالت دعا و شہادت یا اگر جس میں انفرادی کے ساتھ انسان کے تمام مقاصد داخل ہو جائیں، جیسے دعا بابت صراطِ مستقیم کو دنیا و دین کے برکات میں اگر انسان کا واسطہ ہو تو یہاں تو یہیں غور کرتے اور نقصان پہنچنے کا خطرہ نہیں رہتا، غرض اس بگڑے و حق تعالیٰ کی طرف سے اپنی دعا ثناء بیان کرنے کا اصل مقدار انسان کو تعلیم دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء (۱) اس سورت کے پہلے چلے ہی اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے کی تعلیم و ترویج انسانی کا نظریہ مندرجہ ذیل ہے، ہر گھر میں نعت یا صفت کی بنا پر پڑھ کر لی ہے، یہاں کسی نعت یا صفت

کا ذکر نہیں اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں، ان کا کوئی انسان احاطہ نہیں کر سکتا، جیسا کہ مشرکان کچھ کار شاعر، وَاِنَّ لَآ مَقْعَدَ لِلْعَاقِبَتِ وَاللّٰہُ لَا یُحِصِیْہَا (۳۳:۳۴) میں ہی ان کا اشارہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شکر کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے انسان اگر سالانہ عالم کچھ ذکر کرے ہی وہ پورے نظر ڈال لے تو معلوم ہو گا کہ اس کا وہ خود ایک عالم صغیر ہے جس میں عالم کبر کے سارے نعمت موجود ہیں، اس کا پورا زمین کی مثال ہے، اس پر ہاتھ ڈالنے والے دنیا جات کی مثال ہیں، اس کی پٹیاں پیازوں کی شبیہ ہیں، اس کے بدلے کی گھیریں ہیں مگر خون رواں ہے زمین کے پتے چھنے والے بھڑوں اور بڑوں کی مثال ہیں۔

انسان دو چیز سے مرکب ہے، ایک بدن اور دوسرے روح، اور یہی ظاہر ہے کہ قدرت کے کائنات سے روح اصل اور فاضل ہے، بدنی صفت اس کے تابع اور ادنیٰ درجہ رکھتا ہے، اس ادنیٰ حسیں کے متعلق ہی انسان کی تحقیق کرنے والے اہل اہل اور اہل تشیع نے بتلایا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے تعزیناً یا تجزیراً صراحت اور نشانہ رکھے ہیں، اس کے بدن میں جس سے زیادہ جڑیں، ہر ایک جو کڑا کڑا تعالیٰ ہی کی قدرت کا مظہر ہے ایسا حکم بنایا ہے کہ ہر وقت کی حرکت کے باوجود وہ جھکتا ہے، نہ اس کی مرثیٰ کی ضرورت ہوتی ہے، مادۃ انسان کی عمر ساٹھ سال ہوتی ہے، پوری عمر اس کے ہر ذرہ و ذرہ اعضا، اور ان کے سب جو کڑا و اوقات اس طرح حرکت میں رہتے ہیں کہ فوہ کی ہر تا تو گیس جاتا، مگر حق تعالیٰ نے فرمایا اَنْفُ حَقِّقْ فَعَلْفَعْلَفٌ وَشَدَّ ذَا شَرِّہُمْ (۱:۲) میں ہی ان کے بدن میں انسان کو کیا کیا اور ہم نے ہی اس کے ہر ذرہ و ذرہ کا کسے کسے قدرتی مقبولی کا نتیجہ ہے کہ تمام مادیات کے مطابق یہ ہم ذرہ و ذرہ جو شہر ہیں اور اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کام دیتے ہیں، انسانی اعضا و جوارح صرف ایک آنکھ ہی کو لے لیجئے، اس میں جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کی حکمت باللہ کے مظاہر موجود ہیں، انسان کو ہر طرح پر کر کے جو ان کا پورا ارادہ آسانی نہیں۔

پھر اس آنکھ کے صرف ایک مرتبہ کے عمل کو دیکھ کر حساب لگانے کا اس ایک منٹ کی کل میں حق تعالیٰ کی کتنی نعمتیں کام کر رہی ہیں، تو حیرت ہوتی ہے، یہ دیکھ کر کہ آنکھ اٹھی اور اس کے کسی چیز کو دیکھا اس میں جس طرح آنکھ کی اندرونی طاقتوں نے عمل کیا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کی بیرونی عظمت کا اس میں بڑا نمونہ ہے، اگر کتاب کی روشنی نہ ہو تو آنکھ کے اندر کی روشنی کام نہیں لے سکتی، پھر آنکھ کے لئے بھی ایک نقصان کی ضرورت ہوتی ہے، انسان کے دیکھنے اور آنکھ کو کام لانے کے لئے نفاذ و ہوا و فوہ کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے معلوم ہو کہ ایک مرتبہ نظر آنکھ کو کچھ دیکھتی ہو اس میں ہونے والے عالم کی طاقتیں کام کر رہی ہیں، ایک مرتبہ کا عمل ہوا، پھر کچھ دن میں کتنی مرتبہ دیکھتی اور اس کا کیا کتنی مرتبہ، ہر گھر میں کتنی مرتبہ، یہ ایسا سلسلہ ہے جس کے اعادہ و تکرار انسانی طاقت سے خارج ہیں۔

اس طرح کان، زبان، ہاتھ و پاؤں کے جتنے کام ہیں ان سب میں ہونے والے عالم کی توہین شامل

ہرگز کام نہ پڑا ہو سکا ہے، یہ تو دولت ہے جو ہر زندہ انسان کو میسر ہے، اس میں شاہ و گدا، امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں، اور اللہ جل شانہ کی بڑی بڑی نعمتیں سب ایسی ہی دقت عام ہیں کہ ہر فرد انسانی انہی سے نفع اٹھا سکتا ہے، آسمان و زمین ان دونوں میں اور ان کے درمیان پیدا ہونے والی تمام کائنات کا مادہ، سورج، قمریت اور کسپائے، ہوا، آتش، کائنات پر جاندار کی پہچان و پیدائش تمام کے بعد اللہ جل شانہ کی نعمتیں خاصہ جو انسان کے افراد کائنات کے لئے نعمت تھیں کہ وہ ان سے بے غلہ و ہونے ہیں، مال اور دولت، عزت اور پاؤ، راحت اور آرام سب اس نعمت میں داخل ہیں، اور اگرچہ یہ بات بالکل برسی ہے کہ نعمت کے ساتھ تمام انسانوں میں مساوی طور پر شریک نہیں ہے، آسمان و زمین اور ان کی تمام مخلوقات پر نعمتیں نسبت نعمت خاصہ مال اور دولت دھیسڑ کی زیادہ و کم اور شریک ہیں، مگر یہ ہر حال میں انسان تمام انسانوں میں عام ہونے کی بنا پر، کسی ان عظیم انسان نعمتوں کی طرف التفات بھی نہیں کرتا بلکہ یہ کوئی نعمت ہے، صرف گروہ و طبقہ کی معمولی چیزیں کھانے پینے، رہنے سہنے کی خصوصیتیں ہیں، ہر اس کی نظر مرک جاتی ہے۔ ہر حال یہ ایک سرسری غور ہے، ان نعمتوں کا جو ہر انسان پر ہر وقت مہل و ایں دیکھا جالازی نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی نعمت و درہمیان احسانات و انعامات کرنے والے کی حدود و گتہ کرے، اور اگر نہ ہے، اسی کے نقصانے غفلت کی نعمتیں کے لئے قرآن کی سب سے پہلی صورت کا سب سے پہلا آیت **لَا تَقْسِدُوا وُجُوْہَکُمْ** لایا ہے، اور اللہ کی حدود و گتہ عبادت میں چار درجہ دیا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائیں اور وہ اس پر اکتور کہے تو بجا ہو گیا کہ گویا کچھ اس نے لیا ہے اس سے افضل چیز نہ دی تو دلچسپی از اسى اہم برداشت انہی

ایک دوسری حدیث میں یوکر اگر ساری دنیا کی نعمتیں کسی ایک شخص کو حاصل ہو جائیں اور وہ اس پر کھمبہ کہے تو یہ کھمبہ ان ساری دنیا کی نعمتوں سے افضل ہے۔ فخریٰ نے یہاں ملایا نقل کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کھمبہ ان دنیا کی نعمتوں کے لیے ایک فستک کا اور یہ نعمت ساری دنیا کی نعمتوں سے افضل ہے اور حدیث صحیح میں ہے کہ کھمبہ کے میزان میں کھمبہ کا اور پتھر بھرا ہوا ہے اور خدا کی حقیقت حضرت شفیق بن ابراہیمؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی چیز عطا فرمائے تو اول اس کے دینے والے کو پہنچاؤ، پھر جو کچھ اس نے دیا ہو اس پر راضی ہو جاؤ، پھر جب تک محتاج نہ ہو جس میں اس کی گھلائی ہوئی قوت و طاقت موجود ہے اس کی نافرمانی کے قریب نہ جاؤ و قرعہ ادراکھہ ۱۰۰۰ ہے۔ اس میں انشاء اللہ کے ساتھ شروع میں حرف لام لگا ہوا ہے جس کو کوہیت کے نام سے یہ لام لکھا جس کا جانا ہے، جو کسی حکم یا وصفت کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس لکھ

ہمیں یہی کھربوت میں نہیں کرانے تھا کی کو محدودنا، انسان کا فرض ہے، بلکہ حقیقت ہے کہ کو محدودنا، صرف ان کی ذات قدوس کے ساتھ مخصوص ہے، حقیقی طور پر اس کے سرعام میں کوئی یقین محدودنا، کا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہاں اس کے ساتھ یہ بھی اس کا انعام ہے کہ انسان کو تہذیب و احسان کی تعلیم کے لئے اس کو یہی محدود کر دیا کہ میری نعمت و احسان جن واسطوں سے تمہارے لئے آئے آج ادا کا میں شکر ادا کرو، کیونکہ جو شخص اپنے عین انسان کا شکر ادا کرے گا خوشگزر نہ ہو وہ خدا کا میں شکر ادا نہیں کرے گا۔

خود اپنی مدد و نشانہ کی (۲) خود اپنی محدود نشانہ کا بیان کرنا کسی مخلوق کے لئے جائز نہیں، قرآن کریم انسان کے لئے جائز نہیں میں ارشاد ہے:-

ہم نے ان کے لیے ایک اور جگہ بھی مقرر کر دی ہے۔
 اس جگہ پر کوئی بھی نہیں آئے گا۔

پسین (۳۴/۵۳)

مطلب ہے کہ اگر انسان کی تعریف اور مدح کا مدار تقویٰ پر ہے، اور اس کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ اس کا تقویٰ کس درجہ پر ہے، اس لیے یہ تعریف حق تعالیٰ نے جو بیان فرمائی ہے، اس کی وجہ سے کہ بجا رہے انسان، اس کی ہست و عدم نہیں رکھتا کہ اگر وہ عزت و وجلت کی حمد و ثناء کیسے بیان کرے اور کسی کی تو کیا مجال کہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان حمد و ثناء کرے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَمْنَحُوا ثَنَاءً عَلَىَّ، یعنی میں آپ کی ثناء کا حق نہیں کر سکتا، اس نے اللہ جل شانہ سے خود شایان شان کا طریقہ انسان کو تعلیم فرمایا۔

فقط رب مطلقاً کا خاص نام ہے۔ (۴) لفظ رب کو اپنے شخص کے لئے بولا جا کے جو کسی چیز کا مالک ہو اور اس کی تربیت و اصلاح کی تہ پر اور جو کسی مگرانی یا بھی کرنا اور یہ ظاہر ہے کہ اسی کائنات و مخلوقات کا ایسا رب مولے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا اس لئے یہ لفظ اپنے اطلاق کے وقت حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، لفظ رب کو رب بنا جائز نہیں، جس مسلم کی حدیث میں اسی کی ممانعت آئی ہے کہ کوئی ظلم یا لو کر اپنے آقا کو رب کہے، اگر کسی خاص چیز کی طرف اضافت کر کے انسانی وغیرہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جا سکتا ہے، مثلاً ربّ الکافی، ربّ اللہ اور وغیرہ و قریناً

استقامت سے ہمیں کی شرح
اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں کی شرح
اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں کی شرح
اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں کی شرح

بعض سلف صالحین نے فرمایا کہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر قرآن کا راز و غماز ہے اور آیت اِنَّا لَقَدْ فَتَنَّا وَابْتَلٰی قُلُوبَهُمْ پوری سورۃ فاتحہ کا راز و غماز ہے، کیونکہ اس کے پہلے چلے میں شرک سے نری ہونے کا اعلان ہے، اور دوسرے چلے میں اپنی قوت و قدرت سے نری ہونے کا اعلان ہے کہ بندہ عاجز و ناتوان ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا، چنانچہ اپنے سب کاموں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہے، جس کی ہدایت قرآن کریم ہی چاہیاء ہے، قَاتِلِیْہِمْ وَاَمْشِیْہِمْ وَتَوَلَّوْا عَنْ عِلَیْہِمْ (ہود: ۷۳) قُلْ هٰذَا مَوْضِعُ الْاِثْمِ اِثْمَاہُمْ وَتَوَلَّوْا عَنْ قَوْلِہُمْ اِذْ ذٰلَکَ ۚ (۲۹) رَبُّہِ الْمَشْرِیْقِ وَالْمَغْرِبِ ۚ اِنَّہٗ اِلٰہٌ ۭ اَحَدٌ ۭ لَا یُحِیْ ۚ وَیَمِیْتُ ۚ (زمزم: ۹)

ان تمام آیات کا حاصل یہی ہے کہ خوش اپنے بڑے بڑے اعمال اور دوسرے ماہرین زانیہ قایت پر کرے دیکس و دسکر کے مدد پر لکھ لکھ کر اللہ تعالیٰ ہی پر بونا چاہئے، وہی کارنامہ مطلق ہے۔ اس سے دوسرے اصول عقائد کے ثابت ہونے، ازلہ یکر۔

طرح کے سوا کسی کی عبادت، اور اپنی عبادت کے معنی اور پر معلوم ہو چکے ہیں کہ کسی ذات کی انتہائی عظمت و اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرنا، جس کی بنا پر اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور ذلیل کا اظہار کر دیا اور اذاعل صافی منسوب ہو۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے، تو وہی شرک کہلاتا ہے۔ اس سے معلوم ہو کہ شرک صرف اسی کو نہیں کہتے کہ بت پرستوں کی طرح کسی چتر کی توری و فیکو نہائی نہایت کمال کا مالک سمجھے بلکہ کسی کی عظمت، محبت، اطاعت کر دے دینا جو اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے، یہی شرک ہے، اور اس کے بعد ہی یہ دو دھاری کے شرک کا بیان کرتے ہوئے اوشاد فرمایا ہے:

اِشْعَدُ وَالتَّحْنِیْتُ شَعْرَہٗ وَتَحْنِیْتُ شَعْرَہٗ
اَزَّیْنٰہَا قِیْنَ ذُوْیْنَ الشُّعْرِ (۳۱: ۹)

حضرت مدی بن حاتم جو مسلمان ہوئے سے پہلے نصرانی تھے، انھوں نے اس آیت کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ قرآن ہے، اے اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے، پھر تشریف لائے ان کو مسلمان بنانے کا ارادہ کیا کہ یہ لکھا گیا آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ملاہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے مال ہیں، اور تم نے ان کے علاوہ کچھ اور ان کو مال ہی سمجھتے ہو، اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے مال ہیں، اے اللہ تعالیٰ کے مال ہیں، ان کو حلال کر دیتے ہیں، تو تم ان کے کہنے کا اتباع کر کے مال کر لیتے ہو، مدی بن حاتم نے عرض کیا کہ جیسا ایسا کہتے ہیں، اس پر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو ان کی عبادت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے مال یا حرام قرار دینے کا حق صرف حق تعالیٰ کا ہے جو مخلوق

میں کسی دوسرے کو شریک قرار دینے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حرام و حلال معلوم ہونے کے باوجود ان کے خلاف کسی دوسرے کے قول کو واجب الاتباع سمجھ دے اور اس کی عبادت کرنا ہے، اور دوسرے میں مستحب ہے۔

کلمہ مسلمان جو قرآن و سنت کو براہ راست سمجھنے کی اور ان سے احکام شرعی نکالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس نے کسی امام مجتہد، عالم یا مفتی کے قول پر اعتقاد کر کے عمل کرتے ہیں اس کو اس آیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ وہ درحقیقت قرآن و سنت ہی پر عمل ہے اور احکام خداوندی ہی کی اطاعت ہے، اور خود قرآن کریم نے اس کی ہدایت فرمائی ہے:

فَاسْتَشِیْزُوا اَخْلَیْنَ اَللّٰہِ عَلٰی سُلُوْکِہُمْ مُّشْہِدًا
اَللّٰہُ مُشْہِدٌ ۙ (۳۳: ۱۱۵)

اور میں ہر طرح احکام حلال و حرام میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو شریک کرنا شرک ہے اس طرح کسی کے نام کی نذر سنت، ماننا بھی شرک میں داخل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو عبادت روا ٹھکانا بھی شرک ہے، اور اگر کسی کو شرک ہے، کیونکہ حدیث میں دیا کہ عبادت فرمایا گیا ہے۔ اس طرح ایسے اعمال و افعال جو علماء شرک کے کہتے ہیں ان کا انکباب بھی مجہم شرک ہے

جیسے حضرت مدی بن حاتم نے فرمایا کہ مسلمان ہونے کے بعد میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں حاضر ہوا تو میرے مجاہد صلیب پڑی ہوئی تھی، آپ نے مجھے سے فرمایا کہ اس بت کو اپنے گلے سے کاٹ دو، اگر میں اس وقت مدی بن حاتم کا خادمہ صلیب کے متعلق وہ خبر پڑے ہوتی تو میں اس کا پتہ نہ دیتا۔ ظاہری طور پر یہی عبادت شرک ہے، شتاب کو ضروری سمجھ کر یہ ہدایت کی گئی، مفسرین کا اچھل بھڑا دل مسلمان ریڈ کر اس کا صلیب نشان لگاتے ہوئے چھوٹے ہیں، اور کوئی یہ دہرائیں کہتے، کہ بلا وجہ ایک شرک کا جرم کے مرتکب ہوئے ہیں، اسی طرح کسی کو کہنا کہ انبیا و ائمہ کے سوا کسی دوسری چیز کے گرد و اطواف کرنا، یہ سب علامات شرک ہیں، ان کے انتساب و ابتلاء قیامت کے روز امانت و وفادار کا جو ہے، دوسرا مسئلہ یہ کہ ہر عبادت اور ہر عبادت اللہ تعالیٰ ہی سے کرتا ہے کسی دوسرے ہاتھ میں مسئلہ ہنسات و قسمل کی تعیین یہ دوسرا مسئلہ بھی ہے، مدی بن حاتم کا زور فقرہ طلب ہی کیونکہ ایک حد اور احکام کی تقدیر میں قسمل تو ماضی اسباب کے ماحول پر انسان دوسرے انسان سے لیتا ہے، اس کے بغیر اس دنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، ہنسات کا دینی ہنسات کے ذریعہ ماری مخلوق کی خدمت کو ناز و مزور و معمار، بعضی اوقات سب مخلوق کی مدد دینا بھی ہے، اور ہر نفس ان کو دینے چاہئے، جو مجبور ہے، ظاہر ہے کہ کسی دین اللہ کی عبادت میں نہ ہو، دوسرے ہنسات میں داخل نہیں، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خداوندی ہے، اسی طرح فرمادی ہے، اب اس کے ذریعہ کسی نبی یا ولی سے دعا کرنے

کی مدد مانگنا اِن کا وسیلہ ہے کہ ربو راست اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اور ایسے حدیث اور احادیث قرآن سے اس کا بھی جواز ثابت کر دو، جس کا بھی استعانت میں داخل نہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص اور غیر اللہ کے لئے حرام و مشرک ہے۔

اب وہ مخصوص استعانت و امداد جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہ ہو اور غیر اللہ کے لئے مشرک ہو کسی پر اس کی دُعا نہیں ہے، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی اور انسان کو خدا تعالیٰ کی طرح قادر مطلق اور رفیع مطلق سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے، یہ تو ایسا بھوکا کھوکھرا ہے کہ کام مشرکین سے بہتر ہے کہ اس کو کفر سمجھتے ہیں، اپنے نبیوں اور ان کی اولاد کو باطل خدا تعالیٰ کی مشعل قادر مطلق اور رفیع مطلق سمجھ کر بھی نہیں مانتے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کو کفر اختیار کرتے ہیں، اور قرآن اور اسلام اس کو باطل و مشرک قرار دیتا ہے، و یاتقۃ کُفُوفِیوں میں یہی مراد ہے، کہ ایسی استعانت و امداد وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں پاتے، وہ یہ کہ اللہ کی کسی مخلوق فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی دُعا کے شائق و عقیدہ رکھنا اگرچہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کامل اقتضیات اسی کے ہیں، لیکن اس نے اپنی قدرت و غنیہ کا کچھ حصہ نقلی شخص کو سونپ دیا ہے، اور اُس دانے میں وہ خود غنا کر رہی ہیں وہ استعانت و استمداد سے بے مومن و کافر ہیں فرق اور اسلام و کفر یہاں بہت بڑا کرتی ہے، قرآن اس کو مشرک و حرام قرار دیتا ہے، بہت ہرست مشرکین اس کے فائل اور اس پر حامل ہیں۔

اس معاملے میں دھوکہ یہاں سے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے فرشتوں کے استحقاق نبوی نظام کے بہت سے کام جاری کرتے ہیں، دیکھئے وہ اس معاملے میں بڑا سکا ہے کہ اس فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے بہت سیاد ہر دگر دیا ہے، یا انبیاء علیہم السلام کے ذریعے بہت سے ایسے کام وجود میں آتے ہیں جو مامور اولیٰ کی قدرت سے خارج ہیں، جن کو کفر و کجاعت کہا جاوے، اسی طرح اولیاء اللہ کے ذریعے بھی ایسے ہی بہت سے کام وجود میں آتے ہیں، جن کو کفر و کجاعت کہا جاوے، یہاں سرسری نظر والوں کو یہ منالط گھباہتا ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کامل کی قدرت و شہادت ان کو سہرہ دیکھتا تو ان کے ہاتھ سے یہ کیسے وجود میں آتے؟ اس سے وہ ان انبیاء و اولیاء کے ایک درجے میں شک کر رہے ہیں کا عقیدہ بناتے ہیں حالانکہ حقیقت یوں نہیں، بلکہ حجرات اور کرامات ربو راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، صرف اس کا پتہ دینا ہی کافی نہیں، بلکہ حجرات اور کرامات ثابت کرنے کے لئے کیا جاوے، پیغمبر اور ولی کو اس کے وجود میں لانے کا کوئی بہت سیاد نہیں ہوتا، قرآن مجید کے ہر شانہ آیات اس پر شاہد ہیں، مٹو آیت قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ (۱۰۰)، یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس محبوب کا ذکر ہے جس میں آپ نے دشمن کے لشکر کی طرف ایک مٹی بکھریوں کی بھیجی، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے

وہ سارے لشکر کی اسحوں میں جا گئیں، اس کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ آپ نے نہیں بھیجی بلکہ اللہ تعالیٰ نے بھیجی تھی، جس سے معلوم ہو کہ معجزہ جو حق کے واسطے سے صادر ہوتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کو جب اُن کی قوم نے کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو جس درخت سے ڈرا ہے میں وہ بلا لیجئے، تو انھوں نے فرمایا: اِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ لَكُم مِّنْ غَدِ طَائِفٍ (۲۳۵)، میں تم کو سکھو رہا آسمان غراب ازل کرانیر سے قبضے میں نہیں، اللہ تعالیٰ اگرچہ کا تو یہ غراب آجائے گا پھر تم اس سے بھاگ نہ سکو گے۔

سورۃ الزمر میں انبیاء و رسول کی ایک جماعت کا یہ قول ذکر فرمایا ہے تَعْلَمُونَ أَنَّا نَحْنُ الْمُغْلَبُونَ (۱۱۳)، یعنی کسی معجزہ کا صدور کرنا ہمارے ہاتھ میں نہیں، اللہ تعالیٰ کے انون و شفقت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا، اس وجہ سے کوئی یہ پیغمبر اگر کوئی ولی جب چاہے جو چاہے معجزہ و کرامات دکھائے یہ قطعاً کسی کے ہی نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء سے بہت سے معجزات و کرامات کا مطالعہ ہر مشرکین سے کیا، مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے پاؤں اٹھا کر دیا جس کو نہ پاؤں اٹھائیں ہوا، پورا مشرقی اس کی شادوقوں سے بھرا ہوا ہے۔

ایک عمومی مثال سے اس کو یوں سمجھ کر آپ ہم کرے میں بیٹھے ہیں اس میں ہلکی کڑو دشمنی ہے اور بڑا رتی پیچھے سے آپ کو پیچ کر رہی ہے، مگر یہ لب اور پنگا اس روشنی اور بڑا پیچھے سے منقطع ہو نہیں، بلکہ برائن اس بڑا دلکش کے محتاج ہیں جو تار کے ذریعے باور اُس کے ساتھ ان کو متصل ہے، ایک سینکڑے لے سے جو زوٹ جاتے، تو نہ لب آپ کو روشنی سے سکتا ہے نہ پنگا ہوائے سکتا ہے، یہ کج و درحقیقت وہ عمل لب اور پنگا کا ہے نہیں، بلکہ ہلکی کڑو کا ہے، جو باور اُس سے یہاں بچ کر رہی ہو، انبیاء و اولیاء اور سب فرشتے ہر عمل میں و کرامات میں برحق حق تعالیٰ کے محتاج ہیں، اسی کی قدرت و شفقت سے سب کام وجود میں آتے ہیں، اگرچہ کچھ و اس کا لب اور پنگا کے کی طرح انبیاء و اولیاء کے استحوال پر ہوتا ہے۔

اس مثال سے بھی واضح ہو گیا کہ ان چیزوں کے صدور اور وجود میں اگرچہ بہت سیاد انبیاء و اولیاء کو نہیں مگر ان کا وجود باور اُس سے بالکل بے دخل نہیں ہیں، بسبب اور پیچھے کے بغیر کچھ کو روشنی اور بڑا نہیں پہنچ سکتی، یہ حجرات و کرامات بھی انبیاء و اولیاء کے بغیر نہیں ملے، اگرچہ یہ فرق ضرور ہو کہ پوری فتنہ اور کشش درست ہونے کے باوجود آپ کو بغیر لب کے روشنی اور پنگا کے بڑا کا ملنا مافہ ناممکن ہے، اور حجرات و کرامات میں حق تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے کہ بغیر واسطہ کی پیغمبر و ولی کے بھی اس کا پتہ دے فراوی، مگر مادۂ انسانی سے کہ کوئی کا صدور و اثر واسطہ اولیاء و انبیاء کے

نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے خوارق عادات کے اظہار سے جو مقصد پر وہ اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

اس لئے معلوم ہو کہ عقیدہ تو یہی رکھنا ہو کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے ہو رہا ہے اس کے ساتھ انبیاء و اولیاء کی عظمت و ضرورت کا بھی اعتراف ضروری ہے، اس کے بغیر رضائے الہی اور طاعت احکام خداوندی سے محروم رہیگا، جس طرح کوئی شخص بلب اور پتکے کی قدر نہ پہچانے اور ان کو ضائع کرنے تو روشنی اور بتوں سے محروم رہتا ہے۔

وسیلہ، استغانت اور تہجد کے مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے، امید ہو کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نہبیاء و اولیاء کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو مختار سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے، اور نص واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے، اس میں عام طور پر لوگوں میں افراط و تفریط کا عمل نظر آتا ہے۔

واللہ اسأل الصواب والتسلی دو میں المبنیٰ او المعاد

صراط مستقیم کی ہدایت دنیا و آخرت میں یہ بات وضاحت سے آگئی ہے کہ قرآن کریم نے جس میں صراط مستقیم کا مسیابی ہے دعا کو ہر شخص کے لئے ہر کام کے لئے ہر حال میں انتخاب فرمایا ہو وہ صراط مستقیم کی ہدایت کی دعا ہے جس طرح آخرت کی کامیابی اس صراط مستقیم پر موقوف ہو جو انسان کو جنت کی طرف لیجاتے اس طرح دنیا کے سامنے کاموں میں بھی غور کر دو تو کامیابی کا مدار صراط مستقیم ہی ہے جس کام میں وہ آلات و ذرائع خستیاں کئے گئے جس کے نتیجے میں مقصد کا حصول عاودہ لازمی ہو تو کامیابی عاودہ لازمی ہوتی ہے، چنانچہ انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا تو اگر وہ غور کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ کام کے کسی مرحلے میں اس نے غلطی کی ہے، صحیح راستہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اس لئے ناکامیابی ہوئی۔

اس کا حاصل یہ ہو کہ صراط مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دین کے کاموں کے ساتھ مخصوص نہیں، دنیا کے سب کاموں کی درستی اور کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے، اس لئے یہ دعا ایسی ہو کہ نومن کو ہر وقت عز و جان بنانے کے قابل ہے، شرط یہ ہو کہ آنحضرت اور نبوت کے ساتھ کی جائے، محض الفاظ کا پڑھ لینا نہ ہو، واللہ الموفق والمعين۔

بسم اللہ تعالیٰ تفسیر سورۃ فاتحہ ختم ہوئی،

و لہ الحمد للہ و آخرہ و ظاہرہ و باطنہ

بسم اللہ تعالیٰ

سورة البقرہ

۱۱۱ اور تعداد آیات | اس سورت کا نام سورۃ البقرہ ہے، اور اسی نام سے حدیث اور آثار صحابہ میں اس کا ذکر موات ہے، جس روایت میں سورۃ بقرہ کہنے کو منع کیا ہے وہ صحیح نہیں (ابن کثیر) تعداد آیات دو سو چھیالیس ہیں اور کلمات چھ ہزار دو سو اکیس اور حروف پچیس ہزار پانسویں (ابن کثیر)

زمانہ نزول | یہ سورت مدنی ہے، یعنی ہجرت مدینہ طیبہ کے بعد نازل ہوئی، اگرچہ اس کی بعض آیات مکہ مکرمہ میں حج کے وقت نازل ہوئی ہیں، مگر وہ بھی باصطلاح مفسرین مدنی کہلاتی ہیں۔

سورۃ البقرہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت ہے، اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے اس کا نزول شروع ہوا، اور مختلف زمانوں میں مختلف آیتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ ربیع الثانی سورۃ کے متعلق جو آیات ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں نازل ہوئیں، اور اس کی ایک آیت وَ اتَّقُوا فِیْ مَآئِئِ جَعْلَہٗ فِیْہِ لَیْ اَللّٰہُ (۲۸۱:۲) تو قرآن کی بالکل آخری آیت ہے، جو سنہ ہجری میں ۱۰ ہجری کو مرقی کے مقام پر نازل ہوئی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھے، و قرطبی، اور اس کے اسی نوے دن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وحی الہی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ فضائل سورۃ بقرہ | یہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت اور بہت سے احکام پر مشتمل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: سورۃ البقرہ کو پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت اور بد نصیبی ہے، اور اہل باطل اس پر قابو نہیں پاسکتے۔

قرطبی نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ اہل باطل سے مراد جادو گر ہیں، مراد یہ ہے کہ اس سورت کے پڑھنے والے پر کسی جادو نہ چلے گا (قرطبی از مسلم بروایت ابو امامہ باہلی)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں سورۃ بعثہ پڑھی جائے شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے (ابن کثیر از حاکم)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سورۃ بعثہ منام القرآن اور ذرۃ القرآن ہے، اسم اور ذرۃ ہر چیز کے اعلیٰ و افضل حصہ کو کہا جاتا ہے، اس کی ہر آیت کے نزول کے وقت انبی فرشتے اس کے جکو میں نازل ہوئے ہیں (ابن کثیر از مسند احمد) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے جو تمام آیات قرآن میں اشرف و افضل ہے، اور وہ آیت الکرسی ہے (ابن کثیر از ترمذی) حضرت عتبہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ: سورۃ بعثہ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کو رات میں پڑھے تو اس رات کو جن شیطان گھر میں داخل نہ ہوگا، اور اس کو اور اس کے اہل عیال کو اس رات میں کوئی آفت، بیماری، بچ و غم وغیرہ ناگوار چیز پیش نہ آئے گی، اور اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑیں تو اس کو افاقہ ہو جائے گا، وہ دس آیتیں یہ ہیں: چار آیتیں شروع سورۃ بعثہ کی پھر تین آیتیں درمیانی یعنی آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں، پھر آخر سورۃ بعثہ کی تین آیتیں۔

احکام و مسائل

مضامین و مسائل کے اعتبار سے بھی سورۃ بعثہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ سورۃ بعثہ میں ایک ہزار اور ایک ہزار تہی اور ایک ہزار چھتیس، ایک ہزار تہی اور قہقہے ہیں (قرطبی) و ابن کثیرؒ یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورۃ بعثہ کو تفسیر کے ساتھ پڑھا تو اس کی تعلیم میں بارہ سال خرچ ہوئے، اور حضرت عتبہ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی (قرطبی)

سورۃ فاتحہ درحقیقت پورے قرآن کا خلاصہ ہے، اس کے بنیادی مضامین تین ہیں: اول اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، یعنی پروردگار عالم ہونے کا بیان، دوسرے اس کا مستحق عبادت ہونا، اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونا، تیسرے طلب ہدایت، سورۃ فاتحہ کا آخری مضمون صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب ہے اور درحقیقت پورا قرآن اس کے جواب میں ہے، کہ جو شخص صراطِ مستقیم چاہتا ہو قرآن ہی میں ملے گا۔ اسی لئے فاتحہ کے بعد پہلی سورۃ بعثہ رکھی گئی، اور اس کو ذلک الکتاب سے شروع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ جس صراطِ مستقیم کو تم ڈھونڈ رہے ہو وہ یہ کتاب ہے۔

اس کے بعد اس سورت میں اول ایمان کے بنیادی اصول، توحید، رسالت، آخرت اجمالی طور پر اور آخر سورت میں ایمان مفصل بیان فرمایا گیا ہے، اور درمیان میں ہر شعبہ زندگی: عبادات، معاملات، معاشرت، حسن خلق، اصلاح ظاہر و باطن کے متعلق ہدایات کے بنیادی اصول اور ان کے ساتھ بہت سی جزئیات بیان ہوئی ہیں۔

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ آيَاتُهَا ۲۸۶ رُكُوعَاتُهَا ۲۰

سورة بقرہ مدنی ہے، اس میں ۲۸۶ آیتیں ہیں اور ۲۰ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بڑھ برہان ہدایت رحم والا ہے

الْم ۱ ذَلِكِ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۱

اس کتاب میں کچھ شک نہیں راہ بتلاق ہے ڈرنے والوں کو

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ

جو کہ یقین کرتے ہیں بے دبی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے روزی دی ہے

يُنْفِقُونَ ۲ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ

ان کو اس سے خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر

مِّن قَبْلِكَ ۳ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۴ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى

کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں، وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے

مِّن تَرْتِيمٍ ۵ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۵

پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔

خلاصہ تفسیر

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں رہیں قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں کسی شبہ

کی غمناک نشانی نہیں، اگرچہ کوئی اناہم اس میں شبہ رکھتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے شبہ کرنے سے بھی حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے، راہ ہٹلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو یقین لاتے ہیں یہی ہوئی چیزوں پر (یعنی جو چیزیں ان کے حواس و عقل سے پوشیدہ ہیں صرف اللہ و رسولؐ کے فرمانے سے ان کو صحیح مان لیتے ہیں) اور قائم رکھتے ہیں نماز کو (قائم رکھنا یہ ہر کہ اس کو پابندی کے ساتھ اس کے وقت میں پورے شرائط و ارکان کے ساتھ ادا کریں) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (یعنی نیک کاموں میں) اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں (مطلب یہ ہر کہ ان کا ایمان ستر آں پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی) اور ایمان سچا سمجھنے کو کہتے ہیں عمل کرنا دوسری بات ہے، جتنی کتابیں اللہ نے پہلے انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کو سچا سمجھنا فرض اور شرط ایمان ہے، یعنی یہ سمجھ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں وہ صحیح ہیں خود غرض لوگوں نے جو اس میں تبدیل و تحریف کی ہے وہ غلط ہے، وہ عیا عمل سورہ صرف قرآن پر ہوگا، پہلی کتابیں سب منسوخ ہو گئیں، ان پر عمل جائز نہیں) اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں، بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب (یعنی ایسے لوگوں کو دنیا میں تو یہ نعمت ملی کہ راہ حق ملی اور آخرت میں ہر طرح کی کامیابی ان کے لئے ہے) :

حَلُّ لُغَاتِ ذَلِكْ كَسَى دُورِ كِ حَيْسِرْ كِ طَرَفِ اِشَارَةِ كِ لِنِ اسْتِمَالِ ہوتا ہے، وَتَبَّ شَكِّ وَشِبَّ،
 هَدَى ہدایت سے بنا ہے، اور ہدایت کے معنی رہنمائی، مُتَقَبِّلٌ جن میں صفت تقویٰ ہو
 تقویٰ کے لفظی معنی بچنے کے ہیں، مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، غَیْبٌ لفظی معنی ہر وہ چیز جو انسان کی
 نظر اور دوسرے حواسِ سماعت وغیرہ سے باہر ہو، یَقْبُضُونَ اقامت سے بنا ہے، جس کے معنی سیدھا کرنے
 کے ہیں، اور ناز کا سیدھا کرنا یہ ہے کہ آداب اور خشوعِ حضور کے ساتھ ادائیگی جائے، وَتَرَّ قَدْحُهُمْ رَزَقَ
 بنا ہے، جس کے معنی پیار و ریزی اور گداز دینے کا سامان دینا، یُفْغِقُونَ انفاق سے بنا ہے، خرچ کرنے کے معنی
 میں آتا ہے، الْخَيْرَةُ لغت میں مؤخر اور بعد میں آنے والی چیز کو آخرت کہا جاتا ہے، اس جگہ عالمِ دنیا کے مقابلے
 میں عالمِ آخرت بولا گیا، یَوْ قَسَتُونَ اِیقَان سے ہے اور دو یقین سے بنا ہے، اور یقین اس کو کہتے ہیں جس میں
 کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، مُفْلِحُونَ فلاح سے اور وہ فَلَاحٌ سے بنا ہے، فلاح کے معنی پوری کامیابی۔

معارف ومسائل

حروف مقطعه جو بہت سی سورتوں | التَّحْمِ، بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حروف سے مرکب
کے شروع میں آتے ہیں ان کی تحقیق | ایک کلمہ لایا گیا ہے جیسے التَّحْمِ، حَمْ، التَّحْمِ وغیرہ ان کو

—

اصطلاح میں حروف مقطعه کہا جاتا ہے، انہیں ہر حرف جدا جدا سا کن پڑھا جاتا ہے، الف، لام، میم، حروف مقطعه جو ادراک سور میں آئے ہیں، ان کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اسبابِ اربعہ کے رموز ہیں، مگر جبوہ صحابہؓ و تابعینؓ اور علماء امت کے نزدیک رائج یہ ہے کہ یہ حروف رموزِ ادراک اور اسرار ہیں، جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطورِ ایک راز کے دیا گیا ہو، جس کی تبلیغ امت کے لئے روک دی گئی ہو اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر و تشریح میں کچھ منقول نہیں۔ امام تفسیر قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کو حجت بنا کر فرمایا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

عام شیں، سفیان ثوریؒ اور ایک جماعت فقہاءؒ نے فرمایا ہے کہ ہر آسان کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص و نوزد اسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حروف و قلمہ مسترقین میں حق تعالیٰ کا راز ہے، اس لئے یہ ان منشیات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے، ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو کی بنا پر نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں، اولیٰ تو ان پر ایمان لانا پھر ان کا پڑھنا ہمارے لئے ثوابِ عظیم، دوسرے ان کے پڑھنے کے منہی فوائد و برکات ہیں، جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر یہ ہے وہ ان میں بہرہ بخشے ہیں ۛ

پھر فرمایا:-

حضرت صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ جیہو صحابہؓ
 کما ان حروف کے متعلق یہی عتقاد تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں، ان پر ایمان لانا واجب
 کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں، اور جس طرح آئے ہیں ان کی تلاوت کرنا چاہیے، مگر معنی معلوم
 کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں۔

اس کو بھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ لَفْظَ ذَٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارے کے لئے آتا ہے اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے، رَیْب کے معنی شک و شبہ، معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اشارۃ بعید کا نہیں تھا، کیونکہ اسی سترآن کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اشارۃ بعید سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سورۃ فاتحہ میں جس صراطِ مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا سترآن اس درخواست کا جواب بصورتِ قبولیت اور صراطِ مستقیم کی تشریح و تفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دعا مانگی اور قرآن

-11-

نہیں کہتے، کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ایمان و شیطانی اور ہیبت سے کفار کو کسی میں ہے نہ کہ ان کو کہ خضریت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق کا یقین تھا، مگر اس کو مانا نہیں اس کو انہوں نے نہیں مانا اور اس مسئلہ کا امت کے منہ میں طائر چڑھنے کے نہیں، بلکہ نماز کو ہر جہت اور ہر حیثیت سے درست کرنے کے نام انعام، پھر جس میں نماز کے تنہم فراغت، واجبات، استعجاب اور بھڑکائی پر دوام و التزام ہے سب انعام کے مفہوم میں داخل ہیں اور حج ہے کیونکہ اس جگہ نماز سے کوئی خاص نماز مراد نہیں، بلکہ مسکن و امن و واجبات اور اعلیٰ نماز کو ہر لحاظ سے، محتاطانہ معنیوں پر یہ کہ وہ حج جو نمازوں کی پابندی میں قواعد شرعیہ کے مطابق کرتے ہیں، اور ان کے لئے آداب میں کمال ہے۔

تیسرا مسئلہ: اس میں بھی صحیح اور عقلی بات ہے کہ جو خضریت نے ختم فرمایا ہے، یہی ہے کہ ہر قسم خشکی اور بیکاری کا کماؤ و خرچہ و اجل ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے، خوار و فقیہ و زکوٰۃ ہو یا دوسرے صدقات واجبہ یا نقل صدقات و تحریات، کیونکہ قرآن کریم میں جہاں کہیں لفظ انفاق استعمال ہوا ہے، غرضاً نقل صدقات میں یا عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے، زکوٰۃ فرض کے لئے حرمنا لفظ زکوٰۃ ہی آیا ہے۔

اس فقرہ جوں ہی لفظ و مشارق فی خلد غریبہ کی تو ایک طرہ سے لفظ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ایک قوی ماہ پر شریعت انسان کے دل میں پیدا کر دیتا ہے کہ جو کچھ مال ہائے پاس ہے پسب خدا ہی کا اعلان ہو اور اس کی امانت ہے، اگر ہم اس تمام مال کو بھی اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے لئے خرچ کر دیں تو حق اور بھلا ہے، اس میں بھی بیکاری کوئی حسان نہیں ہے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق اور نہ ہوا اس پر نماز لفظ و مشارق فی خلد غریبہ کی تو ایک طرہ سے لفظ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ایک قوی ماہ پر شریعت انسان کے دل میں پیدا کر دیتا ہے کہ جو کچھ مال ہائے پاس ہے پسب خدا ہی کا اعلان ہو اور اس کی امانت ہے، اگر ہم اس تمام مال کو بھی اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے لئے خرچ کر دیں تو حق اور بھلا ہے، اس میں بھی بیکاری کوئی حسان نہیں ہے۔

جہاں جتنوں کی مصافحت کا بیان کرتے ہوئے ازل ایمان کا لفظ لکھا ہے کہ ایمان، مگر راستہ گزار اور ان کی راہ میں خرچ کرنے کا ایمان کی اہمیت تو سب کو معلوم ہے کہ وہی اصل الاصل اور سائنس ایمان کی مقبولیت کا دار و مدار ہے، لیکن جب ایمان کے ساتھ اعمال کا بیان کیا جائے تو ان کی فہم طریقی اور فراغت و واجبات کی تفسیر ضروری ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعمال میں سے صرف وہ عمل نماز اور انفاق مال کے ذکر پر اکتفا کر کے چلے کیا رہا ہے؟ اس میں ناخالص طرہ اشارہ دیتے کہ جتنے اعمال انسان پر فرض ہوا ہے جب ان کے تعلق

انسان کی ذات اور بدن سے ہے یا اس کے مال سے، بدنی اور ذاتی عبادات میں سب اہم نماز ہے، ایمان کا ذکر کرتے ہوئے پر اکتفا کیا گیا، اور مالی عبادات سب کی سب لفظ انفاق میں داخل ہیں اس لئے درحقیقت یہ تنہا و اعمال کا ذکر نہیں، بلکہ اعمال و عبادات ان کے ضمن میں آگئے، اور پوری آیت کے یہ معنی ہونگے کہ متیقن وہ لوگ ہیں جن کا ایمان بھی کامل ہے اور دل بھی اور ایمان و دل کے مجموعہ کا نام ہی اسلام ہے، گو یا اس آیت میں ایمان کی مکمل تعریف کے ساتھ اسلام کے مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہو گیا، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس جگہ اس کی بھی وضاحت کر دی جائے کہ ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے؟

ایمان اور اسلام میں فرق

گفت میں ایمان کسی چیز کی دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے، اور اسلام طاعت فرما کر بندگی کا، اور ایمان کامل قلب ہے، اور اسلام کا بھی قلب اور سب اعضا و اجزا لیکن بشرط ایمان غیر اسلام کے اور اسلام غیر ایمان کے معتبر نہیں، لیکن اللہ اور اس کے رسول کی محض دل میں تصدیق کر لینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں جب تک زبان سے اس تصدیق کا اعلان اور طاعت فرما کر ایمان کی کمال شدت نہ کرے، اسی طرح زبان سے تصدیق کا اعلان بشرط ایمان اور ایمان کے اقرار اس وقت تک معتبر نہیں جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ ہو۔

غرض یہ کہ گفت کے اعتبار سے ایمان اور اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں، اور شرعاً وحدیث میں اسی ملوث مفہوم کی بناء پر ایمان اور اسلام میں فرق کا ذکر نہیں ہے، مگر شرعاً ایمان جو دلی اسلام کے اور اسلام جو دلی ایمان کے معتبر نہیں۔

جب اسلام میں ظاہری اشتراک و فرامین واری کے ساتھ دل میں ایمان نہ ہو تو جس کو قرآن کی اصطلاح میں لفظ انعام دیا گیا ہے، اور اس کو کھٹکے کھٹکے زیادہ شدہ جرم ٹھہرایا گیا۔

إِنَّ الشَّافِعِيَّ فِي الشَّارِعِ
الْأَشْفَقِيَّ فِي الشَّارِعِ

میں ناخوشیوں کے سبب بچے کے
میں ناخوشیوں کے سبب بچے کے

اسی طرح ایمان میں تصدیق قلبی کے ساتھ اگر اقرار و طاعت نہ ہو تو اس کو بھی شرعی

نصوص میں کفری مشرک اور دلچسپ، ارشاد ہے: اِیْمٰنٌ فُتِحَتْ لَهَا فِیْہِیْ فُتُوْحٌ اَیْمٰنٌ اَوْھَمُ (۳۰)۔
 یقین یہ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی حقانیت کو اپنے یقینی طریق پر جاننے میں جیسے
 اپنے دشمن کو جانتے ہیں۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے: وَجَعَلْنَا دَابَّةَ الْاِیْمٰنِ تَحْتَهُ الْكُفْرَ وَتَحْتَهُ الْكُفْرَ وَتَحْتَهُ الْكُفْرَ وَتَحْتَهُ الْكُفْرَ (۳۱)۔
 کا اہتمام کرتے ہیں، حالانکہ ان کے دلوں میں ان کا یقین کا میل ہے، اور ان کی یہ حرکت مختل کم
 و کج کی وجہ سے ہے۔

میرے استاد ختم حضرت العتقاد سید محمد آقہ شامی کفری رحمت اللہ علیہ اس مضمون
 کو اس طرح بیان فرماتے تھے کہ ایمان اور اسلام کی مسافت ایک ہی، فرق صرف ابتداء
 و انتہا میں ہے، یعنی ایمان قلب تک شروع ہوتا ہے اور ظاہر میں پہنچ کر مکمل ہوتا ہے، اور
 اسلام ظاہر سے شروع ہوتا ہے اور قلب پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے، اگر تصدیقی ظاہری افراد
 اخلاص تک نہ پہنچے وہ تصدیقی ایمان مستور نہیں، اس طرح اگر ظاہری اخلاص و اقراء تصدیقی ظہن
 تک نہ پہنچے تو وہ اسلام مستور نہیں۔

امام خوافی اور امام سبکی کی بھی یہی تحقیق ہے، اور امام طبرانی جہاں نام مسامحہ میں اس تحقیق پر
 تمام اہل حق کا اتفاق ذکر کیا ہے۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْہِمْ مِنْ قِبَلِ رَبِّہِمْ وَ یَاۤتِیْہِمْ مِنْ رَّبِّہِمْ
 فَیُؤْمِنُوْنَ فِیْہِمْ ۝ اُولٰٓئِہِمْ یُحِبُّہُمْ اِلٰہِہِمْ کَمَا یُحِبُّہُمْ رَبُّہُمْ کُلٌّ فِیْ طَرَفٍ اَوْھَمُ
 اور ان کو اپنی پرہیزگری پر آپ سے پہلے ان کی باجگہ میں اور آخرت پر بھی وہی دل رکھتے ہیں۔
 اس آیت میں متعین کی باقی صلاحت کا بیان ہے جس میں ایمان، انشیک کی کچھ تفصیل اور
 ایمان کا آخرت کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما
 نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ جو کچھ رسالت میں موعین یقین و طوطی کے حضرات تھے، ایک دوسرے
 پہلے مشرکین میں تھے، پھر مشرک اسلام ہوئے، دوسرے وہ جو پہلے اہل کتاب یہودی انصار
 تھے، پھر مسلمان ہو گئے، اس سے پہلے آیت میں پہلے طبع کا ذکر تھا، اور اس آیت میں دوسرے طبع
 کا ذکر ہے، اسی سے اس آیت میں مشرکین پر ایمان لانے کے ساتھ پہلی آیت میں ایمان لانے کے
 بھی تصریح فرمائی گئی کہ حسب عصبہ حدیث و ہر دو قول کے جتن ہیں، ایک پہلی کتابوں کے زمانے
 میں ان پر ایمان لانے اور عمل کرنے کا ثواب، دوسرے قرآن کے زمانے میں قرآن پر ایمان لانے اور
 عمل کرنے کا ثواب، پہلی آیت میں ایمان لانے کا ثواب بھی ہر مسلمان کے لئے لازم ہے، فرق متجاوز

کتاب ان کو اپنی پرہیزگری میں طوطی پرہیزگری کہہ کر انسانی نے ان کو ایمان میں داخل فرمایا تھا سبقت
 ہو، اور اس زمانے کے لئے وہی واجب عمل تھا، پھر مشرکین داخل ہونے کے بعد چونکہ پہلی کتاب میں
 اور مشرکین میں سب موعین ہو گئیں، ثواب عمل صرف قرآن ہی پر ہوگا۔

مسئلہ تہذیب کی آیت کے اس طرز بیان سے ایک اہم اصولی مسئلہ بھی صحت آیا کہ آنحضرت صلی اللہ
 علیہ وسلم آخری نبی ہیں، اور آپ کی وہی آخری وحی، کیونکہ اگر قرآن کے بعد کوئی
 اور کتاب یا وحی میں داخل ہونے والی ہوئی تو جس طرحت اس آیت میں پہلی کتابوں اور وحی پر ایمان
 کا ضروری مشرک اور ایمان ہے اس آیت پر آئندہ تامل ہونے والی کتاب اور وحی پر ایمان لانے کا کوئی
 ضروری ہوتا، بلکہ اس کی ضرورت زیادہ تھی کیونکہ قرأت و تہذیب اور تمام کتب ساتھ پر ایمان لانے کا
 پہلے سے جاری اور معلوم تھا، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی مسئلہ وحی اور تہذیب جاری تھا
 تو ضرورت اس کی تھی کہ اس کتاب اور اس نبی کا ذکر زیادہ و اہتمام سے کیا جاتا جو بعد میں آنے والے پہلے
 کتابوں کو اشتباہ نہ رہے۔

مگر آیت میں جہاں ایمان کا ذکر کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے داخل ہونے والی
 وحی اور پہلے انبیاء کا ذکر مشرک آیا، بعد میں آنے والی کس وحی یا نبی کا کہیں قلمنا ذکر نہیں، پھر صرف اس
 قیمت میں نہیں بلکہ مشرک کہیں بھی موعین اول سے آخر تک مختلف مقامات میں جائیں، پچاس
 آیتوں میں آیا ہے، سب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء پہلی وحی پہلی کتابوں کا ذکر
 ہو، کیونکہ ایک آیت میں اس کا اشارہ کتب نہیں کرتا، وہی کوئی وحی یا نبی آنے والا ہے، جس پر ایمان
 لانا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

(۱) وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اَوْھَمُ (۳۲) ۝ وَتَقَعَتْ اُتْسُلَہُ فِیْہِمْ قَبْلَکَ (۳۳) ۝
 (۳) وَتَقَعَتْ اُتْسُلَہُ فِیْہِمْ قَبْلَکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اَوْھَمُ (۳۴) ۝ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اَوْھَمُ (۳۵) ۝
 وہ تو قلعہ اُتْسُلَہُ فِیْہِمْ قَبْلَکَ (۳۶) ۝ وَتَقَعَتْ اُتْسُلَہُ فِیْہِمْ قَبْلَکَ (۳۷) ۝ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اَوْھَمُ (۳۸) ۝
 وَتَقَعَتْ اُتْسُلَہُ فِیْہِمْ قَبْلَکَ (۳۹) ۝ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اَوْھَمُ (۴۰) ۝

ان آیات میں اور ان کی مثال دوسری آیات میں جہاں کہیں نبی یا رسول یا نبی کا ذکر ہے، سب کے ساتھ میں قہن کی اور جن قہن کی قید لگ جاتی ہے، کہیں میں لفظی کا اشارہ رنگ
 نہیں، اگر تہذیب نہ تھی اور لفظ طوطی وحی کا دوسری آیات میں صراحت ذکر نہ ہوتا تو مشرکین کا یہ طوطی
 اس مضمون کی شہادت کے لئے کافی تھا، مسئلہ تہذیب نہ تھی، پھر قرآنی تصریحات اور احادیث حضرات
 کی شہادت اور اہتمام کا اجازت تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو تو میرا رسالہ تہذیب نہ تھی دیکھا جائے۔

مشتقین کی تفسیر میں اس آیت میں مشتقین کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ آخرت پر ایمان مند بن جائیں یا آخرت نہ کھتے ہیں، آخرت سے مراد وہ آخرت ہے جس کو کفر میں دارالفرقہ دارالحیوان اور مشن کے نام سے بھی ذکر کیا گیا ہے، اور یہ راستہ ان اس کے دگر دار اس کے ہونا گ مالا سے بھرا ہوا ہے۔

آخرت پر ایمان ایک آخرت پر ایمان والا گرج ایمان کا جذبہ ہے اور اس کو چھوڑ دینا آخرت کا نقصان ہے اور اس کے لئے ذکر کیا گیا کہ یہ صبر سائے ایمان میں اس حیثیت سے سبب ہیں، اگرچہ ہے کہ نقصان سے ایمان پر عمل کا جذبہ ہے پھر اگر کسی کا شرف ہے۔

اور اسلامی عقائد میں یہ وہ افتخاری عقیدہ ہے جس نے دنیا کی کامیابی کا لالچ لٹکایا اور جس نے آسمانی تعلیم پر عمل کرنے والوں کو پیچھے ہٹا دیا اور اعمال میں اور ہجرت دنیا کی سیاست میں یہی تمام اوزام عالم کے مقابلے میں یکسے پیچھے ہٹا دیا، اور عقیدہ توحید و رسالت کی طرح تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام مشرق میں مشرک اور مشن علیہم السلام کا ہے۔

وہ ظاہر ہے کہ یہی گویں کے سامنے صرف دنیا کی زندگی اور اس کی عیش و عشرت ان کا ہوتا مقصود ہے، اس کی کلیت کو کلیت سمجھتے ہیں، آخرت کی زندگی اور اعمال کے حساب کتاب اور جزاء و سزا کو نہیں مانتے، وہ جب جھوٹ، سچ اور سلاطین اسرام کی تعریف کو اپنی عیش و عشرت میں غلطی ناکہ برتے دیکھیں تو ان کو جزائے سے روکنے والی کوئی چیز سبائی نہیں دیتی، حکومت کے تعزیری قوانین قطعاً اسود و جزائے اور اصلاح و اعتقاد کے لئے کافی نہیں، عادی جرم تو ان سزائی کے عادی ہوتی جاتے ہیں، کوئی شریف انسان اگر تعزیری سزائے کو ختم سے اپنی خواہشات کو ترک کر کے کسی کو کسی حد تک کس کو حکومت کی داد دے گا مگر کا خطرہ ہو، غلو تو ہیں اور دروازہ دانا طریقیں ہیں حکومت اور اس کے قوانین کی رسائی نہیں آتے کوئی جبر کر سکتا ہے کہ اپنی عیش و عشرت اور دنیا کو چھوڑ کر پابندیوں کا طوق اپنے گھٹے میں ڈالے۔

ان وہ صرف عقیدہ آخرت اور خوف خدا ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کی ظاہری اور باطنی حالت جلتی و خلوت میں یکساں ہو سکتی ہے، وہ یہ یقینی رکھتا ہے کہ مکان کے بندر وازوں اور ان پر پہرہ چڑھیں میں اور رات کی تاریکیوں میں بھی کوئی نہ سمجھے والا ہے دیکھ رہا ہے، کوئی نہ سمجھے والا ہے اعمال کو نہ دیکھ رہا ہے۔

یہی وہ عقیدہ تھا جس پر پورا عمل کرنے کی وجہ سے اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا پاکساز معاشرہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی صورت دیکھ کر، پال چین دیکھ کر گنگ دل و جان سے اسلام کے گروہ ہو جاتے تھے، یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ اس آیت میں یہ بات بھی ہے کہ ساتھ ساتھ یہ بات بھی

نہیں، بلکہ یہ یقین استعمال فرمایا گیا ہے، کیونکہ ایمان کا مقابلہ کفر ہے، اور ایمان ان کا مقابلہ شک و تردید اس میں شانہ ہے کہ آخرت کی زندگی کی محض تصدیق کرنا مقدمہ کو یہ دانیوں کرنا، بلکہ اس کا ایسا یقین ضروری ہے جیسے کہ چہرہ انھوں کے سامنے ہو، مشتقین کی یہی صفت کہ آخرت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیش اور صواب کتب، پھر جزاء و سزا کا نقشہ ہر وقت ان کے سامنے رہتا ہے۔

وہ شخص جو دوسروں کا حق غصب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمے لڑا ہے، جھول گویا دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے خلاف حرام مال کمانے اور کمانے میں لگا ہوا ہے یا دنیا کے ذیل مقاصد حاصل کرنے کے لئے خلاف شرع ذرائع اختیار کر رہا ہے، وہ ہزار بار آخرت پر ایمان لائے گا مگر آخرت کے اوزام پر مشرعت میں اس کو کوئی کام نہیں جائے، لیکن مشرکت میں ایمان کا مطالعہ کر لے وہ اسے عمل میں لائے، اور وہ یہ انسان کی زندگی میں انقلاب لانے والا ہے، اسی کے نتیجے میں مشتقین کو ہدایت اور کامیابی کا وہ انسان ہو گیا ہے جس کا کادرسوہ بقرہ کی آیت میں ہے، اُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ یعنی یہی ہیں وہ جسے شک و گمان نہ ہو جو ان کے پروردگار کی طرف سے نلی ہے، اور یہی لوگ ہیں جن کے کامیاب ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَاءَ مَا لَهُمْ بِالدِّينِ كَوْنَهُمْ كَالْآفِكِ الْخَالِصِ

جسک کو کفر کا فریب برابر ہے، ان کو تو دین سے یا نہ ڈرا ہے، وہ

لَا يُؤْمِنُونَ ۝ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ

ایمان نہ دلاتی ہے، ہر گویا اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور

أَبْصَارِهِمْ غَشَاوًا ۚ وَكَانَ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے

خلاصہ تفسیر

جسک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہ دلا دیں گے، بات ان کا دلوں کے مشتق ہے جن کی نسبت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کا غلام کفر ہو گا، مگر ان کو دلائل میں ان میں بہت سے لوگ بعد میں مسلمان ہو گئے ہندو گروہ اور ان کے گروہ کے گروہ ہندو گروہ کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے سزا ضروری ہے۔

معارف و مسائل

خلاصہ مضمون مع ریلو سورۃ فرقان کی آیتوں میں قرآن کی کتاب دایت اور ہر ایک مشابہ سے الذا ترہو تا بیان کرنے کے بعد ان کوئی نصیب و گون کا ذکر تھا، جنوں نے اس کتاب دایت سے ہوا فائدہ اٹھایا، جن کو شتران کی اصطلاح میں مؤمنین اور متین کا لقب دیا گیا ہے، اور ان حضرات کی مخصوص صفات و علامات بھی بیان کی گئیں، اس کے بعد پندرہ آیتوں میں ان گون کا ذکر ہے جنوں نے اس دایت کو قبول نہیں کیا، بلکہ انکار و مناد سے پیش آئے۔ پھر ان گون میں دو گروہ تھے، ایک وہ جنوں نے کھل کر انکار و کفارت کا راستہ اختیار کیا جن کو شتران کی اصطلاح میں کافر کہا گیا، دوسرے وہ جو اپنی عقل پرستی اور دنیا کی ذلیل باہوشی کی بنا پر یہ جہت بھی نہ کر کے اپنے شریکِ آماز اور دینی عقیدے کو صاف طور پر نظر کر رہے تھے، بلکہ ان کو اور فریب کی راہ اختیار کیا، مسلمانوں سے یہ کہتے کہ ہم مسلمان ہیں، قرآن اور اس کی ہدایت کو مانتے ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، اور وہوں میں ان کے کفر و انکار کا کفار کی جہلوں میں جا کر کہتے کہ ہم تمہارے عقیدے پر اور تمہارے ساتھ ہیں، مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور ان کے راہ و معلوم کرنے کے لئے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

اس گروہ کا نام شتران کی اصطلاح میں منافق ہے، یہ پندرہ آیتیں ہیں جو قرآن کو نہ ماننے والوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں، ان میں سے مذکورہ دو آیتوں میں کھلے کافروں کا ذکر ہے، اور آگے تیس آیتوں میں منافقین کا ذکر اور ان کے متعلق حالات و علامات اور ان کا انجام مذکور ہے، اس تمام آیات کی تفصیل پر پچھائی نظر ڈالنے سے معلوم ہوا ہے کہ قرآن مجید نے سورۃ فرقان کی ابتدا ہی بیش آیتوں میں ایک طوطی پر مشابہ دایت کا پتہ دیا، اور وہ قرآن ہے، اور دوسری طرف تمام اقوام عالم کو اس دایت کے قبول یا انکار کے معیار سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک دایت ماننے والے کو مؤمنین و متین کہا جاتا ہے، دوسرے دایت سے انحراف و انکار کرنے والے کو کافر یا منافق کہا جاتا ہے۔

پہلی قسم وہ ہے جن کا راستہ صراطِ راستہ الیٰ نبیٰ آتھم علیہم السلام ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جن کے راستے سے غلجہ انفسہ غلوٰب علیہم و لکنا العنقا لیتین، میں ہٹنا لگتی رہتی ہے۔

شتران کریم کی اس تعلیم سے ایک اصول مستند یہ بھی نکل آتا کہ اقوام عالم کے حصوں پر جو ان میں ایسی تقسیم اصول پر اثر انداز ہو سکے وہ صرف اصول و نظریات ہی کے اعتبار سے ہو سکتی ہوں

نسب، وطن، زبان، رنگ اور جسمانی حالات ایسی چیزیں ہیں جن کے اشتراک یا اختلاف سے اقوام کے گروہوں کے باہمی، اشتراک کریم کا اس بارے میں واضح فیصلہ نہیں سورۃ نساء میں مذکور ہے:

خَلَقْنَاهُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ خَلَقْنَاهُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ
وَلَوْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْكَافِرِينَ
اور تم میں سے کون اور کچھ کافر ہو گئے؟

مذکورہ صدر و آراء میں جن تعالٰی نے ان کافروں کا ذکر فرمایا ہے جو اپنے کفر و انکار میں اندر و خارج یکجہ تھے، اور اس خدا کی وجہ سے، کسی نہ کسی بات کو سننے اور روشن دلیل کو دیکھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے، ایسے گون کے بارے میں سورۃ فرقان میں ہے کہ ان کو ایک سزا اس جہان میں تعدی ہو جاتی ہے کہ ان کے دلوں پر ٹھہر گیا کسی جاتی ہے، انھوں نے انھوں کو حق و عدل کے متنبہ کرنے سے ہٹ کر دیا جاتا ہے، ان کی حال میں وہ دن کے بارے میں ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا نہ ان کی کوئی عقل نہ دیکھنے کے لئے آنکھیں نہ سننے کے لئے کان۔

آخر آیت میں ایسے گون کا مذاہب عظیم میں مستلما ہونا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کی نوعیت اس کے عقلی مسئلہ سے چھاننے کے ہیں، ہر شریک کو بھی کفر اس لئے کہتے ہیں کہ جس کے احکام کو چھوڑا ہے، اصطلاح شریعت میں جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام کفر ہے، مثلاً ایمان کا خدا ہے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ اللہ تعالٰی کی طرف سے لائے ہیں اور اس کا ثبوت قطعی یقین سے ان سب چیزوں کی دل سے تصدیق کرنا اور ان جہان، اس لئے جو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات میں سے جن کا ثبوت قطعی یقین و قطعی ہو، کچھ کچھ بھی حق نہ سمجھے اور اس کی تصدیق نہ کرے وہ کافر کہلاتا ہے۔

[مذکورہ آیت کے معنی] انھوں نے اللہ تعالٰی کی خبر دینا جس سے خوف نہ ہو، جیسا کہ اوپر اشارہ بھی فرمایا ہے کہ کچھ ہیں جس سے سرور پیدا ہو، اور وہ زبان میں اس کا ترجمہ ڈالنے سے لیا جاتا ہے، مگر وہ حقیقت مطلقاً ڈالنے کا آثار نہیں سمجھتے، بلکہ ایسا ڈالنا جو شفقت و رحمت کی بنا پر ہو، جیسے اولاد کو آگ سے، اسبابِ بچہ اور دردوں سے ڈرا دیا جاتا ہے، اسی سے جو ڈرا کر، جو غلام کسی انسان کو دھکے ڈالتے ہیں اس کو انڈر اور ان گون کو تذکرہ نہیں کیا جاتا، انبیا علیہم السلام کو نہ کو نصیحت سے تذکرہ کا لقب دیا جاتا ہے کہ وہ ان ذرا شفقت آئندہ کے لئے نصیحت سے ڈراتے ہیں، انبیا علیہم السلام کے لئے ان لفظ کو نہیں دیا کرتے ہیں اس کی دایت ہے کہ مصلح انسانیت کے لئے ضروری ہے کہ مخالف کی غلطی پر کسی شخص اور دوسرے سے گفتگو کرے، اصل ایک کلمہ بچا دینا مقصد نہ ہو۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مثل دینے کے لئے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ہندسی اور

سازگار جو حقیقت کو پہچانتے کے باوجود کفر و کفر ہے ہوتے ہیں۔ اپنے کبر اور کی رانی کی بنا پر کسی حق بات کو سننے اور دوش دلائی کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ان کی اصلاح اور ایمان کے متعلق جو آپؐ کو پیش کرتے ہیں ان کے لئے خوش ثابت نہ ہوگی، بلکہ آپؐ کا کوئی مشن کرنا اور نہ کرنا ان کے حق میں برا رہے۔

اس کی وجہ اہل آیت میں یہ بتلائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر ہر گھڑی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ چڑھا ہوا ہے، سو جب کبھی کے بتنے راستے سے دور سب بند ہیں، اس لئے ان سے اصلاح کی توقع رکھنا دور مری ہے۔

کبھی چیز پر غور سے لگائی جاتی ہے کہ اگر اسے کوئی چیز اس میں داخل نہ ہو سکے، ان کے دلوں اور کانوں پر پھر لگے۔ تاکہ ان کا مطلب ان کے دل میں قبول ہی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

ان کی اس حالت کو دلوں اور کانوں پر پردہ چڑھانے کے بغیر فرمایا ہے، مگر آنکھوں کے لئے نہیں ہے جیسے پردہ چڑھانے کا ذکر کیا گیا، اس میں سخت ہے کہ دلوں میں آنے والا کوئی عضو یا کوئی فکر و خیال کسی ایک سمت سے نہیں آتا، ہر طرف سے آ سکتا ہے، اس طرح کانوں میں پہنچنے والی آواز بھی ہر سمت اور ہر جہت سے آ سکتی ہے، ان کی بندش جب ہی ہو سکتی ہے جب آپؐ پر ہر گھڑی کوئی ایسا غلط فہمی آنکھوں کے کان کا ادھاک صرف ایک سمت میں سامنے سے ہو سکتا ہے، اور جب سامنے پردہ چڑھا تو آنکھوں کا ادھاک صرف وہی ہو جاتا ہے۔ (منہاجی)

وہاں تک کہ وہی مسز اور دلوں پر بھی ہے معلوم ہو کہ کفر اور کفر نہ کی اصل سزا تو آخرت میں ہوگی، مگر بعض لوگوں نے یہ بھی کہ مسز اور دنیا میں ہی جاتی ہے، پھر یہ دنیا کی مسز بعض اوقات یہ شکل اختیار کرتی ہے کہ اصلاح حال کی کوئی دلیل طلب ہو جاتی ہے، انسان آخرت کے حساب و کتاب سے بے فکر ہو کر اپنی ماضی ماضی اور ماضیوں میں پڑتا چلا جاتا ہے اور اس کی بڑائی کا احساس بھی اس کے دل سے جا کر ہوتا ہے، ایسے حال کے متعلق بعض بزرگوں کا ارشاد ہے اِن جَنِّ خِرَافًا وَنَظْمًا لِّلْمُتَّقِينَ اِنَّ جَنَلًا مِّنْ جَنَلٍ هَٰذَا الَّذِي هُمْ فِيْهِ يَخْتَفُونَ اَلَيْسَ لِهَٰذَا عَذَابٌ اَلِيمٌ کہ ایک سزا یہ بھی ہو جاتی ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچ لے گا، یہی طرح ہر ایک کا گناہ دوسرے ہی ہوتا ہے کہ ایک نیک دوسری نیک کو کھینچ لے گا۔

اور حدیث میں ہے کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، انہیں طرح طرح سے کھینچے پر ایک سیاہ نقطہ انسان کو بگاڑتا رہتا ہے، یہ نقطہ گناہ سے بھی انسان پریشا ہو آئے، لیکن اگر اس نے اس گناہ سے توبہ نہ کی اور دوسرا گناہ کر لیا تو ایک دوسرا نقطہ سیاہ لگ جاتا ہو، اور اس طرح ہر گناہ پر سیاہ نقطہ لگتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ سیاہی اس کے قلب پر پھیل جاتی ہو جاتی

ہے، اور اب اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ کسی اچھی چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے نہ بری چیز کو برا، خوں بھی بدی کا اعتبار اس کے دل سے اٹھ جاتا ہے، اور پھر فرمایا کہ اس ملک و دیار کا نام قرآن کریم میں ران یا دین آج ہے، خدا جل شانہ تعالیٰ علیٰ کل شیء عیون، خدا کا کوئی چھپا ہوا حق نہ ہو سکتا، اور توحید کے ساتھ ہر روایت اور ہر برائی عقل کا یہ ہے کہ حضرت علیؑ اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ کر لے تو مساف ہو جاتا ہے (منہاجی)

۴) نصیحت تاکہ کہنے پر والی، اس آیت میں ان کی قافروں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق نصیحت کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر سزا دینے کے ہیں، مگر ان کے ساتھ عقلی قسم کی قید کا ذکر کیا گیا کہ یہ ہر ایک کے لئے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق میں نہیں، بلکہ ان کو تبلیغ و تعلیم اور اصلاح خلق کو پیش کا ثواب بھی حاصل ملے گا، اس لئے ہر مسلمان کو قرآن کریم کی کسی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے لوگوں کو بھی دعوت ایمان دینے سے روکا نہیں گیا، اس سے معلوم ہو کہ ہر شخص دعوت دین اور اصلاح کا کام کرنا ہے خواہ فخر پر یا نہ ہو اس کو بھی حال اپنے عمل کا ثواب ملتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب اس آیت کا معنی وہی ہے جو سورہ مقلین کی اس آیت کا ہے، عَجَلًا اِنَّا نَسْتَرِٰى عَنْ عَنِ قُلُوْبِهِمْ عَمَّا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ اور اِنَّا نَسْتَرِٰى عَنْ عَنِ قُلُوْبِهِمْ عَمَّا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ کہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا رنگ چھوٹا ہے، جس میں حقیقت واضح کر دی گئی، مگر ان کی بڑھاپا اور سرکش ہی ان کے دلوں کا رنگ بن گیا ہے، اسی رنگ کو آیت مذکورہ میں تہر یا پردہ کے نظروں سے تھیم کر لیا گیا ہے، اس لئے اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دلوں پر ہر گھڑی اور جو اس کو اُن کر دیا تو یہ بڑھاپا میں منور ہو گئے، پھر ان کو عذاب کیسا اور جب یہ کہ ان دلوں نے شرارت و عداوت کے باوجود خود اپنی استعداد پر یاد کر لے، اس لئے ان تہائی استعداد کے حامل اور مذہب یہ خود ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے تمام افعال کے خالق ہونے کی حیثیت سے اس جگہ ہر گھڑی کو اپنی طرقت نصبت کر کے یہ بتلا دیا کہ جب ان لوگوں نے قبول ہی کی صلاحیت وہ استعداد کو اپنے اختیار سے تیار کرنا یا یا تو سنت الہیہ کے مطابق بہنے وہ یا استعداد کی کیفیت ان کے قلب اور دلوں میں پیدا کر دی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ اور انہوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور یقیناً قیامت برآمد ہو کر ہر کس کو دیں

ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے (یعنی ایمان کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتے تھے) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں ان کی دوزخی روش سے جب فتنے فساد واقع ہونے لگے اور کسی غیر خواہنے فتنش کی کہ ایسی کارروائی موجب فساد ہو کر رہی ہے اس کو چھوڑ دو تو اس کے جواب میں یہ اپنے آپ کو بجائے مفسد کے صلح بتاتے ہیں یعنی اپنے فساد ہی کو اصلاح سمجھتے ہیں) یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یہ تو ان کی جہالت اور غیارت کا بیان ہے کہ اپنے عیب ہی کو گنہگار سمجھتے ہیں) آگے دوسری چال کا بیان ہے کہ دوسروں کے گنہگار کو یعنی ایمان خالص کو عیب اور حقیر سمجھتے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لاتے ہیں اور لوگ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لاؤں گے جیسا ایمان لے آؤ ہیں یہ بیوقوف، یاد رکھو کہ بیگ بھی ہیں بیوقوف لیکن اس کا علم نہیں رکھتے یہ منافق ایسی کھلی ہوئی بات بظاہر عسریب مسلمانوں کے سامنے کر لیتے ہوں گے جن سے ان کو کوئی اندیشہ نہ تھا، ورنہ عام طور پر تو وہ اپنے گنہگار کو چھپاتے بھرتے تھے) اور جب ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمھارے ساتھ ہیں۔ ہم تو (مسلمانوں سے) صرف استہزاء کیا کرتے ہیں (یعنی ہم مسلمانوں سے بطور تمسخر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں ورنہ ہم تو تمھارے ہم مشرب ہیں، آگے ان کے استہزاء کا جواب ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں (وہ اللہ کا استہزاء یہی ہو کہ ان کو مہلت دی جا رہی ہے جب وہ خوب کفر میں کامل ہو جاویں اور مجرم سنگین ہو جاوے اس وقت اچانک پکڑ لئے جاویں گے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل ان کے استہزاء کے مقابلہ میں تھا اس لئے اس کو استہزاء کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو نفع بخش نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیکہ طریقہ پر چلے (یعنی ان کو تجارت کا سلیقہ نہ ہوا کہ ہدایت جیسی قیمتی چیز کے بدلہ میں گمراہی لے لی) ان کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہو جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گرد اگر دی سب چیزوں کو ایسی حالت میں سلب کر لیا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہواں کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں، تو جس طرح یہ شخص اور اس کے ساتھی روشنی کے بعد اندھیرے میں رہ گئے اسی طرح منافقین حق واضح ہو کر سامنے آ جانے کے بعد گمراہی کے اندھیرے میں جا پھنسے اور جس طرح آگ جلانے

دالوں کی آنکھ، کان، زبان، اندھیرے میں پیکار ہو گئے، اسی طرح گمراہی کے اندھیرے میں ہمیں کر ان کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا وہ) بہرے ہیں جو گئے ہیں، اندھے ہیں سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے، رکہ ان کے حواس حق کو دیکھنے سننے سمجھنے کے قابل نہ رہیں، یہ مثال تو ان منافقین کی تھی جو خود دل کھول کر کھنسر پر جمے ہوئے ہیں، کبھی ایمان کا دھیان بھی دل میں نہیں آتا، آگے منافقین کے اس گردہ کی مثال ہے جو فی الواقع تردد میں تھے، کبھی کبھی اسلام کی حقانیت دیکھ کر اس کی طرف مائل ہونے لگتے، پھر جب اغراض نفسانی کا غلبہ ہوتا تو یہ متیسلان بدل جاتا تھا، یا ان منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے انسان کی طرف سے بارش ہو اس میں اندھیری بھی ہو اور برق برق بھی ہو جو لوگ اس بارش میں مل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کرناک کے سبب اندیشہ موت سے، اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لے ہوئے ہو کافروں کو، برق کی یہ حالت ہو کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بنائے اس نے لی جہاں ذرا ان کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا، اور جب ان پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے کان اور آنکھ سب سلب کر لیتے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (تو جس طرح یہ لوگ کبھی طوفان باد و باران میں کبھی چلنے سے رہ جاتے ہیں کبھی موقع پا کر آگے چلنے لگتے ہیں یہی حال ان متردد منافقین کا ہے) :-

معارف و مسائل

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورہ بقرہ کے شروع میں ربط آیات قرآن کریم کا شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد بتائیں آیتوں میں اس کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے، اول پانچ آیتوں میں ماننے والوں کا تذکرہ متقین کے عنوان سے ہے، پھر دو آیتوں میں ایسے ماننے والوں کا ذکر ہے جو کھلے طور پر قرآن کا معاندانہ انکار کرتے تھے، ان تیرہ آیتوں میں ایسے منکرین و کفار کا ذکر ہے جو ظاہر میں اپنے آپ کو مؤمن مسلمان کہتے تھے، مگر حقیقت میں مومن نہ تھے، ان لوگوں کا نام قرآن میں منافقین رکھا گیا ہے مذکورہ بالا آیات میں پہلی دو آیتوں میں منافقین کے متعلق فرمایا کہ لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے اللہ پر، حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں بلکہ وہ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی جاہل نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے :-

اس میں ان کے دعویٰ ایمان کو غلط اور جھوٹ قرار دیا گیا، اور یہ کہ ان کا یہ دعویٰ محض فریب ہے،

یظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں ہے سکتا، اور غالباً یہ لوگ بھی ایسا نہ سمجھتے ہوں گے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے سکتے ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی چال بازی کو ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ چال بازی منسردہ کر فرمایا گیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چال بازی کرتے ہیں تو قریش میں افسوس

اس لئے اس کا نتیجہ بنتو گیا گیا کہ بے وقوف اپنے سوا اور کسی کے ساتھ چال بازی نہیں کر رہے ہیں یا یہ یوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دھوکہ دے فریب سے باز تر ہیں یہ اسی کے رسول اور زمین میں وہی، انہی کی وجہ سے ہر دھوکہ، فریب، غفلت ہو جائے ہیں، کوئی نقصان ان کو نہیں پہونچتا، البتہ ان کے دھوکہ، فریب کا وبال دنیا و آخرت میں خود انہیں پہونچتا ہے۔

تیسری کیفیت میں فرمایا کہ ان کے دلوں میں برا مرض ہے، سوا اور بھی بڑھا دیا اللہ نے ان کے مرض کو وہ مرض اور بیماری اس کیفیت کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنے اعتدالی مناسبت بھل جائے، اور اس کے انفعال میں خلل پیدا ہو جائے جس کا اثر یہ ہے کہ ایک اور صحت اور صحت ہوتا ہے۔

مشرکان و حدیث کے اصطلاح میں ان نقصان کی کیفیت کو بھی مرض کہا جا رہا ہے جو نفس انسانی کے کمال میں خلل آواز ہوں، اور جس کی وجہ سے انسان اپنے انسانی افعال سے محروم ہو کر پانچا جائے جس کا آخری نتیجہ روحانی موت و ہلاکت ہے۔

حضرت شاہ فیض ادا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دلوں کے امراض خواہ شایع نقصان کے انتہا سے پیدا ہوتے ہیں، جیسے بدن انسان کے امراض اخلاص انسان کی ہے اعتدالی سے پیدا ہوتے ہیں اس آیت میں ان کے دلوں میں غلطی محسوس کر دینا فرمایا گیا ہے جو روحانی اور جسمانی دونوں اعتبار سے بڑا مرض ہے، مگر حالی مرض یوں تو ظاہر ہے کہ اول تو اپنے پیدا کرنے والے اپنے دلوں کے نامشروعی اس کے احکام سے سرکش ہیں کا نام کفر ہے، یہ خود وہ انسان کے لئے سب سے بڑا مرض اور مشرفیت انسانی کے لئے بڑا مرض و آغ ہے، دوسرے دنیا کی ذلیل اغراض کی خاطر اس کی چھاپے دہنا اور اپنے دل کی بات کو ظاہر کرنے کی بھی جرأت نہ ہونا یہ دوسری دہشت ہے جو روح کا بہت بڑا مرض ہے اور نقصان کا جسمانی مرض یوں اس بنا پر ہے کہ منافق کے دل میں ہمیشہ یہ زعفران ہوتا ہے کہ کہیں میرا اصل حال نہ نکل جائے، شب و روز اس کی فکر میں رہنا ہر ایک جہان میں مرض ہے، اس کے علاوہ اس مرض کا لازمی نتیجہ حسد ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کو دیکھ کر منافقوں میں جھگڑا ہوگی، مگر دوسرے ان اپنے دل کی سوزش کا ظاہر بھی نہیں کر سکتا، یا سبب ان کے جہان میں مرض بھی بن جاتے ہیں۔

اور جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور بھی بڑھا دیا، اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی سے جلتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو یہ ترقی دینا ہے، اور ہر وقت اس کے مشاہدہ

ہوتے رہتے ہیں اس لئے ان کا یہ مرض بڑھتا ہی رہتا ہے۔ چوتھی اور پانچویں آیتوں میں منافقین کی مضابطہ دیکر ہے کہ خدا کو اصلاح کیجئے اور اپنے آپ کو اصلاح کیجئے، مفسدان کریم نے واضح کیا کہ خدا کو اصلاح نہ دینا وہ لوں پر دائر نہیں ہوتے، وہ کوئی چور کو بھی اپنے آپ کو منصف نہ کہتا رہیں، بلکہ دیکھا کہ اس کام میں ہے جو کیا جا رہا ہے وہ خدا کو تو کرنے والے کو منصف نہ کیا جائے گا، خواہ اس کی نیت خدا کی نیت ہو۔

پہلی آیت میں منافقین کے سامنے صحیح ایمان کا ایک معیار رکھا گیا کہ ایسا کہ اس آیت میں انشائاً یعنی ایمان کا وہی ہے ایمان کا نام اور لوگ اس میں انقطاع سے مراد اتفاق مفسرین صحابہ کرام ہیں، کیونکہ یہ حضرات ہیں جو نزول قرآن کے وقت ایمان لائے تھے، کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحت دین ایمان میں ہے جو صحابہ کرام کے ایمان کی طرح جو ہیں جو پیروں میں ہیں جس کیفیت کے ساتھ ان کا ایمان ہو اس طرح کا ایمان دوسروں کو ہو گا تو ایسا کیا جائے گا، اور نہ نہیں، اس سے معلوم ہو کہ صحابہ کرام کا ایمان ایک کسوٹی ہے، جس پر اپنی ساری نشت کے ایمان کو پرکھا جائے گا، جو اس کسوٹی پر بیچ نہ ہو اس کو شرفا ایمان اور ایسا کرنے والے کو مؤمن نہ کہا جائے گا، اس کے خلاف کوئی قضیہ اور اصل خواہ ظاہر میں کیستنا ہی اچھا نظر آئے اور کتنی ہی نیکی نہیں سے کیا جائے اللہ کے نزدیک ایمان معتبر نہیں ان لوگوں نے صحابہ کرام کو سبھا، میں یہ قوت کہا، اور یہی ہر زمانے کے گمراہوں کا طریقہ رہا ہے کہ جو ان کو صحیح راہ دیکھتے اس کو یہ قوت جاہل مشرک کہتے ہیں، مگر قرآن کریم نے بتا دیا کہ وہ حقیقت وہ خود ہی یہ قوت ہیں کہ انہیں کلمہ شہادتوں پر ایمان نہیں دیکھتے۔

ساتویں آیت میں منافقین کے انفاق اور دروغی یا ایسی طرح اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جب مسلمانوں سے ملنے کو کہتے ہیں کہ ہم ہنرمیں مسلمان بن گئے، اور جب اپنی قوم کے کارفرموں سے ملنے کو کہتے ہیں کہ ہم قرضاء ہی ساتھ ہیں، اور ہماری قوم کے فرو ہیں، اور مسلمانوں کے ساتھ تو بعض حسن و استہوار کے لئے، میں ان کو یہ قوت، ہانے کے لئے ملتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں ان کی اس اعتقاد غفلت کو کا جواب دیکر ہے یہ شور کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں سے استہوار کرتے ہیں، اور ان کو یہ قوت ہمارے ہیں، حالانکہ وہ حقیقت خود یہ قوت ہیں سب ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے علم و کرم سے ان کو وحیل دے کر خود انہی کے استہوار کا سامان کر دیا ہے کہ کتنا ہی کسی مذہب کے ذائقے سے وہ اور غفلت میں پڑ گئے، اور اپنی سست رفتاری میں بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کا جوہر اور رنگین ہو گیا، پھر دفعتاً پھر گئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ چل چل گمان کے استہوار، کہ جواب میں حق اس لئے اس عمل کو بھی استہوار سے تعبیر کیا گیا۔

نویں آیت میں منافقین کے اس حال کا ذکر ہے کہ انہوں نے اسلام کو بھی قریب سے دیکھا

اس کا ذائقہ بھی چکھا، اور کفر میں تو پہلے سے مستلا ہی تھے، پھر کفر و اسلام دونوں کو دیکھنے بچنے کے بعد انہوں نے اپنی ذلیل دنیاوی اغراض کی خاطر اسلام کے بدلے کفر ہی کو ترجیح دی، اُن کے اس عمل کو مسترآن کریم نے تجارت (بیوپار) کا نام دے کر یہ بتلایا کہ ان لوگوں کو بیوپار کا بھی سلیقہ نہ آیا، کہ بہترین قیمتی چیز یعنی ایمان بے کر دہی اور بھکلیٹ چیز یعنی کفر خرید لیا۔

آخری چار آیتوں میں منافقین کے حال کی دو مثالیں دے کر اس کا قابلِ نفرت ہونا بیان فرمایا گیا، دو مثالیں اس بنا پر دی گئیں کہ منافقین میں دو طرح کے آدمی تھے، ایک وہ جو اپنے کفر میں بالکل پختہ تھے، ایمان کا اظہار صرف دنیوی مصلحت کی وجہ سے کرتے تھے، ایمان و اسلام سے اُن کو کوئی واسطہ نہ تھا، دوسرے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سچے مسلمان ہونے کا ارادہ بھی کر لیتے تھے، مگر پھر دنیوی اغراض سامنے آکر ان کو اس ارادہ سے روک دیتی تھیں، اسی طرح وہ ایک تذبذب اور تردد کے حال میں رہتے۔

اسی مضمون کے ضمن میں ان ظالموں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں، ہر وقت ہر حال میں ہلاک بھی کر سکتے ہیں، اور بینائی و شنوائی کی طاقتیں بھی سلب کر سکتے ہیں۔

یہ تیسرے آیتیں منافقین کے حال و مثال پر مشتمل ہیں، ان میں بہت سے احکام و مسائل اور اہم ہدایات بھی ہیں۔

۱) کیا کفر و نفاق جہنمی کے ساتھ اس معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ منافق کے نفاق کو پہچانتا اور اس کو منافق مخصوص تھا، یا اب بھی موجود ہے؟
مسترار دینا دو طریقوں سے ہوتا تھا، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلادیا کہ فلاں شخص دل سے مسلمان نہیں منافق ہے، دوسرے یہ کہ اُس کے کسی قول و فعل سے کسی عقیدہ اسلام کے خلاف کوئی بات یا اسلام کی مخالفت کا کوئی عمل ظاہر اور ثابت ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انقطاع وحی کے سبب اُن کے سچانے کی پہلی صورت تو باقی نہ رہی، مگر دوسری صورت اب بھی موجود ہے، جس شخص کے کسی قول و فعل سے اسلامی قلع و عمارت کی مخالفت یا اُن پر استہزاء یا تحریف ثابت ہو جائے، مگر وہ اپنے ایمان و اسلام کا مدعی بنے تو وہ منافق سمجھا جائے گا، ایسے منافق کا نام مسترآن کی اصطلاح میں ملحد ہے، اَلَّذِي جُنَّ يُلْحِقُهُ وَالَّذِي فِي آيَاتِنَا^(۱) اور حدیث میں اُس کو زندیق کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کا کفر و میل سے ثابت اور واضح ہو گیا، اس لئے اس کا حکم سب کفار جیسا ہو گیا، الگ کوئی حکم اس کا نہیں ہے، اسی لئے علماء اہل امت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقین کا قصہ ختم ہو گیا، اب جو مومن نہیں وہ کافر کہلائے گا۔

حضرت امام مالک سے عمدہ شرح بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ بعد زمانہ نبوت کے نفاق کی یہی صورت ہے جس کو پہچانا جاسکتا ہے، اور ایسا کرنے والے کو منافق کہا جاسکتا ہے۔

(۲) ایمان و کفر کی حقیقت آیات مذکورہ میں غور کرنے سے ایمان و اسلام کی پوری حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور اس کے بالمقابل کفر کی بھی، کیونکہ ان آیات میں منافقین کی طرف ایمان کا دعویٰ اِمْتَنَابِا لِلّٰہ میں، اور قرآن کریم کی طرف سے اُن کے اس دعوے کا غلط ہونا و مَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ میں ذکر کیا گیا ہے، یہاں حسد باتیں غور طلب ہیں،

اُٹل یہ کہ جن منافقین کا حال قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے وہ اصل میں یہودی تھے، اور اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان لانا یہود کے مذہب میں بھی ثابت اور مسلم ہو، اور جو چیسز ان کے عقیدہ میں نہیں تھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کو ماننا اور آپ پر ایمان لانا اس کو انہوں نے اپنے بیان میں ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف دو چیزیں ذکر کیں، ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، جس میں اُن کو جھوٹا نہیں کہا جاسکتا، پھر قرآن کریم میں اُن کو جھوٹا قرار دینا اور اُن کے ایمان کا انکار کرنا کس بنا پر ہے؟ بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی من مانی صورتوں میں خدا تعالیٰ یا آخرت کا اقرار کر لینا ایمان نہیں، یوں تو مشرکین بھی کسی نہ کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور سب بڑا قادر مطلق مانتے ہیں اور مشرکین ہندوستان تو پر تو کا نام دے کر قیامت کا ایک نمونہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر قرآن کی نظر میں یہ ایمان نہیں، بلکہ صرف وہ ایمان معتبر ہے جو اس کی بتلانی ہوئی تمام صفات کے ساتھ ہو، اور آخرت پر ایمان وہ معتبر ہے جو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے حالات و اوصاف کے ساتھ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہود اس معنی کے اعتبار سے نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، کیونکہ ایک طرف تو وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اور آخرت کے معاملہ میں بھی یہ غلط اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء کی اولاد کچھ بھی کرتی رہے وہ بہر حال اللہ تعالیٰ کی محبوب ہو، اُن سے آخرت میں کوئی باز پرس ہوگی اور کچھ عذاب ہو ابھی تو بہت معمول ہوگا، اس لئے قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے اُن کا یہ کہنا کہ ہم اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں غلط اور بھوٹ ہوا۔

(۳) کفر و ایمان کا ضابطہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان وہ ہے جس کا ذکر ادھر سورہ بقرہ کی تیسری آیت میں چکا ہو وَ اِلَّا اَقْبَلْتُمْ اِلَیْہُمْ اِمْنًا اَعْمٰی اَمِّنَ النَّاسِ، جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا دعویٰ صحیح یا غلط کے جانچنے کا معیار صحابہ کرام کا ایمان ہے، جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایمان نہیں۔

اگر کوئی شخص مسترآنی عقیدہ کا مضمون قرآنی تصریح یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح

کے خلاف قرار دے کر یہ کہے کہ میں تو اس عقیدہ کو ماننا ہوں تو یہ ماننا شرعاً معتبر نہیں، جیسا کہ آج کل قادیانی گروہ کہتا ہے کہ ہم بھی عقیدہ ختم نبوت کو مانتے ہیں، مگر اس عقیدہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات اور صحابہ کرامؓ کے ایمان سے بالکل مخالفت تخریفات کرتے ہیں، مرزا غلام احمد کی نبوت کیلئے جگہ نکالتے ہیں، قرآن کریم کی اس تصریح کے مطابق وہ اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو مَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ کہا جائے، یعنی وہ ہرگز مؤمن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان صحابہؓ کے خلاف کوئی شخص کسی عقیدہ کا نیا مفہوم بنائے، اور اس عقیدہ کا پابند ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مؤمن مسلمان بتلائے اور مسلمانوں کے ناز و زہ میں شریک بھی ہوا، مگر جب تک وہ قرآن کے اس بتلائے ہوئے معیار کے مطابق ایمان نہیں لائے گا، اس وقت تک قرآن کی اصطلاح میں مؤمن نہیں کہلائے گا۔

ایک شبہ کا ازالہ | حدیث و فقہ کا یہ مشہور مقولہ کہ "اہل قبلہ کو کافر نہیں کہا جاسکتا" اس کا مطلب بھی آیت مذکورہ کے تحت میں یہ متنبہ ہو گیا کہ اہل قبلہ سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو ضروریات دین میں سے کسی چیز کے منکر نہیں، ورنہ یہ منافقین بھی تو قبلہ کی طرف سب مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے، مگر یہ صرف رد قبلہ نماز پڑھنا ان کے ایمان کے لئے اس بنا پر کافی نہ ہوا کہ ان کا ایمان صحابہ کرامؓ کی طرح تمام ضروریات دین پر نہیں تھا۔

۴) جھوٹ ایک گھناؤنی چیز ہے | یہاں منافقین کے قول اَمَّا بِالنَّبِيِّمُ الْاٰخِرِيْنَ میں غور کیجئے کہ یہ لوگ پرلے درجے کے کافر ہونے کے باوجود اپنی دانت میں جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتے ہیں، کیونکہ دعویٰ ایمان کے لئے صرف اللہ اور روز قیامت پر ایمان کا ذکر کرتے ہیں، ایمان باز رسول کا ذکر اس لئے نہیں کرتے کہ جھوٹ نہ ہو جائے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی گندمی اور گھناؤنی چیز ہے کہ کوئی شریف آدمی خواہ کافر فاسق ہو جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا۔

یہ دوسری بات ہے کہ ان کا دعویٰ ایمان بالہ و بالیوم الآخر بھی مشرانی اصطلاح کے خلاف ہونے کی وجہ سے نتیجہ جھوٹ ثابت ہوا۔

۵) ایمان و ادیان کے ساتھ براسلوک کرنا | آیت مذکورہ میں منافقین کا ایک مال یہ بتلایا ہے یَخَاجِدُوْنَ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بُرائی کرنا ہے | اللہ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ چال بازی کرتے ہیں، حالانکہ گروہ منافقین میں شاید کوئی بھی ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا قصد رکھتا ہو، یا یہ سمجھتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو فریب دے سکتا ہے، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کو دھوکہ دینے کے قصد سے شیع حرکتیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں اس کو اللہ کو دھوکہ دینا مشراردے کر یہ بتلادیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی رسول یا دلی کے ساتھ

کوئی بُرا معاملہ کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کے حکم میں ہے، دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت شان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ آپ کی شان میں کوئی گستاخی کرنا ایسا ہی جرم ہے جیسا اللہ جل شانہ کی شان میں گستاخی جرم ہے۔

۱) جھوٹ بولنے کا وبال | آیات مذکورہ میں منافقین کے عذاب الیم کی وجہ بتلایا گیا اِيَتَكُنْ بُكُوْنٌ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلَا تَدْرٰیۤ اَنَّ اللہ تعالیٰ ان کے کفر و نفاق کا جرم سب سے بڑا تھا، اور دوسرے جرائم مسلمانوں سے حسد ان کے خلاف سازشیں بھی بڑے جرائم تھے، مگر عذاب الیم کا سبب ان کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا، اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ان کا اصلی جرم تھا، اسی بُری عادت نے ان کو کفر و نفاق تک پہنچا دیا تھا، اس لئے جرم کی حیثیت اگرچہ کفر و نفاق کی بڑھی ہوئی ہے مگر ان سب خرابیوں کی جبر اور بنیاد جھوٹ بولنا ہے، اسی لئے قرآن کریم نے جھوٹ بولنے کو بت پرستی کے ساتھ جوڑ کر اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

فَاٰخِثِيْٓہٗمُ الْاَلْوَحٰشٰی مِنَ الْاَدْوَانِ | یعنی بچت پرستی کی خواہش سے اور بچہ
وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۳۰:۲۲) | جھوٹ بولنے سے ۵

۲) اصلاح و فساد کی تعریف | آیات مذکورہ میں گزر چکا ہے کہ جب کوئی ان منافقین سے یہ کہتا کہ اپنی نفاق اور مصلح و مفید کی پہچان کے ذریعہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ بڑے زور اور تاکید سے کہتے تھے اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اس میں لفظ اِنَّمَا جو حصراً و انحصار کے لئے بولا جاتا ہے اس کی وجہ سے معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ ہم تو مصلح ہی ہیں، یعنی ہمارے کسی عمل کا فساد سے کوئی واسطہ نہیں، مگر قرآن کریم نے ان کے جواب میں فرمایا اَلَا اِنَّہُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُوْنَ، یعنی یاد رکھو کہ یہی لوگ مفسد ہی ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہیں۔

اس میں دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ منافقین کی حرکات حقیقتہً زمین میں فتنہ و فساد پھیلانے کا سبب تھیں، دوسری بات یہ کہ منافقین فتنہ و فساد پھیلانے کی نیت اور قصد سے یہ کام نہ کرتے تھے بلکہ ان کو معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا نتیجہ فتنہ و فساد ہے، جیسا کہ مشرانی کی تصریح وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ زمین میں فتنہ و فساد جن چیزوں سے پھیلتا ہے ان میں کچھ تو ایسی چیزیں ہیں جن کو ہر شخص فتنہ و فساد سمجھتا ہے، جیسے قتل، غارتگری، چوری، دھوکہ، فریب، اغواء، بدکاری وغیرہ ہر سمجھدار آدمی ان کو شر و فساد سمجھتا ہے، اور ہر شریف آدمی ان سے بچتا ہے، اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی ظاہری سطح کے اعتبار سے کوئی فتنہ و فساد نہیں ہوتیں، مگر ان کی وجہ سے انسانوں کے اخلاق برباد ہوتے ہیں، اور انسانوں کی اخلاقی گراؤٹ سائے فتنوں اور فسادوں کے دروازے کھول دیتی

ہے، ان منافقین کا بھی یہی حال تھا کہ چوری، ڈاکہ، بدکاری وغیرہ سے بچتے تھے، اسی لئے بڑی زد سے اپنے مفید ہونے کا انکار اور مصلح ہونے کا اثبات کیا۔

مگر ففاق اور کینہ و حسد اور اس کے ماتحت دشمنوں سے سازشیں یہ چیزیں انسان کے اخلاق کو ایسا تباہ کر دیتی ہیں کہ انسان بہت سے جوائفوں کی سطح سے بھی نیچے آ جاتا ہے، اور ایسے کام کرنے پر اُتر آتا ہے جو کبھی کسی بھلے مانس سے متصور نہیں ہوتے، اور جب انسان اپنے انسانی اخلاق کو بھٹکا، تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد ہی فساد آ جاتا ہے، فساد بھی ایسا عظیم جو نہ درندے جانوروں سے متوقع ہے نہ ڈاکوؤں اور چوروں سے، کیونکہ ان کے فساد کو قانون اور حکومت کی طاقت سے روکا جاسکتا ہے، مگر قانون تو انسان ہی جاری کرتے ہیں، جب انسان انسان نہ رہا تو قانون کی جوگت بننے لگی اس کا تماشا آج کھلی آنکھوں پر شخص ہر جگہ اور ہر ادارہ میں دیکھتا ہے، آج دنیا کا تمدن ترقی پذیر ہے، تعلیم و تعلیم کے اداروں کا جال گھاؤں گھاؤں تک پھیلا ہوا ہے، تہذیب و تہذیب کے الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں، قانون سازی کی مجلسوں کا بازار گرم ہے، تنفیذ قانون کے بے شمار ادارے اربوں روپے کے خرچ سے قائم ہیں دفتری انتظامات کی بھول بھلیاں ہیں، مگر جرائم اور فتنے فساد روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں، درجہ اس کے سرا نہیں کہ کوئی قانون خود کار مشین نہیں ہوتا، بلکہ اس کو انسان چلاتے ہیں، جب انسان اپنی انسانیت کو بھٹکا تو پھر اس فساد کا علاج نہ قانون سے ہو سکتا ہے نہ حکومت اور محکموں کے چکر سے، اسی لئے انسان کے عظیم ترین محسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز فرمائی ہے کہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنادیں، تو پھر فساد و جبرائیم خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، نہ پولیس کی زیادہ ضرورت رہتی ہے نہ عدالتوں کے اس پھیلاؤ کی جو دنیا میں پایا جاتا ہے، اور جب تک دنیا کے جس حصہ میں آپ کی تعلیم و ہدایات پر عمل ہوتا رہا دنیا نے وہ امن و امان دیکھا جس کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ ان تعلیمات کو چھوڑنے کے بعد متوقع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کی روح ہے اللہ تعالیٰ کا خوف، اور قیامت کے حساب کتاب کی فکر، اس کے بغیر کوئی قانون و دستور اور کوئی محکمہ اور کوئی مدرسہ اور یونیورسٹی انسان کو جبرائیم سے باز رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

آج کی دنیا میں جن لوگوں کے ہاتھ میں خستہ سار کی باگ ہو وہ جرائم کے اسداد کے لئے نئے سے نئے انتظام کو تو سوچتے ہیں، مگر اس روح انتظام یعنی خوفِ خدا سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ اس کو فنا کرنے کے اسباب مہیا کرتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ہمیشہ یہی سامنے آتا رہتا ہے کہ سہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کھلے طور پر فساد مچانے والے چوروں، غارت گردوں کا علاج سہل ہے، مگر ان انسانیت فراموش

انسانوں کا فساد ہمیشہ برنگ اصلاح ہوتا ہے، وہ کوئی دلچسپ لغزب اصلاحی اسکیم بھی سن کر رکھ لیتے ہیں اور خالص ذاتی اغراض فاسدہ کو اصلاح کا رنگ دے کر [لَمَّا تَخُنْ مَصْلِحَتَهُنَّ] کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، اسی لئے حق تعالیٰ سبحانہ نے جہاں فساد سے روکا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ** (۲۲، ۲۳)، یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون؟ جس میں اشارہ فرمایا کہ فساد و مصلح کی اصل حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں جو دلوں کے حال اور نیتوں سے بھی واقف ہیں، اور ہر عمل کے خواص و نتائج کو بھی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ مصلح ہوگا یا فساد، اس لئے اصلاح کے لئے صرف نیت اصلاح کافی نہیں، بلکہ عمل کا رخ بھی شریعت کے مطابق صحیح ہونا ضروری ہے، بعض اوقات کوئی عمل پوری نیک نیتی اور اصلاح کے قصد سے کیا جاتا ہے مگر اس کا اثر فساد و فتنہ ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ

تمہارے لئے پرہیز گار بن جاؤ، جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بھجونا اور آسمان کو

بِنَاءً ۝ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا

چھت اور آمارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے تمہارے کھانے

لَكُمْ ۝ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

کے واسطے سو نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو

خلاصہ تفسیر

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ (شاہی محاورہ میں عجب نہیں کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے) وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر پردہ عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے، اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم تو جانتے ہو جتنے ہو، (یعنی یہ جانتے ہو کہ یہ تمام تصرفات خدا تعالیٰ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں، پھر خدا کے مقابل میں دوسری چیزوں کو معبود بنانا کیسے درست ہو سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

رابط آیات | سورۃ بقرہ کی دوسری آیت میں اُس دعا و درخواست کا جواب تھا جو سورۃ فاتحہ میں آئی ہے، **بِیْنِ اِھْدِیْ نَا الْاِیْتِیْ اِلَیْہِ السُّبُلِ** یعنی جو صراطِ مستقیم تم طلب کرتے ہو وہ اس کتاب میں ہے، کیونکہ قرآن کریم اول سے آخر تک صراطِ مستقیم ہی کی تشریح ہے۔ اس کے بعد مسترانی ہدایات کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے اعتبار سے انسان کے تین گروہ بیان کیا گیا، پہلی تین آیات میں مومنین متعین کا ذکر ہوا، جنہوں نے ہدایت قرآنی کو اپنا نصب العین بنالیا، بعد کی دو آیتوں میں اُس گروہ کا ذکر کیا جس نے کھلے طور پر اُس ہدایت کی مخالفت کی، اس کے بعد تیسرے آیتوں میں اُس خطرناک گروہ کے حالات بیان کئے گئے جو حقیقت میں قرآنی ہدایات کے مخالفت تھے، مگر دنیا کی ذلیل اغراض یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے خیال سے اپنے کفر و مخالفت کو چھپا کر مسلمانوں میں شامل رہتے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے۔

اس طرح سورۃ بقرہ کی ابتدائی تین آیتوں میں ہدایت کے قبول کرنے اور نہ کرنے کے معیار پر عمل انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا گیا، جس میں اس طرف بھی اشارہ پایا گیا کہ انسانوں کی گروہی اور قومی تقسیم نسب اور وطن یا زبان اور رنگ کی بنیادوں پر معقول نہیں، بلکہ اس کی صحیح تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہو، کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ہدایات کو ماننے والے ایک قوم اور نہ ماننے والے دوسری قوم جن کو سورۃ مجادلہ میں **حزب اللہ** اور **حزب الشیطان** کا نام دیا گیا۔ غرض سورۃ بقرہ کی ابتدائی تین آیتوں میں مسترانی ہدایات کو ماننے یا نہ ماننے کی بنیاد پر انسان کو تین قوموں میں تقسیم کر کے ہر ایک کا کچھ حال بیان فرمایا گیا۔

اس کے بعد مذکورہ اکیسویں اور بائیسویں آیتوں میں تینوں گروہوں کو خطاب کر کے وہ دعوت پیش کی گئی ہے جس کے لئے قرآن نازل ہوا، اس میں مخلوق پرستی سے باز آنے اور ایک خدا کی عبادت کرنے کی طرف دعوت ایسے انداز سے دی گئی ہے، کہ اس میں جو کچھ کے ساتھ اس کے واضح دلائل بھی موجود ہیں، جن میں ادنیٰ سمجھ بوجھ والا انسان بھی ذرا سا غور کرے تو توحید کے اقرار پر مجبور ہو جائے۔

پہلی آیت میں **يَا أَيُّهَا النَّاسُ** سے خطاب شروع ہوا، لفظ **النَّاسُ** عربی زبان میں مطلق انسان کے معنی میں آتا ہے، اس لئے مذکورہ تینوں گروہ اس میں داخل ہیں، جن کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا **اَعْبُدُوا رَبَّكُمُ**، عبارت کے معنی ہیں اپنی پوری طاقت مکمل فناء و تاراج میں صرف کرنا، اور خوف و عظمت کے پیش نظر فناء و تاراج سے ڈر رہنا اور وحی البیان

ص ۳، ج ۱، اور لفظ **رَبِّ** کے معنی پر دروگاہ کے ہیں، جس کی پوری تشریح پہلے گزر چکی ہے، ترجمہ یہ ہوا کہ "عبادت کرو اپنے رب کی"۔

یہاں پر لفظ **رَبِّ** کی جگہ لفظ **"اللہ"** یا **"اسما حسنی"** میں سے کوئی اور نام بھی لایا جاسکتا تھا، مگر ان میں سے اس جگہ لفظ **رَبِّ** کا انتخاب کرنے میں یہ حکمت ہو کہ اس مختصر سے جملے میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی آگئی، کیونکہ عبادت کی مستحق صرف وہ ذات ہو سکتی ہے جو انسان کی پرورش کی کفیل ہو، جو اس کو ایک قطرہ سے تدریجی تربیت کے ساتھ ایک بھلا چنگا، سمیع و بصیر، عقل و ادراک والا مہر انسان بنائے، اور اس کی بقا، دارققاء کے وسائل مہیا کرے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کتنا ہی جاہل ہو، اور اپنی بصیرت کو برباد کر چکا ہو، جب بھی ذرا غور کرے گا تو اس کا یقین کرنے پر، اُسے ہرگز تامل نہیں ہوگا، کہ یہ شانِ ربوبیت، بجز حق تعالیٰ کے اور کسی میں نہیں، اور انسان پر یہ تربیانہ انعامات نہ کسی پتھر کے تراشے ہوئے بُت نے کئے ہیں اور نہ کسی اور مخلوق نے، اور وہ کیسے کرتے جب کہ وہ سب خود اپنے وجود اور بقا میں اُس ذاتِ واحد کے محتاج ہیں، ایک محتاج دوسرے محتاج کی کیا حاجت روائی کر سکتا ہے؟ اور اگر ظاہری طور پر کدو بھی تو وہ بھی درحقیقت اُس ذات کی تربیت ہوگی، جس کی طرف یہ دونوں محتاج ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ لفظ **رَبِّ** لاکر یہ واضح کر دیا گیا کہ جس ذات کی عبادت کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری ہستی عبادت کی مستحق ہو ہی نہیں سکتی۔

اس جملہ میں انسانوں کے تینوں گروہوں کو خطاب ہے، اور ہر مخاطب کیلئے اس جملہ کا معنی مطلب جدا ہو، مثلاً جب کہا گیا کہ اپنے رب کی عبادت کرو، تو کفار کے لئے اس خطاب کے معنی یہ ہوتے کہ مخلوق پرستی چھوڑ کر توحید اختیار کرو، اور منافقین کے لئے اس کے یہ معنی ہوتے کہ لفاق چھوڑ کر اخلاص پیدا کرو، گناہگار مسلمانوں کے لئے یہ معنی ہوتے کہ گناہ سے باز آؤ اور کامل اطاعت اختیار کرو، اور متقی مسلمانوں کے لئے اس جملہ کے یہ معنی ہوتے کہ اپنی طاعت و عبادت پر ہمیشہ قائم رہو، اور اس میں ترقی کی کوشش کرو (روح البیان)۔

اس کے بعد **رَبِّ** کی چند صفات خاصہ کا ذکر کر کے اس مضمون کی مزید توضیح منبر مادی گئی، ارشاد ہوتا ہے **الَّذِي خَلَقَكُمْ ذَاتِنَہُمْ قَبْلُ** یعنی تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، اور ان قوموں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں، اس میں **رَبِّ** کی وہ صفت بتلائی گئی ہو جو اللہ جل شانہ کے سوا کسی مخلوق میں پائے جانے کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا، کہ نیست سے ہست اور نابود سے بود کرنا، پھر بطنِ مادر کی تاریکیوں اور گندگیوں میں ایسا حسین و جمیل، پاک و صاف انسان بنادینا کہ فرشتے بھی اس کی پاکی پر رشک کریں، یہ سوائے اُس ذاتِ حق کے کس کا کام ہو سکتا

ہر جو کسی کا محتاج نہیں اور سب اُس کے محتاج ہیں۔

اس آیت میں خَلَقَکُمْ کے ساتھ اَلَّذِیْ نَزَّلَ مِنْ قَبْلِکُمْ کا اضافہ کر کے ایک تویہ بتلادیا کہ تم اور تمہارے آباء و اجداد یعنی تمام بنی نوع انسان کا خالق وہی پروردگار ہے، دوسرے صرف مِنْ قَبْلِکُمْ کا ذکر فرمایا، مِنْ تَحْتِ کُمْ، یعنی بعد میں پیدا ہونے والے لوگوں کا ذکر نہیں کیا، اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعد کوئی دوسری امت یا دوسری ملت نہیں ہوگی، کیونکہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کوئی نبی مبعوث ہوگا، نہ اس کی کوئی حبیہ یا امت ہوگی۔

اس کے بعد اس آیت کا آخری جملہ ہے **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** یعنی دنیا میں مگر اہی اور آخرت میں عذابِ نجات پانے کی امید تھامے لئے صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ توحید کو اختیار کر دو اور شرک سے باز آؤ۔

کائناتِ زمین و آسمان
میں قدرتِ حق کے مظاہر

پھر دوسری آیت میں "رب" کی دوسری صفات کا بیان اس طرح فرمایا گیا ہے: الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بَنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ

”یعنی رب وہ ذات ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش، اور آسمان کو چھت اور برپایا آسمان سے پانی، پھر اس پانی کے ذریعہ پردہ عدم سے نکالی پھلوں کی غذا تمہارے لئے۔“

پہلی نعمت اس سے پہلی آیت میں اُن انعامات کا ذکر تھا جو انسان کی ذات سے متعلق ہیں، اور اس آیت میں اُن انعامات کا ذکر ہے جو انسان کے گرد و پیش کی چیزوں سے متعلق ہیں، یعنی پہلی آیت میں "انفس" اور دوسری میں "آفاق" نعمتوں کا ذکر فرما کر تمام اقسامِ نعمت کا احاطہ فرمایا گیا۔

ان آفاقی نعمتوں میں سے زمین کی پیدائش کا ذکر ہے کہ اس کو انسان کے لئے فرش بنا دیا، نہ پانی کی طرح نرم ہے، جس پر مسترا نہ ہو سکے، اور نہ لوہے، پتھر کی طرح سخت ہو کہ ہم اسے اپنی ضرورت کے مطابق آسانی سے استعمال نہ کر سکیں، بلکہ نرمی اور سختی کے درمیان ایسا بنایا گیا جو عام انسانی ضرورتاً زندگی میں کام دے سکے۔

فِرَاش کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین گول نہ ہو، کیونکہ زمین کا یہ عظیم الشان کرہ گول ہونے کے باوجود دیکھنے میں ایک سطح نظر آتا ہے، اور مگر آں کا عام طرز یہی ہے کہ ہر چیز کی وہ کیفیت بیان کرتا ہے جس کو ہر دیکھنے والا عالم، جاہل، شہری، دیہاتی سمجھ سکے۔

دوسری نعمت یہ ہے کہ آسمان کو ایک مزن اور نظر فریب چھت بنا دیا، تیسری نعمت یہ ہے کہ آسمان سے پانی برسایا، پانی آسمان سے برسانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بادل کا واسطہ درمیان میں ہو

بلکہ محاورات میں ہر ادھر سے آنے والی چیز کو آسان سے آنا بولتے ہیں۔

خود قرآن کریم نے متعدد مقامات میں بادلوں سے پانی برسانے کا ذکر فرمایا ہے، مثلاً ارشاد ہوا:

فَاَنْزَلْنَاهُ اَمْزًا مُّطَوَّرًا مِّنَ الْمُزْنِ | تَكْبِيْا بِرِشِّكَا پَانِیْ سَفِیْدًا دِلُوں سَہ مَہ نَہ اَنکَا
 اَمْ نَخْرُجُ الْمُنْزِلُوْنَ ط (رداعہ: ۶۹) | ہوا بہم اس کے اُتارنے والے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے،

وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً
ثَجَّاجًا (نبا: ۱۳)

ہم نے اُنار پانی مہرے جوئے اءون
پانی کارچہ :

چوتھی نعمت اس پانی کے ذریعہ پھل پیدا کرنا اور پھلوں سے انسان کی غذا پیدا کرنا ہے ، پروردگار عالم کی چار مذکورہ صفات میں سے پہلی تین باتیں تو ایسی ہیں کہ ان میں انسان کی سعی و عمل تو کیا خود اس کے وجود کو بھی دخل نہیں ، بچا رہے انسان کا نام و نشان بھی نہ تھا ، جب زمین اور آسمان پیدا ہو چکے تھے اور بادل اور بارش اپنا کام کر رہے تھے ، ان کے متعلق تو کسی بیوقوف جاہل کو بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کام سوائے حق جل شانہ کے کسی انسان یا بت یا کسی اور مخلوق نے کئے ہوئے ہاں زمین سے پھل اور پھلوں سے انسانی غذا اٹھانے میں کسی سادہ لوح اور سلی نظر رکھنے والے کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ انسانی سعی و عمل اور اس کی دانشمندانہ تدبیروں کا نتیجہ ہیں کہ وہ زمین کو نرم کرنے اور کمانے میں ، پھر بیج ڈالنے اور جانے میں ، پھر اس کی تربیت اور حفاظت میں اپنی محنت خرچ کرتا ہو لیکن قرآن کریم نے دوسری آیات میں اس کو بھی صاف کر دیا کہ انسان کی سعی و محنت کو درخت اُگانے یا پھل بھالنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں ، بلکہ اس کی ساری تدبیروں اور محنتوں کا حاصل رکاوٹوں کو دور کرنے سے زیادہ کچھ نہیں ، یعنی انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ پیدا ہونے والے درخت کی راہ سے رکاوٹیں دور کرے اور بس ۔

غور کیجئے کہ زمین کا کھودنا، اس میں ہل چلانا، اس میں سے جھاڑ جھنکاڑ کو رد کرنا، اس میں کھاد ڈال کر زمین کو نرم کرنا جو کاشتکاروں کا ابتدائی کام ہے، اس کا جاہل اس کے سوا کیا ہے کہ بیج یا مٹھل کے اندر سے جو نازک کوئیل قدرت خداوندی سے نکلے گی زمین کی سختی یا کوئی جھاڑ جھنکاڑ اس کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں، بیج میں سے کوئیل نکالنے اور اس میں پھول پتیاں پیدا کرنے میں اس بیچاڑے کاشتکار کی محنت کا کیا دخل ہے۔

اسی طرح کاشتکار کا دوسرا کام زمین میں بیج ڈالنا، پھر اس کی حفاظت کرنا، پھر جو کونپل نکلے اس کی سردی گرمی اور جانوروں سے حفاظت کرنا ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہو کہ قدرت پر خداوندی سے پیدا ہونے والے کونپلوں کو ضائع ہونے سے بچایا جائے، ان سب کاموں کو کھیت

جس کے ذریعہ وہ اسباب ظاہر کی حقیقت کو پہچان لے گا کہ یہ سلسلہ اسباب و حقیقت ایک بڑے ہے جس کے پیچھے دست قدرت کا فرما ہے۔

برق اور بھاپ کے پھنپھنے والے دانیائیں اور پ اگر اس حقیقت کو سمجھیں تو ان میں معلوم ہوئے کہ برق اور بھاپ آگے بھی کوئی حقیقت ہے، اور حقیقی طور اور طاقت برق میں ہے نہ بھاپ میں، بلکہ سب طاقتوں اور قوتوں کا سرچشمہ اسی ذات حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ برق اور بھاپ پیدا کئے، اس کو جگہ کے لئے بصیرت چاہئے، اور جس سے اس حقیقت کو نہیں سمجھا وہ دنیا میں کتنا ہی دانشمند مظلوم ملتا ہو اگر اس کی مثال اس دنیا کی برق قوت کی سی ہے جس کے لمحے آتش پر ہو چکا اور دھماکا گڑ کے ہاتھ میں دھندلیاں شرح اور سبز ہیں، سبز کے دکھلانے سے ریل چلنے لگتی ہے اور شرح جھنڈی دکھلانے سے ریل تھم جاتی ہے، یہ دیکھ کر وہ ابن جھنڈی ہی کو ڈنڈ کر دیتے کہ لگے اللہ کیجئے کہ یہ جھنڈی میں طاقت کی، بالک ہیں کہ اتنی بڑی چیز رفتار پیدا کی طرح جوصل گلاؤں کو چلاتا اور روکنا ان کا کام ہے، جس طرح دنیا میں دنیا کی برق قوت سے کہ اس جالی کو خبر نہیں کہ جھنڈی میں طاقت ہے اور کام و حقیقت ڈرائیو رکاوٹ ہے، اور وہ ریل کو چلاتا ہے اور وہ رکاوٹ ہے، بلکہ اس کا بھی نہیں مشین کے عمل پر زور نہ کا ہے، اور جس سے ڈرائیو کو اور گر کر ریا تو ہے یہ نظر آ جاتا ہے کہ وہ حقیقت اس کا چلانے والا نہ تو ایسا کام ہے، نا اچھ کے عمل پر زور نہ کا، بلکہ اصل طاقت اس انجینئر کے ہوا چھ سکائی پیدا ہو رہی ہے، اسی طرح ایک موجد انسان اس سب عقل مند پر ہوتا ہے کہ حقیقت کو سمجھنے بھی نہیں پاتا، فکر و فکر سنسنی میں آ رہا ہے، ڈرائیو کو تیز کر اور دوسرے کام، تو معلوم ہو گا کہ سلیم اور آگ و پانی بھی کہ نہیں، طاقت و قوت ہر اس ذات کی ہے جس سے آگ اور پانی پیدا کئے ہیں اور اسی کی مشیت و امر کے ماتحت یہ سب چیزیں اپنی ذاتی اور اگر بھی ہیں۔

ناک و باد و آب و آتش بسو داند

یا من و تو مرد و با حق زندہ اند

جس کا عمل اس کی غلات اور فَعَلَكُمْ تَشَقُّقًا، اس میں اس لفظ تَشَقُّقُ استعمال فرما رہا ہے جو رجاء و یقینی امید کے معنی میں آتا ہے، اور ایسے مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں کسی نیک کا قورع یقینی نہ ہو مگر ایمان و توحید کے تجربہ میں غلات اور جنت کا حصول وعدہ آئیہ کے مطابق یقین ہے، مگر اس یقین سے کہ امید و رجاء کے عزائم سے بیان کر لے یہ محنت ہے، بلکہ ان کے کہ انسان کو ان کی عمل اپنی ذات میں غلات و جنت کی قسمت نہیں ہو سکتا، بلکہ فضل خداوندی اس کا اصل سبب ہے، ایمان و عمل کی توفیق پر ان فضل خداوندی کی ملامت ہے، ملامت نہیں۔

حقیدہ تو حیدری دنیا میں اس عالمی اعتقیدہ تو حیدر اسلام کا ہے پہلا بنیادی عقیدہ ہے، یہ صرف اور سکون و اطمینان کا شانس ہے ایک نظر نہیں بلکہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کا واحد ذریعہ ہے جو انسان کی تمام مشکلات کا حل اور برکات میں اس کے لئے بنا چکا، اور ہر قسم و فکر میں اس کا حلال ہے، یہ کہ وہ عقیدہ تو حیدر کا حاصل یہ ہے کہ خدا کے کون و نساد اور ان کے سامنے خیرات صرف ایک ہی شئی کی خیریت کے تابع اور اس کی محنت کے مظاہر ہیں۔

ہر نفسیر جو طیب کی آواز

ہر عقیدہ میں ہیں ہزاروں داز

اور ظاہر ہے کہ جب یہ عقیدہ کسی کے قلب و دماغ پر چھا جائے اور اس کا حال میں ہاتھ تو وہ دنیا میں اس کے لئے محنت ہیں ہاتھ گی، سامنے بھگتے نساد اور ہر نسا کی بنیادیں ہیں منہدم ہو جائیں گی، نیز کہ اس کے سامنے یہ سبق ہو گا کہ

از خدا وان خلافت دشمن و دوست

کو دل پرود و رخصت منب او مست

اس عقیدہ کا بالک ساری دنیا سے بے نیاز ہر قوت و خطر سے بالاتر نہ لگے گزرا ہے، اس کا عالم یہ ہوتا ہے کہ

موجود ہر پائے بڑی زرش چہ فودر ہندی بھی بر سرش

امید و برکاتش نباشد و کس و بین است بنیاد تو حیدر و کس

کلہ لا لا ولا تو حیدر تو حیدر ہوتا ہے اس کا بھی مفہوم ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ تو حیدر کا بعض بنانی اثر اس کے لئے کافی نہیں، بلکہ چہ دل سے اس کا یقین اور یقین کے ساتھ جتنا ضروری ہو،

کیونکہ تو حیدر خدا واحد و چنانچہ بورہ واحد گفتن

کلہ لا لا لا انا کے چہنےنے دل سے تو آج دنیا میں کر ڈروں ہیں اور اتنے ہیں کہ کس زمانے میں اتنے نہیں ہوتے، لیکن عام طور پر یہ صرف زبانی تہم خراج ہے، توحید کا رنگ ان میں دھپیں اور ان کا بھی وہی حال ہو تا ہے جو پچھلے بزرگوں کا تھا کہ نہ کئی بڑی سے بڑی قوت و طاقت ان کو محبوب کر سکتی تھی، اور نہ کسی عدوی کثرت اثر ہی پر اثر تھا، نہ کسی تھی مذکور بڑی سے بڑی دولت و سلطنت ان کے قلب کو خلافت حق اپنی طرف جھکا تھی، ایک پیغمبر کو اگر اس کی دیکھ لگا کر کہہ دیتا تھا کہ تم میرے نہیں جانتے تھے، کیونکہ وہی قوت مذکور تھی، انہی کے بعد بھی جانتے جو خود ہی مذمت میں دیا ہے چھانے ان کی طاقت و قوت اسی تھی تو حیدر میں مضر حق، اللہ تعالیٰ ہیں اور سب مسلمانوں کو یہ دولت نصیب فرمائے۔

رسالت محمدیؐ کا اثبات

بذریعہ اعجازِ مشرآن

وَاِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهٖ
اور اگر تم شک میں ہو اس حکام سے جو انما پر آئے اپنے بندے پر تو آؤ ایک سورۃ

مِثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۰﴾

اس جیسی اور ملاؤ اس کو جو تمہارا دعوہ گار ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو،

فَاِنْ كُنْتُمْ تَقْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاْتُوا بِالْبَآئِثِ وَكُفُّوْا هَٰذَا الشَّامُسَ ۚ
پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو پھر بھروسہ اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور

الْحِجَارَةُ ۚ اَعَدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ ﴿۱۱﴾

پتھر ہیں تیار کی ہوئی ہے کافروں کے واسطے۔

خلاصہ تفسیر

اگر تم کو شک ہے یہاں میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہو اپنے بندے سے
خاص پر تو آجھا پھر تم بنالو ایک عدد دیکھا جو اس کا ہم پر جو دیکھو کہ تم بھی عربی زبان کا محقق
ہو اور اس کی نظم و نثر کے مشابہ ہو، پھر پہلی اٹھ علیہ وسلم نے اس کی کوئی مشق بھی نہیں کی،
اور جب اس کے بار جو دم مشرآن کے ایک کوشش کے بھی مشق نہ دینا سکو تو بشرط انصاف یہاں
اثبات ہو جانے لگا کہ یہ مجبوراً محتاجِ اثبات ہے اور آپ اللہ کے پیغمبر ہیں، اور بلا واسطہ حائضیوں
کو (جو خدا سے الگ) الگ پھر ذکر کر کے ہیں، اگر تم سچے ہو، پھر اگر تم یہ کام نہ کر سکو اور قیامت تک
بھی نہ کر سکو گے تو پھر ذرا تجھے دیکھو درخت سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، تیار رکھی ہوئی
ہے کافروں کے واسطے۔

معارف و مسائل

۱۔ سورۃ بعشرہ کی تین سو سی اور چھ سو سی آیتیں ہیں، اس سے پہلے
زبط آیات و خلاصہ مضمون ۲۔ آیتوں میں قریباً کچھ ثابت تھا، ان دونوں آیتوں میں رسالت
لے، اللہ کے پیغمبر کی بی شکوہی، علیہ السلام شاک ہے کہ ۱۰۰

محمدیؐ کا اثبات ہے، (طریقہ الصلوۃ والاسلام) وہ جاہلیتِ قرآن سے کر آیا ہے اس کے دو دعوہ ہیں،
توحید اور رسالت، پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے چند مخصوص کام ذکر کر کے توحید ثابت کی گئی تھی
ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا کلام پیش کر کے حضرت علیؑ علیہ السلام کی رسالت ثابت فرمائی
گئی ہے، اور طریق اثبات دونوں کا ایک ہی ہے کہ پہلی دو آیتوں میں چنانچہ کام ذکر کر کے
سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں کر سکتا، خطہ زمین اور آسمان کا پیدا کرنا، آسمان سے اپنی آواز بکال
سے پہلے پہول پیدا کرنا۔

اور شانِ اقدسِ انبیاء علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تو سچے معارف
ہیں اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اور ان دونوں آیتوں میں ایک ایسا کلام پیش کیا گیا ہے جو
اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی انسانی فرد یا جماعت اس کی مثال و نظیر
لا سکتی ہے، جس طرح زمین و آسمان کی بناوٹ، اپنی برسات نے اور اس سے پہلے پہول پھلنے سے انسان
خالق کا ماہر ہو کر اس کی دلیل جس کی یہ کام صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، اسی طرح کلامِ انبیاء کا پیش
یا نظیر پیش کرنے سے پہلے ہی مخلوق کا عاجز رہنا اس کی دلیل ہے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔
بہی مخلوق کا نہیں، اس آیت میں قرآن نے پہلے ہی دنیا کے افسانوں کو خطاب کر کے چیلنج دیا ہے کہ اگر
تم اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں، بلکہ کسی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی انسان ہو، تمہیں بھی ایسا کلام
پیش کر سکتے ہو قدرت پر ہونا چاہئے، پھر کلام کو کیا تم اس کلام کے ایک جھوٹے سے نمٹنے کے نظیر
و مثال بنا کر دکھاؤ، اور اس پر تمہارے لئے یہ سزا یہ آسانی دی جاتی ہے کہ تم بنا کر کوئی آدمی نہ بنا سکو
تو تمہیں جہنم دیا ہے، سامنے جہان سے اپنے حائضی اور مردگان سے کرو، اور ایک بینِ عالمی کافر نفس
کر کے اس مشرآن کی چھوٹی سی سورت کی مثال بنالو۔

پھر اس پر نہیں کیا دوسری ثابت میں ان کو کویت و دانی کہ چند ہی جہاں نہیں کر سکتی ہیں
ایک سورت بنا سکو، پھر مذہب سے لڑنا کہ جب تم اس کلام کی مثال بنانے سے اپنا جہنم محسوس
کرتے ہو، اور یہ صاف اس کی دلیل ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں، بلکہ ایسی ہستی کا کلام ہے جو
تام مخلوق سے باوق اور بلند دماغ ہے، جس کی قدرت کا سبب یہ عاوی ہے، تو پھر اس پر ایمان
نہ لانا اپنے انھوں نے اپنا ٹھکانا ہے اس سے بچو۔

حاصل یہ کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ معجزہ ہے، ہر شے
آپ کی رسالت اور جہاں کی جاہلیت پر کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تو بڑے بڑے
ہیں اور بڑے بڑے حیرت انگیز ہیں، لیکن ان سب میں سے اس جگہ آپ کے علمی معجزے یعنی قرآن
کے ذکر کا مقصد کر کے بتلوا دیکھا کہ آپ کا سبب بڑا معجزہ، قرآن ہے، اور اس معجزہ کو انبیاء علیہم السلام

تجلی میں موجود ہے۔

یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سماوی کی تصدیق ہر سال اور ہر زمانے میں ہو سکتی ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ کج میں فتنوں آدمی ہر سال بیت جوتے ہیں، اور ہر شخص ہر چہرہ پر ہر روز سات سات لکھوں پہنکتا ہے، اور بعض جاہلوں تو بڑے بڑے پتھر پھینکتے ہیں اور یہ بھی یقیناً طور پر معلوم ہے کہ ان لکھوں کو یہاں سے اٹھانے اور سات کرنے کا حکومت کوئی کی جانت ہے اور نہ ان سے انتظام نہیں کرتی، ذرا غصائی جاتی ہیں، اور عیسائے قدیم سے دستور پڑا ہے کہ اس جنگ سے سکر ہاں اٹھائی ہیں جنہیں جاسن تو اچھے سال اس کا دو گنا اور دوسرے سال گھٹا ہو جائے گا، پھر کیا ہے کہ چند سال میں یہ حضرت یسوع علیہ السلام کے ان لکھوں میں شہب جاسے گا، اور بجائے ہر سال کے ایک بار یا دو بار نظر آئے، مگر شاید اس کے خلاف ہے اور یہ شاید ہر زمانے میں رسول کریم صلی اللہ کی تصدیق اور آپ پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے، چونکہ اب یہاں سے لکھوں یا اٹھانے کا حکم انتظام ہونے لگا ہے، مگر یہ سویر میں تک کا عمل بھی اس معنوں کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔

اس طرح مجوزہ قرآن ایک زندہ اور پیشہ دار رہنے والا مجوزہ ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اس کی نظیر یا مثال پیش نہیں کی جاسکتی، آج بھی نہیں کی جاسکتی۔

اعجاز قرآنی کی تشریح

اس اجمالی بیان کے بعد آپ کو معلوم کرنا ہو کہ قرآن کریم کو کس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا جائے اور اس کا اعجاز کون کون سے وجوہ سے ہے، اور کیوں ساری دنیا اس کی مثال نہیں کرنے سے عاجز ہو گئی۔

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ وہ سویر سے کوسمیں قرآن کی زبردست حسنی و جلیلی کے بار جو کوئی اس کی پاس کے کسی گوشت کی مثال پیش نہیں کر سکا، یہ تاریخ نبیث سے کیا دلالت رکھتا ہے یہ دونوں ایسی طویل الاکثر و تقبیل کی غلاب ہیں۔

پہلی بات کہ قرآن کو معجزہ کیوں کہا گیا؟ اور وہ کیا وجوہ ہیں اس کے سبب ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے اس پر قدیم و جدید علماء نے متفق ہیں جنہیں بھی یہ اور ہر منتر سے اپنے اپنے طرز میں اس معنوں کی بیان کیا ہے، میں اختصار کے ساتھ چند ضروری چیزیں عرض کرنا ہوں۔

اس جگہ سے پہلے غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ جب تک علوم کی جامع کتاب کہیں جگہ، اس عالم میں اور کس پر تالیف ہوئی، اور کون کون پر ایسے علمی سالن موجود تھے جس کے ذریعہ اور اثر و انتساب

میں ایسی جامع بے نظیر کتاب تیار ہو سکے، جو علوم اوقلین و آخرین کی جامع، اور انسان کی اخلاقی اور دینی زندگی کے ہر پہلو کے ضلع بہترین دلائل میں کر سکے، جس میں انسان کی جسمانی اور ذہنی عقلی تربیت کا محض نظام ہو، اور نہ ہر منزل سے لے کر سیاست، مالک تک ہر نظام کے بہترین اصول ہوں۔

جس سرزمین اور جس ذات پر یہ کتاب مقدس تالیف ہوئی اس کی جسمانی و اخلاقی کیفیت اور تاریخی حالت معلوم کرنے کے لئے آپ کو ایک ہر گستاخی خشک اور گرم علاقہ سے سابقہ پڑے گا، ہاں کو جگہ جگہ اور جہز ذہنی ملک و مضمین، اس ملک کی آب و ہوا، کس کو ایسی خوشگوار ہو، جس کے لئے باہر کے کوئی وہاں پہنچنے کی جھٹ کرے، نہ راستے ہی کچھ ہر راہ میں ہیں، وہاں تک پہنچنا آسان ہو، اکثر دنیا سے کتب ہاں ایک جہز ہاں ہے، جہاں خشک پہاڑوں اور گرم دھبے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور وہ خشک مٹی جیسی نظر آتی ہے نہ کوئی نعمت نہ درخت۔

اس پر سے غلط ملک میں کچھ شہری نہیں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ان میں اونٹ بکریاں پال کر رہتی زندگی گزارنے والے انسان بچتے ہیں، اس کے چھوٹے دیہات کا تو دیکھنا کیا جو بڑا سے کم چند شہر کہلاتے ہیں ان میں بھی کسی قسم کے طرز تعلیم کا کوئی جسر نہیں، وہاں کوئی اسکول اور کالج ہے نہ کوئی بڑی یونیورسٹی دارالعلوم، وہاں کے باشندوں کو اگر اعلیٰ کے محض قدرتی اور پیدا نشی طور پر فصاحت و بلاغت کا ایک فن ضرور دیا ہے جس میں وہ ساری دنیا سے فائق اور متکا ہیں، وہ نثر اور نظم میں ایسے قادر و فاضل ہیں کہ جب کہیں میں خود کوئی طرز تعلیم کے اور بالوں کی طرح جرتے ہیں، ان کی ادنیٰ ادنیٰ جہز کا ایسے فصیح و بلیغ شعر کہتے ہیں کہ دنیا کے ادیب حیران رہ جائیں۔

لیکن یہ سب کچھ کن کا نظری فی ہے، جو کسی محبت یا دوسری مایل نہیں کیا جاتا، فرض نہ دیا تعلیم و تعلم کا کوئی سالانہ ہے، وہاں کے رہنے والوں کو ان چیزوں سے کوئی لگاؤ یا وابستگی ہے، ان میں کچھ لوگ پتھر کی زندگی بسر کرنے والے ہیں تو وہ تجارت پیشہ ہیں، مختلف اہم مال کی درآمد و آمد ان کا مشغلہ ہے۔

اس ملک کے قدیم شہر کے ایک شریف گھرانہ میں دو ذات مقدس پیدا ہوئی ہے جو پہلے دسویں، دسویں پر قرآن نازل ہوا، اب اس ذات مقدس کا حال سنئے،

ولاوت سے پہلے ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، پیدا ہونے سے پہلے تم جہنم جہنم، ابھی سات سال کی بھی عمر نہ تھی کہ والدہ کی بھی وفات ہو گئی، آخر خوشی ملو کہ گھرانہ کی نصیب شد، اب مشرب و آب و ہوا کی فاضلی اور بے شش مقامات نے اپنے گھر میں کئی کئی اندوختہ چھوڑا تھا جس سے تمہیں کچھ پرورش اور کشادہ زندگی کا سامان ہو سکے، بنایت حضرت کی زندگی پھر ان آپ کا سایہ سر پر نہیں، ان حالت میں آپ نے پرورش پائی، اور عمر کا ابتدائی حصہ گزارا جو تعلیم و تعلم کا اصلی وقت ہے، اس وقت اگر کہیں

کوئی اور اسلام یا اسکول و کالج بھی ہوتا تو کسی آپ کے لئے اس سے استفادہ مشکل تھا، مگر مسلم ہر جگہ کہہ جان سرتے سے علی غفلت اور اس سے دلچسپی نہ کی کسی کو جس میں ہے پوری قوم عرب انتہائی بڑھ چکی تھی، قرآن کریم نے یہی ان کے مشعل سے لفظ استعمال کیا ہے **مکھڑکھڑ** کہ یہی ہوتا تھا کہ آپ ہر قسم کی تعلیم و تعلیم سے بے خبر تھے، ہاں کوئی بڑا عالم بھی ان کے پاس کی سہرت میں رہ کر یہ علوم حاصل کر چکے تھے جن کا قرآن حامل ہے، پھر قدرت کو ایک قرآنِ عسائر، عجز و کھلا تھا، آپ کے لئے مخصوص طور پر ایسے سامان ہوتے معمولی نوشت و خواندہ ہر جگہ کے ایک کسی بھی طرح کیسے ہی لیتے ہیں آپ نے وہ بھی دیکھی، بالکل انہی کی قسم ہے، اگر آپ تمام کتب بھی نہ دیکھ سکتے تھے، عرب کا مخصوص فن شعر و سخن تھا، جس کے لئے خاص خاص اہتمامات کئے جاتے اور مشاغل سے منع ہوتے، اور اس میں ہر شخص مساجت کی کوشش کرنا تھا، آپ کو ان تعالیٰ نے ایسی ثابت طاقات دی تھیں کہ ان چیزوں سے بھی دلچسپی نہ لے، یہی کوئی شعر یا قصیدہ لکھنا نہیں ایسے ایسے میں شریک ہوتے۔

ان انہی محض ہونے کے ساتھ آپ نے ہی آپ کی شرافت نفس، انفاق، فاضلہ، فہم اور فراست کے غیر معمولی آثار و دیانت و ولایت کے اعلیٰ ترین شاہکار آپ کی ذات مقدس میں ہر وقت مشاہدہ کئے جاتے تھے، جن کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب کے بڑے بڑے مفرد و مکتبر سردار آپ کی تعلیم کرتے تھے اور سناٹے کو میں آپ کو ان کے لئے بچا کر لیا تھا۔

یہ انہی محض چالیس سال تک کہیں اپنی برادری کے سامنے رہتے ہیں، کسی دوسرے ملک کا مسافر بھی نہیں کرتے، جس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہاں جا کر علوم حاصل کرنے ہوتے تھے، صرف ملک شام کے دو تھانوں میں سفر ہوتے، وہ بھی گئے چھ چار دنوں کے لئے جس میں اس کا کوئی امکان نہیں۔

اس انہی محض ذات مقدس کی زندگی کے چالیس سال تک میں اپنی برادری میں اس طرح گذر کر کہ کہیں کسی کتاب یا فقر کو پڑھا لگایا، دیکھی سمجھی میں گئے، دیکھی محاسن میں کوئی نظم قصیدہ بھی لکھا، ٹھیک چالیس سال کے بعد ان کی زبان مبارک پر وہ کلام آئے لگا جس کا نام قرآن ہے جو اپنی شکل و صورت و طاقت کے لحاظ سے اور منہی علوم و فنون کے لحاظ سے غیر اعتقالات کا ہے، اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو اس کے معجزہ ہونے میں کسی انصاف پسند کو کیا شبہ ہو سکتا ہے، مگر یہاں یہی نہیں بلکہ ساری دنیا کو محمدی کی پہنچ دیا کہ کسی کو اس کے کلام انہی ہونے میں شبہ ہو تو اس کا شل بنالٹا ہے۔ اب ایک طرف قرآن کی یہ تھیں اور دوسری طرف ساری دنیا کی مخالفت کا قیاس ہے۔

اسلام اور دیگر اسلام کی شکست دینے کے لئے اپنی اہل جان، اولاد و آبرو سمجھوتہ کو تیار کیا، مگر اتنا کام کرنے کے لئے کوئی جرات نہیں کرنا کہ قرآن کی ایک چھٹی ہی صورت کی مثال بنالٹا دے، مشرطن کر بیچ کر یا کتاب پر مثال دے بغیر نہیں دے دیتی، جب بھی ایک ایسی محض کی زبان سے اس کا عجز و اعجاز

قرآن اور جو اعجاز کی تفصیل میں جاتے بغیر کسی قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے لئے کہ نہیں جیسا کہ ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے۔

اعجاز قرآن کی دوسری وجہ یا اعجاز قرآن کی دوسری وجہ دیکھئے، یہ آپ کو مسلم ہے کہ قرآن اور اس کے احکام ساری دنیا کے لئے آئے، لیکن اس کے بلا واسطہ اور پہلے غالب عرب تھے، جن کو اور کوئی علم نہ تھا، ان کا غلطی پر سنسار اور پیدا و فانی صفت تھا، جس میں وہ اقوام دنیا سے ممتاز تھے جاتے تھے، قرآن ان کو غالب کر کے چلیے کرنا ہے کہ ان میں میرے کلام الہی ہو، نہ میں کوئی شے نہ تم پر میری ایک سوت کی مثال بنا کر دکھلا دو، اگر تیرا ان کی یہ تھیں اور چلیا جوت اپنے سخن منہی میں مسکینا، اصول اور بیجا معارف اور سراسر ابلیس کی حد تک ہوئی تو قوم انتہیں کے لئے اس کی نظر پریشان کرنے سے غرور مقول رہتا، لیکن مسرتان نے صرف سخن منہی میں ہی کے مشعل تھیں نہیں کی، بلکہ جنگی نصاحت و طاقت کے اعتبار سے بھی پوری دنیا کو پہنچ دیا، اور اس چلیے کو قبول کرنے کے لئے اقوام عالم میں سب سے زیادہ متجن عرب ہی تھے، اگر انی اوراق پر کلام دیتے ہشرے باہر کسی افوق قدرت کا کلام نہیں تھا، پھر بنا جو عرب کے لئے یہی شکل تھا کہ ایک انہی محض کے کلام کی مثال لکھنا سے بہتر کلام فوراً پتہ کر دیتے، اور ایک دیکھی یہ کام نہ کر سکتے تو قرآن نے ان کو یہ ہولت بھی دہی کہ ساری قوم ان میں کہنا تے، اگر تیرا ان کے اس بلند باگ و دھوے اور پھر طرح طرح سے فیرت دلائے یہ بھی عرب کی فیرت و قوم پوری کی پوری خاموشی ہے، چند سطر میں مقابلہ پر نہیں پیش کرتا۔

عرب کے سرداروں نے قرآن اور اسلام کے شانے اور پیر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مغلوب کرنے میں جس طرح اپنی اپنی چوٹی کا زور لگایا، وہ کسی گئے بڑے آدمی سے عقلی نہیں، دشمن میں انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گئے چھنے چھنے، وقتاً کو طرح کی آیریاں دے کر جاہل و کفر اسلام کو چھوڑ دیں، مگر جب دیکھا کہ یا ان دے نشہ نہیں ہے ترشی انہی لئے، تو خوشامد کا پہلو اختیار کیا، عرب کا سردار عبدالمین بنیہ قوم کا نمائندہ بن کر آپ کے پاس حاضر ہوا، اور عرب کی پوری دولت و حکمت اور بہتر تر سخن و جمال کی لڑائیوں کی بیٹیں اس کام کے لئے کہ آپ اسلام کی تبلیغ چھوڑ دیں، لیکن اس کے جواب میں قرآن کی چند آیتیں سننا دینے پر اکتفا فرمایا، جب یہ تدبیریں کامیاب نہ ہوئی تو جنگ کے مقابلہ کے لئے تیار ہو کر قبل از جہرت اور بعد از جہرت جو قرآنی عرب نے انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے مقابلہ میں سرد و زور کی بازی لگائی، جان مال اور دوا، آبرو، سب کچھ اس مقابلہ میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہونے سے سب بچ کر گریہ کی سے ذہب کا قرآن کے چلیے کو قبول کرنا، اور چند سطر میں مقابلہ پر نہیں کرنا، کیا ان حالات میں سارے عرب کا اس کے مقابلہ سے سکوت اور عجز اس کی کمال ہی کی شان

نبی کریم ﷺ کے لئے تمام کلام میں لکھنا تھا کلام ہے جس کے کام یہ کلام کی نظیر انسان کیا ساری مخلوق کی قدرت سے باہر ہے۔

پھر صحت انتہائی نہیں کر وہ اس کے قابل سے نہ نکلتا تھا۔ بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں سنبے اس کے پیش میں ہونے کا اعزاز کیا۔ اور جن میں سے منیعت مزاج تھے انھوں نے اس اعزاز کا اظہار بھی کیا، پھر ان میں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، اور کچھ اپنی آبائی رسوم کی پابندی اور بنی عہد سات کی ضد کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے باوجود اعزاز کے محروم رہے، مگر اہل عرب کی تاریخ ان واقعات پر شاہد ہے، وہیں اس میں سے چند واقعات اس جگہ بیان کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکے کہ پورے عرب نے اس کلام کے بے مثل اپنے نظیر کو کس قدر تسلیم کیا، اور اس کی مثال پیش کرنے کی کتنی رسوائی کے خیال سے چھوڑ دیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا چرچا چاک کرنے پر اجازت کے دوسرے مقامات میں ہوئے لگھا، اور آج کا موسم آیا تو قریش مکہ کو اس کی فکر ہوئی کہ آپ اطراف عرب سے حجاج آئیں گے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلام میں گئے تو فریاد ہو جائیگا اور قاب خیال ہے کہ مسلمان ہو جائیں گے اس کے اندر کی نہ ہر سچے کے لئے قریش نے ایک مجلس منعقد کیا، اس مجلس میں عرب کے بڑے بڑے سردار موجود تھے، ان میں ولید بن مغیرہ میں سب بڑے اور مثل میں متاویس کے جاتے تھے، سب نے ولید بن مغیرہ کو پیش کر کے کہا کہ اب اطراف عرب لوگ آئیں گے، اور ہم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چچیں گے تو ہم کیا کہیں؟ یہیں آپ کوئی ایسی بات بتائیے کہ ہم سب وہی بات کہہ دیں، بیاد ہو کہ خود ہائے بیانات میں اختلاف ہو جائے، ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ہی کو یہ کیا کہنا چاہئے؟

وگوں نے کہا کہ ہائے خیال میں ہم سب یہ کہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، معاذ اللہ مجنون بناؤں کلام مجنون نہ ہو ہے، ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم اس بارگزراؤ کہ یہ لوگ جب ان کے پاس ہائیں گے، اور ان سے ملاقات و گفتگو کریں گے، اور ان کو ایک نفع و فایده حاصل انسان ہائیں گے تو ان میں سے جو جائے جاکر تم نے جھوٹ بولا، وہ پرکھ دوں گے، نہ کہ اگر اچھا ہم ان کو یہ کہیں کہ وہ ایک شاعر ہیں، ولید نے اس سے بھی منع کیا، اور کہا کہ جب لوگ اس کلام میں گئے وہ تو شاعر شاعری کے ماہر ہیں، انھیں یقین ہو جائے جاکر یہ شعر سنیں اور وہ آپ شاعری، تمہارے ہر لفظ کے سب لوگ ٹھیک ہو جائیں گے، پھر کچھ لوگ نے کہا کہ تو چہرہ ان کو کاہن مشرودہم، جو شیائین و جنات سے مستتر فیک کی خبر دیا کرتے ہیں، ولید نے کہا یہ غلط ہے، کہہ دیجئے کہ لوگ اس کلام میں گئے تو پہل جانیکا کہ کلام کس کا نہیں ہے، وہ پھر کس میں ہی جڑا نہیں گئے، اس کے بعد قرآن کے ایشے میں جو کچھ بن مغیرہ نے تاخرات میں ان کو ان الفاظ میں بیان کیا،

خدا کی قسم اگر میں کوئی آدمی شاعر شاعری اور شاعر ہوئے میرے برابر و اہل حق نہیں، خدا کی قسم اگر اس کلام میں خاص طاقت ہے، اور ایک خاص روشنی ہے، تو ہمیں کسی شاعر یا نفع دینے کے کلام میں نہیں پاتا؟

پھر ان کی قوم نے دریافت کیا کہ آپ کی بتلائے پھر ہم کیا کریں؟ اور ان کے ایشے میں لوگوں سے کیا کہیں؟ ولید نے کہا میں غور کرنے کے بعد کچھ جواب دیا، وہاں پھر بہت سوچنے کے بعد کہا کہ اگر کچھ کہنا ہے تو قرآن کو سنا کر پھر کہنا کہ جتنا حد سے آپ بڑے اور میں بڑی میں تفرقہ ڈال دیتے ہیں۔ قرآن میں قرآن اور حقیقی ہو گئی، اور سب سے ہی کہنا شروع کیا، مگر خدا کا چراغ کہیں چھو نہ کہنے والا تھا؟ اس بات عرب کے لوگ آتے قرآن شستا اور بہت سے مسلمان ہو گئے، اور اطراف عرب میں اسلام پھیل گیا، اور خاصاں کیڑی

اس طرح ایک قریشی سردار رضی عنہ نے ایک عربی اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا، تمہارے قوم قریش، آج تم ایک معیبت میں گرنا ہو کہ اس سے پہلے کہا میں معیبت سے سابقہ نہیں پڑا، خدا کی قسم، اصل اللہ علیہ وسلم، تمہاری قوم کے ایک نوجوان تھے، اور تم سب ان کے خدا و احسان کے گرد و اور ان کی قوم میں ان کو سب سے زیادہ سنا، اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے اب جب کہ ان کے سر میں سفید پاؤں آئے، اور انھوں نے ایک بے مثل کلام اللہ کی طرف سے پیش کیا تو تم ان کو جادو کہنے لگے، خدا کی قسم، جادو گر نہیں، ہم نے جادو گروں کو دیکھا اور برتا ہے، ان کے کلام سے ہیں، اور طریقوں کے سمجھا ہے، وہ اہل حق کلمات ہیں۔

اور بھی قرآن کو کاہن کہتے تھے، خدا کی قسم، وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے بہت کاہنوں کو دیکھا اور ان کے کلام سے ہیں، ان کو ان کے کلام سے کوئی مناسبت نہیں۔

اور بھی قرآن کو شاعر کہتے تھے، خدا کی قسم، وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے خود شعر شاعری کے تمام فنون کو سیکھا، ہم سب نے اور بڑے بڑے شعرا کے کلام سنا، ان کو ان کے کلام سے اس کو کوئی مناسبت نہیں، پھر جس قرآن کو کہتے تھے، خدا کی قسم، وہ چٹوٹ بھی نہیں، ہم نے بہت سے چٹوٹوں کو دیکھا، ان کو ان کے کلام سے نہیں، ان کے کلمات اور کلام میں ہیں، یہاں یہ کچھ نہیں، ایشے میری قوم تم انصاف کے ساتھ ان کے معاملہ میں غور کرو، یہ سرسری لکھ دینے کی چیز نہیں، (وہ خاصاں کیڑی)، حضرت ابو موسیٰ خدری نے کہا کہ میرا بھائی انیس ایک مرتبہ مکہ منظر گیا، اُس نے دایمہ ذکر مجھے بتایا کہ مکہ میں ایک شخص جو یہ کہتا ہے کہ اللہ کا رسول ہے، میں نے پوچھا کہ وہاں کے لوگ اس کے ایشے میں کیا کہتے ہیں؟ بھائی نے کہا کہ ان کو شاعر کہتے ہیں، کوئی کاہن جتنا کہ جادو گر کہتا ہے، میرا بھائی انیس خود جادو شاعر اور کلمات و غیرہ سے واقف آدمی تھا، اس نے مجھ سے

کہا کہ جاں نکل میں نے فرمایا کہ لوگوں کی یہ سب باتیں غلط ہیں، اُن کا کلام دشمنی ہے نہ کائنات پر، نہ جبراً نہ کائنات میں، بلکہ مجھے وہ کلام صادق نظر آتا ہے۔

الہود فرماتے ہیں کہ ہماری سے یہ کلمات سکر میں سے نکلا سکر گیا، اور سب حرام میں اگر کچھ بھی تین روز میں نے اس طرح گزارا کہ سو اسے نازم کے ہانی کے میرے پیش میں کچھ نہیں گیا، اس تمام وعدہ میں مجھے بھوک کی تکلیف معلوم ہوئی کہ نہ کوئی صنعت محسوس کیا (خصوصاً ص ۱۱۹ ج ۱)

واپس گئے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تو تم اور فارس کے قصداً، اِنما کے کلام بہت سے ہیں اور کا بنوں کے کلمات اور بغیر کے مقالات بہت تھے ہیں، مگر وہی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مثال میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی، تم سب میری بات مانو، اور آپ کا اتباع کرو، چنانچہ فتح مکہ کی سال میں اُن کی پوری قوم کے تقریباً ایک ہزار آدمی مکہ پہنچ کر مسلمان ہو گئے اور سال ۱۱ ج ۱

اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل اور غصن بن شریحہ وغیرہ بھی لوگوں سے چھپ کر قرآن سننا نہ کر سکتے، اور اس کے عجیب و غریب دلیہ مشکل دلیہ نظائر اثرات سے متاثر ہوئے تھے، مگر جب قوم کے کہہ لوگوں نے ان کو کہا کہ جب تم اس کلام کو ایسا بے نظیر باتے ہو

تو اس کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ تو ابوجہل کا جواب تھا کہ میں معلوم ہے کہ نبی خداوند میں ہمارے قبیلہ میں ہمیشہ سے رقابت اور معارضہ مقابلہ چلا رہا ہے، وہ جبراً کہہ رہا ہے کہ میرا جانتے ہیں کہ

اس کا جواب دیتے ہیں اب جبکہ تم اور وہ دونوں برابر حیثیت کے ایک ہیں تو اب وہ یہ کہتے تھے کہ ہم میں ایک ہی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے اب یہ اس میں کیسے اُن کا مقابلہ کریں میں تو کسی اس کا استرداد نہ کروں گا (خصوصاً ص ۱۱۹ ج ۱)

خلاصہ کلام یہ ہو کہ استرآن کے اس دعوے اور چاہنے پر صرف نبی نہیں کہہ کر وہ سب نے دار مان لی اور سکوت کیا، بلکہ اس کے بے مثل دلیہ نظیر بھی لے کر اپنے عجز کی شکل پر اہواز وند بھی کیا ہے، مگر یہی انسان کا کلام ہوتا تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عجب بلکہ ساری دنیا اس کا نکل لانے سے عاجز ہو جاتی۔

استرآن اور بغیر استرآن کے مقابل میں جان و مال، اولاد و کرب و سب کچھ قربان کرنے کے لئے قہر تیار ہو گئے، مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ استرآن کے چیلنج کو قبول کر کے دو سطریں اس کے مقابلہ میں پیش کر دیتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے مال و اموال کا دفاع کے باوجود صنعت مزاج تھے، جمہوریت کے اس دے جانتے تھے، جب انھوں نے قرآن کو سکر پر کھولنا کہ جب وہ حقیقت اس کلام کی مثل نہیں

لائے تو محض وہ سامانی اور کلمہ تھی کہ طور پر کوئی کلام نہیں کہنا پڑے لے مارا، کیونکہ وہ یہ بھی جانتے

تھے کہ ہم نے کوئی چیز پیش نہیں کر دی جو تم سے عجب کے قصداً، اِنما داس انسانی مقابلہ میں ہمیں نہیں کر دی گئی، اور خواہ خیر و خیراں ہوگی، اس نے پوری قوم نے سکوت چمکایا، اور جو زکوۃ مزاج تھے انھوں نے صاف طور پر دست بردار تسلیم بھی کیا جسکے کچھ وقائع پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

اسی سلسلہ کا ایک اور قصہ یہ کہ عجب کے سربراہ سعد بن زہراء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے سامنے اقرار کیا کہ:

میں نے خود کو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر کے، چھ لکھ تائے قوشہ اور اسقامات غلاب کے، میں یمن کے ساتھ تھا کہ ہوں کہ وہ بلا مشقہ اللہ کے رسول ہیں، جرم گزشتہ نے میرا اور کلام وہ کہنے پر جبراً کہہ کلام نہیں ہو سکتا:

(خصوصاً ص ۱۱۹ ج ۱)

قبیلہ بنی سلمہ کا ایک شخص مسطح بن قیس بن نبیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے قرآن سننا اور چند سوالات کئے میں کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تو یہ کسی وقت سلطان ہو گئے، اور چچا بنی قیس میں وہاں گئے، تو لوگوں سے کہا:

میں نے تو تم و تمہارے قصداً، اِنما کے کلام میں ہے، بہت سے کا بنوں کے کلمات تھے کا مجھ پر ہوا ہے، مجھ کے مقالات مستند ہوں، مگر وہی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مثل میں نے آج تک کہیں نہیں سنا، تم میری بات، اور اُن کا اتباع کرو، انھیں کی غریب،

تکلیف یہاں کی قوم کے ایک ہزار آدمی تھے کہ موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرتاب اسلام ہو گئے:

(خصوصاً ص ۱۱۹ ج ۱)

یہ اقرا و قبیلہ صرف ایسے ہی لوگوں سے منقول نہیں جو آپ کے معاملات سے یہ سادہ و غیر جانبدار تھے، بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہر طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں تھے وہ تھے جو قرآن کے متعلق ان کا بھی حال تھا، اگر اپنی خدا اور وحد کی وجہ سے اس کا انکار لوگوں پر نہ کرتے تھے۔

ملاوہ یہ ساری خصوصیات کہیں نہیں ہیں، جو ابوبہل بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل اور ابوسہیل اور غصن بن شریحہ رات کو اپنے اپنے گھروں سے اس لئے نکلے کہ چپکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنیں، ان میں ہر ایک علیحدہ علیحدہ ایک کی دوسرے کو خبر نہ تھی، اور علیحدہ علیحدہ دونوں میں چپکے قرآن سننے لگے، تو اس میں ایسے جو بھونے کہ ساری رات گذر گئی، جب صبح ہو گئی تو سب

وہیں ہوتے، اتفاقاً راستہ میں مل گئے، اور ہر ایک نے دوسرے کا قصد کیا، تو سب آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے، کوہ قمع نے بڑی حرکت کی، اور کسی نے یہ بھی کہا کہ اللہ کوئی ایسا ذکر ہے کیونکہ اگر وہ سب کے حوام کو اس کی خبر ہو جاتی تو وہ سب ملتان ہو جاتیں گے۔

یہ کہ سب کسب اپنے اپنے گھر چلے گئے، اگلی رات آنی تو چھان میں سے ہر ایک کے دل میں یہی نہیں تھی کہ ستر آن نہیں، اور پھر اس طرح چپ چاپ کچھ کر ہر ایک نے قرآن سنا، یہاں تک کہ رات گزرتی، اور صبح ہوئے یہی یہ وقت نہیں ہوتے، تو پھر آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے، اور اس کے خوف پر سبے اتفاق کیا، مگر تیسری رات آنی تو پھر قرآن کی قدرت و طاوت نے انھیں چپے اور سننے پر مجبور کر دیا، پھر پھر پھر پھر قرآن مسکرواٹھنے لگے، تو پھر راستہ میں اجتماع ہو گیا، تو اب سب نے کہا کہ آؤ آپس میں عبادہ کر لیں کہ اتنا ہم ہرگز ایسا ذکر نہیں گئے، چنانچہ اس عبادہ کی تعبیل کی گئی، اور سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، کچھ انفس میں شرفی نے اپنی کاخی اطمینان پر چپے اور تفتیان کے پاس پھر پھر پھر کہتا کہ اس کام کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے دے دے لفظوں میں ستر آن کی حقانیت اور حشرات کیا، تو حاضر نے کہا کہ بخدا میری بھی یہی رائے ہے، اس کے بعد وہ ابو جہل کے پاس پھر پھر پھر اور اس سے بھی یہی سوال کیا کہ تم نے عمرو کے کلام کو کیا پایا؟

ابو جہل نے کہا کہ اسات بات یہ ہے کہ ہوائے خاندان اور جو عید منات کے خاندان میں ہمیشہ سے جنگ چلی آتی ہے، قوم کی سیادت و قیادت میں وہ ہیں عاز پرانے پر رہنا چاہتے ہیں، ان کا مقابلہ کرتے ہیں، انھوں نے عمارت و خوشیش کے ذریعہ قوم پرانے پرانے کا مقابلہ کیا، تو ہم نے ان سے بڑھ کر یہ کام کر رکھا، انھوں نے تو گوئی کہ زور دار ہیں اپنے سرے میں تو ہم اس میدان میں بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں، یہاں تک کہ پھر راجب جانا ہے کہ ہم دونوں خاندان برابر حیثیت کے مالک ہیں۔

ان حالات میں ان کے خاندان سے یہ زور دار اٹھ کر ہوائے میں ایک نئی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے، اب ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ کر کیے کریں اس نے ہم نے طے کر لیا ہے کہ ہم زور دار و طاقت سے ان کا مقابلہ کریں گے، اور ہرگز ان پر ایمان نہ لائیں گے، وخصائص ص ۱۱۵ ج ۱، یہ کہ ستر آن کا وہ کھلا ہوا شہرہ ہیں کا دشمنوں کو بھی اعزاز کرنا پڑتا ہے، یہ تمام واقعات علامہ حبشہ لادین سیوطی نے مختصراً نہیں کہہ کر ہی نقل کئے ہیں۔

تیسری وجہ: اجماع ستر آنی کی ہے کہ اس میں فیہب کی اور اتنا ہر پیش آنے والے واقعات کی ہرست کی خبر یہی ہیں جو ستر آن نے دی، اور پھر ہر اس طرح واقعات

پیش آنے میں طرح قرآن نے خبر دی تھی، مثلاً قرآن نے خبر دی کہ دو مہینوں کے بعد قرآن میں ایک نیا نیا غالب آئیں گے، اور وہی مغلوب ہوں گے، لیکن ساتھ ہی یہ خبر دی کہ دو سال گذرنے کے بعد میں گے کہ پھر وہی اہل کائنات اس پر غالب آجائیں گے، کہ کہ ستر آوں نے قرآن کی اس خبر حضرت صدیق اکبرؓ سے روایت کی مثلاً کہ اہل کائنات اس پر غالب آجائیں گے، وہی غالب آئے، تو سب کا اپنی پار ماتا بڑی اور ہارنے والے پھر حال دینے کی شہادت تھی، وہ حال ان کو دینا چاہا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال کو قبول نہیں کیا، بلکہ یہ کہ وہ ایک قسم کا جڑا تھا، اس طرح اور بہت سے واقعات اور خبریں ہیں جو ہم غیبیہ کے متعلق ستر آن میں یہ بھی اور ان کی سچائی بالکل روز روشن کی طرح واضح ہو گئی۔

چوتھی وجہ: اجماع ستر آنی کی ہے کہ اس میں پہلی آیتوں اور ان کی شرائط اور تاریخی حالات کا ایسا اسات تذکرہ ہے کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے علماء یہود و نصاریٰ جو پہلی کتابوں کے ماہر تھے جانتے تھے ان کو بھی اتنی معلومات نہ تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھیں کہ یہ تمہارے عالم کی سمیت اٹھائیں، دیکھیں کہ یہ کتاب کا ہاتھ لگایا، پھر ابتدا و نہایت آپ کے زمانہ تک تمام اقوام عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور صحیح سوانح اور ان کی شہرتیں کی تفصیلات کا بیان ظاہر ہے کہ پھر اس کے نہیں ہو سکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو اور اللہ تعالیٰ ہی آپ کو یہ خبر دی ہو۔

پانچویں وجہ: اور پھر ان کے اقرا سے ثابت ہو گیا کہ وہ بات صحیح اور سچی تھی، یہ کام میں مالک انساب و اہل تاریخ یہ کہ ستر آئے، کسی ایشیہ سے ماوراء النہر نہیں، مثلاً اور شاعر قرآنی ہے:

إِذْ هَمَّتْ طَلْفُ قَدْشِي وَتَشْكُرُ | تَبْعًا مَرَّةً دَوَّاهَاتِي لَمْ يَلَمْ
قَدْ تَشْكُرُ (۱۳۱۳)

اور یہ ارشاد کر۔

يَقُولُونَ فِي الْغَيْبِ مَا لَمْ يَلَمُوهَا | وَهِيَ كَذِبٌ كَرِيمٌ
اللَّهُ يَشْهَدُ عَلَى قُلُوبِهِمْ (۱۵۹)

یہ سب جاہل ایسی ہیں جن کو انھوں نے کسی سے ظاہر نہیں کیا، قرآن کریم نے ہی ان کا انکشاف کیا۔
چھٹی وجہ: اجماع ستر آنی کی وہ آیات ہیں جن میں قرآن نے کسی قوم یا فرد کے متعلق یہ پیش گوئی کی کہ وہ فتنہ کام ذکر کریں گے، اور پھر وہ لوگ باوجود ظاہری قدرت کے اس کام کو ذکر کریں گے، جیسے ہر دور کے متعلق ستر آن نے اعلان کیا کہ اگر وہ ان اوقات اپنے آپ کو اللہ کے

دوست اور دل جیتنے ہیں تو انھیں اللہ کے پاس جانے سے محبت ہونا چاہئے، وہ نور امت کی حقانیت کر کے دکھائیں اور پھر ارشاد فرمایا:

وَلَنْ يَسْتَوْفُوا أَجْرَهُمْ

موت کی فتنہ کار ناکسی کے لئے مشکل رہتا ہے۔ خدا انھیں مٹائی لوگوں کے لئے جو قرآن کو جھٹلاتے تھے، مشرآن کے ارشاد کی وجہ سے ان کو کتنا موت میں خوف و ہراس کی کوئی وجہ نہ تھی، یہودی کے لئے تو مسلمانوں کو شکست دینے کا یہ موقع بڑا اہمیت تھا کہ قرآن کتنا موت کا پرہیز و خطر میں مسلمان کرتے۔

مگر یہودیوں یا مشرکین زبان سے کتنا ہی مشرآن کو جھٹلا لیں ان کے دل جاننے تھے کہ قرآن کا ہے اس کی کوئی بات نکل نہیں برحق مگر موت کی فتنہ کار اس وقت کریں گے تو فوراً مر جائیں گے اس لئے قرآن کے اس نیکو ہونے پہلے کے باوجود کسی یہودی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک مرتبہ زبان سے کتنا سے موت کا اظہار کر دے۔

اور خاص کیفیت جو جو مشرآن کے سینے سے ہر خاص و عام اور مؤمن و کافر پر سا تو یہی وجہ نکلتی ہوئی ہے، یہی حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف سے پہلے پیش آیا کہ ایمانی انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز مغرب میں سورۃ طور پڑھتے ہوئے سنا، جب آپ آخری آیات پڑھتے ہوئے پوچھ کر پتہ لگ گیا کہ یہودیوں کا اور یہ سب سے پہلا دن تھا کہ وہ دل میں اسلام لے آکر کیا، آیات یہ ہیں:

أَمْ نَحْيِيكَ مِنَ الْأَرْضِ الَّتِي كُنْتَ أَهْلَها

أَلَمْ نَخْلُقْكَ وَأَنْتَ تَكْفُرُ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَاللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

اے ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے اور سننے سے کوئی کتنا نہیں، بلکہ جتنا زیادہ پڑھا جائے اچھوٹیں وجہ ہے اس کا شوق اور پڑھتا ہے، دنیا کی کوئی بڑے بڑے بہتر اور عظیم کتاب کے لیے اس کو جو دار تہ پر چھا جائے تو انسان کی طبیعت کتنا جاتی ہے، پھر پڑھنے کو ہی چاہتا ہو نہ سنے کی صورت قرآن کا خاصہ، جو کہ جتنا اس کو زیادہ پڑھتا ہے اتنا ہی اس کو شوق و درجہ بڑھتا جاتا ہے، یہ بھی قرآن کے کلام الہی ہونے ہی کا اثر ہے۔

نویں وجہ اے ہے کہ مشرآن نے اعلان کیا کہ اس کی حفاظت کا خود مرد اللہ تعالیٰ نے لیا ہو،

و قیامت تک ہر کسی کو اپنی تفسیر و ترمیم کے باقی رہو گا، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو اس طرح پورا فرمایا کہ جب قرآن نازل ہوا ہے آج چودہ سو برس کے قریب ہوئے کو آئے ہیں ہر قرن ہر زمانے میں انھوں انسان اپنے رہے ہیں اور دہریہ گئے ہیں کے سینوں میں پورا مشرآن اس طرح محفوظ رہا کہ ایک نیریز برکی نعلی کا امکان نہیں، ہر زمانے میں مرد و عورت، بچے، بوڑھے اس کے حافظ طبعی بڑے سے بڑا عالم اگر کہیں ایک نیریز برکی نعلی کر جائے تو ذرا آواز سے بچے وہیں نعلی پڑ جائے، دنیا کا کوئی مذہب اپنی مذہبی کتاب کے متعلق اس کی شال و تکیا اس کا دوسرا حصہ بھی پیش نہیں کر سکتا بہت سے مذاہب کی کتابوں میں قرآن ہے پتہ چلا نا بھی نیکل ہو گیا ہے کہ اس کی اصل زبان میں آتی تھی اور اس کے کتنے اجزاء تھے۔

کتاب کی صورت میں بھی ہر قرن ہر زمانے میں اپنی اشاعت قرآن کی ہوئی شاید دنیا کی کسی کتاب کو یہ بات نصیب نہیں، حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کی تلواریں دنیا پر نسبت مگرین اور کافروں کے بہت کر رہی، اور ذرا لے لے کر اشاعت میں جتنے مسلمانوں کو مل رہے ہیں مسلمانوں کو اس کا کوئی معتبر حصہ نصیب نہ تھا، مگر ان باتوں کے باوجود کسی قوم کسی مذہب کی کوئی کتاب دنیا میں اپنی شائع نہیں ہوئی جتنا قرآن شائع ہوا۔

پھر قرآن کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے صورت کتابوں اور صوفیوں پر موقوف نہیں رکھا جن کے بل جانے اور سوچ جانے کا امکان ہو، بلکہ اپنے ہندوں کے سینوں میں بھی محفوظ کر دیا، اگر آج ساری دنیا کے مشرآن (معاذ اللہ) نابود کر دیے جائیں تو اللہ کی یہ کتاب پھر بھی اس طرح محفوظ رہے گی، چند ماہ نظر لیں کہ پتہ چلے گا کہ دنیا میں پھر ساری کی ساری کتبیں جاسکتی ہے، یہ بے لکھ حفاظت بھی صرف قرآن کی کا خاصہ اور اس کے کلام الہی ہونے کا نایاب ثبوت ہے، کہ جس طرح اللہ کی کتاب ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اس کی مخلوق کا تصرف نہیں بل کہ اس کی اس کا کلام بھی ہمیشہ تمام مخلوقات کی دستبرد اور تصرفات سے آزاد ہو کر ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا، قرآن کی یہ پیش گوئی چودہ سو برس تک شاہدہ میں آچکی ہے، اور تا قیامت انشاء اللہ تعالیٰ آتی رہے گی، اس کے لئے جو کچھ کے بعد مشرآن کے کلام الہی ہونے میں کیا کسی کو شک و شبہ کی گنجائش رہ سکتی ہے۔

دسویں وجہ اور علم و معارف میں جن کا احاطہ نہ آج تک کسی کتاب کے لیے ہے نہ آئندہ امکان ہو کہ اس کے مختصر علم اور دعوہ و کلمات میں اتنے علم و فنون جمع کئے جاسکیں جو تمام کائنات کی دائمی ضروریات کو مددگار اور انسان کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حال سے متعلق ہر وقت اور ہر بہترین نظام پیش کرے، شخص جو حقیقی زندگی کے لئے کریمانی اور شہری زندگی تک اور کچھ غرائیات و باطنیات اور سیاسیات و ممالک کے ہر پہلو پر مددگار نظام پیش کرے۔

بحر صحت فخری اور علی طور پر نظام پیش کرنا ہی نہیں علی طور اس کا رواج یا نا اور تمام نظام دنیا پر غالب کر قوموں کے رواج، اختلاف، احوال، معاشرت اور تمدن میں وہ انقلاب علیہم پیدا کر جس کی نظیر دوسرے دنیاوی میں مل سکتی ہے۔ فرقوں یا مذہبوں میں حیرت انگیز انقلاب کیسی حالت کی قدرت اور اس کی محنت علی تاثیر ہو سکتا ہے؟ فخر صاحب کو وہ انسان بھی اُسی اور اس کی قوم بھی اتنی پرست

خداست سرا پر دہانے قرآنی

چہ در بزرگ دول می برند پستیانی

ہیں وہ تحیر انقول تاثیرات ہیں کہ جن کی وجہ سے قرآن کو کلام الہی ماننے پر ہر وہ شخص مجبور ہو جس کی عقل و بصیرت کو تعصب و عناد نے بالکل ہی پر باد و گردیا ہو۔

یہاں تک کہ اس دور مادہ پرستی کے سبھی مصنفین جنہوں نے یہ کلمہ شتران میں خود فکر سے کام لیا اس اقرار پر مجبور ہو گئے کہ یہ ایک بے مثل و بی نظیر کتاب ہے۔

فرائض کا پیشرو مستشرق و مکتومہ راس میں کہ مکتومہ فرائض کی وزارت معارف نے شتران تکیم کی با سطور قرآن کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کر کے پرا مو کر کیا تھا اس نے اعزازات کیا کر جس کا اور وترجمہ ہے۔

”یہ فکرت قرآن کا طرز زبان خان جنق و علم کا طرز بیان ہے، بلاشبہ بین خالق و مملکت پر یہ کلام مادی ہے، وہ ایک کلام الہی ہی ہو سکتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں شک و شبہ کرنے والے بھی جب اس کی تاثیر فکرم کو سمجھتے ہیں تو تسلیم و اعزازات پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن اگر وہ مسلمان یا چلنے زمین کے حصہ پر پہلے ہوں تو ان میں شتران کی خاص تاثیر کو دیکھ کر بھی متحیر نہیں ہو کر مانتے والے بلا باج اس کا اعزازات کرنے کیوں ایک واقعہ میں ایسا نہیں کیا یا شکر کا حق مسلمان نے تسلیم اور قرآن کو سمجھا وہ بھی مزہ دیا یا قرآن کا مکتومہ کیا ہو؟

مسلمانوں میں تاثیر قرآنی کا یہ اعزاز اس سبب مستشرق سے ایک ایسے ذوق میں ہو رہا ہے جبکہ خود مسلمان اسلام اور قرآن سے بیگانہ داس کی تعلیمات سے دور داس کی تلاوت سے غافل ہو چکے ہیں، کاش! یہ مصنف اسلام اور قرآن کے اس دور کو دیکھتا جب کہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں شتران کا عمل فساد انگیزی باؤں پر قرآن کی بات تھیں۔

اس طرح دوسرے بھی مصنفین نے بھی جو صنعت مزاج ہیں اس قسم کے اعزازات کو نہیں مسترد و تمسخر سنے اپنی کتاب حیات نمونہ میں واضح طور پر اس کا اعزاز کیا ہے، اور ڈاکٹر شکیل شکیل نے اس پر ایک بے مثل مقالہ لکھا ہے۔

قرآن کے کلام الہی اور مجرور نبوی ہونے پر دیکھ دو، آپ مجھ میں آخر میں ایک اہل نظر اس پر ڈالنے کو محض صلی علیہ وسلم پر انشائی قلم ہو کر دنیا میں شریفانے لائے ہیں، عربی و عجمی کی تعبیر میں قدم نہیں رکھتے، قلم اور کتاب کو با د نہیں لگاتے، اپنا نام بھی خود نہیں لکھتے، داس میں جوں ہوتے ہیں، آپ کی طبیعت و طوالت پسند ہو، کیوں کیوں کیوں، جہلوں، ہنگاموں میں جانے کے بھی عادی نہیں، فخر صاحب دیکھتے ہیں، کسی قوم کو یہ سماع میں کسی کوئی تخیل دینے یا تقریر کرنے کا بھی عزم و ارادہ نہیں ہوتا، چالیس سال ہونے کے بعد جب کہ اور عزم میں پہنچ جاتے ہیں، اور مادہ کوئی علم کے سیکھے سکھانے کا وقت ختم ہو جاتا ہے اس وقت آپ کی زبان مبارک پر ایک ایسا بحر العقول کا جامع خالق خاصہ و بخت میں، اپنا نام لکھ دیتا ہے، جو جس بڑے سے بڑے عالم، امیر اور فصیح و بلیغ سے بھی ممکن نہیں جس کے ذریعہ آپ عرب کے بڑے بڑے فصحاء و بلغاء کو خطاب فرماتے ہیں، ان کے جلسوں میں پہنچ کر بیٹھ دیتے ہیں، اپنا دہری دنیا کے لئے عواما عک کے لئے فخر صاحب چیلنے مانتے ہیں کہ کوئی اس کے کلام الہی کو نہیں شہ کرے داس کے کسی چہرے سے حصہ کمال و شکر دھلائے، اس پر دوسری قوم مثال پیش کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔

پوری قوم جو آپ کو چیلنے آئیں کے لقب بھاری اور منظم کرتی تھی آپ کی مخالفت ہو جاتی ہو اس کلام کی تبلیغ سے باز رکھنے کے لئے دولت، حکومت اور ہر انسانی خواہش کی چیز کیا پہنچ کر آپ ان میں سے کسی جیسے کر قبول نہیں کرتے، پوری قوم آپ کو اور آپ کے رفقاء کو ستانے، مسلم کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپ سے سب کچھ برداشت کرتے ہیں، مگر اس کلام کی تبلیغ نہیں چھڑنے قوم آپ کے قتل کی سازشیں کرتی ہے، بائیس چھ ہزار آدمی پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپ کا پناہ دہن چھوڑ کر مدینہ جا چڑھا ہے، آپ کی قوم آپ کو ہلاک نہیں سکون سے نہیں بیٹھے دیتی۔

سارا عرب اور اہل کتاب آپ کی مخالفت پر تہمت ہو جاتے ہیں، اُنے دن مدینہ پر حملے ہو جاتے ہیں آپ کے مخالفین یہ سب کچھ کرتے ہیں، مگر قرآن کے چیلنے کو قبول کیے ایک چھوٹی سی سورت قرآن کی مثل بنا کر پیش نہیں کرتے، قرآن کی کو فیرت رکھتے ہیں، اس پر بھی ان کی جگہ حیرت میں حرکت نہیں کرتی صرف یہی نہیں کہ پر راعوب قرآن کی مثال پیش کرنے سے عاجز رہا، بلکہ خود وہ ذات اقدس میں پر یہ قرآن نازل ہوا، وہ بھی اس کی مثال اپنی طرقت سے پیش نہیں کر سکتے، ان کا سارا کلام یعنی حدیث جس طرح کا ہے قرآن کا کلام یعنی اناس سے ممتاز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہو،

قَالَ اَلَمْ يَجْعَلْ لَّنَا سِرًّا مَّجْنُونًا
لَقَدْ اَتَيْنَاكَ بِكُفْرٍ اِنْ تَكُنْ مِنْ اُولٰٓئِكَ
اَوْ نَبِيٍّ لَّكُم مَعْنٰى سَيَكْفُرُوْنَ بِكَ

تو لوگ آخرت میں ہمارے ملنے لگنے کے نکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس میں کیا ایک اور قرآن کا ہونا چاہیے اس کا بدل دینے تو

چند شباحت اور جوابات

ایضاً لوگوں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ یہ کتاب جو قرآن کے مقابلے میں کتابیں اور احادیث کے لئے مقررہ مصلحتاً ضرور ہے۔

لیکن اگر زراعی مصلحت سے کام لیا جائے تو اس احتمال کی کوئی غائی نہیں رہتی کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ جب سے قرآن نازل ہوا، پوری دنیا میں قرآن کے سامنے والے کہ اور دیگر بڑے بڑے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہو کر ذرائع نشر و اشاعت جیسے مکتبیں قرآن کو حاصل رہے ہیں قرآن کے سامنے والوں کو اکثر قرون میں اس کا کوئی قابل ذکر حصہ حاصل نہیں رہا، قرآن اتنا بلند پایہ علمی اپنے مخالفین کے سامنے کرتا ہے، اُن کو جیتلج دیتا ہے، بغیر اس کے، اور مخالفین اسلام اس کے مقابلے میں جان مال اور دار و مالک کو سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، اگر انھوں نے قرآن کا پہلے قبول کر کے کوئی چیز مقابلہ کرنے کی ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ وہ ساری دنیا میں شائع نہ ہوئی، اور ہر زمانہ میں مسکین قرآن مسلمانوں کے مقابلے میں اس کو پیش نہ کر کے اور اسی طرح کی طرف سے اس پر جرح و قدح میں کسی کیوں کر کتابیں نہ لکھیں گی۔

اسلام کے قرآن ازل میں صرف ایک واقعہ سیکڑ کتاب علی کا پیش آیا کہ اس نے کچھ چند بے حیائی کے لئے سیدے کلمات کہہ کر کہا تھا کہ وہی آسانی قرآن کی مثل ہے، مگر دنیا جانتی ہے کہ اگر ان کلمات کا کیا اثر ہوا، خود اس کی قوم نے اس کے منہ پر مار دیئے، وہ کلمات ایسے شرمناک غیر مذہب تھے کہ کسی مذہب سوسائٹی میں ان کو بیان نہیں کیا جاسکتا، اور یہ حال جیسے بھی ہو وہ آج تک کتابوں میں نقل ہوئے چلے آئے ہیں، اگر کسی اور شخص نے کوئی اچھا کام قرآن کے مقابلے میں پیش کیا ہوتا، تو کوئی زبردستی کوئی تلافی کوئی تحسین کر دیتا، اور مکتبیں قرآن اس کو برتریت پر مبنی کر کے ان کو پیش نہ کرتے۔

دو لوگ جو قرآن کے مقابلے پر ہر وقت مہینہ سپر تھے قرآن کے سامنے کچھ جواب دینا ہی طبع علی کی باتیں ہیں جن کو قرآن میں نقل کر کے جواب دیا گیا، مگر اس کا ایک واقعہ یہی کہ قرآن کا مقابلہ پیش کر کے اس کے قرآن کا مثل ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو، ایک دوسری غلط حد یہی کہ قرآن کا کام کرتا تھا اور دیگر قرات و تفسیل پڑھا ہوا تھا، جس کی کسی شخصیت علی افتد علیہ وسلم سے متعلقہ مصلحتوں کے کچھ جابلوں نے تعصب و عناد سے پیش کر دیا کہ حضرت علی افتد علیہ وسلم پر قرآن میں منافقین اس نے عیسائے میں قرآن کے اُن کا یہ اعتراض نقل کر کے خود جواب دیا کہ جس شخص کی طرف سے بکھارنے کی نسبت کرتے ہیں وہ خود گویا ہے، وہی زبان کی بلاغت کو کیا کہا جائے، اور یہ قرآن علی کی انتہائی بیحد کتاب جو سورۃ فتح کی آیت نمبر ۲-۳ دیکھئے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوْا لَیْسَ بِکُمْ عِلْمٌ بِرُوحِیِّیۡمَ اِلٰہِیۡمَ

آنحضرت ﷺ اِلٰہِیۡمَ عَزَّوَجَلَّ

مکتبہ ۵ (۱۶۱-۱۶۲)

آپ کو قرآن ایک کتاب کی سکھایا، جو عالمگیر ہے، آدمی کی طرف نسبت کرتے ہیں، اس سے اس قرآن ایک طبع علی تھا، یہاں ہے۔

کچھ لوگوں نے قرآن کی قدسی کے جواب میں یہ کہا کہ،

وَلَقَدْ کَلَّمْنَا نُوْحًاۙ وَّیٰسٰۤیٰۤاۙ وَاٰدَمَؑ ۝۱۵۱

لیکن قرآن ان سے بڑھے کچھ اور بھی کہیں نہیں، قرآن کے مقابلے کے لئے سارا بڑی چیزیں نکال دی گئی ہیں، جان و مال کی قربانی دے کر انھیں اس کا مثل کلام کہنے یا کہنے کی قدرت تھی قرآن کی اس شہسادی کے بعد ہم نے اس کی مثل کلام بنا کر فرج کا پہلا سرسبز بنایا!

خلاصہ یہ کہ قرآن کے اس دعویٰ کے بعد مخالفین نے کوشش کرنا نہ سکتے۔ نہیں کیا بلکہ جو کچھ ان کے منہ پر آتا اس کے مقابلے کیلئے ہے، لیکن یہ کچھ بھی نہ لے سکا کہ ہم میں سے طلاق آدمی نے قرآن میں خالص کلام لکھا ہے، اس نے قرآن کا یہ دعویٰ کیا تھا کہ دعا و دعا اللہ غلط ہے۔

ایضاً مخالفین کو یہ بھی کہ حضرت علی افتد علیہ وسلم جو قبل از نبوت چند روز کے لئے کلمتیں قرآن میں لکھے، اور اور اس میں تفسیر، راہب کے ملاقات، وہی وہ قرات کا نام تھا، اس سے آگے علم ہی، مگر کوئی ان سے بڑھے کچھ اور ان کی ایک ملاقات میں اس سے بڑھے علم و معارف فصاحت و بلاغت کا اعجاز انسانی تفسیر، نظام خانگی، نظام مکتب کیسے بکھلے۔

آجکل کے بعض محرمین نے کہا کہ قرآن کی مثل نہ بنایا جا سکتا کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ خدا کا کلام یا سمجھو، یہ ہو سکتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا پہلا کلام قرآن کی شریف نظم نامی لکھے کہ دوسرا آدمی اس کی نظیر نہ لکھیں۔

سعدی شریانی کی کلمتیں، فتنی کی تفسیر، فقہ کا عام طور پر بے مثل دینے نظر کرتا ہیں کہا جا رہا ہے تو کیا وہ بھی مجوز ہیں؟

لیکن اگر زراعی مصلحت سے کام لیا جائے کہ قرآن میں معلوم ہو گا کہ سعدی اور فتنی کے پاس سامان تعلیم تالیف کس قدر دیر ہو چکا تھا، کتنے عرصہ تک انھوں نے تعلیم حاصل کی، برسوں دروسوں میں پڑھے، رسے، راتوں جاگے، قرون میں نہیں کہیں، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ادب طے کئے، سامان اس کی عقلوں اور داغ سوزیوں کے نتیجہ میں اگر بالفرض فتنی یا سعدی کی کوئی اور عربی زبان میں اور سعدی فارسی میں اور ملحق انگریزی میں یا ہر زبان میں یا کمالی اس میں سبکدستی میں ایسے ہو کر ہیں کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے ناقص ہو گیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

معموزہ کی تعریف تو یہ ہو کہ وہ اسباب متعارفہ کے توسط سے بنی ہوئے ہیں، اس لئے کہ ان

لوگوں کی باقاعدہ تحصیل علوم، استادوں کے ساتھ طویل ملازمت و صحبت، وسیع مطالعہ، مدقوں کی مشاقی ان کی علمی مہارت کے کھلے ہوئے اسباب نہیں ہیں؟ اگر ان کے کلام دوسروں سے ممتاز ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہو؟ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس نے کبھی کتاب قلم کو ہاتھ نہ لگایا ہو کسی مدرسہ و مکتب میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کرے کہ ہزاروں سعدی اور لاکھوں فیضی اس پر مستر بان ہو جانے کو اپنا سرمایہ فخر سمجھیں، اور ان کو جو کچھ علم و حکمت حاصل ہو کر اس کو بھی آپ ہی کے فیض تعلیم کا اثر مستر اردی، اس کے علاوہ سعدی اور فیضی کے کلام کا مثل پیش کرنے کی کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور اپنے کلام کے بمثل دے کر نظیر ہونے کو اپنا معجزہ کہا تھا، اور دنیا کو اس کا چیلنج دیا تھا کہ ہمارے کلام کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جس کے نتیجہ میں لوگ اس کا مقابلہ کرنے اور مثال پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

پھر قرآن کی صرف فصاحت و بلاغت اور نظم و ترتیب ہی بے مثال نہیں لوگوں کے دل و دماغ پر اس کی تاثیرات عجیبہ اس سے زیادہ بے مثال اور حیرت انگیز ہیں جن کی وجہ سے قوموں کے مزاج بدل گئے، انسانی اخلاق میں ایک کایا پلٹ ہو گئی، عرب کے تند خو، گنوار، حلم و احتلاق اور علم و حکمت کے استاد مانے گئے، ان حیرت انگیز انعتلابی تاثیرات کا اقرار صرف مسلمان نہیں موجودہ زمانے کے سینکڑوں غیر مسلموں نے بھی کیا ہے، یورپ کے مستشرقین کے مقالات اس بارے میں جمع کئے جائیں تو ایک مستقل کتاب ہو جائے، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام شہادۃ الاقوام علی صدق الاسلام تحریر فرمائی ہے اس جگہ چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مستاد دل بان نے اپنی کتاب تذکرہ عرب میں صفائی سے اس حیرت انگیزی کا اعتراف کیا، ان کے الفاظ کا ترجمہ اردو میں یہ ہے:

”اس پیغمبر اسلام اس نبی اُمّی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگزشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم کو اپنا راجہ اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہ آئی تھی رام کیا، اور اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا، اور اس وقت بھی وہی نبی اُمّی اپنی قسب کے اندر سے لاکھوں ہندوگان خدا کو کلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔“

مستر ڈول جس نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے لکھتا ہے کہ:

”جتنا بھی ہم اس کتاب (یعنی قرآن) کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اُسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی نامرغوبی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے، لیکن فوراً ہمیں محض کریمتی ہے، متوجہ بنادیتی ہے اور آخر میں ہم سے تعظیم کر کر چھوڑتی ہے، اس کا طرز بیان باعتبار اس کے مضامین و اغراض کے،

عقیدت مالی شان اور تہذیب و تہذیب اور جاہ اس کے مضامین سخن کی غایت رفعت تک پہنچ جاتے ہیں۔

غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا زور اثر دکھاتی ہے گی۔“ (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

مصر کے مشہور مصنف احمد فحی بک زاغلول نے ۱۸۹۵ء میں مسٹر کونٹ ہنری کی کتاب الاسلام کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا، اصل کتاب فریچ زبان میں تھی، اس میں مسٹر کونٹ نے قرآن کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:

”عقل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیونکر ادا ہو جو بالکل اُمّی تھا، تمام مشرق نے استرا کر لیا ہے کہ نوع انسانی لفظاً و معنی ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہی کلام ہے جس کی بلند انشاء پر رازسی نے عربین خطاب کو مطمئن کر دیا، اُن کو خدا کا معترف بننا پڑا، یہ وہی کلام ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے چلے جعفر بن ابی طالب نے حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں پڑے تو اس کی آنکھوں سے میا خستہ آنسو جاری ہو گئے، اور ہشپ چلا اٹھا کہ یہ کلام اُسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا۔“ (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۶، ص ۵۹۹ میں ہے:

”قرآن کے مختلف حصوں کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں، بہت سی آیات دینی و اخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں، مظاہر قدرت، تاریخ، الہامات انبیاء کے ذریعہ اس میں خدا کی عظمت، ہر بانی اور صداقت کی یاد دلاتی گئی ہے، بالخصوص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطے خدا کو واحد اور قادر مطلق ظاہر کیا گیا ہے، بت پرستی اور مخلوق پرستی کو بالکل لحاظ نہ جاننا مستر اردو یا گیا ہے، قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔“

انگلستان کے نامور مورخ ڈاکٹر گبن اپنی مشہور تصنیف رسلطنت روم کا اخطاطہ و زوال، کی جلد ۱ باب میں لکھتے ہیں:

”قرآن کی نسبت بحر اطلانتک سے لے کر دریاے گنگا تک نے ان لیاہے کہ یہ پارلیمنٹ کی روح ہے، قانون اساسی ہے، اور صرف اصول مذہب ہی کے لئے نہیں بلکہ احکام تعزیریات کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے جن پر نظام کامدار ہر جن سے نوع انسان کی زندگی وابستہ ہو، جن کو حیات انسانی کی ترتیب تسبیق سے گہرا تعلق ہو، حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر مادی ہے، یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سامعے جہان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔“

اس جگہ مستشرقین یورپ کے اقوال و اعتراضات کا استیسااب کرنا نہیں کہ اس کی گنجائش نہیں، نونہ کے طور پر چند اقوال نقل کئے گئے ہیں سے واضح ہوتا ہے کہ قبائیر فضا سے بلوغت کے اور با قبائیر افواض و مقاصد کے اور با قبائر علوم و معارف کے قرآن کے لیے نظریہ بے مشل ہونے کا اقرار صرف مسلمانوں نے نہیں پر زمانہ کے مختلف مزاج فخریوں نے بھی کیا ہے۔

قرآن نے ساری دنیا کو اپنی مثال مانے کا بیج ڈیا تھا اور کوئی نہ دلا سکا آج بھی ہر مسلمان دنیا کے ماہرین علم و سیاست کو چیلنج کر کے کہہ سکتا ہے کہ وہی دنیا کی لالچ میں ایک واقعہ ایسا دکھلا کر ایک بڑے سے بڑا ماہر عظیم فیلسوف دکھا دے اور ساری دنیا کے عقائد و نظریات اور رسوم و عادات کے خلاف ایک نیا نظام پیش کرے اور اس کی قوم میں اپنی جابل غنوار ہو۔ یہ وہ اتنے قلیل حوص میں اس کی تعلیم کو بھی عام کرنے اور اعلیٰ تفسیر کو بھی اس حد پر پہنچانے کے اس کی نظیر آج کے معنیوں و حکم نظاموں میں ملنا ناممکن ہے۔

دنیا کی پہلی لالچ میں اگر اس کی کوئی نظیر نہیں تو آج تو بڑی روشنی، روشن خیالی، بڑی تیز رفتاری کا زمانہ ہے، آج کوئی کر کے دکھا دے، اگر کوئی نہ کر سکے تو اپنی قوم کو جگہ دنیا کی ساری اقوام کو فتح کر کے اس کی مثال پیدا کر دے۔

فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوا آيَاتُنَا فَأَعْلُوا آيَاتِ الْإِنِّ وَفَعَلْنَا الْإِنَّمَا وَاجْتَبَيْنَا
أَعْلَىٰ تِلْكَ صَفِيٍّ بَيْنَ ۝

”اگر تم اس کی مثال نہ دے سکو تو ہمارے ہی آیت کو آگے ڈھکیا جائے گا یہی ہماری اور ہماری ہر سکرور کے لئے تیار کی گئی ہے“

وَبَقِيَ الْإِنِّ مِنَ الْأَمْنِ وَأَعْمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّ لَهُمْ جَنَّتْ خَيْرِي
اور جو خیر خیر سے آج کوئی کو جو ایمان سے اور اچھے کاموں کے کوئی کے واسطے بنا رہی ہے
مِنْ تَعْمَلُهَا الْإِنَّمَا وَاجْتَبَيْنَا خَيْرِي تَعْمَلُهَا خَيْرِي
جتنی بھی ان کے بچے خیر کا جب بنے گا ان کو دیاں کو کوئی پس کمال کو تو کہیں گے یہ
هَلْ الْإِنِّ دُرِّ قَاتِلٍ مِنْ قَبْلُ ۝ وَأَتَوَاتِيهِ مُسْتَأْجِرًا ۝ وَلَهُمْ فِيهَا
تو دیکھ یہ جو ملاح تھا یہ کہ اس سے پہلے اور دیکھ جائے گا کہ ان کو کبھی ایک صورت کے اور ان کیلئے دیاں

آتُوا وَاجْتَبَيْنَا خَيْرِي ۝	۝
عزیز ہوں گی ایک اور وہی ہمیشہ رہیں گے۔	

خلاصہ تفسیر

اور جو خیر خیر سے آج کوئی کو جو ایمان سے اور اچھے کاموں کے کوئی کے واسطے بنا رہی ہے
مِنْ تَعْمَلُهَا الْإِنَّمَا وَاجْتَبَيْنَا خَيْرِي تَعْمَلُهَا خَيْرِي
جتنی بھی ان کے بچے خیر کا جب بنے گا ان کو دیاں کو کوئی پس کمال کو تو کہیں گے یہ
هَلْ الْإِنِّ دُرِّ قَاتِلٍ مِنْ قَبْلُ ۝ وَأَتَوَاتِيهِ مُسْتَأْجِرًا ۝ وَلَهُمْ فِيهَا
تو دیکھ یہ جو ملاح تھا یہ کہ اس سے پہلے اور دیکھ جائے گا کہ ان کو کبھی ایک صورت کے اور ان کیلئے دیاں

رابطہ آیات

ان سے پہلی آیت میں قرآن کو حکم کرتے والوں کے مطالب کا بیان تھا، اس آیت میں ماننے والوں کے لئے بشارت اور خوشخبری منکر و کفر میں جنت کے عجیب فریب پھولوں کا اور جو ان جنت کا ذکر ہے۔

معارف و مسائل

اہل جنت کو ثنات پھیل ایک ہی شکل و صورت میں پیش کرنے سے مقصد بھی ایک فرق اور لطافت کا سامان بنانا ہوگا اور بعض مغتربین نے فرمایا کہ پھولوں کے مشابہ ہونے سے مراد یہ کہ کہ جنت کے پھول صورت شکل میں دنیا کے پھولوں کی طرح ہوں گے، جب اہل جنت کو ایسے تو کہیں گے کہ یہ تو وہی پھول ہیں جو دنیا میں ہیں مگر ان کے رنگ و بو اور لذت میں دنیا کے پھولوں سے ان کو کوئی نسبت نہ ہوگی، صرف نام کا اشتراک ہوگا۔

جنت میں ان کو کوئی پاک معارف پھیلنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام ظاہری اور حسی لذت مندگیوں سے پاک ہوں گی، بڑی درواز، میض، دلفاس اور ہر ایسی چیز سے پاک ہوں گی جن سے انسان کو نفرت ہوتی ہے، ایسی طرح ک خلقی، بیروانی سنوئی جو سب سے بھی پاک ہوں گی۔

آخر میں فرمایا کہ ہر جنت کی نعمتوں کو دنیا کی آئی فانی نعمتوں کی طرح نہ سمجھیں گے فنا ہو جانے یا سلب ہو جانے کا ہر وقت خلو لگا رہتا ہے، بلکہ یہ وقت ان نعمتوں میں ہمیشہ بہار عیش و خرم رہیں گے۔

یہی مومنین کو جنت کی بشارت دینے کے لئے ایمان کے ساتھ عمل صالح کی بھی قیادت لگا کر

اس کے بعد اس کی ایک اور حکمت بھی بتلا دی کہ ایسی مثالوں سے لوگوں کا ایک امتحان بھی ہوتا ہے، نظر و فکر کرنے والوں کے لئے یہ مثالیں ہدایت کا سامان پیدا کرتی ہیں، اور بے پروائی برتنے والوں کے لئے اور زیادہ گمراہی کا سبب بنتی ہیں، اس کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ قرآن کریم کی ان مثالوں سے صرف ایسے سرکش لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں اور جن تعلقات و روابط کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے یہ لوگ ان کو توڑتے ہیں، جس کا نتیجہ زمین میں فساد پھیلانا ہوتا ہے۔

بَعُوضَةً فَمَا كُوْنُهَا اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ بچھڑا ہوا یا اس سے بھی زیادہ اس جگہ زیادہ سے مراد یہ ہو کہ حقارت میں زیادہ ہو۔ (منظری)

يُفْضِلُ بَعْضُهُمْ أَوْ تَهْدِيْهِمْ بَعْضُهُمْ اِلَى بَعْضٍ اور اس کی مثالوں کے ذریعہ بہت سی مخلوق کو ہدایت کرنا تو ظاہر ہے، مگر اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہو کہ جس طرح یہ قرآن اس کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے اسی طرح اس کا انکار کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے لئے ذریعہ گمراہی بھی ہے۔

وَمَا يُفْضِلُ بَعْضُهُمْ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ - فاسقین فسق کے لفظی معنی خسروچ اور باہر نکل جانے کے ہیں، اصطلاح شرع میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے کو فسق کہتے ہیں، اور اطاعتِ الہیہ سے نکل جانا کفر و انکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، اور علیٰ ناسرمانی کے ذریعہ بھی، اس لئے لفظ فاسق کا فرق کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآن کریم میں بیشتر لفظ فاسقین کا شرعوں ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، اور مومن گناہگار کو بھی فاسق کہا جاتا ہے، فقہاء کی اصطلاح میں عموماً لفظ فاسق اسی معنی میں استعمال ہوا ہے کہ فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی قسم قرار دیا گیا ہے، جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے، یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے، اس کی عادت بنائے وہ فقہاء کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے، (منظری) اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ علانیہ جرات کے ساتھ کرتا پھرے اس کو ناجر کہا جاتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کی ان مثالوں سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے، اور بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آتی ہے، مگر ان مثالوں سے گمراہی صرف انہی لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو فاسق یعنی اطاعتِ خداوندی سے نکل جانے والے ہیں، اور جن میں کچھ بھی خدا تعالیٰ کا خوف ہوتا ہو وہ تو ہدایت ہی حاصل کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهٖ - عہد اس صورت، حاملہ اور معاہدے کو کہا جاتا ہے جو دو شخصوں کے درمیان طے ہو جائے، اور ميثاق ایسے معاہدے کو کہتے ہیں

جو قسم کے ساتھ مضبوط و مستحکم کیا جائے۔

اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی مزید تشریح ہے اور منکرینِ قرآن کے انجام کا ذکر ہے کہ قرآن کی ان مثالوں سے جن پر مشرکین نے اعتراض کیا ہے صرف وہی لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو حق تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے سرکش کرتے ہیں، جس کی دو وجہ ہیں:

اول یہ کہ ایسا کرنے والے اُس اذلی معاہدے کو توڑ ڈالتے ہیں جو تمام انسانوں نے اپنے رب سے باندھا تھا، جبکہ تمام انسانوں کی اس عالم میں پیدائش سے پہلے حق تعالیٰ نے تمام پیدا ہونے والے انسانوں کی ارواح کو جمع کر کے ایک سوال فرمایا تھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ یعنی کیا میں تمہارا رب اور پروردگار نہیں ہوں؟ اُس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا بلیٰ تین آپ رب کیوں نہ ہوتے جو جس میں بڑی تاکید کے ساتھ اس کا استراہ ہے کہ اللہ جل شانہ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہو کہ ہم اس کی اطاعت سے سربموجہ و تراز نہ کریں، اس لئے یہ عہد اذلی انسان اور اللہ جل شانہ کے درمیان ہو چکا، اب دنیا میں پیدا ہونے کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں اسی عہد کی تجدید اور یاد دہانی اور اس پر عمل کی تفصیلات بتلانے کے لئے آئے ہیں، جس نے اس معاہدے ہی کو توڑ ڈالا، اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی سفیمبر یا آسمانی کتاب سے فائدہ اٹھائے؟

دوسری وجہ یہ کہ ان لوگوں نے ان تمام تعلقات کو قطع کر ڈالا ہے جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان تعلقات میں وہ تعلق بھی داخل ہو جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے، اور وہ تعلق بھی جو انسان کا اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں سے ہے، اور وہ تعلق بھی جو ایک انسان کا اپنے پڑوسی اور دوسرے شرمکار کار کے ساتھ ہے، اور وہ تعلق بھی جو عام مسلمانوں یا عام انسانوں کے ساتھ ہے، ان تمام تعلقات کے پورے حقوق ادا کرنے ہی کا نام اسلام، یا شریعتِ اسلام ہے، اور انہی میں کوتاہی کرنے سے ساری زمین میں فساد اٹکتا ہے، اسی لئے اس جملے کے بعد فرمایا وَ يُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ، یعنی یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں، آخر آیت میں ان کے انجام بد کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں۔

مثال میں کسی حقیر و ذلیل یا شرمناک | اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْسِنُ سے ثابت ہوا کہ کسی مفید مضمون کی توضیح چیز کا ذکر کرنا کوئی عیب نہیں ہے | میں کسی حقیر و ذلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا نہ کوئی عیب گناہ ہو، اور نہ قائل کی عظمتِ شان کے منافی ہے، قرآن و سنت اور علماء ملت کے اقوال میں بکثرت ایسی مثالیں بھی مذکور ہیں جو عفو شرمناک سمجھی جاتی ہیں، مگر قرآن و سنت نے اس عربی شرم و حیا کی پرواہ کئے بغیر اصل مقصد پر نظر رکھ کر ان مثالوں سے اجتناب گوارا نہیں کیا۔

يُخَلِّصُونَ قُلُوبَهُمْ وَلَكِنْ سَاءَ مَا يَكْسِبُونَ عَلَيْهِمْ مِنَ الذُّلِّ وَالْخِلَافِ وَرَبِّ شَرِّ مَكْرَهٍ
 جس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمام نیکیوں سے محروم ہو جائے۔

تعلقات کے متعلق شرطیں اور احکامات
 اَوْ يَخْلُطُوْنَ مِمَّا آمَنُوا بِاللهِ بِمَا لَمْ يَكُنْ يَكُنْ لَكُمْ فَرْجٌ لَّيْسَ بِاللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ
 تعلقات کو قائم رکھنے کا شرط یہ ہے کہ اسلام نے حکم دیا ہے ان کا
 نام نہ رکھا ضروری اور طبع کرنا حرام ہے، غور کیا جائے تو دین و مذہب نام ہی ان محدود و محدود کا کار
 جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی اور ان کی کسے کے لئے مقرر کی گئی ہیں، اور اس نام کا اصلاح و فساد انہیں
 تعلقات کو درست رکھنا یا توڑنے پر موقوف ہے، اس لئے ان تعلقات کی اصلاح کے لئے طبع کرنے کو
 يَخْلُصُونَ قُلُوبَهُمْ فِي الْاَشْيَاءِ وَالْمَعَالِي وَالْمَعَالِي وَالْمَعَالِي وَالْمَعَالِي وَالْمَعَالِي وَالْمَعَالِي
 اَوْ يَخْلُطُوْنَ مِمَّا آمَنُوا بِاللهِ بِمَا لَمْ يَكُنْ يَكُنْ لَكُمْ فَرْجٌ لَّيْسَ بِاللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ
 اس کام کی غلط درزی کرے، اس میں اشارہ ہے کہ اصل خیار اور نقصان آخرت ہی کا ہے، دنیا
 کا خیار کوئی قابلِ توجہ چیز نہیں۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَانًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ
 بہر حال کافر ہوتے ہو خدا سے نفرت سے حالاً کون ہے جائے ہی پھر جیو یا تم کو پھر مار دیا تم کو

ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ رُجُوعُونَ ﴿٥٠﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي
 پھر جلاتے گا تم کو پھر اس کی طرف لوٹاؤ گے جاؤ گے، دینی برس نے پیدا کیا تم کو واسطے جو

الْاَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ
 پھر زمین پر ہے سب پھر قسم کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا ان کو سات آسمان

وَهُوَ يَخْلُقُ شَيْءًا عَلِيمٌ ﴿٥١﴾
 اور خدا تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے۔

خُلاصۂ تفسیر

مجاہدین کو کراہتیں کرتے ہو اللہ کے ساتھ ذکر اس کے احسانات کو بھلا دیتے ہیں، اور
 غیروں کا کلمہ پڑھتے ہو اس کا کلام اس پر دلائل واضح قائم ہیں کہ ممرت ایک اللہ ہی متوجہ عبادت کو

مَشْفُوعٌ كَيْفَ تَكْفُرُونَ قُلْ هِيَ جَانِزَةٌ لِّمَن يَشَاءُ لِمَن شَاءَ لِمَن شَاءَ لِمَن شَاءَ لِمَن شَاءَ لِمَن شَاءَ لِمَن شَاءَ لِمَن شَاءَ
 دین کے پھر زندہ کر دیں گے (یعنی قیامت کے دن) پھر اس کے پاس لے جائے گا جو گئے (یعنی میدان
 قیامت میں حساب کتاب کے لئے حاضر کئے جاؤ گے) وہ ذات پاک الہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو
 فانیہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا حساب اے فانیہ عاقل ہے کھانے پینے کا بڑا پیہنہ اور
 بہتے کا بڑا صفا اور روح کو ناز کی پہلے کا، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے
 انسان کو فانیہ پر پہنچاؤں، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کا ہر سمت مال حلال ہو جیسے مہنت
 فانیہ میں فانیہ انسان سے غالی نہیں، مگر ان کا محالینا عقلا کے نزدیک ممنوع ہے (پھر توجہ دلائی
 آسمان کی طرف، یعنی اس کی تخلیق و تخیل کی طرف) تو درست کر کے بنا دیے ان کو سات آسمان اور
 وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں ۵

معارف مسائل

ربط آیات | پچھلے آیتوں میں خدا تعالیٰ کے وجود و توحید اور رسالت کے
 دلائل واضح اور مستحکم و محققین کے خیالات باطلہ کا رد

مذکورہ قصہ، مذکورہ روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اعانت کا ذکر کر کے اس پر اطمینان
 نجب کیا گیا ہے کہ اتنے احسانات کے ہوتے ہوئے کیسے یہ ظالم کفر و انکار میں مبتلا ہیں جس میں
 اس پر تنبیہ ہو کہ اگر داخل میں غور کرنے کی کوشش گوارا نہیں کرتے تو کم از کم کفر و انکار میں
 کی تعلیم و اطاعت کرنا تو ہر بشر میں انسان کا طبی اور فطری تقاضا ہے، اس واسطے سے تم اللہ
 کی اطاعت پڑھاؤ۔

پہلی آیت میں ان خصوصیتوں کا ذکر ہے جو ہر انسان کی ذات اور نفس کے اندر موجود ہیں
 کہ پہلے وہ بے جان ذرات کی صورت میں تھا، پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے زندگی پیدا فرمائی،
 دوسری آیت میں ان عام فطرتوں کا ذکر ہے جن سے انسان اور تمام مخلوقات فانیہ و فانیہ
 ہیں، اور وہ انسان کی زندگی اور بقا کے لئے ضروری ہیں، ان میں پہلے زمین اور اس کی پیداوار کا
 ذکر کیا گیا، جس سے انسان کا جسم بنی معلق ہے، پھر آسمانوں کا ذکر کیا گیا جن کے ساتھ زمین کی
 حیات اور پیداوار وابستہ ہے۔

ثُمَّ يَخْلُصُونَ قُلُوبَهُمْ بِاللّٰهِ وَيَكْفُرُونَ بِهِمْ لِمَن كَانُوا يَكْفُرُونَ لِمَن كَانُوا يَكْفُرُونَ لِمَن كَانُوا يَكْفُرُونَ
 کا انکار نہیں کیا، مگر رسول خدا کے انکار کو خدا ہی کا انکار قرار دے کر ایسا خطاب
 کیا، ۵۔

عارف اللہ ہیں، عطا کرنے سے آپ اس کے تحت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو
 تھامے واسطے اس نے پیدا فرمایا کہ ساری کائنات تمہاری ہوا درم اثم کے ہے، ہوا اس کا معقلہ
 کا کام ہے کہ جو چیز اس کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ تو اس کو ملے گی، اس کی فکر میں لگ کر اس ذات
 سے غافل نہ ہو جس کے لئے یہ پیدا ہوا ہے، (مکرم حبیب)

انشاء، عالم میں اصل اس آیت سے بعض علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں میں
 بابت یہ حاکمیت اصل یہ ہو کہ وہ انسان کے لئے حلال و حرام ہیں، کیونکہ وہ اس کے لئے پیدا
 کی گئی ہیں، جو ان چیزوں کے جن کو شریعت نے حرام قرار دیا، اس لئے جب تک کسی چیز کی حرمت
 قرآن و سنت سے ثابت نہ ہو اس کو حلال کہا جائے گا۔

اس کے انقال بعض علماء نے یہ قرار دیا کہ انسان کے فائدے کے لئے کسی چیز کے پیدا کرنے
 سے اس کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوگا، اس لئے اصل اس میں حاکمیت ہے، جب تک قرآن و سنت
 کی کسی دلیل سے جواز ثابت نہ ہو جو حرام سمجھی جائے گی۔

بعض حضرات نے توقف فرمایا۔

تفسیر مجرمین میں ابن حنفی نے فرمایا کہ صحیح یہ ہو کہ اس آیت میں اقوال مذکورہ میں سے کسی کے
 لئے حجت نہیں، کیونکہ حقائق تکلف میں حرف قلم سمیت بتلانے کے لئے آیا ہو کہ تھامے سب سے
 یہ چیز پیدا کی گئی ہیں، اس سے نہ انسان کے لئے ان چیزوں کے حلال ہونے پر کوئی دلیل قائم
 ہو سکتی ہے نہ حرام ہونے پر، بلکہ حلال و حرام کے احکام وہاں کا نہ قرآن و سنت میں بیان ہوئے ہیں
 انصاف کا اتباع لازم ہے۔

اس آیت میں زمین کی پیدائش پہلے اور آسمانوں کی پیدائش بعد میں ہونا لفظ قلم بیان
 کیا گیا ہے، اور کسی صحیح ہے، اور سورہ وائزات میں جو یہ ارشاد ہے وَالْأَرْضُ مَحْبُورَةٌ لَظْف
 وَخَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ
 پیدائش آسمانوں کے بعد ہوئی ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہو کہ زمین کی روشنی اور اس میں سے پیداوار
 نکالنے وغیرہ کے تفصیل کا کام آسمانوں کی پیدائش کے بعد ہوئے، اگرچہ اصل زمین کی تخلیق آسمانوں
 سے پہلے ہو چکی تھی (مکرم حبیب وغیرہ)

اس آیت سے آسمانوں کی تعداد و سائت بہ نام ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مہمل
 بیت و والوں کا آسمانوں کی تعداد کو بتلانا غلط ہے، دلیل اور ضمن خیالات پر مبنی ہے۔

وَأَرْأَيْتُمْ إِنْ جَاءَ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةٌ قَالُوا لَا
 اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں نے اپنے نائب، کہا، فرشتوں نے

أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ
 کہاں کا تم کہ ہے تو زمین میں اس کو نہ کرے اس میں اور وہی ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے

يُحْمِلِكُمْ وَتَقْدِرُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۚ وَ

اور اذکر کہ میں تیری ایک ذات کو، خدا یا اپنے شک مجھ کو معلوم ہو کہ میں نہیں جانتے، اور

عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَكَلَّةِ فَقَالَ

سبکو دینے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے پھر اس نے کہا آپ سب چیزوں کو فرشتوں کے، پھر فرمایا

أَنْتُمْ كُونُوا بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۚ فَاتَّوَلَّوْا

بتاؤ مجھ کو نام ان کے اگر تم سچے ہو، اور

سُبْحَنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۚ

ایک ہے تو ہم کو معلوم نہیں مگر شائقہ مجھ کو سکھایا، جبکہ تو پہلے ہی بتا دیا تھی حکمت والا،

قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ

فرمایا اے آدم بتانے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام پھر جب بتا دینے ان کے نام

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ

فرمایا اے آدم کیا تھا میں نے تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں جو ہوتی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور میں جانتا ہوں

مَائِدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۚ

جو تم غافل کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

خُلاصۂ تفسیر

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے (کہا کہ) میں نے اپنے نائب کو کہ میں نے
 میں حکمت و معلومت تھی مشورہ کی حاجت سے تو حق تعالیٰ بالاور قرین، غرض اللہ تعالیٰ نے
 فرشتوں سے فرمایا کہ سرحد میں بتاؤ ان چیزوں میں ایک نائب زمین وہ میرا نائب ہوگا کہ
 اپنے احکام شرعیہ کے اجراء و دفاع کی خدمت اس کے سپرد کروں گا، کہنے لگے کیا آپ پیدا

کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اس میں اور خوں ریزیاں کریں گے اور ہم برابر تبیح کرتے رہتے ہیں بھلا اللہ اور آپ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں فرشتوں کی یہ گزارش نہ بطور اعتراض اور نہ اپنا استحقاق جتانے کے لئے، بلکہ فرشتوں کو کسی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جو نئی مخلوق زمین سے بنائی جائے گی ان میں نیک و بد ہر طرح کے لوگ ہونگے بعض لوگ اس نیابت کے کام کو اور زیادہ خراب کریں گے، اس لئے نیاز مندانہ عرض کیا کہ ہم سب کے سب ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور گرد و ملائکہ میں کوئی گناہ کرنے والا بھی نہیں، اس لئے کوئی نیا عمل بڑھانے اور نئی مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیلئے ہے، خصوصاً جبکہ اس نئی مخلوق میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ آپ کی مرضی کے خلاف کام کریں گے جس سے آپ ناخوش ہوں ہم ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں اور ہماری خدمت آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگی (حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے (یعنی جو چیز تمہاری نظر میں تخلیق بنی آدم سے مانع ہے کہ ان میں بعض فساد بھی پھیلائیں گے وہی چیز درحقیقت ان کی تخلیق کا اصلی سبب ہے، کیونکہ اجراء احکام و انتظام تو جہی وقوع میں آسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے تجاوز کرنے والا بھی ہو، یہ مقصود تم فرمانبرداروں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہو سکتا، اور اعتدال سے تجاوز کر جانے والی ایک مخلوق جنات پہلے سے موجود تھی، اس سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے موزوں وہ مخلوق ہو سکتی ہے جن میں شر و فساد کا عنصر موجود ہو مگر غالب نہ ہو، جنات میں یہ عنصر غالب تھا، اس لئے تخلیق آدم کی تجویز فرمائی، آجی اسی حکمت الہیہ کی مزید توضیح اس طرح کی گئی کہ نیابت خداوندی کے لئے ایک خاص علم کی ضرورت ہے، وہ علم ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے، اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو (ان کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا (یعنی سب چیزوں کے نام اور ان کے خواص و آثار سب کا علم آدم کو دیدیا گیا) پھر وہ چیزیں فرشتوں کے رد برد کر دیں پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر تم پہنچے ہو (یعنی اپنے اس قول میں پہنچے ہو کہ ہم خلافت ارضی کا کام اچھا انجام دے سکیں گے) فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں اس الزام سے کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرمادیا ہم سے پوشیدہ رکھا کیونکہ کسی آیت یا روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کو علم اسماء کی تعلیم فرشتوں سے الگ کر کے دی گئی، اس سے ظاہر یہ ہے کہ تعلیم تو سب کے سامنے یکساں دی گئی مگر آدم علیہ السلام کی فطرت میں اس علم کے حاصل کر لینے کی صلاحیت تھی انھوں نے حاصل کر لیا، فرشتوں کی طبیعت اس کی متحمل نہ تھی ان کو یہ علم حاصل نہ ہوا، مگر ہم کو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم فرمایا

بیشک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں ذکر جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا اسی قدر علم و فہم اس کو عطا فرمایا، اس سے فرشتوں کا یہ اعتراض تو ثابت ہو گیا کہ وہ اس کام سے عاجز ہیں جو نائب کے سپرد کرنا ہے، آگے حق تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علم خاص کی مناسبت کو فرشتوں کے سامنے آشکارا فرمادیں، اس لئے (حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم تم بتلاؤ ان کو ان چیزوں کے اسماء (یعنی مع حالات و خواص کے جب آدم علیہ السلام نے یہ سب فرشتوں کے رد برد بتلا دیا تو فرشتے اتنا سمجھ گئے کہ آدم علیہ السلام اس علم کے ماہر ہو گئے ہیں) سو جب بتلا دیے ان کو آدم علیہ السلام نے ان چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے نہ کہتا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کر دیتے ہو اور جس کو دل میں رکھتے ہو۔

معارف مسائل

رابط آیات | پچھلے آیات میں اللہ جل شانہ کی خاص و عام نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کو ناشکری اور ناشرمائی سے بچنے کی ہدایت کی گئی،

اس آیت سے آخر کو تک دس آیتوں میں آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اسی سلسلہ میں ذکر فرمایا ہے، کیونکہ نعمت و وقیم کی ہوتی ہے، ایک صوری بن محسوس، جیسے کھانا، پینا، روپیہ، مکان جائیداد دوسری معنوی، جیسے عزت و آبرو، مسرت، علم، پچھلے آیات میں صوری اور ظاہری نعمتوں کا ذکر تھا، اور ان گیارہ آیتوں میں معنوی نعمتوں کا ذکر ہے، کہ ہم نے تمہارے آپ آدم علیہ السلام کو دولت علم دی، اور سجدہ ملائکہ بنانے کی عزت دی، اور تم کو ان کی اولاد میں ہونے کا فخر عطا کیا۔ خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے جب تخلیق آدم اور دنیا میں اس کی خلافت قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو فرشتوں سے بظاہر ان کا امتحان لینے کے لئے اس ارادے کا ذکر فرمایا، جس میں اشارہ یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، فرشتوں نے رائے یہ پیش کی کہ انسانوں میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد اور خوں ریزی کریں گے، ان کو زمین کی خلافت اور انتظام سپرد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس کام کے لئے تو فرشتے زیادہ انسب معلوم ہوتے ہیں، کہ

نیکی ان کی فطرت ہے، بُرائی کا صدور ہی اُن سے ممکن نہیں، وہ مکمل اطاعت گزار ہیں، دنیا کا مظلماً بھی وہ درست کر سکیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے غلط ہونے کا اظہار اول ایک حاکمانہ طرز سے دیا کہ خلافت ارضی کی حقیقت اور اس کی ضروریات سے ہم واقف نہیں، اس کو میں ہی مکمل طور پر جانتا ہوں۔

پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقام علم میں آدم کے حقوق کا ذکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافت ارض کے لئے زمینی مخلوقات کے نام اور ان کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متعل نہیں۔

یہاں یہ بات غور طلب ہو کہ حضرت حق جل و علا شانہ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا اُن سے مشورہ لینا مقصود تھا؟ یا محض ان کو اطلاع دینا پیش نظر تھا؟ یا فرشتوں کی زبان سے اُن کی رائے کا اظہار کرنا اس کا منشاء تھا؟

سو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں، اور اپنے علم و بصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دوسرے عقلاً و اہل دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے، یا ایسی صورت میں جہاں حقوق دوسروں کے بھی مساوی ہوں، تو اُن کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے، جیسے دنیا کی عام کونسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں صورتیں نہیں ہو سکتیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ خالق کائنات ہیں، ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں اور ظاہر و باطن ہر چیز اُن کے علم و بصیرت کے سامنے برابر ہے، اُن کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں!

اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہو، جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں، اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے خالق اور مالک ہیں، فرشتے ہوں یا جن و انس سب اُن کی مخلوق و مملوک ہیں، کسی کو حق نہیں کہ اُن کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کر سکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا، لَایَسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یَسْئَلُونَ (۳۳: ۳۴) (اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کے متعلق سوال نہیں کیا جاسکتا اور سب سے ان کے اعمال کا سوال کیا جائے گا)

بات یہی ہے کہ درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں اور نہ اُس کی ضرورت، مگر صورت مشورہ کی بنائی گئی، جس میں مخلوق کو سنت مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہو سکتا ہے، جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کی ہدایت مشرآن میں فرمائی گئی، حالانکہ آپ تو صاحبِ وحی ہیں، تمام معاملات اور اُن کے تمام پہلو آپ کو بذریعہ وحی بتلائے جاسکتے تھے،

مگر آپ کے ذریعہ مشورہ کی سنت جاری کرنے اور امت کو سکھانے کے لئے آپ کو بھی مشورے کی تائید فرمائی گئی۔

غرض فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کے اظہار سے ایک فائدہ تو تعلیم مشورہ کا حاصل ہوا رکافی روح البیان، دوسرا فائدہ خود الفاظِ مشرآنی کے اشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل و اعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کریں گے۔

اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ خلقت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ اِن یَخْلُقُ اللہُ خَلْقًا اَکْوَمَ عَلَیْہَا مِثْلَ ذَٰلِکَ اَعْلَمُ رَبِّی اللہُ تعالیٰ کوئی مخلوق ہم سے افضل اور اعلم پیدا نہ فرما دیں گے، حضرت حق جل شانہ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام مخلوقات سے زیادہ افضل و اعلم ہوگی، اور جس کو اپنی خلافت و نیابت کا خلعت عطا کیا جائے گا۔

اس لئے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے نائب بنانے کا ذکر کیا گیا کہ وہ اپنے خیال کا اظہار کریں۔

چنانچہ فرشتوں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق نیازمندی کے ساتھ رائے کا اظہار کیا کہ جس مخلوق کو آپ خلیفہ زمین بنائے ہیں، اس میں تو شر و فساد کا مادہ بھی ہے، وہ دوسروں کی اصلاح اور زمین میں امن و امان کا انتظام کیسے کر سکتا ہے، جبکہ وہ خود خوئی ریزی کا بھی مرتکب ہوگا، اس کے بجائے آپ کے فرشتوں میں شر و فساد کا کوئی مادہ نہیں، وہ خطاؤں سے معصوم ہیں، اور ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس اور عبارت و اطاعت میں لگے ہوتے ہیں، وہ بظاہر اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

غرض اس سے معاذ اللہ حضرت حق جل شانہ کے فعل پر اعتراض نہیں، کیونکہ فرشتے ایسے خیالات و حالات سے معصوم ہیں، بلکہ مقصد محض دریافت کرنا تھا، کہ ایک ایسی معصوم جماعت کے موجود ہوتے ہوئے دوسری غیر معصوم مخلوق پیدا کر کے یہ کام اُس کے حوالے کرنا اور اس کو ترجیح دینا کس حکمت پر مبنی ہے!

چنانچہ اس کے جواب میں پہلے تو حق تعالیٰ نے اجمالی طور پر یہ فرمایا کہ: اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، یعنی تم خلافتِ الہیہ کی حقیقت اور اس کے لوازم سے واقف نہیں، اس لئے یہ سمجھ رہے ہو کہ ایک معصوم مخلوق ہی اس کو انجام دے سکتی ہے، اس کی پوری حقیقت کو ہم ہی جانتے ہیں۔

اس کے بعد فرشتوں کو اس کا کچھ تفصیل علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائنات عالم کے نام اور ان کے خواص و آثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی، فرشتوں کی فطرت و جبلت اس کے مناسب نہ تھی، وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھائے اور بتلائے گئے تھے، مثلاً دنیا کی نافع و مضر چیزیں اور ان کے خواص و آثار، ہر جان دار اور ہر قوم کے مزاج و طبائع اور ان کے آثار، ان چیزوں کے معلوم کرنے کے لئے طبیعت ملکی متعل نہیں، فرشتہ کیا جائے کہ بھوک کھا ہوتی ہے، پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے، نفسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے، کسی چیز سے نشہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، سانپ اور بھوکا زہر کس بدن پر کیا اثر کرتا ہے۔

غرض زمینی مخلوقات کے نام اور خواص و آثار کی دریافت فرشتوں کے مزاج اور مخصوص طبیعت سے بالکل علیحدہ چیز تھی، یہ علم صرف آدم ہی کو سکھایا جاسکتا تھا، انہیں کو سکھایا گیا، پھر قرآن کی کسی تصریح یا اشارہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم کسی تہنائی میں فرشتوں سے علیحدہ دی گئی، اس لئے ہو سکتا ہے کہ تعلیم سب کے لئے عام ہی ہو، مگر اس تعلیم سے فائدہ اٹھانا آدم علیہ السلام کی طبیعت میں تھا وہ سیکھ گئے، فرشتوں کی فطرت میں تھا وہ نہ سیکھ سکے، اسی لئے یہاں تعلیم کو آدم کی طرف منسوب کیا گیا، اگرچہ یہ تعلیم فی نفسہ عام تھی، آدم اور ملائکہ دونوں کو شامل تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظاہری تعلیم کی صورت ہی عمل میں نہ آئی ہو، بلکہ آدم علیہ السلام کی فطرت میں ان چیزوں کا علم ابتداء سے آفرینش سے ودیعت کر دیا گیا ہو، جیسے بچہ ابتداء ولادت میں ماں کا دودھ پینا جانتا ہے، بلح کا بچہ قیرنا جانتا ہو، اس میں کسی ظاہری تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہو، وہ فرشتوں کا مزاج اور طبیعت بدل کر ان کو بھی یہ چیزیں سکھا سکتے تھے، تو ان کو کیوں نہ سکھایا گیا؟ مگر اس کا ماحول تو یہ ہوا کہ فرشتوں کو ہی انسان کیوں نہ بنادیا، کیونکہ اگر فرشتوں کی جبلت و فطرت کو بدلا جاتا تو پھر وہ فرشتے نہ رہتے، بلکہ انسان ہی ہو جاتے۔

خلاصہ یہ کہ زمینی مخلوقات کے اسماء اور ان کے خواص و آثار کا آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا، جو فرشتوں کے بس کا نہیں تھا، اور پھر ان مخلوقات کو فرشتوں کے سامنے کر کے سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں پتے ہو کہ ہم سے زیادہ کوئی مخلوق اعلم و افضل پیدا نہیں ہوگی، یا یہ کہ زمین کی خلافت و نیابت کے لئے فرشتے بہ نسبت انسان زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ جن پر خلیفہ زمین کو حکومت کرنا ہے۔

یہاں سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ مالک کے لئے ضروری ہو کہ اپنی محکوم رعایا کے مزاج و طبائع سے اور ان کے خواص و آثار سے پرآواقت ہو، اس کے بغیر وہ ان پر عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی نہیں کر سکتا، جو شخص یہ نہیں جانتا کہ بھوک سے کیسی اور کتنی تکلیف ہوتی ہے، اگر اس کی عدالت میں کوئی دعویٰ کرے کہ بھوکا رکھنے کے متعلق پیش ہو تو وہ اس کا فیصلہ کیا اور کس طرح کرے گا؟ غرض اسی واقعہ سے حق تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتلادیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم ہو کر دیکھنا نہیں، بلکہ اس کو دیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پرآواقت ہو، ان کے استعمال کے طریقوں اور ان کے اثرات کو جانتا ہو، اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہو کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ۔

فرشتوں کا اظہار رائے چونکہ کسی اعتراض یا فخر و غرور یا اپنا استحقاق جتلانے کے لئے نہیں، بلکہ محض اپنے خیال کا اظہار ایک نیاز مند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا، اس لئے قرآن بول اٹھے: سَبَّحْتَ لَا إِلَهَ إِلَّا مَا عَلَّمْنَا لَا إِلَهَ إِلَّا مَا عَلَّمْنَا أَتَىٰ تَعْلِيمُهُ الْحَكِيمُ ۵ (پاک ہیں آپ، ہم کو علم نہیں، مگر وہی جو آپ نے عطا فرمایا، بے شک آپ بڑے علم و حکمت والے ہیں) جس کا حاصل اپنے خیال سے رجوع اور اس کا اصرار تھا کہ زیادہ اعلم و افضل مخلوق بھی موجود ہے، اور یہ کہ زمین کی نیابت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

دوسرا سوال اس جگہ یہ ہو کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خوں ریزی کرے گا، کیا انہیں علم غیب تھا؟ یا محض اہل اور تخمینہ سے انہوں نے یہ سمجھا تھا؟ اس کا جواب جمہور محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو انسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات بتلا دیئے تھے، جیسا کہ بعض آثار میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو خلیفہ زمین بنانے کا ذکر فرمایا، تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی سے اس خلیفہ کا حال دریافت کیا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی نے ان کو بتلایا (روح المعانی) اس سے فرشتوں کو تعجب ہوا کہ جب انسان کا یہ حال ہے کہ وہ فساد و خوں ریزی بھی کرے گا تو اس کو نیابت زمین کے لئے منتخب فرمانا کس حکمت پر مبنی ہے۔

اسی کا ایک جواب تو حضرت حق جل شانہ کی طرف سے آدم علیہ السلام کے علیٰ تفوق کا اظہار فرما کر دیا گیا، اور فساد و خوں ریزی سے جو شبہ اس کے استحقاق نیابت پر کیا گیا تھا، اس کا جواب اپنی إِنِّي أَنَا عَلَّمَ مَائِلًا تَعْلَمُونَ میں اجمالاً دیدیا گیا، جس میں اشارہ ہے کہ جس چیز کو تم نیابت و خلافت کے منافی سمجھو ہے ہو درحقیقت وہ ہی اس کی اہلیت کا بڑا سبب ہے، کیونکہ نیابت زمین کی ضرورت ہی رفع فساد کے لئے ہے، جہاں فساد نہ ہو وہاں خلیفہ اور نائب

بھیجے کی ضرورت ہی نہیں، غرض یہ بتلادیا گیا کہ منشاء الہی یہ ہو کہ جس طرح اس نے ایک ایسی مقدس معصوم مخلوق فرشتے پیدا کر دیئے جس سے کسی گناہ خطا کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، اور جس طرح اس نے شیاطین پیدا کر دیئے جن میں نیکی اور بھلائی کی صلاحیت نہیں، اسی طرح ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا منشاء حسد اور ہمدی ہے، جس میں خیر و شر نیکی اور بدی کا مخلوط مجموعہ ہو، اور جس میں خیر و شر کے دونوں جذبات ہوں، اور جو جذبات شر کو مغلوب کر کے خیر کے میدان میں آگے بڑھے، اور رضائے خداوندی کا خلعت حاصل کرے۔

واضح لغت خود حق تعالیٰ ہیں اس قصہ آدم علیہ السلام اور تعلیم اسماء کے واقعہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زبان اور لغت کے اصل واضح خود حق سبحانہ و تعالیٰ ہیں، پھر اس میں مخلوق کے استعمالات سے مختلف صورتیں اور مختلف زبانیں پیدا ہو گئیں، امام اشعریؒ نے اسی آیت سے استدلال کر کے اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کو واضح لغت قرار دیا ہے۔

آدم علیہ السلام کا تفوق فرشتوں پر اس واقعہ میں تشرآن حکیم کے یہ بلخ الفاظ بھی قابل نظر ہیں کہ جب فرشتوں کو خطاب کر کے منبرمایا کہ ان چیزوں کے نام بتلاؤ لفظ **أَمْسِكُوا** ارشاد منبرمایا کہ مجھے بتلاؤ، اور جب آدم علیہ السلام کو اسی چیز کا خطاب ہوا تو لفظ **أَمْسِكْهُمْ** فرمایا گیا، یعنی آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرشتوں کو یہ اسماء بتلائیں۔

اس طرز بیان کے فرق سے واضح ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کو معلم کا درجہ دیا گیا، اور فرشتوں کو طالب علم کا، جس میں آدم علیہ السلام کی فضیلت و تفوق کا ایک اہم صورت سے اظہار کیا گیا، اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علوم میں بھی کمی اور زیادتی ہو سکتی ہے کیونکہ جس چیز کا ان کو علم نہیں تھا، آدم علیہ السلام کے ذریعہ ان کو بھی ان چیزوں کا اجمال طور پر کسی نہ کسی درجہ میں علم دیدیا گیا۔

خلافت ارض کا مسئلہ زمین کا انتظام اور اس میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے اس کی طرف سے کس نائب کا معتبر رہونا، جو ان آیات سے معلوم ہوا، اس سے دستور مملکت کا اہم باب نکل آیا، کہ اقتدار اعلیٰ تمام کائنات اور پوری زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا ہو، جیسا کہ تشرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں: **إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ** (۵۴: ۲۶) اور **لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** (۱۰: ۳) اور **أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ** (۵۴: ۴) وغیرہ زمین کے انتظام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نائب آتے ہیں، جو باذن حسد اور ہمدی زمین پر سیاست و حکومت اور بندگان خدا تعالیٰ کی تعلیم و تربیت کا کام کرتے اور احکام الہیہ کو نافذ کرتے ہیں، اس خلیفہ و نائب کا تفسر بلا واسطہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کسی کے کسب عمل کا کوئی دخل

نہیں، اسی لئے پوری امت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ نبوت کسی حسینہ نہیں، جس کو کوئی اپنی سی دعل سے حاصل کر سکے، بلکہ حق تعالیٰ ہی خود اپنے علم و حکمت کے تقاضے سے خاص خاص افراد کو اس کام کیلئے چن لیتے ہیں، جن کو اپنا نبی و رسول یا خلیفہ و نائب قرار دیتے ہیں، تشرآن حکیم نے جگہ جگہ اس کا اظہار منبرمایا ہے، ارشاد ہے:

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ
رُسُلًا وَيُنَازِلُ النَّاسَ إِنَّ اللَّهَ يَبْصُرُ
أَعْيُنُهُمْ (۵۵: ۲۲)

اللہ تعالیٰ انتخاب کر لیتا ہر فرشتوں میں
سے اپنے رسول کو اور انسانوں میں سے جسکے
اللہ تعالیٰ سینے والا دیکھنے والا ہے۔

نیز ارشاد ہے:

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ
رِسَالَتَهُ (۱۲۳: ۶)

اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ اپنی رستا
کس کو عطا فرما دیں۔

یہ خلیفہ اللہ بلا واسطہ حق تعالیٰ سے اس کے احکام معلوم کرتے، اور پھر ان کو دنیا میں نافذ کرتے ہیں، یہ سلسلہ خلافت و نیابت الہیہ کا آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی انداز میں چلتا رہا، یہاں تک کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے آخری خلیفہ ہو کر بہت ہی اہم خصوصیات کے ساتھ تشریف لائے۔

ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ سے قبل نہایت خاص خاص قوموں یا ملکوں کی طرف مبعوث ہوتے تھے، ان کا حلقہ حکومت و خستیار اپنی قوموں اور ملکوں میں محدود ہوتا تھا، ابراہیم علیہ السلام ایک قوم کی طرف، لوط علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے درمیان آنے والے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے عالم اور اس کی دونوں قوم جنات و انسان کی زمین میں اللہ کے آخری خلیفہ طرف بھیجا گیا، آپ کا اختیار و اقتدار پوری دنیا کی دونوں قوموں پر حاوی ہیں اور آپ کی خصوصیات، فرمایا گیا، تشرآن کریم نے آپ کی بعثت و نبوت کے عام ہونے کا اعلان اس آیت میں فرمایا:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ
إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (۲: ۱۵۸)

”آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں اللہ کا رسول
ہوں، تم سب کی طرف اللہ ذات باری کے
قبض میں ہو ملک آسمانوں اور زمین کا“

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمام انبیاء

علیہم السلام پر چھ چیزوں میں خاص فضیلت بخشی گئی ہو، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو تمام عالم کا نبی و رسول بنا کر بھیجا گیا۔

دوسری خصوصیت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت دنیا بت جس طرح خاص خاص ملکوں اور قوموں میں محدود ہوتی تھی اسی طرح ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص ہوتی تھی، اُس کے بعد دوسرا رسول آجاتا، تو پہلے رسول کی خلافت دنیا بت ختم ہو کر آنے والے رسول کی خلافت قائم ہو جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے خاتم الانبیاء بنا دیا، کہ آپ کی خلافت دنیا قیامت تک قائم رہے گی، اُس کا زمانہ بھی کوئی مخصوص زمانہ نہیں، بلکہ جب تک زمین آسمان قائم اور زمانہ کا وجود ہے وہ بھی قائم ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات و شریعت ایک زمانہ تک محفوظ رہتی اور چلتی تھی، رفتہ رفتہ اُس میں تحریفات ہوتے ہوئے وہ کالعدم ہو جاتی تھیں، اُس وقت کوئی دوسرا رسول اور دوسری شریعت بھیجی جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کا دین آپ کی شریعت قیامت تک محفوظ رہے گی، ستر آن نبید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کے تو الفاظ اور معانی سب چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی، اور ارشاد فرمایا،

إِنَّا نَحْنُ حَافِظُونَ مَا نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۹۱:۵۰)

ہم نے ہی ستر آن نازل فرمایا اور ہم اس کے محافظ ہیں۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات جن کو حدیث کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام فرما دیا، کہ قیامت تک آپ کی تعلیمات اور ارشادات کو جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والی ایک جماعت باقی رہے گی، جو آپ کے علوم و معارف اور آپ کے شرعی احکام صحیح صحیح لوگوں کو پہنچاتی رہے گی، کوئی اس جماعت کو مٹا نہ سکیگا اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی اُن کے ساتھ رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی کتابیں اور صحیفے سب مٹ و محرف ہو جاتے، اور بالآخر دنیا سے گم ہو جاتے، یا غلط سلط باقی رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب قرآن اور آپ کی بتلائی ہوئی ہدایات حدیث سب کی سب اپنے اصل خود خال کے ساتھ قیامت تک موجود و محفوظ رہیں گی، اسی لئے اس زمین پر آپ کے بعد نہ کسی نے نبی اور رسول کی ضرورت ہے، نہ کسی اور خلیفہ اللہ کی گنجائش۔

چوتھی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت دنیا بت جو محدود زمانے کے لئے ہوتی تھی ہر نبی و رسول کے بعد دوسرا رسول مخاب اللہ مقرر ہوتا اور نیابت کا کام سنبھالتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ خلافت دنیا بت قیامت کے بعد نظام خلافت ہے، اس لئے قیامت تک آپ ہی اس زمین میں خلیفہ اللہ ہیں، آپ کی خلافت کے بعد نظام عالم کیلئے جو نائب ہوگا وہ خلیفہ الرسول اور کچا نائب ہوگا، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا

كَانَتْ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ثَلَاثُ نُسُوحٍ
الْأُولَىٰ نُسُوحٌ كَلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ
خَلَفَهُ نَبِيٌّ وَلَا نَبِيٌّ
بَعْدِي شَيْءٌ وَتَسِيكُونُ خُلَفَاءَ
فَيَكْتُمُونَ

پانچویں خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کی امت کے مجموعے کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا جو انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے، یعنی امت کے مجموعے کو معصوم قرار دیا، کہ آپ کی پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، یہ پوری امت جس مسئلہ پر اجماع و اتفاق کرے وہ حکم خداوندی کا منظر سمجھا جائے گا، اسی لئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے بعد اسلام میں تیسری حجت اجماع امت قرار دی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

فَيُخَيِّمُ أَمَّتِي عَلَى النَّاسِ

اس کی مزید تفصیل اُس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، دنیا کتنی ہی بدل جائے، حق کتنا ہی مضلل ہو جائے، مگر ایک جماعت حق کی حمایت ہمیشہ کرتی رہے گی، اور انجام کار وہی غالب رہے گی۔

اس سے بھی واضح ہو گیا کہ پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، اور جب کہ امت کا مجموعہ معصوم قرار دیا گیا تو خلیفہ رسول کا انتخاب بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نیابت زمین اور نظم حکومت کے لئے انتخاب کا طریقہ مشروع ہو گیا، یہ امت جسے خلافت کے لئے منتخب کر دے وہ خلیفہ رسول کی حیثیت سے نظام عالم کا واحد ذمہ دار ہوگا، اور خلیفہ سارے عالم کا ایک ہی ہو سکتا ہے۔

خلفائے راشدین کے آخری عہد تک یہ سلسلہ خلافت صحیح اصول پر چلتا رہا، اور اسی لئے اُن کے فیصلے صرف دینی اور ہنگامی فیصلوں کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ایک محکم دستاویز

اور ایک درجہ میں امت کے لئے حجت مانے جاتے ہیں، کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان متعلق منبرایا:

عليكم بسنتي وسنة الخلفاء
الراشدين

”میری سنت کو لازم کیڑو اور خلفاء راشدین کی سنت کو۔“

خلافت راشدہ کے بعد خلافت راشدہ کے بعد کچھ طوائف الملوکی کا آغاز ہوا، مختلف خطوں میں مختلف امیر بنائے گئے، ان میں سے کو بھی خلیفہ کہلانے کا سبب نہیں، ہاں کسی ملک یا قوم کا امیر خاص کہا جاسکتا ہے اور جب پوری دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع کسی ایک فرد پر متعذر ہو گیا، اور ہر ملک ہر قوم کا ملحدہ علیحدہ امیر بنانے کی رسم چل گئی، تو مسلمانوں نے اس کا تقرر اسی اسلامی نظریہ کے تحت جاری رکھا، کہ ملک کے مسلمانوں کی اکثریت جس کو امیر منتخب کرے وہ ہی اس ملک کا امیر اور اول الامر کہلائے، قرآن مجید کے ارشاد وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ (۲۸۱:۳۲) کے عموم سے اس پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی اسمبلیاں اسی طرز عمل کا ایک نمونہ ہیں، فرق اتنا ہے کہ عام جمہوری ملکوں کی اسمبلیاں اور ان کے ممبران شورایت میں منسرق بالکل آزاد و خود مختار ہیں، محض اپنی رائے سے جو چاہیں اچھا یا بُرا قانون بناتے ہیں، اسلامی اسمبلی اور اس کے ممبران اور منتخب کردہ امیر سب اس اصول و قانون کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اُن کو ملا ہے، اس اسمبلی یا مجلس شوریٰ کی ممبری کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں، اور جس شخص کو یہ منتخب کریں اس کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ہیں، پھر اُن کی قانون سازی بھی مسترآن و سنت کے بیان کردہ اصول کے دائرہ میں ہو سکتی ہے، اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کا ان کو اختیار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مخاطب کر کے جو ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، اس سے دستور مملکت کی چند اہم دفعات پر روشنی پڑتی ہے۔ آیت مذکورہ سے دستور مملکت کی اول: یہ کہ آسمان اور زمین میں اقتدار اعلیٰ اللہ جل مجدہ کا ہے، چند اہم دفعات کا ثبوت دوسرے: یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے لئے اس کا نائب خلیفہ اس کا رسول ہوتا ہے، اور ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافت اہلبیہ کا سلسلہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، تو اب خلافت رسول کا سلسلہ اُس کے قائم مقام ہوا، اور اس خلیفہ کا تقرر ملت کے انتخاب کے مسترار پایا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ

اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کر دو آدم کو تو سب سجدہ میں گر پڑے، مگر شیطان

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿۳۵﴾

اس نے نہ مانا اور تکبر کیا، اور تمنا وہ کافروں میں کا

خلاصہ تفسیر

اور جس وقت حکم دیا ہم نے سب فرشتوں کو اور جنوں کو بھی جیسا کہ بعض روایات میں حضرت ابن عباس سے منقول ہے، غرض ان سب کو یہ حکم دیا گیا کہ سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے، سب سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس کے کہ اس نے نہ مانا اور غرور میں آگیا، اور ہو گیا کافروں میں سے۔

معارف و مسائل

ربط آیات | پچھلے واقعہ میں جب آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہو چکی، اور دلائل سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ صلاحیت

خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، اور ملائکہ کو ان میں سے بعض علوم حاصل ہیں، اور جنوں کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اور اس حیثیت خاص سے کہ ملائکہ و جن ہر دو گروہ کے علوم کے یہ جامع ہیں، اُن کا شرف ہر دو گروہ پر ظاہر ہو گیا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس مقدمہ کو معاملہ سے بھی ظاہر فرما دیا جائے، اور ملائکہ اور جنوں سے ان کی کوئی خاص تعظیم کرائی جائے، جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ اُن دونوں سے کامل اور مصداق ہے۔

آخپہ خواہاں ہمدارند تو تہنہ داری

کے ہیں، اور آدم علیہ السلام ان علوم خاصہ میں ملائکہ اور جن ہر دو گروہ سے کامل اور دونوں کے علوم و قومی کو جامع ہیں، جیسا کہ مفصل طور پر مذکور ہوا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اُس کامل کی کوئی ایسی تعظیم کرائی جائے کہ علمائے یہ امر ظاہر ہو جائے کہ یہ اُن دونوں سے کامل اور جامع ہیں، جب تو یہ دونوں ان کی تعظیم کریں، اور گویا بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ جو اوصاف ہم میں الگ الگ ہیں وہ ان کے اندر یک جا ہیں، اس لئے جو عمل تعظیمی تجویز فرمایا گیا ہے اس کی حکایت ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں، سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کیا، اور غرور میں آگیا۔

کیا سید کا حکم جانت کر بھی تھا اس آیت میں جو بات صراحتاً ذکر ہو تو یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا، مگر آجے جب استثناء کر کے یہ استثناء دیا گیا کہ سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہیں کیا تو اس سے ثابت ہوا کہ سجدہ آدم علیہ السلام کا حکم اس وقت کی تمام ذوی العقول مخلوقات کے لئے عام تھا جن میں فرشتے اور جنات سب داخل ہیں، مگر حکم میں صرف فرشتوں کے ذکر پر اس لئے استثناء کیا گیا کہ وہ سب افضل اور روشن تھے، جب آدم علیہ السلام کی تعظیم کا حکم ان کو دیا گیا تو جنات کا بوجہ اولیٰ اس حکم میں مشاغل و بوجہ معلوم ہو گیا۔

سجود تعظیم میں آیتوں میں اس آیت میں فرشتوں کو حکم دیا گیا، پر آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا اور سورہ ہازلہ تھا اسلام میں نبی کریم ﷺ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین اور عیسیٰ کا مہر بھیجے گئے بعد یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا ذکر ہو کر ذکر خداوند تعالیٰ کا ذکر ہو گیا تو یہیں ہو سکتا ہے کہ کوئی فرد مذکور کی عبادت شرک و کفر ہے، جس میں یہ احتمال نہیں کہ کسی وقت کسی شریعت میں جائز ہو سکے اس کے سوا کوئی احتمال نہیں کہ وہ قدیم انبیاء کے زمانے میں سجدہ کا بھی وہی درجہ ہوگا جو ہائے زمانے میں سلام و صافحہ، معافیت اور دست بوسی یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانے کا۔ امام حقانی نے احکام القرآن میں یہی مندر کیا ہے کہ انبیاء سابقین کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم اور عہد کے لئے سجدہ مباح تھا شریعت محمدیہ میں منسوخ ہو گیا، اور بڑوں کی تعظیم کے لئے صرف سلام بھلائی کی اجازت دی گئی، اور کعبہ، سجدہ اور بیست و ست غلظ یا نہ کھڑے ہونے کو ناجائز مندرجہ اولیہ کیا گیا۔

توضیح اس کی ہے کہ اصل کفر و شرک اور طراندگی کی عبادت تو اصول ایمانی کی خلاف ورزی ہو کسی بھی شریعت میں جائز نہیں ہو سکتے، لیکن یہ اعمال و افعال ہیں جو اپنی ذات میں شرک و کفر نہیں، مگر لوگوں کی جہالت اور غفلت سے وہ افعال ذریعہ شرک و کفر کا بن سکتے ہیں ایسے افعال کو انبیاء سابقین کی شریعتوں میں مطلقاً منع نہیں کیا گیا، بلکہ ان کو ذریعہ شرک بنانے سے روک دیا گیا، جیسے جانداروں کی تصویر بنانا اور استعمال کرنا اپنی ذات میں کفر و شرک نہیں، اس لئے پہلی شریعتوں میں جائز تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہو:

يَتَذَكَّرُونَ لَكَ تَابِعًا مِّنْ تَحَارِيرِكَ
تصویر میں بنا کر تھے۔

اس طرح سجدہ تعظیم پہلی شریعتوں میں جائز تھا، لیکن آخر کار لوگوں کی جہالت سے یہی چیزیں شرک و بت پرستی کا ذریعہ بن گئیں اور اسی مادہ سے انبیاء علیہم السلام کے دین و شریعت

میں تحریر ہو گئی، اور پھر دوسرے انبیاء اور دوسری شریعتوں نے اس کو شاپا شریعت محمدیہ جو کہ دائمی اور ایک شریعت، اور رسول کریم علیہ السلام پر بت و رسالت ختم اور آپ کی شریعت آخری شریعت ہے، اس لئے اس کو بت و تحریر سے بچانے کے لئے ہر ایسے سوراخ کو بند کر دیا گیا جہاں سے شرک و بت پرستی آ سکتی تھی، اسی سلسلہ میں وہ عام چیزیں اس شریعت میں حرام کر دی گئیں جو کسی زمانے میں شرک و بت پرستی کا ذریعہ بن چکیں۔

تصویر سازی اور اس کے استعمال کو اس وجہ سے حرام کیا گیا، سجدہ تعظیم اس وجہ سے حرام ہوا ایسے اوقات میں غلط ہونے کو حرام کر دیا گیا جن میں شرکین اور کفار اپنے معبودوں کی عبادت کیا کرتے تھے، کہ بت پرستی کا بقیہ کسی وقت شرک کا ذریعہ نہ بن جائے۔

بیعت تسلیم کی حدیث میں ہو کہ رسول کریم علیہ السلام نے سلمہ کے آقاؤں کو بحر و باگا اپنے غلام کو جو بدلتی اپنا بندہ بیکر نہ بگاڑیں، اور غلاموں کو بحر و باگا وہ آقاؤں کو اپنا رب کہیں غلام غفلت معنی کے اعتبار سے بندہ کے معنی غلام کے اور رب کے معنی پالنے والے اور تربیت کرنے والے کے ہیں، ایسے غلام کا مستقل مندرجہ ہونا چاہئے تھا، مگر محض اس لئے کہ یہ غلام وہم و شرک میں رہیں وقت چہالت سے یہی غلط آقاؤں کی پرستش کا وہانہ کھول دینا اس ان غلطی کے ابطال کو روک دیا گیا۔

خلاصہ یہ کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ اور یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور عیسیٰ کو سجدہ جو فرشتوں میں مذکور ہے، یہ سجدہ تعظیم تھا، جو ان کی شریعت میں سلام، معافیت، اور دست بوسی کا ذریعہ رکھنا تھا، اور جائز تھا، شریعت محمدیہ کو کفر و شرک کے شائبہ سے بھی پاک رکھنا تھا، اس لئے اس شریعت میں اندھالی کے سوا کسی کو بقصد تعظیم بھی سجدہ یا کعبہ کرنا جائز نہیں رکھا گیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ تاجز اصل عبادت ہے اس میں جاہل کے افعال ہیں، کھڑا ہونا، بیٹنا، رکوع، سجدہ، ان میں سے پہلے دو ہیں کھڑا ہونا اور بیٹنا تو ایسے کام ہیں جو مادہ ہی انسان اپنی ضرورتوں کے لئے کرتا ہے، اور عبادت میں غلظ میں کئے جاتے ہیں، مگر کعبہ اور سجدہ ایسے فعل ہیں جو انسان عادت نہیں کرتا، وہ عبادت ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے ان دونوں کو شریعت محمدیہ میں عبادت ہی کا حکم دے کر فرما کر دے کے ممنوع کر دیا۔

اب یہاں ایک سوال ابھی رہا ہے کہ سجدہ تعظیم کا جواز فرشتوں کی ذکرہ آیات سے ثابت ہو، شریعت محمدیہ میں اس کا منسوخ ہونا اس دلیل سے ثابت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم علیہ السلام نے احادیث متواترہ و مشہورہ سے سجدہ

تعظیم کا حرام ہونا ثابت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں غیر اللہ کے لئے سجدہ تعظیم کو جائز قرار دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ شوہر کو سجدہ کیا کرے، (مگر اس شریعت میں سجدہ تعظیم مطلقاً حرام ہے، اس لئے کسی کو کسی کے لئے جائز نہیں)۔

یہ حدیث میں صحابہ کرام کی روایت سے ثابت ہے، اصول حدیث کی معروف کتاب تدریب الراوی میں ہے کہ جس روایت کو دس صحابہ کرام نقل فرمادیں تو وہ حدیث متواتر ہو جاتی ہے، جو تشریح کی طرح قطعی ہے، یہاں تو میں صحابہ کرام سے منقول ہے، یہ میں صحابہ کی روایتیں ماسیہ بیان القرآن میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع فرمادی ہیں، ضرورت ہو تو وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

مسئلہ :- ابلیس کا کفر محض علی نافرمانی کا نتیجہ نہیں، کیونکہ کسی فرض کو علی ترک کر دینا اصول شریعت میں فسق و گناہ ہے، کفر نہیں، ابلیس کے کفر کا اصل سبب حکم بآبانی سے معارضہ اور مقابلہ کرنا ہے کہ آپ نے جس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سجدہ کروں، یہ معارضہ بلاشبہ کفر ہے۔

مسئلہ :- یہ بات قابل غور ہے کہ ابلیس علم و معرفت میں یہ مقام رکھتا تھا کہ اس کو طائوس الملائکہ کہا جاتا تھا، پھر اس سے یہ حرکت کیسے صادر ہوئی؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے کبر کے سبب اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی فی ہوتی معرفت اور علم و فہم کی دولت سلب کر لی، اس لئے اس کی جہالت کا کام کر بیٹھا، بعض نے فرمایا کہ چاہے اور خود پسندی نے حقیقت شناسی کے باوجود اس بلا میں مبتلا کر دیا، تفسیر روح المعانی میں اس جگہ ایک شعر نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات کسی گناہ کے وبال سے تائید حق انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، تو اس کی ہر کوشش اور عمل اس کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے، شعر یہ ہے،

إِذَا الْكَرُّ يَكُنْ عَوْنُ تَوْنٍ اللَّهُ يُلْعَثُ شَيْ
فَأَوَّلُ مَا يَنْجِبُنِي عَلَيْكَ إِجْتِهَادُكَ

روح المعانی میں اس سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انسان کا ایمان وہی معتبر ہو جو آخر عمر اور اول منازل آخرت تک ساتھ رہے، موجودہ ایمان و عمل اور علم و معرفت پر غرہ نہ ہونا چاہئے (روح)

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا
اور ہم نے کہا اے آدم رہا کرو اور زہیر کی عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو

حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ
جہاں کہیں سے چاہو اور پاس مت جانا اس درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے ظالم

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا

پھر بلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا ان کو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے اور ہم نے کہا تم سب کو

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى الْحِينِ

تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہو اور نفع اٹھانا ایک وقت تک

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بی بی رجن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مادہ لے کر بنا دیا تھا، بہشت میں پھر کھاؤ و پولاؤ میں ہے با فراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائو اس درخت کے ورنہ تم بھی اپنی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں (خدا جانے وہ کیا درخت تھا، مگر اس کے کھانے سے منع فرمادیا، اور پھر آقا کو اختیار ہو کہ اپنے گھر کی چیزوں سے غلام کو جس چیز کے برتنے کی چاہے اجازت دیدے، اور جس چیز کو چاہے منع کر دے) پس لغزش دیدی آدم و حوا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے سو بر طرف کر کے رہا ان کو اس پیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ بیچو اگر تم میں سے بعض بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر کچھ عرصہ بٹھرنا ہے اور کام چلانا ایک میعاد معین تک (یعنی وہاں جا کر بھی دوام نہ ملے گا کچھ عرصہ کے بعد وہ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا)۔

معارف و مسائل

یہ آدم علیہ السلام کے قصہ کا مکمل ہے جس میں بیان کیا گیا کہ جب آدم کی فضیلت اور خلافت ارضی کی مصلحت فرشتوں پر واضح کر دی گئی، انھوں نے تسلیم کر لیا، اور ابلیس اپنے تکبر اور معارضہ کی وجہ سے کافر ہو کر کمال دیا گیا، تو آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حوا کو یہ حکم ملا کہ تم دونوں جنت میں رہو، اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر ایک معین درخت کے لئے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس نہ جانا، یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا، شیطان جو آدم کی وجہ سے مردود ہوا وہ خار کھاتے ہوئے تھا اس نے کسی طرح موقع پا کر اور مصلحتیں بتلا کر ان دونوں کو اس درخت کے کھانے پر آمادہ کر دیا، ان کی لغزش کی وجہ سے ان کو بھی جس حکم ملا کہ اب تم زمین پر جا کر رہو، اور یہ بھی بتلا دیا کہ زمین کی رہائش جنت کی طرح بے غل و غش نہ ہوگی، بلکہ وہاں آپس میں اختلافات اور دشمنیاں بھی ہوں گی، جس سے زندگی کا لطف پورا نہ رہے گا۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَثْتَ وَزَوْجَكَ الْجَنَّةَ، اور ہم نے کہا کہ اے آدم! تمہرے ہم اور تمہاری زوجہ جنت میں — یہ واقعہ حضرت آدم کی تخلیق اور ملائکہ کے سجدے کے بعد کا ہے، بعض حضرات نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تخلیق اور سجدہ کا واقعہ جنت کے باہر کہیں ہوا ہے، اس کے بعد جنت میں داخل کیا گیا، لیکن ان الفاظ میں یہ مفہوم یقینی نہیں، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تخلیق بھی جنت میں ہوئی، اور سجدے کا واقعہ بھی جنت میں پیش آیا، مگر اس وقت تک اُن کو کوئی فیصلہ اس کے متعلق نہیں سنایا گیا تھا کہ آپ کا مسکن و مستقر کہاں ہوگا، اس واقعہ کے بعد یہ فیصلہ سنایا گیا۔

وَعَلَّامًا رَحِيمًا رَحِيمًا شَيْئًا۔ رَعْنَا کے معنی عربی لغت میں اُس نعمت و رزق کے ہیں جس کے حاصل کرنے میں کوئی محنت و مشقت بھی نہ ہو، اور وہ اتنی کثیر اور وسیع ہو کہ اس کے کم یا ختم ہو جانے کا خطرہ نہ ہو، معنی یہ ہوئے کہ آدم و حوا علیہما السلام کو فرمایا کہ جنت کے پہلے! فراغت استعمال کرتے رہو، نہ اُن کے حاصل کرنے میں تمہیں کسی محنت کی ضرورت ہوگی، اور نہ یہ منکر کہ یہ غذا ختم ہو جائے گی۔

وَلَا تَقْرَبُوا هَٰذَا وَ الشَّجَرَةَ ۖ كَيْسٍ خَاصٍ دَرَخْتِ كِي طَرَفِ اِشَارَةِ كَرَكِي فَرَا يَ اِغْلِيَا كِي اِس كِي قَرِيبِ نَهْ جَاوَا، اَصْلِ مَقْصِدِ تَوِيَهْ تَحَا كِي اِس كَا پَھْلِ نَهْ كَھَاوَا، مَگَر تَا كِيدِ كِي طَوْرِ پَر عَنَوَانِ يِهْ اَخْتِيَاو كِيَا اِغْلِيَا كِي اِس كِي پَاسِ بِي نَهْ جَاوَا، اَوْر اَدِي سِي، يُو كِي كَھَانِي كِي لَئِي اِس كِي پَاسِ نَهْ جَاوَا، يِهْ دَرَخْتِ كُو نَافِ تَحَا قُرْآنِ كَرِيمِ نِي مَنعِينِ نَہِيں كِيَا، اَوْر كُسي مُسْتَنَدِ حَدِيثِ مِيں بِي اِس كِي تَعْيِينِ مَذْكُورِ نَہِيں، اَتَمَّ تَفْصِيلِ مِيں سِي كُسي نِي عَزْمِ كَا دَرَخْتِ قَرَارِ دِيَا، كُسي نِي اَنگُورِ كَا، كُسي نِي اَجِيْرِ كَا، مَگَر جِن كُو مُسْتَرْنَ اَنْ وَ حَدِيثِ نِي مَہِمْ جُھُٹَا سِي اِس كُو مَحْتَمِلِ كَرْنِي كِي ضَرُورَتِ يِهِي كِيَا سِي (قُرطبي)

فَتَكُونُ تَامِينَ الظَّالِمِينَ، یعنی اگر آپ نے اس شعبہ ممنوعہ کو کھایا تو آپ ظالموں میں داخل
ہو جائیں گے۔

فَاَزَلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا۔ زَلَّہ کے معنی عربی لغت میں لغزش کے ہیں، اِزْلال کے معنی کسی کو لغزش دینا، معنی یہ ہیں کہ شیطان نے آدم و حوا کو لغزش دیدی، قرآن کے یہ الفاظ صاف اس کا اظہار کر رہے ہیں کہ حضرت آدم و حوا کی یہ غلات و رزی اس طرح کی نہ تھی جو عام گناہگاروں کی طرف سے ہوا کرتی ہے، بلکہ شیطانی تمبلیس سے کسی دھوکہ فریب میں مبتلا ہو کر ایسے اقدام کی نوبت آگئی، کہ جس درخت کو منوع قرار دیا تھا اُس کا پھل وغیرہ کھا بیٹھے، عَنْہُمَا میں لفظ عَنْ بمعنی سبب ہی، یعنی اُس درخت کے سبب و ذریعہ سے شیطان نے آدم و حوا کو لغزش میں مبتلا کر دیا۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب شیطان کو جس کے سے انکار کی بنا پر پہلے ہی مژدہ کے جنت سے نکال دیا گیا تھا، تو یہ آدم و حوا کو بہکانے کے لئے جنت میں کیسے پہنچا؟ اس کا بے غبار جواب یہ ہے کہ شیطان کے بہکانے اور دہاں تک پہنچنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہو کہ بغیر ملاقات کے اُن کے دل میں دوسوہ ڈالا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان جنات میں سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جنات کو بہت سے ایسے تصرفات پر قدرت دی ہے جو عام طور پر انسان نہیں کر سکتے، ان کو مختلف شکلوں میں متشکل ہو جانے کی بھی قدرت دی ہے، ہو سکتا ہو کہ اپنی قوتِ جنتیہ کے ذریعہ سرزمین کی صورت سے آدم و حوا کے ذہن کو متاثر کیا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دوسری شکل میں مثلاً سانپ وغیرہ کی شکل میں متشکل ہو کر جنت میں داخل ہو گیا ہو، اور شاید یہی سبب ہو کہ آدم علیہ السلام کو اس کی دشمنی کی طرف وحیان نہرا، قرآن مجید کی آیت قَاتِلُوهُمْ مَا يَفِيٰ لَكُمْ مَالٌ وَلَا نَفْسٌ حَيَاتٍ (۳۱:۱۷) سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے صرف دوسوہ اور ذہنی اثر ڈالنے سے کام نہیں لیا، بلکہ آدم و حوا سے زبانی گفتگو کر کے اور تمہیں کھا کر متاثر کیا۔

فَاَخْرَجْنَاهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ۔ یعنی شیطان نے اس دھوکہ اور لغزش کے ذریعہ آدم و حوا، علیہما السلام کو ان نعمتوں سے محال دیا جن میں وہ آرام سے گزربسر کر رہے تھے، یہ نکالنا اگرچہ بحکم خداوندی ہوا، مگر سبب اس کا شیطان تھا، اس لئے نکالنے کی نسبت اُس کی طرف کر دی گئی۔

وَلَوْلَا اهْبَاطُ الْبَعْضِ لِبَعْضٍ عَظُوًّا. یعنی ہم نے حکم دیا کہ نیچے اتر جاؤ، اس طرح کہ تم میں سے بعض بعضوں کے دشمن رہیں گے، اس حکم کے مخاطب حضرت آدم و حوا ہیں، اور شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا تو وہ بھی اسی خطاب میں شامل ہے، اس صورت میں باہم عداوت ہونے کا مطلب ہوگا کہ شیطان کے ساتھ تمھاری عداوت کا سلسلہ دنیا میں بھی جاری رہے گا، اور اگر بقول بعض اس واقعہ کے وقت سے پہلے ہی شیطان نکالا جا چکا تھا، تو پھر اس کلام کا رخ آدم و حوا اور ان کی اولاد کی طرف ہوگا، کہ ان کو بطور عتاب کے یہ جتلا یا گیا کہ ایک سزا تو یہ ہے کہ جنت سے زمین پر اکارا گیا، دوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کی اولاد کے درمیان باہم عداوتیں بھی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ اولاد کے باہم عداوت ہونے سے والدین کا طبع زندگی بھی رخصت ہو جاتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور روحانی سزا ہوگی۔ (بیان القرآن)

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ۔ یعنی آدم وحوار علیہا السلام کو یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور ایک یہ عرصہ متین تک کام چلانا ہے، یعنی زمین پر جا کر بھی دوام نہ ملے گا، کچھ مدت کے بعد اس گھر کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔

آیات مذکورہ سے متعلق مسائل واحکام شرعیہ

اَشْكُنْ اَنْتَ وَرَوْحُكَ الْجَنَّةَ میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام دونوں کے لئے جنت کو مسکن بنانے کا ارشاد ہے جس کو مختصر لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے اَشْكُنَا الْجَنَّةَ یعنی آپ دونوں جنت میں رہیں، جیسا کہ اس کے بعد کَلَّا اور لَا تَخْشَا بَیْنَیْهِمَا دُونَکَ اَوَّیْکَ ہر صیغہ میں جمع کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے خلاف اَنْتَ وَرَوْحُکَ کے الفاظ کو اختیار کرنے میں مخاطب مرت حضرت آدم کو متراویا اور اپنی سے فرمایا کہ آپ کی زوجہ بھی جنت میں رہے، اس میں دو مسئلوں کی طرف اشارہ ہے۔

مسئلہ اول یہ کہ یہودی کے لئے رہائش کا انتظام شوہر کے ذمہ ہے، دوسرے یہ کہ سکونت میں یہودی شوہر کے تابع ہے، جس مکان میں شوہر رہے اس میں اس کو رہنا چاہئے۔

مسئلہ لفظ اَشْكُنْ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس وقت ان دونوں حضرات کے لئے جنت کا قیام محض عارضی تھا، دائمی قیام جو شان ملکیت کی ہوتی ہے وہ نہ تھی، کیونکہ لفظ اَشْكُنْ کے معنی یہ ہیں کہ اس مکان میں رہا کرو یہ نہیں فرمایا کہ یہ مکان تمہیں دیا گیا یہ تمہارا مکان ہو، درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آئندہ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آدم و حوا علیہما السلام کو جنت کا مکان چھوڑنا پڑے گا، نیز جنت کا اتقان ملکیت ایمان اور عمل صالح کر کے معاوضہ میں حاصل ہوتا ہے جو قیامت کے بعد ہوگا، اسی سے حضرات فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے کہ میرے گھر میں رہا کرو یا یہ کہ میرا گھر تمہارا مسکن ہو، اس سے مکان کی ملکیت اور دائمی اتقان اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا (قرطبی) غذا، و خوراک میں یہودی و کَلَّا وَتَمَتَّعُوا بِغَدَا یعنی کھاؤ تم دونوں جنت سے با فراغت اس میں بطور تذکرہ سابق خطا شوہر کے تابع نہیں

اس میں اشارہ اس کی طرف ہو سکتا ہے کہ غذا اور خوراک میں یہودی شوہر کے تابع نہیں، وہ اپنی ضرورت خواہش کے وقت اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور یہ اپنی خواہش کے مطابق ہر جگہ چلنے پھرنے کی آزادی

اِنَّ الْاِنْسَانَ کَافِرٌ یَّحْتَدِیْ جَنَّتَیْنِ جہنم جتنی چاہیں کھا سکتی ہیں بجز ایک درخت کے اور کسی چیز میں کاؤ اور مانع نہیں اور لفظ یَشْتَمُکُنَّ میں مقامات کی وسعت کا بیان ہے، کہ پوری جنت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں کھائیں، کوئی خط ممنوع نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ چلنے پھرنے اور مختلف مقامات سے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے، ایک محدود و معین مقام یا مکان میں اگرچہ ضرورت و خواہش کی ساری چیزیں مہیا کر دی جائیں، مگر وہاں سے باہر جانا ممنوع ہو تو یہ بھی ایک قسم کی قید ہو اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کو کھانے پینے کی تمام چیزیں بکثرت و فراغت عطا کر دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ حَتِّیْ یَشْتَمُکُنَّ فرما کر ان کو چلنے پھرنے اور ہر جگہ جانے کی آزادی بھی دی گئی۔

سُزَّذَ لَکَ کَامِثْلَ لَا تَخْشَا بَیْنَیْهِمَا الْجَنَّةَ یعنی اس درخت کے قریب بھی نہ جاؤ یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ، مگر احتیاطی حکم یہ دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ اس سے اصول فقہ کا مسئلہ سد ذرائع ثابت ہوا، یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں، لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ ان چیزوں کے اختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہو جائے گا تو اس جائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے، جیسے درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا اس کے پھل پھول کھانے کا، اُس ذریعہ کو بھی منع فرما دیا گیا، اسی کا نام اصول فقہ کی اصطلاح میں سَدِّ ذَرَائِعِ ہے۔

مسئلہ عصمت انبیاء

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے کھانے سے منع فرما دیا گیا تھا، اور اس پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہو، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے، اس کے باوجود آدم علیہ السلام نے اُس درخت سے کھا لیا جو نظر ہر گناہ ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے، کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیر و گناہ اُن سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں (قرطبی)

وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ صادر ہو سکے تو انبیاء کے اقوال و افعال سے امن اٹھ جاتے گا، اور وہ قابل اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کہاں ٹھکانا ہے۔

البتہ فسران کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر عتاب بھی ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے۔

ایسے واقعات کا حاصل باتفاق امت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطا و نسیان کی وجہ سے ان کا صدور ہو جائے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا خطا و نسیان کے سبب قابل معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جاسکتا، اور یہ یہودیسیان کی غلطی اُن سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور

تشریع سے ہو، بلکہ اُن سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا ہونے یا نہ ہونے کا ہے (تفسیر بحر المحیط) مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے چھوٹی کسی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے اس واقعہ کے متعلق علماء تفسیر نے بہت سی توجیہات لکھی ہیں ان میں چند یہ ہیں:

اول یہ کہ جس وقت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، تو ایک خاص درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اور مرد خاص یہی درخت نہیں تھا، بلکہ اس کی جنس کے سارے درخت مراد تھے، جیسے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ریشمی کپڑا اور ایک ٹکڑا سونے کا ہاتھ میں لیکر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں، ظاہر ہے کہ حرمت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تھے، بلکہ تمام ریشمی کپڑے اور سونے کا یہی حکم ہے، لیکن یہاں کسی کو یہ وہم بھی ہو سکتا ہے کہ مانعت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ وابستہ ہو جو اُس وقت آپ کے دست مبارک میں تھے، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہو گیا کہ جس درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا تھا مانعت اسی کے ساتھ خاص ہے، شیطان نے یہی دوسوہ اُن کے دل میں مزین اور مستحکم کر دیا، اور کہیں کھا کر یہ با درکرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، تمہیں کسی ایسے کام کا مشورہ نہیں دے رہا جو تمہارے لئے ممنوع یا مضر ہو، جس درخت کی مانعت کی گئی ہے وہ دوسرا ہے، اس درخت کی مانعت نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان نے یہ دوسوہ دل میں ڈالا ہو کہ اس درخت کی مانعت صرف آپ کی ابتداء پیدائش کے وقت کے ساتھ مخصوص تھی، جیسے چھوٹے بچوں کو اول عمر میں قوی غذا سے روکا جاتا ہے، بلکہ غذا دی جاتی ہے، اور قوت پیدا ہو جانے کے بعد ہر غذا کی اجازت ہو جاتی ہے، تو اب آپ قوی ہو چکے ہیں، اس لئے وہ مانعت باقی نہیں رہی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت شیطان نے اس درخت کے کھانے کے منافع بتلائے کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی نعمتوں میں رہنے کا اطمینان ہو جائے گا، اُس وقت اُن کو وہ مانعت یاد نہ رہی ہو جو ابتداء آفرینش کے وقت اس درخت کے متعلق کی گئی تھی، قرآن مجید کی آیت فَتَنِي وَكَفَجَذَلَهُ عَزْمًا (۲۰: ۸۵) یعنی آدم علیہ السلام

بھول گئے اور ہم نے ان میں پھنسی نہ پائی، یہ اسی احتمال کی تائید کرتی ہے۔

بہر حال اس طرح کے متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہو کہ جان بوجھ کر نافرمانی کا صدور حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہوا، بھول ہو گئی، یا اجتہادی لغزش، جو درحقیقت گناہ نہیں، مگر آدم علیہ السلام کی شان نبوت اور قرب خداوندی کے مقام عالی کے اعتبار سے یہ لغزش بھی بڑی سمجھی گئی، اور مفسران میں اس کو معصیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا، اور آدم علیہ السلام کی توبہ و استغفار کے بعد معاف کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔

اور یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو جنت سے مردود کر کے نکال دیا گیا تھا تو پھر وہ آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے وہاں کس طرح پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور دوسوہ ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جنت میں داخل ہو کر ہی دوسوہ ڈالے، جنات و شیطاں کو حق تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ دُور سے بھی دل میں دوسوہ ڈال سکتے ہیں، اور اگر داخل ہو کر بالمشافہ گفتگو ہی کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بھی مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں جس کی تحقیق میں پڑنا بے فائدہ اور لایعن بحث ہے۔

اسی طرح یہ سوال کہ آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی منہبہ کر دیا تھا، إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَّاعَدُوٌّ، کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی ایسا کام کرائے جس کی وجہ سے تمہیں جنت سے نکلنا پڑے، پھر حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکے میں کس طرح آ گئے، اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات و شیطاں کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی صورت میں سامنے آیا ہو جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام یہ نہ پہچان سکے کہ یہ شیطان ہے۔

فَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَةً فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ
پھر یہ کہ میں آدم نے اپنے رب سے چند باتیں پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر بیشک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا

الرَّحِيمُ ﴿۲۰﴾ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَمَا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنْهُ
ہر باہی، ہم نے حکم دیا چلے جاؤ یہاں سے سب، پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی

هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۲۱﴾
ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے،

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ
اور جو لوگ منکر ہوتے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو وہ ہیں دوزخ میں جانے والے وہ

فِيمَا خَلِدُونَ ﴿۳۹﴾

اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

خُلاصۂ تفسیر

بعد ازاں حاصل کرتے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ یعنی معذرت کے کلمات کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہوئے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی ندامت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور خود ہی معذرت کے الفاظ تلقین فرمادیئے (تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی کہ ان پر دینی توبہ قبول کر لی، بیشک وہی ہیں بڑی توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان) اور حضرت حواء کی توبہ کا بیان سورۃ اعراف میں ہے، قَالَ لَا رَبَّائِنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا جِسْمِ سَعْدِ مَعْلُومِ هُوَا كَرِ وہ بھی توبہ اور قبول توبہ میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک رہیں، مگر معاف فرمانے کے بعد بھی زمین پر جانے کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمون تھیں، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم زمین پر اترنے کا حاکمانہ طور پر بطور مزا تھا، اب بیگم حکیمانہ انداز سے اس طرح ارشاد ہوا قُلْنَا اضْبُوْا مِنْهَا جَنَّتَا الْاٰیۃِ یعنی ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب، پھر اگر آدے تمھارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت (یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی) سو جو شخص پر وہی کرے گا میری اس ہدایت کی تونہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے (یعنی ان پر کوئی خوفناک واقعہ نہ پڑے گا اور قیامت کے ہولناک واقعات سے ان کا بھی خوف زدہ ہونا اس کے منافی نہیں، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں سب پر ہزل اور خوف کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے، حزن وہ کیفیت ہے جو کسی مصرت و مصیبت کے واقعہ ہو جانے کے بعد قلب میں پیدا ہوتی ہے، اور خوف ہمیشہ قبل وقوع ہوا کرتا ہے، یہاں حق تعالیٰ نے حزن و غم دونوں کی نفی فرمادی، کیونکہ ان پر کوئی آفت و کلفت واقع نہ ہوگی جس سے حزن یا خوف ہو، آگے ان لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو اس ہدایت کی پیروی نہ کریں، فرمایا) اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ کورہیں گے۔

معارف و مسائل

رابطہ آیا پہلی آیات میں شیطانی دستاورد حضرت آدم کی لغزش اور اسکے نتیجہ میں جنت تکلیے اور زمین پر اترنے

کا حکم مذکور تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے ایسے خطاب عتاب کہاں سنے تھے، نہ ایسے سنگدل تھے کہ اس کی بہار کر جاتے، بے چین ہو گئے، اور فوراً ہی معافی کی التجا کرنے لگے، مگر سبب رانہ معرفت اور اس کی وجہ سے انتہائی ہیبت سے کوئی بات زبان سے نہ نکلتی تھی، یا اس خوف سے کہ معافی کی التجا کہیں خلاف شان ہو کر مزید عتاب کا سبب نہ بن جائے، زبان خاموش تھی، اللہ رب العزت دلوں کی بات سے واقف اور رحیم و کریم ہیں، یہ حالت دیکھ کر خود ہی معافی کے لئے کچھ کلمات ان کو سکھائیئے، اس کا بیان ان آیات میں ہے کہ، آدم علیہ السلام نے حاصل کر لئے اپنے رب سے چند الفاظ، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی، (یعنی ان کی توبہ قبول کر لی) بے شک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے مہربان مگر چونکہ روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمون تھیں، مثلاً ان کی نسل سے فرشتوں اور جنات کے درمیان ایک نئی نوع انسان کا وجود میں آنا اور ان کو ایک طرح کا اختیار دے کر احکام شرعیہ کا مکلف بنانا پھر ان میں خلافت الہیہ قائم کرنا، حدود اور احکام شرعیہ نافذ کرنا، تاکہ یہ نئی مخلوق ترقی کر کے اس مقام پر پہنچ سکے جو بہت سے فرشتوں کو بھی نصیب نہیں، اور ان مقاصد کا ذکر تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے ہی کر دیا گیا تھا، اِنِّیْ جَاعِلٌ فِیْ الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔

اس لئے خطا معاف کرنے کے بعد بھی زمین پر اترنے کا حکم منسوخ نہیں فرمایا، البتہ اس کا طرز بدل دیا، کہ پہلا حکم حاکمانہ اور زمین پر اترنا بطور مزا کے تھا، اب یہ ارشاد حکیمانہ اور زمین پر آنا خلافت الہیہ کے اعزاز کے ساتھ ہوا، اس لئے بعد کی آیات میں ان فرائض منصبی کا بیان ہے جو ایک خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد کئے گئے تھے، اسی لئے زمین پر اترنے کے حکم کو پھر مکرر بیان کر کے فرمایا کہ، ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی کے، تو جو شخص پر وہی کرے گا میری اس ہدایت کی، تونہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، یعنی نہ کسی گزشتہ چیز کے فوت ہونے کا غم ہوگا، نہ آئندہ کسی تکلیف کا خطرہ۔

تَلَقَّیْ، تلقی بمعنی میں شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا، اور اس کو متبرک کرنا (روح کشاف) مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب ان کو توبہ کے کلمات کی تلقین کی گئی تو آدم علیہ السلام نے اہتمام کے ساتھ ان کو قبول کیا۔

تَحْلِمَاتٍ، وہ کلمات جو حضرت آدم علیہ السلام کو ارض توبہ بتلائے گئے کیا تھے، اس میں مغفرتین صحابہ سے کئی روایات منقول ہیں، مشہور قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے کہ وہ کلمات وہی ہیں جو ستر آن مجید میں دوسری جگہ منقول ہیں، اِنِّیْ رَزَقْنَاکُمْ اَنْفُسَنَا وَاَنْتُمْ تَغْفِرُوْنَ

لَتَذَكَّرَ حَتَّىٰ تَسْأَلَ عَنْ تَوْبَتِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۲۹۱:۴)

تائب، توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے کے ہیں، اور جب توبہ کی نسبت بندہ کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اول اپنے کئے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اس پر نادم و شرمندہ ہونا، دوسرا اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا، تیسرے آئندہ کے لئے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرنا، اگر ان میں چیزوں میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو وہ توبہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے اللہ توبہ کے الفاظ بول دینا نجات کے لئے کافی نہیں جب تک یہ تینوں چیزیں جمع نہ ہوں، یعنی گزشتہ پر ندامت اور حال میں اس کا ترک، اور مستقبل میں اس کے نہ کرنے کا عزم و ارادہ، تائب علیہ یہاں توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس کے معنی ہیں توبہ قبول کرنا، بعض سلف سے پوچھا گیا کہ جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ کیا کرے تو فرمایا وہی کام کرے جو اس کے پہلے والدین آدم و حوا علیہما السلام نے کیا، کہ اپنے کئے پر ندامت اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے لئے عرض کیا، رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا بِمَا كُنَّا نَدْعُوكَ بِهِ فَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا (۲۹۱:۱) یعنی اے میرے پالنے والے میں نے اپنی جان پر ظلم کر لیا ہے، تو آپ ہی میری مغفرت فرمائیے، اور حضرت یونس علیہ السلام سے جب لغزش ہو گئی تو عرض کیا، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (۲۹۱:۲) یعنی اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، آپ ہر برائی سے پاک ہیں، میں ظلم کرنے والوں میں داخل ہو گیا ہوں : (مطلب ہو کہ مجھ پر رحم فرمائیے) (قرطبی)

قائدہ: حضرت آدم و حوا سے جو اجتہادی سنسز یا بحول صادر ہوئی ہے، اولاً تو قرآن حکیم نے دونوں ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے، فَازِلْمَنَا الشَّيْطَانُ حَتَّىٰ فَاخْرَجَنَا مِنْهَا (۲۹۱:۱) اور زمین پر اترنے کے حکم میں بھی حضرت حوا کو شریک کر کے لفظ اُخْرِجُوا فرمایا ہے، مگر بعد میں توبہ اور قبول توبہ میں یہ لفظ مفرد صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، حضرت حوا کا نہیں، اس مقام کے علاوہ بھی اس سنسز کا ذکر صرف آدم علیہ السلام کی طرف کر کے کیا گیا ہے، فَخَصَّيْنَا آدَمَ وَغَيْرَهُ۔

ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رعایت ہو کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مستور رکھا ہے، اس لئے بطور پردہ پوشی کے گناہ اور عتاب کے ذکر میں اس کا ذکر صراحتہ نہیں فرمایا، اور ایک حسب گہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا فِي دُونِ تَوْبَةٍ كَذَلِكَ بَيَّنَّا لَكُمُ الشَّيْءَ الَّذِي كُنْتُمْ تَعْتَمِدُونَ (۲۹۱:۲) کہ حضرت حوا

کا قصور معاف نہیں ہوا، اس کے علاوہ عورت چونکہ اکثر احوال میں مرد کے تابع ہے، اس لئے اس کے مستقبل ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ (مستطبی)

تائب اور تائب میں فرق (۲۹۱:۲) قرطبی نے فرمایا کہ لفظ تَوَابٌ بندہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے إِنَّ اللَّهَ يُجِيبُ الدُّعَاءَ (۲۹۱:۲) اور اللہ تعالیٰ کیلئے بھی جیسے اس آیت میں هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ، جب بندہ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا، اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا، یہ صرف لفظ تَوَابٌ کا حکم ہے، اسی معنی کا دوسرا لفظ تَائِبٌ ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں، اگرچہ لغوی معنی کے اعتبار سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور القاب استعمال کرنا جائز ہیں، جن کا ذکر قرآن و سنت میں وارد ہے، باقی دوسرے الفاظ اگرچہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا استعمال درست نہیں۔

منہ سے توبہ قبول کرنا اختیار (۲۹۱:۲) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف کرنے کا اختیار سوائے خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں، یہ دونوں نصاریٰ اس قاعدے غفلت کی بنا پر سخت فتنہ میں

مستلا ہو گئے، کہ پادریوں اور پیسروں کے پاس جاتے، اور ان کو کچھ ہدیہ دے کر اپنے گناہ معاف کرا لیتے، اور سمجھتے تھے کہ انھوں نے معاف کر دیا تو اللہ کے نزدیک بھی معاف ہو گیا، آج بھی بہت سے نادان مسلمان اس طرح کے غلط اور خام عقیدے رکھتے ہیں، جو سراسر غلط ہیں، کوئی عالم یا مرشد کسی کے گناہ کو معاف نہیں کر سکتا، زیادہ سے زیادہ دعا کر سکتا ہے۔

آدم کا زمین پر اترنا سزا کے طور پر نہیں (۲۹۱:۲) تَلَمَّا أَهْبَطُوا مِنْهَا جَعَلْنَا بَيْنَهُمُ الْفُجْرَةَ (۲۹۱:۲) اس سے پہلے آیت میں آپکا ہوا، اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے

میں غالباً حکمت یہ ہو کہ پہلی آیت میں زمین پر اترانے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اسی لئے اس کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا، اور یہاں زمین پر اترانے کا ذکر ایک خاص مقصد خلافت الہیہ کی تکمیل کے لئے اعزاز کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کے ساتھ ہدایت بھیجنے کا ذکر جو خلافت الہیہ کے فرائض منصبی میں سے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زمین پر اترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا، مگر بعد میں جب خطا معاف کر دی گئی تو دوسری مصالح اور حکمتوں کے پیش نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا، اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا، اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تنہا بنی آدم کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جا چکا تھا، کہ زمین کے لئے آن کو خلیفہ بنانا ہے۔

دعا و غم سے نجات مرنے والوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے نواہز کو
اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے لئے دو
انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ ان پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔

خوف، آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حزن کسی مقصد
مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام
انواع و اقسام کا ان دونوں لفظوں میں ایسا احاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس
سے باہر نہیں، پھر ان دونوں لفظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز
میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ لا تحزن علیہم بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور
اس کی ضمیر فاعل کو مستم کر کے ولا تھم یحزنون فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے
کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ
کی دی ہوئی ہدایات کی مکمل پیروی کر لے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا
خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا
جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے

دریں دنیا کے بے غم نہ باشد

وگر باشد بنی آدم نہ باشد

بخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے
میں فنا کر دیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، مگر ان مجید میں دوسری جگہ
بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا آقا
پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کر دیا گیا، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (۳۷:۳۵) اس سے
معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، بجز اس شخص کے جس نے اپنا
آمل حق تعالیٰ کے ساتھ سمجھ کر اور مضبوط کر لیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجددؒ نے خوب فرمایا، کہ
جو بچنا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی
مصلحت یا کسی خواہش و مراد پر ان کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہ کی
ہیبت و جلال تو ان پر اور سب زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں
یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی دنیوی نعمت کے
فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء
و اولیاء کو بشری طور پر طبعی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاٹھی کا
سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے فَادْجَسَ فِيْ نَفْسِہِ خِیْفَۃٌ مُّؤْمِنِیۃٌ (۱۶:۲۰) کیونکہ یہ
فطری اور طبعی خوف ابتداءً حال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ تو یہ ڈر بالکل نکل گیا۔
اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس
بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں
گراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَیَ بَلَداً دِیَارِہِمْ کَیْۤیَومَ الَّذِیۡ سَیُجْزَوْنَ ہِمْ
ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے ان کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ
ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیں یعنی کفار اور مؤمنین جو
ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عملاً کیسے بھی گنہگار ہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے
کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

یٰۤیٰۤیۡسٰۤرَآءِیْلَ اِذْ کُرُوْا لِیُغَمِّیْۤیَ الْیَہٰی اَلْعَمٰتُ عَلَیْکُمْ وَاَوْفُوا

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پورا کرو

بِعَمَدِیْۤیۡ اَوْفِ بِعَمَدِکُمْ وَاِیَّایَ فَاَرْہَبُوْنِ ﴿۳۸﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَا

میرا اقرار تو میں پورا کروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو، اور امن و اس کتاب

اَنْزَلْتُ مُّصَدِّقًا لِّمَا مَعْکُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ کٰفِرِیْہِمْ وَاَوْفُوا

کو جو میں نے تمہاری ہی پہنچ بتائی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے اور مت ہو سب میں اول منکر اس کے اور

لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمٰنًا قَلِیْلًا وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَلَا تَلِیْسُوْا

نہ میری آیتوں پر مول تمہارا اور مجھ ہی سے بچتے رہو، اور مت ملاؤ

الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكُوْنُوْا الْحَقُّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

سچ میں غلط اور مت چھاؤ سچ کو جان بوجھ کر۔

خلاصہ تفسیر اے بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد)

رجا و غم سے نجات مرنے والوں کو
 کو نصیب ہوتا ہے جو اللہ کے فرشتوں کا
 ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے۔

انعام مذکور میں، ایک یہ کہ ان پر کوئی خوف نہ ہوگا، اور دوسرے وہ عین اس کے
خوف، آئندہ پیش آئے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حزن کسی مقصد
مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام
انواع و اقسام کا ان دونوں لفظوں میں ایسا احاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس
سے باہر نہیں، پھر ان دونوں لفظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز
میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ لَا حُزْنَ عَلَيْهِمْ، بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور
اُس کی ضمیر فاعل کو معتد مکر کے وَلَا أَهْلَهُمْ يَحْزَنُونَ فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے
کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ
کی دی ہوئی ہدایات کی مکمل پیروی کرنے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا
خواہ وہ بغتہ اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا
جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے

دریں دنیا کے بے غم نہا شد

وگر باشد بنی آدم نباشد

بخلات اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے میں فنا کر دیتے ہیں اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، مگر آن مجید میں دوسری جگہ بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہو گا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کر دیا گیا، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (۲۷:۳۵) اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، بجز اس شخص کے جس نے اپنا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ سمجھ لیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجددِ دہلی نے خوب فرمایا کہ وہ جو بیچنا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی مملکت یا کسی خواہش و مراد پر ان کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال تو ان پر اور سب زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی دنیوی نعمت کے فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء و اولیاء کو بشری طور پر طبعی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاشعی کا سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے **فَاَذْجَسَ فِي ثَغْبِهِ خَيْفَةً مُوسٰی** (۱۷:۱۰) کیونکہ یہ فطری اور طبعی خوف ابتداً بحال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا **لَا تَخَفْ** تو یہ ڈر بالکل نکل گیا۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں گراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ یہ بتلادیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے ان کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیں یعنی کفار اور مؤمنین جو ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عمل کیسے ہیں گنہگار ہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتتے کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

يٰٓبَنِي إِسْرَءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي اٰنَعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا

۱۔ بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پورا کرو

بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ﴿٥٠﴾ وَأَمِنُوا بِمَا

میرا اقرار تو میں پورا کروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو ، اور میں اس کتاب

أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ ۖ وَ

کو جو میں نے امانی کر چاہا، بنا سکی ہے اس کتاب کو جو محاسنِ پاسبان اور متہو سببیں اولیٰ سکھانے کے لئے

لَا تَشْرَوْا بِالَّتِي تُبْتَغَىٰ لَكُمْ وَأَيُّهَا فَاتَّقُوا ۖ وَلَا تَلْبِسُوا

(32) $\frac{1}{x^2} = x^{-2}$

الحق بالباطل ویکہوا الحق والتمسوا الحق

١٠٠٠ : البرية (يعني حضرت يعقوب عليه السلام، اولاد)

حلاصہ تفسیر

یاد کرو تم لوگ میرے ان احسانوں کو جو کہتے ہیں میں نے تم پر تاکر حق نعمت سمجھ کر ایمان لانا تمہارا لئے آسان ہو جائے، آگے اس یاد کرنے کی مراد بتلاتے ہیں، اور پورا کرو تم میرے عہد کو (یعنی تم نے جو توریت میں مجھ سے عہد کیا تھا جس کا بیان تشرآن کی اس آیت میں ہے وَ تَقَعُّ اخْتِ اٰدَمَ مِمَّا كَانَتْ بَيْنِي وَ اٰدَمَ اٰثِمًا وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَبِيًّا (الآیہ) ۱۲:۵) پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو (یعنی میں نے جو عہد تم سے کیا تھا ایمان لانے پر جیسا کہ آیت مذکورہ میں لکھا ہے) وَ تَقَعُّ اخْتِ اٰدَمَ مِمَّا كَانَتْ بَيْنِي وَ اٰدَمَ اٰثِمًا اور صرف مجھ ہی سے ڈرو راہنے عوام معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کا اعتقاد نہ رہے گا اور ان سے آمدنی بند ہو جائے گی، اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہو (یعنی تشرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے، یعنی تورات کے کتاب الہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے، اور جو اس میں تحریفات کی گئی ہیں وہ خود تورات و انجیل ہونے ہی سے خارج ہیں ان کی تصدیق اس سے لازم نہیں آتی، اور مت ہنو تم پہلے انکار کرنے والے اس تشرآن کے (یعنی تمہیں دیکھ کر جو دوسرے لوگ انکار کریں گے) اُن سب میں اَدْل بانی انکار و کفر کے تم ہو گے اس لئے قیامت تک اُن کے کفر و انکار کا وبال تمہارے نامہ اعمال میں ہی درج ہوتا ہے گا، اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاذ حقیر اور خاص مجھ ہی پر کھڑے ہو، (یعنی میرے احکام) چھوڑ کر یا اُن کو بدل کر یا چھپا کر عوام الناس سے دنیا سے ذلیل و قلیل کو وصول مت کرو، جیسا کہ اُن کی عادت تھی جس کی تصریح آگے آتی ہے وَ لَا تَلْمِزُوا النَّبِيَّ بِالْبَاطِلِ اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کرو حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے بھی ہو (کہ حق کو چھپانا بُری بات ہے)۔

معارف مسائل

رابط آیات | سورۃ بقرہ تشرآن کے ذکر سے شروع کی گئی، اور یہ بتلایا گیا کہ تشرآن کی ہدایت اگرچہ ساری مخلوق کے لئے عام ہے مگر اس سے نفع صرف مومنین اٹھائیں گے، اس کے بعد اُن لوگوں کے عذاب شدید کا ذکر فرمایا جو اس پر ایمان نہیں لاتے، ان میں ایک طبقہ کھلے کافروں اور منکروں کا تھا، دوسرا منافقین کا، دونوں کا مع ان کے کچھ حالات اور غلط کاریوں کے ذکر کیا گیا، اس کے بعد مومنین، مشرکین، منافقین کے تینوں طبقوں کو خطاب کر کے سب کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تاکید کی گئی، اور تشرآن مجید کا اہم ذکر کر کے سب کو ایمان دینے پر تلقین کر دیا، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملہ واضح کی گئی تاکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی ترغیب اور نافرمانی سے بچنے کی فکر ہو۔

پھر کفار کی درجاعتیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے کھلے کافر اور منافق، ان دونوں میں دو طرح کے لوگ تھے، ایک تو بت پرست مشرکین جو محض باپ دادوں کی رسوم کی پیروی کرتے تھے کوئی علم قدیم یا جدید ان کے پاس نہ تھا، عام طور پر ان پر بڑھ آتی تھے، جیسے عام اہل مکہ، اسی لئے تشرآن میں ان لوگوں کو اُمّیین کہا گیا ہے۔

دوسرے وہ لوگ تھے جو پچھلے انبیاء پر ایمان لاتے، اور پہلی آسمانی کتابوں تورات، انجیل وغیرہ کا علم اُن کے پاس تھا، لکھے پڑھے لوگ کہلاتے تھے، ان میں بعض حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام پر نہیں، ان کو یہود کہا جاتا تھا، اور بعض عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحیثیت نبی معصوم نہیں مانتے تھے، یہ نصاریٰ کہلاتے تھے، ان دونوں کو تشرآن میں اس بنا پر اہل کتاب کہا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتاب تورات یا انجیل پر ایمان رکھتے تھے، یہ لوگ لکھے پڑھے اہل علم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں مسترزاد و قابلِ اعتماد مانے جاتے تھے، ان کی بات اُن پر اثر انداز ہوتی تھی، یہ راستے پر آجائیں تو دوسروں کے مسلمان ہونے کی توقع بڑی تھی، مدینہ طیبہ اور اس کے قرب و جوار میں ان لوگوں کی کثرت تھی۔

سورۃ بقرہ جو مکہ مدنی سورت ہے، اس لئے اس میں مشرکین و منافقین کے بیان کے بعد اہل کتاب کو خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، چالیسویں آیت سے شروع ہو کر ایک سو تیس آیات آخر پارہ الحمد تک انہی لوگوں سے خطاب ہے، جس میں ان کو مانوس کرنے کے لئے اَدْل ان کی خاندانی شرافت اور اس سے دنیا میں حاصل ہونے والے اعزاز کا پھر اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اُن کی بے راہی اور غلط کاری پر متنبہ کیا گیا، اور صحیح راستہ کی طرف دعوت دی گئی، ان میں سے پہلی ساٹھ آیتوں میں اہل کتاب ہے، جن میں سے تین میں دعوت ایمان اور چار میں اعمال صالحہ کی تلقین ہے، اس کے بعد بڑی تفصیل سے ان کو خطاب کیا گیا، تفصیل خطاب کے شروع میں اور بالکل ختم پر، پھر اہتمام کے لئے یٰٰہِیْ اٰسْرَ اٰیْمٰیْنِ فَرَمَا کَرِ اٰنْھِیْنَ اِلَافَا کا اعادہ کیا گیا ہے جن سے شروع کیا گیا تھا، جیسا کہ کلام کو مؤثر اور وقیع بنانے کے لئے ایسا کرنے کا دستور ہے۔

یٰٰہِیْ اٰسْرَ اٰیْمٰیْنِ۔ اسرائیل عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی عبد اللہ ہیں، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نبی کے نام متعدد نہیں ہیں، صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو نام ہیں، یعقوب اور اسرائیل، تشرآن میں اس جگہ ان کو بنی یعقوب کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔

نہیں کیا، بلکہ دوسرے نام اسرائیل کا استعمال کیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ خود اپنے لقب اور نام ہی سے ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت گزار بندے کی اولاد ہیں، ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے، اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ:-

اور پورا کرو تم میرے عہد کو، یعنی تم نے جو مجھ سے عہد کیا تھا، تو ریت میں جس کا بیان بقول قتادہؓ و مجاہدؓ اس آیت میں ہے: **وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآءَ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَافِقُونَ** اِثْنَيْ عَشَرَ نَفِيسًا (ال، قُرْطُبًا حَسَنًا، دہلوی ۶، سورہ مائدہ: آیت ۱۲) اس میں سب سے اہم معاہدہ تمام رسولوں پر ایمان لانے کا شامل ہے، جن میں ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت سے داخل ہیں نیز نماز، زکوٰۃ، اور صدقات بھی اس عہد میں شامل ہیں، جن کا خلاصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کا مکمل اتباع ہے، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے (ابن جریر بسند صحیح)

پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو، یعنی اسی آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہو کہ جو لوگ اس عہد کو پورا کریں گے تو ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اور جنت میں داخل کیا جائے گا، تو حسب وعدہ ان لوگوں کو جنت کی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل تم میرا عہد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا پورا کرو، تو میں اپنا عہد تمہاری مغفرت اور جنت کا پورا کروں گا، اور صرف مجھ سے ہی ڈرو، اور عوام الناس متقدمین سے نہ ڈرو کہ ان کی منشاء کے خلاف کلمہ حق کہیں گے تو وہ متقدمین رہیں گے آمدنی بند ہو جائے گی۔

(۱) امت محمدیہ کی ایک خاص فضیلت اور اطاعت کی طرف دعوت دی ہے، اور امت محمدیہ کو جب اسی کام کے لئے دعوت دی تو احسانات و انعامات کے ذکر کے بغیر فرمایا **فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ**، یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا، اس میں امت محمدیہ کی خاص فضیلت کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کا تعلق محسن و منعم سے بلا واسطہ ہو، یہ محسن کو پہچان کر احسان کو پہچانتے ہیں، بخلاف دوسری امتوں کے کہ وہ احسانات کے ذریعہ محسن کو پہچانتے ہیں۔

(۲) ایضاً عہد واجب اس آیت سے معلوم ہوا کہ عہد و معاہدے کو پورا کرنا ضروری ہے، اور عہد شکنی اور عہد شکنی حرام ہے، سورہ مائدہ کی پہلی آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ

مضمون آیا ہے: **اَوْ كُفُّوا بِالْعُقُودِ** رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عہد شکنی کرنے والوں کو جو سزا آخرت میں ملیگی

اس سے پہلے ہی ایک سزا دی جائے گی کہ خشر کے میدان میں چپاں تمام اولین و آخرین کا اجتماع ہوگا عہد شکنی کرنے والے پر ایک جھنڈا بطور علامت کے لگا دیا جائے گا، اور جیسی بڑی عہد شکنی کی ہے اسی جیسی یہ جھنڈا بلند ہوگا، اس طرح ان کو میدان خشر میں رسوا اور شرمندہ کیا جائے گا (صحیح مسلم عن سعید)

(۳) جو شخص کسی گناہ یا ثواب کا سبب بنتا ہو اس پر **اَذَلَّ** کا فہرہ ہوگا، کافر ہونا خواہ سب سے پہلے ہو یا بعد بھی کرنے والوں کا گناہ یا ثواب کھٹا جاتا ہے

یہ فرمایا کہ پہلے کافر بنو، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جو شخص اول کفر اختیار کرے گا تو بعد میں اس کو دیکھ کر جو بھی کفر میں مبتلا ہوگا اس کا وبال جو اس شخص پہ پڑے گا، اس پہلے کافر بھی اس کا وبال آئے گا، اس طرح یہ پہلا کافر اپنے کفر کے علاوہ بعد کے لوگوں کے کفر کا سبب بنکر ان سب کے وبال کفر کا بھی ذمہ دار ٹھہرے گا، اور اس کا عذاب چند در چند ہو جائے گا۔

فَاَذَلَّ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دنیا میں دوسروں کے لئے کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب بنتا ہے تو جتنے آدمی اس کے سبب مبتلائے گناہ ہوں گے ان سب کا گناہ ان لوگوں کو بھی ہوگا اور اس شخص کو بھی، اسی طرح جو شخص دوسروں کے لئے کسی نیکی کا سبب بن جائے تو جتنے آدمی اس کے سبب نیکی عمل کریں گے، اس کا ثواب جیسا ان لوگوں کو ملے گا ایسا ہی اس شخص کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، و شرآن مجید کی متعدد آیات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔

(۴) **وَلَا تَقْسُرُوا بِالْيَمِينِ قَسَمًا قَلِيلًا**، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے میں قیمت لینے کی ممانعت کا مطلب وہ ہے جو آیت کے سابق لسانی سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی مرضی اور ان کی اغراض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر یا چھپا کر لوگوں سے پیسے لئے جائیں، یہ فعل باجماع امت حرام ہے۔

(۵) تعلیم شرآن پر رہا یہ معاملہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی آیات صحیح صحیح بتلا کر یا پڑھا کر اس کی اجرت لینا کیسا اجرت لینا جائز ہے؟ اس کا تعلق آیت مذکورہ سے نہیں، خود یہ مسئلہ اپنی جگہ قابل غور و بحث ہو

کہ تعلیم شرآن پر اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں، فقہاء امت کا اس میں اختلاف ہے، امام مالکؒ شافعیؒ و احمد بن حنبلؒ جائز قرار دیتے ہیں، اور امام عظیم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ منع فرماتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرآن کو ذریعہ کسب معاش کا بنانے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن متاخرین حنفیہ نے بھی جب ان حالات کا شاہدہ کیا، کہ شرآن مجید کے معلمین کو اسلامی بیت المال سے گزارہ ملا کرتا تھا، اب ہر جگہ اسلامی نظام میں فتور کے سبب ان معلمین

کو عموماً کچھ نہیں ملتا، یہ اگر اپنے معاش کے لئے کسی محنت مزدوری یا تجارت وغیرہ میں لگ جائیں تو بچوں کو تعلیم و تشریح کے سلسلہ میں بند ہو جائے گا، کیونکہ وہ دن بھر کا مشغلہ چاہتا ہے، اس لئے تعلیم و تشریح پر توجہ لینے کو بضرورت جائز قرار دیا، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے کہ آجکل اسی پر فتویٰ دینا چاہئے، کہ تعلیم و تشریح پر اجرت و توجہ لینا جائز ہے، صاحب ہدایہ کے بعد آنے والے دوسرے فقہاء نے بعض ایسے ہی دوسرے وظائف جن پر تعلیم و تشریح کی طرح دین کی بقاء موقوف ہو، مثلاً امامت و اذان اور تعلیم حدیث و فقہ وغیرہ کو تعلیم و تشریح کے ساتھ ملحق کر کے ان کی بھی اجازت دی (رد مختار، شامی)

(۱۶) ایصالِ ثواب کے لئے ختمِ قرآن پر علامہ شامی نے درمختار کی شرح میں اور اپنے رسالہ شفا بعلیلِ اجرت لینا باعفاقِ حجاز نہیں میں بڑی تفصیل اور قوی دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی کہ تعلیم و تشریح وغیرہ پر اجرت لینے کو جن متاخرین فقہاء نے جائز قرار دیا ہے اس کی علت ایک ایسی دینی ضرورت ہے جس میں غفلت آنے سے دین کا پورا نظام مختل ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدود رکھنا ضروری ہے، اس لئے مُردوں کو ایصالِ ثواب کیلئے ختمِ قرآن کرنا یا کوئی دوسرا وظیفہ پڑھوانا اجرت کے ساتھ حرام ہے، کیونکہ اُس پر کسی عام دینی ضرورت کا مدار نہیں، اور اجرت لیکر پڑھنا حرام ہو تو اس طرح پڑھنے والا اور پڑھوانے والا دونوں گناہگار ہوں گے، اور جب پڑھنے والے ہی کو کوئی ثواب نہ ملا تو میت کو وہ کیا پہنچائے گا، علامہ شامی نے اس بات پر فقہاء کی بہت سی تصریحات تاج الشریعہ، عینی شرح ہدایہ، حاشیہ خیر الدین بر بحر الرائق وغیرہ سے نقل کی ہیں، اور خیر الدین رملی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایصالِ ثواب کے لئے قبر پر تشریح پڑھوانا یا اجرت دے کر ختمِ قرآن کرنا صحابہ و تابعین اور اسلافِ امت سے کہیں منقول نہیں، انہیں بدعت ہے (شامی، ص ۱۴۷، ج ۱)

(۱۷) حق بات کو چھپانا! اس میں آیت دَلَّا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ الْخ سے ثابت ہوا کہ حق بات کو غلط حیل سے مٹا کر ناحسرام ہو۔ باتوں کے ساتھ گڈمڈ کر کے اس طرح پیش کرنا جس سے مخاطب مغالطہ میں پڑ جائے جائز نہیں، اسی طرح کسی خوت یا طبع کی وجہ سے حق بات کا چھپانا بھی حرام ہے، مسئلہ واضح ہو، اس میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں، امام تشرطی نے اپنی تفسیر میں حق کو چھپانے سے پرہیز کرنے کا ایک واقعہ اور مفصل مکالمہ حضرت ابو حازم تابعی اور خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کا نقل کیا ہے، جو بہت سے فوائد کی وجہ سے قابلِ ذکر ہے۔

حضرت ابو حازم تابعی سلیمان بن عبد الملک مدینہ طیبہ سے اور جبندہ زقیام کیا تو لوگوں سے دریافت کیا کہ مدینہ طیبہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے

کسی صحابی کی صحبت پائی ہو؟ لوگوں نے بتلایا، ہاں ابو حازم ایسے شخص ہیں، سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کر اُن کو بلوایا، جب وہ تشریف لائے تو سلیمان نے کہا کہ اے ابو حازم یہ کیا ہے مروتی اور بیوفائی ہے؟ ابو حازم نے کہا، آپ میری کیا بے مروتی اور بیوفائی دیکھی ہے؟ سلیمان نے کہا کہ مدینہ کے سب سے بڑے لوگ مجھ سے ملنے آئے، آپ نہیں آئے، ابو حازم نے کہا، امیر المؤمنین میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں جو واقعہ کے خلاف ہے، آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقعہ تھے اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا، ایسے حالات میں خود ملاقات کے لئے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیوفائی کیسی!

سلیمان نے جواب سنکر ابنِ شہاب زہریؒ اور حاضر مجلس کی طرف التفات کیا، تو امام زہریؒ نے فرمایا کہ ابو حازم نے صحیح فرمایا، آپ نے غلط کی۔

اس کے بعد سلیمان نے رُودے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کئے اور کہا اے ابو حازم! یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو دیران اور دنیا کو آباد کیا ہے، اس لئے آبادی سے دیران میں جانا پسند نہیں۔

سلیمان نے تسلیم کیا، اور پوچھا کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کیسے ہوگی؟ فرمایا کہ نیک عمل کرنے والا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح جائے گا جیسا کوئی مسافر سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے، اور بُرے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہوگا، جیسا کوئی بھانگا ہوا غلام بچہ کر آقا کے پاس حاضر کیا جاتے۔

سلیمان یہ سنکر رو پڑے، اور کہنے لگے کاش میں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے، ابو حازم نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب پر پیش کر دو تو تہ لگ جائیگا سلیمان نے دریافت کیا کہ تشریح کی کس آیت سے یہ پتہ لگے گا؟ فرمایا اس آیت سے، اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ قَدْ اَتَتْ الْفُجَّارَ لَعْنَةُ الْجَحِيْمِ (۱۳۱-۱۳۲) یعنی بلاشبہ نیک عمل کرنے والے جنت کی نعمتوں میں ہیں، اور نافرمان گناہ شعار دوزخ میں۔

سلیمان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی ہے، وہ بکاروں پر بگڑا دی ہے، فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۵۶) یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے۔

سلیمان نے پوچھا اے ابو حازم اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ کون عزت والا ہے؟ فرمایا وہ لوگ جو موت اور عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔ پھر پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا کہ فرائض و اجابات کی ادائیگی حرام چیزوں

سے بچنے کے ساتھ۔

پھر دریافت کیا کہ کونسی دعا زیادہ قابل قبول ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص پر احسان کیا گیا ہو اس کی دعا اپنے محسن کے لئے اقرب الی القبول ہے۔

پھر دریافت کیا کہ صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ ہو سکے، اس طرح خرچ کرنا کہ نہ اس سے پہلے احسان جتائے اور نہ مال مٹول کر کے ایذا پہنچائے۔

پھر دریافت کیا کہ کلام کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص سے تم کو خوف ہو یا جس سے تمہاری کوئی حاجت ہو اور امید وابستہ ہو اس کے سامنے بغیر کسی رو رعایت کے حق بات کہہ دینا۔ پھر دریافت کیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ ہوشیار ہو؟ فرمایا وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت کام کیا ہو، اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔

پھر پوچھا کہ مسلمانوں میں کون شخص احمق ہو؟ فرمایا وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں امداد کرے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دوسرے کی دنیا درست کرنے کے لئے اپنا دین بچ دیا، سلیمانؑ نے کہا کہ صحیح منسرایا۔

اس کے بعد سلیمانؑ نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا کہ ہمارے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابو حازمؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے، سلیمانؑ نے کہا کہ نہیں، آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں۔

ابو حازمؒ نے فرمایا، اے امیر المؤمنین تمہارے آباء و اجداد نے بڑی شمشیر لوگوں پر تسلط کیا، اور زبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت قائم کی، اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا، اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، کاش! آپ کو معلوم ہو تاکہ اب وہ مرنے کے بعد کیا کہتے ہیں، اور ان کو کیا کہا جاتا ہے۔

حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابو حازمؒ کی اس صاف گوئی کو مستحکم کہا کہ ابو حازمؒ تمہارے یہ بہت بری بات کہی ہے، ابو حازمؒ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، بری بات نہیں کہی، بلکہ وہ بات کہی جس کا ہم کو حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ حق بات لوگوں کو بتلائیں گے چھپائیں گے نہیں، لَنْ يَنْتِفِعَ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْفُرُوا قُلُوبَهُمْ (۲۸: ۲)۔ یہیں وہ بات ہے جس کے لئے یہ طویل حکایت امام قرطبی نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں درج فرمائی ہے۔

سلیمانؑ نے پھر سوال کیا کہ اچھا اب ہمارے درست ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ منسرایا کہ

مجتہد چھوڑ دو، عروت نہ تیار کرو، اور حقوق والوں کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ تقسیم کر دو۔ سلیمانؑ نے کہا کہ ابو حازمؒ کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں، منسرایا، خدا کی پناہ سلیمانؑ نے پوچھا یہ کیوں؟ فرمایا کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال و دولت اور عورت و جاہ کی طرف کچھ مائل ہو جاؤں جس کے نتیجے میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔

پھر سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہو تو بتلائیے کہ ہم اس کو پورا کریں؟ فرمایا: ہاں ایک حاجت ہے کہ جہنم سے نجات دلاؤ اور جنت میں داخل کرو، سلیمانؑ نے کہا کہ یہ تو میرے اختیار میں نہیں منسرایا کہ پھر مجھے آپ سے اور کوئی حاجت مطلوب نہیں۔

آخر میں سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا میرے لئے دعا کیجئے، تو ابو حازمؒ نے یہ دعا کی، یا اللہ اگر سلیمانؑ آپ کا پسندیدہ ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی بہتری کو آسان بنائے، اور اگر وہ آپ کا دشمن ہو تو اس کے بال بچہ کو اپنی مرضی اور محبوب کاموں کی طرف لے آ۔

سلیمانؑ نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت فرمادیں، ارشاد فرمایا کہ مختصر یہ ہے کہ اپنے رب کی غفلت و حسلال اس درجہ میں رکھو کہ وہ تمہیں اس مقام پر نہ دیکھے جس سے منع کیا ہے، اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا اس نے حکم دیا ہے۔

سلیمانؑ نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد تنوگتیاں بطور ہدیہ کے ابو حازمؒ کے پاس بھیجیں، ابو حازمؒ نے ایک خطا کے ساتھ ان کو واپس کر دیا، خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ تنوگتیاں میرے کلمات کا معاوضہ ہیں تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے، اور اگر اس لئے بھیجا ہے کہ بیت المال میں میرا حق ہے تو مجھ جیسے ہزاروں علماء اور دین کی خدمت کرنے والے ہیں، اگر سب کو آپ نے اتنا ہی دیا ہے تو میں بھی لے سکتا ہوں اور نہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

ابو حازمؒ کے اس ارشاد سے کہ اپنے کلمات نصیحت کا معاوضہ لینے کو خون اور خنزیر کی طرح قرار دیا ہے اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس طاعت و عبادت کا معاوضہ لینا ان کے نزدیک جائز نہیں۔

وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۲۱۶﴾

اور قائم رکھو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور مجھو نمازیں مجھنے والوں کے ساتھ

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَسْلُونَ

کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو پڑھتے ہو

الْكِتَابِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۲۶۱﴾ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ لِذِكْرِ

کتاب پھر کیوں نہیں سمجھتے ہو، اور مدد چاہو صبر سے اور نماز سے اور

إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿۲۶۲﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ

البتہ وہ بھاری ہے مگر اپنی عاجزوں پر جن کو خیال ہے کہ وہ روبرو ہونے والے

مُلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿۲۶۳﴾

ہیں اپنے رب کے اور یہ کہ اُن کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور قائم کرو تم لوگ نماز کو دینی مسلمان ہو کر اور دو رکعت کو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ علماء بنی اسرائیل کے بعض اقارب مسلمان ہو گئے تھے جب ان سے گفتگو ہوتی تو خفیہ طور پر یہ علماء اُن سے کہتے تھے کہ بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں ہم لوگ تو کسی مصلحت سے مسلمان نہیں ہوتے، مگر تم اس مذہب اسلام کو نہ چھوڑنا، اسی بناء پر حق تعالیٰ نے فرمایا کیا غضب ہو کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو دینی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی دینی توریت کی جس میں جا بجا ایسے عالم بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے اور مدد لو دینی اگر تم کو حُب مال و حُب جاہ کی وجہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو مدد لو صبر اور نماز سے دینی ایمان لا کر صبر اور نماز کا التزام کرو تو یہ حُب مال و جاہ دل سے نکل جائے گی، اور اگر کوئی کہے کہ خود نماز اور صبر کا التزام بہت دشوار ہے تو میں نے کہ اور بیشک وہ نماز دشوار فرماتے ہیں مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بیشک اپنے رب سے اپنے رب کے واسطے بات کا بھی خیال رکھتے ہیں وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں تو ان کو اس کا حساب کتاب بھی دینا ہو گا ان دونوں خیالوں سے رغبت بھی پیدا ہوگی خوف بھی اور یہی دو چیزیں ہر عمل کی روح ہیں۔

معارف و مسائل

ربط آیات | بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلایا ایمان اور عمل صالح

کی طرف دعوت دی ہے، پچھلی تین آیتوں میں ایمان و عقائد سے متعلق ہدایات تھیں، اور ان چار آیتوں میں اعمال صالحہ کی تلقین ہے، اور ان میں جو اعمال سب سے زیادہ اہم ہیں ان کا ذکر ہے، اور حاصل مطلب آیات کا یہ ہے کہ ————— اور اگر تم کو حُب مال و جاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو اس کا علاج یہ ہو کہ صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو، صبر سے حُب مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال اسی وجہ سے مطلوب محبوب ہے کہ وہ ذریعہ ہے لذات و شہوات کے پورا کرنے کا جب ان لذات و شہوات کی مطلق الدنائی چھوڑنے پر ہمت باندھ لو گے، تو پھر مال کی فسادانی کی ضرورت نہیں ہے گی نہ اُس کی بھنت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے، اور نماز سے حُب جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پستی اور عاجزی ہی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو حُب جاہ و منصب اور تکبر و عشرت گئے گا، اصل مادہ فساد جس کے سبب ایمان لانا دشوار تھا یہی مال و جاہ کی بھنت تھی، جب یہ مادہ فساد گھٹ گیا تو ایمان لانا آسان ہو جائے گا۔

اب سمجھئے کہ صبر میں تو صرف غیر ضروری خواہشات اور شہوات کا ترک کرنا ہے، اور نماز میں بہت افعال کا واقع کرنا بھی ہے، اور بہت سی جائز خواہشات کو بھی وقتی طور پر ترک کرنا ہو گا مثلاً کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا پھرنا، اور دوسری انسانی ضروریات جو شرعاً جائز و مباح ہیں ان کو بھی نماز کے وقت ترک کرنا ہے، اور وہ بھی اوقات کی پابندی کے ساتھ دن رات میں پانچ مرتبہ، اس لئے نماز نام ہو کچھ افعال معینہ کا، اور معین اوقات میں تمام ناجائز و جائز چیزوں سے صبر کرنے کا۔

غیر ضروری خواہشات کے ترک کرنے پر انسان ہمت باندھ لے تو چند روز کے بعد طبعی تقاضا بھی ختم ہو جاتا ہے، کوئی دشواری نہیں رہتی، لیکن نماز کے اوقات کی پابندی اور اس کے تمام شرائط کی پابندی اور ضروری خواہشات سے بھی ان اوقات میں پرہیز کرنا یہ انسانی طبیعت پر بہت بھاری اور دشوار ہے، اس لئے یہاں پیشہ ہو سکتا ہے کہ ایمان کو آسان بنانے کا جو نسخہ تجویز کیا گیا کہ صبر اور نماز سے کام لو، اس نسخہ کا استعمال خود ایک دشوار چیز ہے خصوصاً نماز کی پابندیوں کا تو اس دشواری کا کیا علاج ہو گا! اس کے لئے ارشاد فرمایا، بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے، مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، اس میں نماز کے آسان کرنے کی ترکیب بتلا دی گئی۔

حاصل یہ ہو کہ نماز میں دشواری کی وجہ اور سبب پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ انسان کا قلب ہو کر میدان خیال میں آزاد پھرنے کا، اور سب اعضائے انسانی قلب کے تابع ہیں، اس لئے قلب کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اس کے سب اعضا بھی آزاد ہیں، اور نہ اس میں اس آزادی کے خلاف

ہے کہ نہ ہنسوں نہ لوؤ نہ کھاؤ نہ پیو نہ چلو وغیرہ وغیرہ اس لئے قلب ان تقیدات سے تنگ ہوتا ہے اور اس کے تابع اعضاء انسان بھی اس سے تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہو کہ سبب اس دشواری اور گرانی کا قلب کی حرکت فکر یہ ہے، تو اس کا علاج سکون سے ہونا چاہئے، اس لئے خشوع کو نماز کے آسان ہونے کا ذریعہ بتایا گیا، کیونکہ خشوع کے معنی ہی سکون قلب کے ہیں، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سکون قلب یعنی خشوع کس طرح حاصل ہو تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو کہ اگر کوئی شخص اپنے قلب کے مختلف افکار و خیالات کو براہ راست نکالنا چاہے تو اس میں کامیابی قریب بحال ہو، بلکہ اس کی تدبیر یہ ہو کہ نفس انسانی چونکہ ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر اس کو کسی ایک خیال میں محو دست خرق کر دیا جائے تو دوسرے خیالات اور افکار خود بخود دل سے نکل جائیں گے، اس لئے تلقین خشوع کے بعد وہ خیال بتلاتے ہیں جس میں مستغرق ہو جانے سے دوسرے خیالات دفع ہوں، اور ان کے دفع ہونے سے حرکت فکر یہ قلب کی منقطع ہو کر سکون حاصل ہو، اور سکون سے نماز میں آسانی ہو کر اس پر مداومت اور پابندی نصیب ہو، اور اس پابندی سے کبر و غرور اور حب جاہ کم ہو، تاکہ ایمان کے رستہ میں جو حائل ہے وہ دور ہو کر ایمان کا مل ہو جائے، سبحان اللہ کیا مرتب علاج اور مطلب ہے۔

اب اس خیال مذکور کی تلقین و تعیین اس طرح فرمائی: وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب، تو اس وقت اس خدمت کا خوب انعام ملے گا، اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں، تو اس وقت اس کا حساب و کتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالوں سے رغبت و درہیت یعنی امید اور خوف پیدا ہوں گے، ازل تو ہر خیال محو میں مستغرق ہو جانا قلب کو نیک کام پر جا دیتا ہو، خصوصاً امید و ہرجا خیال، اس کو تو خاص طور پر دخل ہے نیک کام میں مستعد کر دینے کے لئے۔

اِقْبِسُوا الصَّلَاةَ صَلَوةً كَ لَفْظِ مَعْنٰی دَعَا کے ہیں، اصطلاح شرع میں وہ خاص عبادت ہے جس کو نماز کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں عموماً نماز کی جتنی تہذیب و تاکید کی گئی ہے لفظ اقامت کے ساتھ آئی ہے، مطلق نماز پڑھنے کا ذکر صرف ایک دو جگہ آیا ہے، اس لئے اقامت صَلَوة کی حقیقت کو سمجھنا چاہئے، اقامت کے لفظی معنی سیدھا کرنے اور ثابت رکھنے کے ہیں، اور عادت جو عموماً بار بار یا درخت وغیرہ سیدھا کرنا ہوتا ہے وہ قائم رہتا ہے، مگر جانے کا خطرہ کم ہوتا ہے اس لئے اقامت کے معنی دائم اور قائم کرنے کے بھی آتے ہیں۔

قرآن و سنت کی اصطلاح میں اقامت صَلَوة کے معنی نماز کو اس کے وقت میں پابندی کے ساتھ اس کے پورے آداب و شرائط کی رعایت کر کے ادا کرنا ہیں، مطلق نماز پڑھ لینے کا نام اقامت

صَلَوة نہیں ہے، نماز کے جتنے فضائل اور آثار و برکات قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ سب اقامت صَلَوة کے ساتھ مقید ہیں، مثلاً قرآن کریم میں ہے:

اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاۃِ وَالْمُنْكَرِ - (۲۵: ۱۲۹)

یعنی نماز انسان کو ہر بے حیائی اور ہر برے کام سے روک دیتی ہے۔

نماز کا یہ اثر اسی وقت ظاہر ہوگا جب کہ نماز کی اقامت اس معنی سے کرے جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں اس لئے بہت سے نمازیوں کو بڑائیوں اور بے حیائیوں میں مبتلا دیکھ کر اس آیت پر کوئی مشتبہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ ان لوگوں نے نماز پڑھی تو ہے مگر اس کو قائم نہیں کیا۔

اَتُوا الزَّكَاةَ، لفظ زکوٰۃ کے معنی لغت میں دُواتے ہیں، پاک کرنا اور بڑھانا، اصطلاح شریعت میں مال کے اس حصہ کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق کسی مال میں نکالا جائے اور اس کے مطابق صرف کیا جائے۔

اگرچہ یہاں خطاب موجودہ بنی اسرائیل کو ہے جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نماز اور زکوٰۃ اسلام سے پہلے بنی اسرائیل پر فرض تھی، مگر سورہ مائدہ میں وَلَقَدْ آتَيْنَا نُوْحًا اِيْمَانًا وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَبِيًّا وَقَالَ اللهُ اِنِّي مَعَكُمْ ذَلِكُمْ اَقِمُّوا الصَّلَاةَ (۱۲: ۵) الخ سے ثابت ہو کہ نماز اور زکوٰۃ بنی اسرائیل پر فرض تھی، اگرچہ اس کی کیفیت اور ہیئت وغیرہ میں فرق ہو۔

وَاَنْ لَّكُم مِّنَ الشَّيْءِ الَّذِي تَرَكَتُ الْاَوَّلٰى رُكُوْعٌ - رکوع کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں، اور اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ سجدہ پر بھی بولا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ بھی جھکنے کا انتہائی درجہ ہے، مگر اصطلاح شرع میں اس خاص جھکنے کو رکوع کہتے ہیں جو نماز میں معرود و مشہور ہے۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ رکوع کر دو رکوع کرنے والوں کے ساتھ: یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ نماز کے تمام ارکان میں سے اس جگہ رکوع کی تخصیص کیوں کی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نماز کا ایک جز، بول کر رکوع نماز مطلقاً گئی ہے، جیسے قرآن مجید میں ایک جگہ قُرْآنَ الْعَجْرِیْنِ مَرَّاراً پوری نماز فجر مراد ہے، اور بعض روایات حدیث میں سجدہ کا لفظ بول کر پوری رکعت یا نماز مراد لی گئی ہے، اس لئے مراد آیت کی یہ ہو گئی کہ نماز پڑھنا نماز پڑھنے والوں کے ساتھ، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ نماز کے بہت سے ارکان میں سے رکوع کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟

جواب یہ ہو کہ یہود کی نماز میں سجدہ وغیرہ تو تھا، مگر رکوع نہیں تھا، رکوع اسلامی نماز کی خصوصیات میں سے ہے، اس لئے راكِعین کے لفظ سے امت محمدیہ کے نمازی مراد ہوں گے، جن کی نماز میں رکوع بھی ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم بھی امت محمدیہ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو، یعنی اول ایمان قبول کرو پھر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو۔

اجاعت نماز کے احکام | نماز کا حکم اور اس کا مندرجہ ہونا تو لفظ "آفَقُوا الصَّلَاةَ" سے معلوم ہو چکا تھا، اس جگہ مَعَ الشَّرَائِعِ کے لفظ سے نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم کس درجہ کا ہے؟ اس میں علماء فقہاء کا اختلاف ہے، ایک جماعت صحابہ و تابعین اور فقہائے امت کی جماعت کو واجب قرار دیتی ہے، اور اس کے چھوڑنے کو سخت گناہ اور بعض صحابہ کرام تو اس نماز ہی کو جائز قرار نہیں دیتے جو بلا غرض شرعی کے بدون جماعت پڑھی جاتے، یہ آیت ظاہری الفاظ کے اعتبار سے ان حضرات کی حجت ہے، جو وجوب جماعت کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ چند روایات حدیث سے بھی جماعت کا واجب ہونا سمجھا جاتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:

لَا صَلَاةَ لِبَعْدِ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ (رواہ ابو داؤد) | "یعنی مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز صرف مسجد ہی میں جائز ہے۔"

اور مسجد کی نماز سے ظاہر ہے کہ جماعت کی نماز اور اگر تو الفاظ حدیث سے یہ مطلب نکلا کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے جائز نہیں۔

مسجد کے سوا کسی اور جگہ جماعت | اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ منقول ہے کہ ایک نابینا صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا اور لیجا کرے، اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں نماز گھر میں پڑھ لیا کر دوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازل توان کو اجازت دیدی، مگر جب وہ جانے لگے تو سوال کیا کہ کیا اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہنچتی ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ اذان کی آواز تو میں سنتا ہوں، آپ نے فرمایا پھر تو آپ کو مسجد میں آنا چاہئے، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پھر میں آپ کے لئے کوئی گھانٹاں اور رخصت نہیں پاتا (آخر جہ ابو داؤد)۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَمِيعَ الْيَتَامَاةَ فَلَهُ يُجِبُ | "یعنی جو شخص اذان کی آواز سنتا ہے اور عجمًا قَلَا صَلَاةَ لَهُ إِلَّا مِنْ عُلْبٍ" | مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں بھٹی مگر یہ کہ اس کو کوئی عذر شرعی ہو۔" (صحیحہ القرطبی)

ان احادیث کی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابو موسیٰ اشعرؓ وغیرہ حضرات صحابہؓ نے یہ فتویٰ دیا کہ جو شخص مسجد سے اتنا قریب رہتا ہے کہ اذان کی آواز وہاں تک پہنچتی ہے تو اگر وہ بلا غرض کے جماعت میں حاضر نہ ہوا تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی (آواز سننے سے مراد یہ ہے کہ متوسط آواز والے آدمی کی آواز وہاں پہنچ سکے، آلہ مکر الصوت یا غیر معمولی بلند آواز کا اس میں اعتبار نہیں)۔

یہ سب روایات ان حضرات کی دلیل ہیں جو جماعت کو واجب قرار دیتے ہیں، مگر جمہور امت علماء فقہاء صحابہؓ و تابعینؓ کے نزدیک جماعت سنت مؤکدہ ہے، مگر سنن مؤکدہ میں سنت فجر کی طرح سب سے زیادہ مؤکدہ اور قریب بوجوب ہے، ان سب حضرات نے قرآن کریم کے امر و نہی کو مَعَ الشَّرَائِعِ کے لفظ سے سمجھا اور روایات کی بناء پر تاکید کے لئے قرار دیا ہے۔ اور جن احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے ہوتی ہی نہیں، اس کا یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ یہ نماز کامل اور مقبول نہیں، اس معاملے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان بہت واضح اور کافی ہے جس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

فقہہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ کل (مشرقی) اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے تو اس کو چاہئے کہ ان (پانچ) نمازوں کے ادا کرنے کی پابندی اس جگہ کرے جہاں اذان دی جاتی ہے، (یعنی مسجد) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ ہدایت کے طریقے بتلائے ہیں، اور ان پانچ نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا انہی سنن حدی میں ہے، اور اگر تم نے یہ نمازیں اپنے گھر میں پڑھ لیں، جیسے یہ جماعت سے الگ رہنے والا اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے (کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ بیٹھو گے، اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دیا تو تم گمراہ ہو جاؤ گے (اور جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح پاکی حاصل کرے) پھر کسی مسجد کا رخ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر نیکی اس کے نامہ اعمال میں درج فرماتے ہیں، اور اس کا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں، اور ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں، اور ہم نے اپنے نبی کو ایسا پایا ہے کہ منافقین بین اتفاق کے سوا کوئی آدمی جماعت سے الگ نماز نہ پڑھتا تھا، یہاں تک کہ بعض حضرات کو غرور اور بیماری میں بھی دوا دمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

اس بیان میں جس طرح باجماعت نماز کی پوری تاکید اور اہمیت و ضرورت کا ذکر ہے اسی کے ساتھ اس کا یہ درجہ بھی بیان فرما دیا کہ وہ سنن ہدی میں سے ہے، جس کو فقہاء سنت مؤکدہ کہتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص عذر شرعی مثلاً مرض وغیرہ کے بغیر تنہا نماز پڑھ لے، اور جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کی نماز تو ہو جائے گی، مگر سنت مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے مستحق عتاب ہوگا، اور اگر ترک جماعت کی عادت بنائے تو سخت گنہگار ہے، خصوصاً اگر ایسی صورت ہو جائے کہ مسجد دیران رہے اور لوگ گھروں میں نماز پڑھیں تو یہ شبہ مستحتمل نہیں، اور قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ ایسے لوگ اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو ان سے قتال کیا جائے (قرطبی ۲/۸ ج ۱)۔

بے عمل و اعظم کی مذمت | اَنَا مُرُودٌ النَّاسِ بِالْبِرِّ وَتَنَسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ، اس آیت میں خطا اگرچہ علمائے یہود سے ہے، ان کو ملامت کی جا رہی ہے، کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے رہو، اور دین اسلام پر قائم رہو (جو علامت ہو اس بات کی کہ علمائے یہود دین اسلام کو یقینی طور پر حق سمجھتے تھے) مگر خود نفسانی خواہشات سے اتنے مغلوب تھے کہ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن معنی کے اعتبار سے یہ ہر اس شخص کی مذمت ہے جو دوسروں کو تو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دے، مگر خود عمل نہ کرے، دوسروں کو خدا سے ڈرائے، مگر خود نہ ڈرے، ایسے شخص کے بارے میں احادیث میں بڑی ہولناک وعیدیں آئی ہیں، حضرت انسؓ سے روایت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شب معراج میرا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی لپچھوں سے کترے جا رہے تھے میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا یہ کون ہیں! جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے دنیا دار و داعظ ہیں، جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے تھے، مگر اپنی خیر نہ لیتے تھے (ابن کثیر)

ابن عساکر نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض جنتی بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھ کر پوچھیں گے کہ تم آگ میں کیوں نہ گر بیٹھے ہو؟ حالانکہ ہم تو بخدا انہی نیک اعمال کی بدولت جنت میں داخل ہوئے ہیں جو ہم نے تم سے سیکھے تھے، اہل دوزخ کہیں گے، ہم زبان سے کہتے ضرور تھے، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے (ابن کثیر)

سبا فاسق و عظ و نصیحت نہیں کر سکتا! لیکن مذکورہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لئے دوسروں کو عظ و نصیحت کرنا جائز نہیں، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے، اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے، اور ظاہر ہو کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے، جیسے ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی ترک کر دے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دوسروں کو نماز پڑھنے کے لئے بھی نہ کہے، اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہو، اور اپنے زیر اثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دوسرا گناہ ہے، اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے۔ (روح المعانی) چنانچہ امام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر ایک شخص مسوئکر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار ہوں، جب گناہوں سے خود پاک ہو جاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کروں گا، تو تجویز یہ نیکے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا، کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے بالکل پاک ہو! حضرت حسنؓ کا ارشاد ہو کہ شیطان تو بھی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ

چھوڑ بیٹھیں (قرطبی) بلکہ حضرت سیدہ حکیم الامتؒ تھانویؒ تو فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے اپنی کسی بری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی مذمت اپنے موعظ میں خاص طور سے بیان کرتا ہوں، تاکہ عظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔

خلاصہ یہ ہو کہ آیت اَنَا مُرُودٌ النَّاسِ بِالْبِرِّ وَتَنَسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کا مطلب یہ نہیں ہو کہ بے عمل آدمی کو عظ کہنا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہو کہ داعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہیے، اور دلوں میں فرق واضح ہو، مگر یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ بے عمل ہونا تو داعظ کیلئے جائز ہو نہ غیر داعظ کیلئے پھر داعظ کی تخصیص کیوں؟ جواب یہ ہے کہ ناجائز تو دونوں کے لئے ہے، مگر داعظ کا جرم غیر داعظ کے جرم کے مقابلے میں زیادہ سنگین اور زیادہ قابل ملامت ہو، کیونکہ داعظ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے، اس کے پاس بدعت نہ نہیں ہوتا کہ مجھے اس کا جرم ہونا معلوم نہ تھا، برخلاف غیر داعظ کے اور ان پڑھ جاہل کے کہ اس کو خواہ علم حاصل نہ کرنے کا الگ گناہ ہو، لیکن ارتکاب گناہ میں اس کے پاس کسی درجہ میں عذر موجود ہوتا ہے، کہ مجھے معلوم نہ تھا، اس کے علاوہ عالم اور داعظ اگر کوئی حبس کرنا ہے تو یہ دین کے ساتھ ایک قسم کا ہتھکڑی ہے، چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا ان پڑھ لوگوں کو معاف کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کرے گا۔ (روافعیاتی بیاریاں) حُب مال اور حُب جاہ، یہ دونوں قلب کی ایسی بیماریاں ہیں جن کے باعث انسان اور ان کا علاج کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی! اور غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تاریخ میں اب تک جتنی انسانیت سوز لڑائیاں لڑی گئیں اور جو فساد برپا ہوئے، ان میں سے اکثر و بیشتر کو انہی دو بیماریوں نے جنم دیا تھا۔

حُب مال کے نتائج یہ نکلتے ہیں،

۱۔ بخوس اور بخل پیدا ہوتا ہے جس کا ایک قومی نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، دوسرا نقصان خود اس کی ذات کو پہنچتا ہے، کہ معاشیہ میں کوئی ایسے شخص کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

۲۔ خود غرضی پیدا ہوتی ہے جو مال کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے آئے ہشیار میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، رشوت ستانی، محروم فریب اور دغا بازی کے نت نئے حیلے نکھاتی ہے، وہ اپنی تجوری پہلے سے زیادہ بھرنے کے لئے دوسروں کا خون نچوڑ لینا چاہتا ہے، بالآخر سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔

۳۔ ایسے شخص کو کتنا ہی مال مل جائے لیکن مزید کمانے کی دھن ایسی سوار ہوتی ہے کہ تفریح اور آرام کے وقت بھی یہی بے چینی اُسے کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح اپنے سرمایہ میں زیادہ سے زیادہ

نیت کرے، باقی نماز میں اگر خشوع حاصل نہ ہو تو اگرچہ اتنی نماز کا ثواب اُسے نہیں ملے گا جتنے حصہ میں خشوع نہیں رہا، لیکن فقہ کی رو سے وہ تارکِ صلوٰۃ نہیں کہلائے گا، اور نہ اُس پر تعزیر وغیرہ کے وہ احکام مرتب ہوں گے جو تارکِ صلوٰۃ پر لگتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ فقہاء باطنی احوال اور قلبی کیفیات پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ وہ تو صرف اعضائے ظاہرہ کے اعمال پر ظاہری احکام بیان کرتے ہیں، یہ بات کہ فلاں عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا یا نہیں، یہ فقہ کی حدود سے خارج ہے، تو چونکہ باطنی کیفیات پر حکم لگانا ان کی بحث سے خارج ہے، اور خشوع ایک باطنی کیفیت ہے، اس لئے انہوں نے خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہیں دیا، بلکہ خشوع کے ادنیٰ مرتبہ کو شرط کیا، اور وہ یہ کہ کم از کم تکبیر تحریمہ کے وقت بعض اللہ کی عبادت و تعظیم کی نیت کر لے۔

خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہ دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی دوسری آیات میں تشریع احکام کا یہ واضح اصول بتا دیا گیا ہے، کہ انسانوں پر کوئی ایسی چیز فرض نہیں کی جاتی جو انکی طاقت و امکان سے باہر ہو، اور پوری نماز میں خشوع برقرار رکھنے سے ماسوا چند خاص افراد کے اکثر لوگ عاجز ہوتے ہیں، اس لئے تکلیف بالالطاف سے بچنے کے لئے پوری نماز کی بجائے صرف ابتدا و صلوٰۃ میں خشوع کو شرط قرار دیا گیا۔

نماز خشوع کے بغیر بھی امام غزالیؒ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ خشوع کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود بالکل بے فائدہ نہیں ہیں اللہ سے یہی امید ہے کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھو والا بھی بالکل تارکِ صلوٰۃ کے درجہ میں نہیں، کیونکہ بہر حال اُس نے ادا سے فرض کا اقدام تو کیا ہے، اور تھوڑی سی دیر کے لئے قلب کو اللہ کے لئے فانی بھی کیا، کہ کم از کم نیت کے وقت تو صرف اللہ ہی کا دھیان تھا، ایسی نماز کا کم سے کم فائدہ یہ ضرور ہے کہ اس کا نام ناسرمانوں اور بے نمازوں کی فہرست سے نکل گیا۔

مگر دوسری حیثیت سے یہ خوفناک ہے کہ کہیں غافل کی حالت تارک سے بھی زیادہ بُری نہ ہو، کیونکہ جو غلام آقا کی خدمت میں حاضر ہو کر آقا سے بے توجہی برتنا اور تحقیر آمیز لہجہ میں کلام کرتا ہے اس کی حالت اُس غلام سے زیادہ شدید ہے جو خدمت میں حاضر ہی نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ معاملہ بزم ورجاء کا ہے، عذاب کا خوف بھی ہے اور بخشش کی امید بھی، اس لئے غفلت و تساہل کو چھوڑنے کے لئے اپنی معتد در بھر کو بخشش کرتے رہنا چاہئے، وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ۔

يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآءِیْلُ اذْكُرُوْا اِنْعَمَتِیْ اَلَّتِیْ اٰمَنْتُ بِكُمْ وَاَتٰی فِضْلُكُمْ
اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے احسان جو میں نے تم پر کئے اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی

عَلَى الْعَالَمِیْنَ ۝ وَاتَّقُوا یَوْمًا لَا تَجْزِیْ فِیْهِ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا

تمام عالم پر، اور ڈرو اس دن سے کہ کما نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور قبول نہ ہو اس کی

شَفَاعَةٌ وَلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ یُنصَرُونَ ۝

طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے اس کی طرف سے بدلہ اور نہ اُن کو مدد پہنچے۔

خلاصہ تفسیر: اے اولاد یعقوب! (علیہ السلام) کی تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو (تاکہ شکر اور اطاعت کی تحریک ہو) جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی، اور اس ربات کو (یاد کرو)

کہ میں نے تم کو (خاص خاص برائیاں) تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی، اور ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے تم کو ایک بڑے حصہ مخلوق پر فوقیت دی تھی، مثلاً اس زمانہ کے لوگوں پر۔

فاصلہ کا:۔ اس آیت میں خطاب چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے پیروؤں کو ہے، اور عموماً ایسا ہوتا ہے، کہ باپ دادا پر جو احسان و اکرام کیا جائے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے، جس کا عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کو بھی اس آیت میں مخاطب سمجھا جاسکتا ہے۔

اور دوسرے دن سے کہ (جس میں) نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکتا ہو، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے، جبکہ خود اس شخص میں ایمان نہ ہو جس کی سفارش کرتا ہے، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جاسکتا ہے، اور نہ اُن لوگوں کی طرف داری چل سکے گی۔

فاصلہ کا:۔ آیت میں جس یوم کا ذکر ہوا اس سے قیامت کا دن مراد ہے، مطالبہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز روزہ کا مطالبہ ہو، اور دوسرا کہہ دے کہ میرا نماز روزہ لے کر اس کا حساب بیاں کر دیا جائے، اور معاوضہ یہ کہ کچھ مال وغیرہ داخل کر کے بچا لائے، سو دونوں باتیں نہ ہوں گی، اور بدون ایمان کے سفارش قبول نہ ہونے کو جو فرمایا ہے تو اور آیتوں سے معلوم ہوا کہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایسوں کی خود سفارش ہی نہ ہوگی، جو قبول کی گنجائش ہو، اور طرف داری کی صورت یہ ہوتی ہو کہ کوئی زوردار، حمایت کر کے زبردستی کمال لائے۔

غرض یہ کہ دنیا میں مدد کرنے کے جتنے طریقے ہوتے ہیں بدون ایمان کے کوئی طریقہ بھی نہ ہوگا۔

وَ اِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اِلٰی فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْکُمْ سُوْعَ الْعَذَابِ یَذُبُّوْکُمْ

اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ رہائی دی ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے جو کہتے تھے تم کو بڑا عذاب دے دیتے تھے

اَبْنَاءُکُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَاءَکُمْ وَ فِیْ ذٰلِکُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّکُمْ

تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی

عَظِيمٌ ۵۱

طرف سے بڑی

خلاصہ تفسیر | اوپر جن خاص برتاؤں کا حوالہ دیا ہے اب یہاں سے اُن کی تفصیل بیان کرنی شروع کی، پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ رہائی دی ہم نے تم لوگوں کے آباء و اجداد کو متعلقین فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری دل آزاری کے، گلے کاٹنے تھے تمہاری اولاد (وڈو) کے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو (لڑکیوں کو کہ زندہ رہ کر بڑی عورتیں ہو جائیں) اور اس واقعہ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا ایک بڑا بھاری امتحان تھا۔

فائدہ: کسی نے فرعون سے پیشینگوئی کر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا ایسا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی، اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اس لئے اُن سے کچھ تعرض نہیں کیا، دوسرے اس میں اس کا اپنا ایک مطلب بھی تھا کہ اُن عورتوں سے ماماگری اور خدمت گاری کا کام لیتا تھا، سو یہ عنایت بھی اپنے مطلب کے لئے تھی۔

اور اس واقعہ سے یا تو یہ ذبح و قتل مذکور مراد ہے، اور مصیبت میں صبر کا امتحان ہوتا ہے، اور بارہائی دنیا مراد ہے جو کہ ایک نعمت ہے، اور نعمت میں شکر کا امتحان ہوتا ہے، اور اس نجات دینے کی تفصیل آگے بیان سنائی۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ

اور جب بھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھر بچا دیا ہم نے تم کو اور ڈوب دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم

تَنْظُرُونَ ۵۱ وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ

دیکھ رہے تھے اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنایا

الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ۵۲

بجھڑا موسیٰ کے بعد اور تم ظالم تھے

خلاصہ تفسیر | اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ شق کر دیا ہم نے تمہارے (رستہ دینے کی) وجہ سے دریا سے شور کو پھر ہم نے (ڈوبنے سے) بچا لیا تم کو اور غرق کر دیا متعلقین فرعون

کو (مع فرعون کے) اور تم (اس کا) معائنہ کر رہے تھے۔

فائدہ: یہ قصہ اس وقت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو کر پیغمبر ہو گئے، اور مدتوں فرعون کو سمجھاتے رہے، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو خفیہ طور پر لے کر یہاں چلے جاؤ، راستہ میں دریا حائل ہوا، اور اسی وقت پیچھے سے فرعون بھی مع لشکر آپہنچا حق تعالیٰ کے حکم سے دریا شق ہو گیا اور بنی اسرائیل کو گزرنے کا راستہ مل گیا، یہ تو بار ہو گئے، فرعون کے پیچھے تک دریا اسی طرح رہا، وہ بھی تعاقب کی غرض سے اس میں گھس گیا، اس وقت سب طرف سے دریا سمٹ کر اپنی سابق حالت پر ہو گیا، اور فرعون اور اس کے ساتھی سب یہاں ہی غرق ہو کر ختم ہو گئے۔

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے رتوریت دینے کا ایک مدت گزرنے پر جس میں دس رات کا اضافہ ہو کر) چالیس رات کا زمانہ ہو گیا تھا، پھر تم لوگوں نے دستکش کے لئے تجویز کر لیا گو سالہ کو موسیٰ (علیہ السلام) کے (جانے کے) بعد اور تم نے اس تجویز میں صریح ظلم پر مکر باندھ رکھی تھی کہ ایسی بے جا بات کے قائل ہو گئے تھے۔

فائدہ: یہ قصہ اس وقت ہوا جب فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل بقول بعض مصر میں واپس آکر پہنچے گئے، یا بقول بعض کسی اور مقام پر پھر گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے عرض کیا کہ اب ہم بالکل مطمئن ہو گئے، اگر کوئی شریعت ہمارے لئے مقرر ہو تو اس کو اپنا دستور العمل بنائیں، موسیٰ علیہ السلام کی عرض پر حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تم کو وہ طور پر آکر ایک مہینہ ہماری عبادت میں مشغول رہو، ایک کتاب تم کو دیں گے، آپ نے ایسا ہی کیا، اور تورات آپ کو مل گئی، مگر دس روز مزید عبادت میں مشغول رہنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ روزہ رکھنے کے بعد افطار فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کا راتھ (جو غلو سے معدہ کی تجویز سے پیدا ہو جاتا ہے) پسند ہوا اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ دس روزے اور رکھیں تاکہ وہ راتھ پھر پیدا ہو جائے، اس طرح یہ چالیس روزے پورے ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام تو یہاں رہے، اور وہاں ایک شخص سامری نامی تھا، اس نے چاندی یا سونے کا ایک بچھڑے کا قالب بنا کر اس کے اندر وہ مثل جو اس نے جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے اٹھا کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی ڈال دی، اُس بچھڑے میں جان پڑ گئی، اور جب بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۵۲

پھر معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر | پھر بھی ہم نے (تمہاری توبہ کرنے پر) درگزر کیا، تم سے اتنی بڑی بات ہوئے

پچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ ۱۰: اس توبہ کا بیان آگے کی تیسری آیت میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ کے اس توقع رکھنے کا مطلب نمونہ اللہ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کو شک تھا، بلکہ مطلب یہ کہ یہ درگزر کرنا ایسی چیز ہے کہ دیکھنے والوں کو شکر گزاری کی توقع کا گمان ہو سکتا ہے۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵۶﴾

اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناحق سے جدا کرنے والے احکام تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ

خلاصہ تفسیر اور (دو زمانہ یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (توریت) دی اور فیصلہ کی چیز، اس توقع پر کہ تم راہ چلتے رہو۔

فائدہ ۱۱: فیصلہ کی چیز یا تو ان احکام شرعیہ کو کہا جو توریت میں لکھے ہیں، (کیونکہ) شرع سے تمام اعتقادی اور عملی اختلافات کا فیصلہ ہو جاتا ہے، یا معجزوں کو کہا کہ ان سے سچے جھوٹے دعویٰ کا فیصلہ ہوتا ہے، یا خود توریت ہی کو کہدیا کہ اس میں کتاب ہونے کی صفت بھی ہے اور فیصل ہونے کی صفت بھی۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ إِنكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا

بَاتِعَاذِكُمُ الْعَجَلُ فَتَوْبُوا إِلَىٰ بَارِعِكُمْ فَأَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ

بے ہمت بنا کر سو اب توبہ کر اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان

ذِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِعِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ

یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر متوجہ ہوا تم پر بیشک وہی ہے

التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۵۷﴾

معاف کرنے والا نہایت مہربان۔

خلاصہ تفسیر اور (دو زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اسی میری قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اس کو سالہ پرستی کی جوڑے سے سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو پھر بعض آدمی (جنہوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی) بعض آدمیوں کو (جنہوں نے

گوسالہ پرستی کی) قتل کرو یا یہ (عمل درآمد) تمہارے لئے بہتر ہوگا، تمہارے خالق کے نزدیک، پھر اس عمل درآمد کرنے سے حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے، بے شک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

فائدہ ۱۲: یہ اس طریق کا بیان ہے جو ان کی توبہ کے لئے تجویز ہوا، یعنی مجرم لوگ قتل کئے جائیں جیسا ہماری شریعت میں بھی بعض گناہوں کی سزا باوجود توبہ کے بھی قتل و جان ستانی مقرر ہے، مثلاً قتل عمد کے عوض قتل اور ثبوت زنا بالشہادۃ پر رجم، کہ توبہ سے یہ سزا ساقط نہیں ہوتی، چنانچہ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا، جس کی وجہ سے آخرت میں مورد رحمت و عنایت ہو گئے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ بَهْرَةً فَأَخَذْنَاكُم

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز یقین نہ کریں گے تیرا جب تک کہ نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے پھر آیا

الصُّحُفَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۵۸﴾

تم کو: بھلے اور تم دیکھ رہے تھے

خلاصہ تفسیر اور (دو زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے دیوں کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہارے کہنے سے ہرگز نہ مانیں گے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) یہاں تک کہ ہم (خود) اللہ تعالیٰ کو علانیہ

طور پر دیکھ لیں، سو اس غستاخی پر تم پر کوک بھل کی آپڑی، اور تم اس بھل کا آنا، آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

فائدہ ۱۳: اس کا قصہ اس طرح ہوا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے توریت لا کر

پیش کی، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، تو بعض گستاخ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ خود ہم سے کہہ دے کہ یہ

ہماری کتاب ہے توبہ شک ہم کو یقین آجائے گا، موسیٰ علیہ السلام نے باذن الہی فرمایا کہ کوہ طور پر چلو

یہ بات بھی ہو جائے گی، بنی اسرائیل نے اس کام کے لئے شتر آدمی منتخب کر کے موسیٰ علیہ السلام کے

ساتھ کوہ طور پر روانہ کئے، وہاں پہنچنے پر اللہ تعالیٰ کا کلام ان لوگوں نے خود سنا، تو اس وقت اور رنگ

لائے کہ ہم کو تو کلام سننے سے قناعت نہیں ہوتی، خدا جانے کون بول رہا ہوگا، اگر خدا کو دیکھ لیں تو

بے شک مان لیں، چونکہ دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتا، اس لئے اس

غستاخی پر ان پر بھلی آپڑی، اور سب ہلاک ہو گئے، (ہلاکت کے متعلق اگلی آیت میں بیان ہے)

ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُشْكِرُونَ ﴿۵۹﴾

پھر اٹھا کر آیا ہم نے تم کو مر گئے پچھے تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر

پھر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے) تم کو زندہ کراٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ:۔ موت کے لفظ سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس پہل سے مر گئے تھے، اُن کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا قصہ یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ بنی اسرائیل میں ہی برگمان رہتے ہیں، اب وہ یہ سمجھیں گے کہ میں نے اُن کو کہیں لیا کر کسی تدبیر کے ساتھ ان کا کام تمام کرا دیا ہوگا، مجھ کو اس جہمت سے محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کو پھر زندہ کر دیا۔

وَلَقَدْ نَاغَلَيْكُمْ الْغَمَامَ وَانْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوٰی

اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا اور آٹا منہ پر من اور سلوی

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوا اَنْفُسَهُمْ

کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دیں اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی

يَظْلِمُونَ ﴿۵۴﴾

نقصان کرتے رہے

خلاصہ تفسیر

اور سایہ لگن کیا ہم نے تم پر ابر کو (میدان تہ میں) اور (خزائنہ غیب سے) پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بلیریں (اور تم کو اجازت دی کہ) کھاؤ لغیں چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں، (مگر وہ لوگ اس میں بھی خلاف بات کر بیٹھے) اور (اس سے) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

فائدہ:۔ دونوں قصے وادی تہ میں واقع ہوئے، وادی تہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا اہل وطن ملک شام ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں مقرر آئے تھے، اور یہاں ہی رہ پڑے، اور ملک شام میں عاتق نامی قوم کا تسلط ہو گیا، فرعون جب غرق ہو گیا اور یہ لوگ مطمئن ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم ہوا کہ عاتق سے چا کر دو، اور اپنی اہل جگہ کو اُن کے قبضہ سے چھڑالو، بنی اسرائیل اس ارادہ پر مقرر چلے، اور اُن کی حدود میں پہنچ کر جب عاتق کے زور و قوت کا حال معلوم ہوا تو جہت ہار بیٹھے اور چہارے صاف انکار کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس انکار کی عیسزادی کہ چالیس برس تک ایک میدان میں سرگرداں و پریشان پھرتے رہے، گھر پہنچا بھی نصیب نہ ہوا۔ یہ میدان کچھ بہت بڑا رقبہ نہ تھا، بلکہ مقرر اور شام کے درمیان پانچ چھ کوس یعنی تقریباً دس میل

کا رقبہ تھا، روایت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن مقرر جانے کے لئے دن بھر سفر کرتے، اور رات کو کسی منزل پر اترتے صبح کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں، اسی طرح چالیس سال سرگرداں و پریشان اس میدان میں پھرتے رہے، اسی لئے اس میدان کو وادی تہ کہا جاتا ہے، تہ کے معنی ہیں سرگردانی اور پریشانی کہ یہ وادی تہ ایک کھلا میدان تھا، نہ اس میں کوئی عمارت تھی نہ درخت، جس کے نیچے دھوپ اور سردی اور گرمی سے بچا جاسکے، اور نہ یہاں کوئی کھانے پینے کا سامان تھا، نہ پہننے کے لئے لباس، مگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اسی میدان میں اُن کی تمام ضروریات کا انتظام فرمادیا، بنی اسرائیل نے دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید رقیق ابر کا سایہ کر دیا، اور مہلک کا تقاضا ہوا تو منہ سلوی نازل فرمادیا، یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز برکثرت پیدا کر دی، یہ لوگ اس کو جمع کر لیتے، اسی کو منہ کہا گیا ہے، اور بلیریں اُن کے پاس جمع ہو جاتیں، اُن سے بھانگی نہ تھیں، یہ اُن کو کپڑا لیتے، اور ذبح کر کے کھاتے، اسی کو سلوی کہا گیا ہے، یہ لوگ دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھر لیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی، اور بلیریں کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہو، لہذا اس حیثیت سے دونوں چیزیں خزانہ غیب کے تشرار دی گئیں، اُن کو بانی کی ضرورت پیش آئی تو موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر لاشی مارنے کا حکم دیا گیا اس پتھر سے چٹے پتھر پڑے، جیسا کہ دوسری آیات قرآنی میں مذکور ہے، ان لوگوں نے رات کی اندھیری کا شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک روشنی عمودی شکل میں ان کے محلہ کے درمیان قائم فرمادی، کپڑے میلے ہوئے اور پھٹنے لگے اور لباس کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بطور اعجاز یہ صورت کر دی کہ اُن کے کپڑے نہ میلے ہوں نہ پھٹیں اور بچوں کے بدن پر جو کپڑے ہیں وہ ان کے بدن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس مقدار سے بڑھتے رہیں۔ (تفسیر قرطبی)

اور اُن لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ بقدر خرچ لے لیا کریں، آئندہ کے لئے جمع کر کے نہ رکھیں مگر ان لوگوں نے حرص کے مائے اس میں بھی خلاف کیا، تو رکھا ہوا گوشت مٹرنا شروع ہو گیا، اسی کو فرمایا ہے کہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَاَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

اور جب ہم نے کہا داخل ہو اس شہر میں اور کھاؤ پھر اس میں جہاں چاہو

رَعْدًا وَاَدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ

زراعت سے اور داخل ہو دروازے میں سجد کرتے ہوئے اور کہتے جاؤ بخند تو تمہارا گناہ ہم تمہارے قصو

وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۸﴾

اور زیادہ بھی دیں گے نیک والوں کو

خلاصہ تفسیر اور وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس کی چیزوں میں سے جس جگہ تم رغبت کر رہے ہو، اور یہ بھی حکم دیا کہ جب اندر جانے لگو تو دروازہ میں داخل ہونا (عاجزی سے) جھکے جھکے اور زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) ہم معاف کر دیں گے تمہاری (پچھلی) خطائیں تو سب کی اور مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو۔

فائدہ ۱۔ بقول شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قصہ بھی زمانہ وادی تیرہ کا ہے کہ جب من و سلوی کھاتے کھاتے اُکٹا گئے اور اپنے معمولی کھانے کی درخواست کی (جیسا آگے کی چوتھی آیت میں آ رہا ہے) تو ان کو ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا تھا کہ وہاں کھانے پینے کی اور معمولی چیزیں ملیں گی، سو یہ حکم اس شہر کے اندر جانے کے متعلق ہے، اس میں قولی اور فعلی ادب داخل ہونے کے متعلق بیان کیا گیا، اور اندر جا کر کھانے پینے میں توسیع کی گئی، اس قول پر بہت سے بہت یہ کہا جاسکے گا کہ قصہ کے بیان میں تقدم و تاخر ہو گیا، کہ بعد کا قصہ پہلے بیان ہوا اور پہلے کا بعد میں، تو یہ اشکال اُس وقت ہوتا جب قرآن مجید میں خود قصوں کا بیان کرنا مقصود اصلی ہوتا، اور جب نظر نتائج پر ہے تو اگر ایک قصہ کے اجزاء میں ہر جزو کا نتیجہ جدا ہو، اور اُن نتائج کے کسی اثر کا لحاظ کر کے جزو مقدم کو مؤخر اور جزو مؤخر کو مقدم کر دیا جائے تو اس میں نہ کوئی مضائقہ ہے، اور کوئی اشکال۔ دیگر مفسرین حضرات نے اس حکم کو اس شہر کے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا، اور بعد مدت تیرہ کے پھر اس پر جہاد ہوا، اور وہ فتح ہوا، اس وقت یوشع علیہ السلام نبی تھے، یہ حکم ان کی معرفت اس شہر کے بارے میں ہوا تھا۔

قول اذل کی بناء پر پچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کر لینا مناسب جزو من و سلوی چھوڑ کر معمولی کھانوں کے متعلق کی گئی تھی، مطلب یہ ہو گا کہ یہ درخواست تھی گوستاخی، لیکن خیر اب اگر اس ادب اور حکم کو بجالائے تو اس کو محاف کر دیں گے، اور ہر قول پر یہ معافی تو سب کہنے والوں کے لئے عام ہوگی، اور جو اخلاص سے اعمال صالحہ کریں گے اُن کا انعام اس کے علاوہ ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَىٰ

پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلافت اس کے کہ جو کہ دی گئی تھی ان سے پھر اُتارا، ہم نے

الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۵۹﴾

ظالموں پر عذاب آسمان سے اُن کی عدول حکمی پر۔

خلاصہ تفسیر اور بدل ڈالا اُن ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلافت تھا اس کلمہ کے جس کے کہنے کی اُن سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک سادی آفت اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔

فائدہ ۱۔ یہ آیت آیت سابقہ کا تتمہ ہے، وہ کلمہ خلافت یہ تھا کہ حِطَّةً بمعنی توبہ کی حسرت ازراہ تمسخر حِطَّةً فِي شَيْئٍ مَّا كَانُوا يَفْسُقُونَ (یعنی غلط درمیان جو کہے) کہنا شروع کیا، وہ آفت سادی طاعون تھا، جو حدیث کی رو سے بے حکموں کے لئے عذاب اور حکمرانوں کے لئے رحمت ہے، اس شرارت کی اُن کو یہ سزا ملی کہ ان میں طاعون پھوٹ پڑا اور بہت سے آدمی فنا ہو گئے، بعضوں نے ہلاک شدگان کی تعداد ستر ہزار تک بتائی ہے۔ (قرطبی)

معارف و مسائل

کلام میں لفظی تغیر و تبدل اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں حِطَّةً کا حکم شرعی یعنی توبہ توبہ کہتے ہوئے داخل ہوں، انھوں نے شرارت سے ان الفاظ کو بدل کر حِطَّةً کہنا اختیار کیا، اس کی وجہ سے اُن پر آسمانی عذاب نازل ہوا، یہ الفاظ کی تبدیلی ایسی تھی کہ جس میں صرف الفاظ ہی نہیں بدلے، بلکہ معنی بھی بالکل الٹ گئے، حِطَّةً کے معنی توبہ یعنی گناہوں کو نظر انداز کرنے کے تھے، اور حِطَّةً کے معنی گندم کے ہیں، جس کا کلمہ مامور یہاں کوئی تعلق نہیں، الفاظ کی ایسی تبدیلی خواہ فسران میں ہو یا حدیث میں، یا اور کسی امر الہی میں بلاشبہ اور بالاتفاق حرام ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا استہزاء یا تحریف ہے، اسی پر یہ عذاب نازل ہوا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ معنی اور مقصود کو محفوظ رکھتے ہوئے صرف الفاظ کی تبدیلی کا کیا حکم ہے؟ امام فخری نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ بعض کلمات اور اقوال میں معنی کی طرح الفاظ بھی مقصود اور ادب عبارت کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ایسے اقوال میں لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں، جیسے اذان کے الفاظ مقررہ کے بجائے اسی معنی کے دوسرے الفاظ پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح نماز میں جو دعائیں مثلاً سبحانک ایلہم، التَّحِيَّاتُ، دعائے قنوت، یا تسبیحات رکوع و سجود، جن الفاظ سے منقول ہیں انہیں الفاظ میں اور اگر ضروری ہے، دوسرے الفاظ میں اگرچہ معنی وہی محفوظ بھی رہیں مگر تبدیلی جائز نہیں، اسی طرح تمام فسران کریم کے الفاظ کا یہی حکم ہے، کہ تلاوت قرآن سے جو احکام

متعلق ہیں وہ صرف اپنی الفاظ کے ساتھ ہیں، جو قرآن کریم کے نازل ہوئے ہیں، اگر کوئی ان الفاظ کا ترجمہ دوسرے لفظوں میں کر کے پڑھے جس میں معنی بالکل محفوظ رہیں اس کو اصطلاح شریعت میں تلاوت قرآن نہ کہا جائے گا، اور نہ اس پر وہ ثواب حاصل ہوگا جو قرآن پڑھنے پر مقرر ہے کہ ایک حرف پر دس نیکیاں بھی جاتی ہیں، کیونکہ قرآن صرف معنی کا نام نہیں بلکہ معنی اور الفاظ نازل شدہ کے مجموعہ کو قرآن کہا جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں قَبَّلَی الْاَیْمَنِ لَكُمْ مَوْ اَقْرَ لَا غَیْرَ الَّذِیْ قَبِلَ لَهْمُ کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو توبہ کے لئے جو الفاظ حقیقہ کے بتلائے گئے تھے یہ الفاظ بھی ماحول تھے، ان کا بدلنا خود بھی گناہ تھا، پھر تبدیلی ایسی کر دی کہ معنی ہی الٹ گئے، اس لئے عذاب آسمانی کے مستحق ہو گئے۔

لیکن جن اقوال اور کلمات میں اصل مقصود معنی ہی ہیں، الفاظ مقصود نہیں ان میں اگر لفظی تبدیلی ایسی کی جائے کہ معنی پر کوئی اثر نہ پڑے وہ پوری طرح محفوظ رہیں تو جہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک یہ تبدیلی جائز ہے، بعض حضرات محدثین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی لفظی تبدیلی کو بھی جائز نہیں کہتے، مشرطین نے امام مالک، شافعی، امام اعظم ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنی بھی جائز ہے، مگر مشرطیہ ہے کہ روایت کرنے والا عربی زبان کا ماہر اور مواقع خطاب اور جس ماحول میں حدیث وارد ہوئی ہے اس سے پوری طرح واقف ہو کر اس کی غلطی سے معنی میں فرق نہ آجائے۔

اور ائمہ حدیث کی ایک جماعت جس طرح الفاظ حدیث سے ہیں اسی طرح نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کوئی لفظی تغیر و تبدل جائز نہیں رکھتے، محمد بن سیرین، قاسم بن محمد وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض حضرات کا تعامل یہ ہے کہ اگر راوی حدیث نے کوئی لفظ نقل کرنے میں کوئی لغوی غلطی بھی کی ہے تو اس سے سننے والے کو اس غلطی کے ساتھ روایت کرنا چاہئے اپنی طرف سے تغیر نہ کرے، اس کے ساتھ یہ ظاہر کر دے کہ میرے خیال میں صحیح لفظ اس طرح ہے، مگر مجھے روایت اس طرح پہنچی ہے، ان حضرات کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ جب سونے کے لئے بستر پر جائے تو یہ دعا پڑھے، اَمْسُکَ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ نِیْ اَنْزَلْتُ وَبِیَسْطِیْکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتُ، اس شخص نے تَبِیْطَ کی جگہ وَتَوَلَّی پڑھ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی ہدایت فرمائی کہ لفظ تَبِیْطَ پڑھا کرے جس سے معلوم ہوا کہ لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

نَصَرَ اللّٰهُ اَمْرًا سَمِیْعًا مَّعَالِیْقِیْ
فَبَلَّغْهَا کَمَا سَمِعْتَهَا۔

تین اللہ تعالیٰ اُس شخص کو سرسبز و شاداب کے
جس پر کوئی کلام اُسناد بھرا اُس کو اسی طرح پہنچا دیا
جس طرح سنا تھا۔

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جن الفاظ سے سنا تھا اپنی لفظوں سے پہنچانا مراد ہے۔

مگر جہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک اگرچہ اولیٰ اور افضل تو یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے حدیث کی روایت میں ٹھیک وہی الفاظ نقل کرے جو سنے ہیں، اپنے قصد سے اُن میں تبدیلی نہ کرے، لیکن اگر وہ الفاظ پوری طرح یاد نہیں ہے تو ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں نقل کر دینا بھی جائز ہے، اور حدیث بلخبر کما سمعہا کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو مضمون سنا ہے وہی بعینہ نقل کر دے، اس کے مفہوم میں کوئی تسرق نہ آئے، الفاظ کی تبدیلی اس کے منافی نہیں، امام قرطبی نے اس کی تائید میں سرایا کہ خود ہی حدیث اس کی دلیل ہے کہ الفاظ کی تبدیلی بضرورت جائز ہے، کیونکہ خود اس حدیث کی روایت ہی ہم تک مختلف الفاظ سے پہنچی ہے۔

اور پہلی حدیث میں جو لفظ رسول کے بجائے نبیؐ ہی پڑھنے کا امر فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لفظ نبیؐ میں صفت مدح بہ نسبت رسولؐ کے زیادہ ہے، کیونکہ رسولؐ کا لفظ تو قائل کے معنی میں دوسروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ نبیؐ کے کہ وہ خاص اسی منصب کیلئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو بذریعہ وحی خطاب کرنے کا عطا کیا جاتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ دعاؤں میں الفاظ منقولہ کا اتباع خواص و آثار کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں وہ خاصیت نہیں رہتی (قرطبی) اسی کو عامل حضرات جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں وہ اس کی بڑی رعایت کرتے ہیں کہ جو الفاظ منقول ہیں ان میں تغیر و تبدل نہ کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادعیہ ماثورہ بھی اسی قسم اول میں داخل ہیں، جن میں معنی کے ساتھ الفاظ مخصوصہ کی حفاظت بھی مقصود ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

وَ اِذْ اسْتَسْقٰی مُوسٰی لِقَوْمِہٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاکَ الْحَجَرَ

اور جب ہانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو ہم نے کہا مار اپنے عصا کو پتھر پر

فَاَنْفَجَرَتْ مِنْہٗ اثْنَتَا عَشْرَۃً عِیْنًا قَدْ عَلِمَ کُلُّ اَنْاسٍ مَّشْرِیْمُہُمْ

سو پتھر نکلے اس سے بارہ چشمے، پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ ۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۚ

کھاؤ اور پیو اللہ کی روزی اور نہ پھر د ملک میں فساد مچاتے ۔

خلاصہ تفسیر اور وہ زمانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے

اس عصا کو نلایں پھر بارود اس سے پانی نکل آوے گا، پس عصا پتھر پر مارنے کی دیر تھی، فوراً اس سے بارود نکل پھوٹ نکلا، اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو کھاؤ اور پینے کو پیو، اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد اعتدال سے مت نکلو، فساد و فتنہ کرتے ہوئے سر زمین میں۔

فائدہ ۱۔ یہ قصہ بھی وادی تیبہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہ چٹے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے انسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چٹے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من و سلوکی اور پینے سے مراد ہی پانی تھا، اور انسرائیلی اور ترک احکام کو تنہا و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاصی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق اور معجزات کا انکار ہیبت بڑی غلطی ہے، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بیداد قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پسپا کر دی ہو کہ اجسزا بزمین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق چل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظریہ محض سطحی نظر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو بھی کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو واللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھتے۔

معارف مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے استسقاء کی دعا فرمائی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا، کہ پتھر پر لائیں مارنے سے چٹے ابل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ استسقاء کی اصل دعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعا پر استسقاء کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد ہے کہ استسقاء کی اصل پانی کے لئے دعا کرنا ہے، یہ دعا بھی خاص نماز استسقاء کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز استسقاء کے لئے عید گاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعا کرنا منقول ہے، اور کہیں ایسا ہی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعا پر استسقاء کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس کی روایت منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ استسقاء خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعا کی صورت میں اس کے موثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عبودیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی انسرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعا کے انتظار کا کسی کو حق نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول انسر مائیں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ بہار و اسطر

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا

اپنی در و دھار سے کہ نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور گلڑی اور گیہوں

وَعَدَاسِهَا وَبَصِلِهَا قَالِ اتَّسَبَّدَ لَوْ أَنَّ الَّذِي هُوَ آذِنِي بِالْأَمْرِ

اور مسرور اور پیاد، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ أَهْطُوا مَضًى فَإِنَّ لَكُمْ مِمَّا سَأَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

بھرتی، اُڑو کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی اُن پر ذلت

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءَ وَبَغَضَ مِنْ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

اور محتاجی اور پھرے اللہ کا غصہ لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بِغَيْرِ الْحَقِّ

نہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝۱

کھاؤ اور پو اللہ کی روزی اور نہ پھر د ملک میں فساد مچاتے ۔

خلاصہ تفسیر اور وہ زمانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے

اس عصا کو نلایں پھر بارو اس سے پانی نکل آوے گا، پس عصا پھر بارو نے کی دیر تھی، فوراً اس سے بارو چٹے پھوٹ نکلے، اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو کھاؤ اور پینے کو پیو، اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد اعتدال سے مت نکلو، فساد و فتنہ کرتے ہوئے سر زمین میں۔

فائدہ کا۔ یہ قصہ بھی وادی تیبہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہ چٹے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے انسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چٹے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من و سلوکی اور پینے سے مراد ہی پانی تھا، اور انسرائیلی اور ترکب احکام کو کتنے و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاصی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق اور معجزات کا انکار ہیبت بڑی غلطی ہے، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بیداد قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پسیدہ کر دی ہو کہ اجسزاہ زمین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق چل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظریہ محض سطحی نظر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزا ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو بھی کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو واللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھتے۔

معارف مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے استسقاء کی دعا انسرائیلی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا، کہ پتھر پر لائیں مارنے سے چٹے ابل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ استسقاء کی اصل دعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعا پر استسقاء کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد ہے کہ استسقاء کی اصل پانی کے لئے دعا کرنا ہے، یہ دعا بھی خاص نماز استسقاء کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز استسقاء کے لئے عید گاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعا کرنا منقول ہے، اور کہیں ایسا ہی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعا پر استسقاء کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس کی روایت منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ استسقاء خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعا کی صورت میں اس کے موثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عیوبیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی انسرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعا کے انتظار کا کسی کو حق نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول انسرائیلیں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ بہار و اسطر

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا

اپنی در و دھار سے کہ نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور گلڑی اور گیہوں

وَعَدَاسِهَا وَبَصِلِهَا قَالِ اتَّسَبَّدَ لَوْ أَنَّ الَّذِي هُوَ آذِنِي بِالْأَمْرِ

اور مسرور اور پیاد، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ أَهْطُوا مَصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مِمَّا سَأَلْتُمْ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

بہتر ہے، اُترو کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی اُن پر ذلت

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءَ وَبَغَضَ مِنْ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

اور محتاجی اور پھر اللہ کا غصہ لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بِغَيْرِ الْحَقِّ

نہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَاكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿۱۱﴾

یہ اس لئے کہ ان سرمان تھے، اور حد پر نہ رہتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ (روزے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے، (یعنی من و سلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اُگا کر نہیں ہوں، ساگ (ہوا) گلوہی (ہوئی) (گیہوں) (ہوا) (مسور) (ہوئی) (پیاز) (ہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو، ادنیٰ درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے، (اچھا اگر نہیں مانتے تو، کسی شہر میں (جا کر) اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانہ میں جا کر نقش کی طرح، جم گئی اُن پر ذلت رکھ دو سرور کی بجگاہ میں قدر نہ رہی) اور پستی رکھ خود اُن کی طبائع میں اولوہی نہ رہی) اور مستحق ہو گئے غضب الہی کے (اور) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ ملے ہو جاتے تھے احکام الہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور (نیز) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرۃ اطاعت سے بھل بھل جاتے تھے۔

فائدہ :- یہ قصہ بھی دادی تہہ کا ہے، من و سلویٰ سے اکتا کر ان زکّاریوں اور غلوں کی درخواست کی، اس میدان کے داخل حدود میں کوئی شہر آباد تھا، وہاں جا کر رہنے کا حکم ہوا کہ بود و جوتو کھاؤ کماؤ۔

اور منجملہ ذلت و مسکنت کے یہ بھی ہے کہ یہودیوں سے سلطنت قرب قیامت تک کیلئے چھین لی گئی، البتہ بالکل قیامت کے قریب محض لیڈروں کا سا بے ضابطہ تھوڑا زور و شور و جہال یہودی کا کل چالیس دن کے لئے ہو جائے گا، اور اس کو کوئی عاقل سلطنت نہیں کہہ سکتا، اور ان کو یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جتلا دی گئی تھی، کہ اگر بے حکمی کر دو گے تو ہمیشہ دوسری قوموں کے محکوم رہو گے، جیسا کہ سورۃ اعراف کی آیت وَ اِذْ تَاَذَنُ رَبُّكَ لَیَجْعَلَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَمَةِ مَنْ یُّقْسِطُوْهُمُ سُوْءَ الْعَذَابِ (۱۱۰:۷) میں مذکور ہے، (موجودہ اسرائیل حکومت کی حیثیت بھی امریکہ اور برطانیہ کے غلام سے زیادہ کچھ نہیں)۔

اور یہیت سے پیغمبر مختلف اوقات میں یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، جس کو وہ لوگ بھی دل میں سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ فعل ناحق ہے، لیکن عناد اور ضد نے اندھا بنا رکھا تھا۔

معارف و مسائل

یہودیوں پر اہل ذلت کا مطلب اور اسرائیل آیات مذکورہ میں یہود کی سزا و نیا میں دائمی ذلت و مسکنت کی موجودہ حکومت سے مشبہ اور اس کا جواب اور دنیا و آخرت میں غضب الہی کو بیان کیا گیا ہے۔

ان کی دائمی ذلت و مسکنت کا مفہوم جو ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین سے منقول ہے، اس کا خلاصہ ابن کثیر کے الفاظ میں یہ ہے کہ لَا یَزَالُ الْکُفْرُ مِنْ وَجْهِهِمْ اَمَّا مَسْنَدٌ لِّهِمْ وَضَرْبٌ عَلَیْهِمُ الصَّغَارِ یعنی وہ کتنے ہی مالدار بھی ہو جائیں ہمیشہ تمام اقوام میں ذلیل و حقیر ہی سمجھے جائیں گے، جن کے ہاتھ لگیں گے ان کو ذلیل کرے گا، اور اُن پر غلامی کی علامتیں لگائے گا۔

امام تفسیر ضحاک ابن مزاحم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے ان کی ذلت و مسکنت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ہم اہل القبالات یعنی العزیزۃ، مطلب یہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دوسروں کی غلامی میں رہیں گے، ان کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے رہیں، خود ان کو کوئی قوت و اقتدار حاصل نہ ہوگا۔

اس مضمون کی ایک آیت سورۃ آل عمران میں ایک زیادتی کے ساتھ اس طرح آئی ہے:

حَسْبُ بَیْتٍ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ اَیْمًا
تُغْفَرُ اِلَّا بِتَحَبُّلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ تَحَبُّلٍ
مِّنَ النَّاسِ (۱۱۲:۳)

تجادی گئی اُن پر بے قدری چاہیں جائیگے
مگر اُن ایک تو ایسے ذریعہ سے جو اللہ کی طرف
سے ہو اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف
سے ہو

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے قانون میں امن دیدیا ہو، جیسے نالغ بچے، عورتیں یا ایسے عبادت گذار جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں پھرتے، وہ محفوظ و مامون رہیں گے، اور آدمیوں کے ذریعہ سے مراد معاہدہ صلح ہے، جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے معاہدہ صلح کا یا حبزیہ دے کر ان کے ملک میں رہنے کا ہو جائے، مگر الفاظ قرآنی میں مِّنَ النَّاسِ فرمایا ہے مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ نہیں، اس لئے یہ صورت بھی محتمل ہے کہ دوسرے غیر مسلموں سے معاہدہ صلح کا کر کے اُن کی پشت پناہی میں آجائیں تو مامون رہ سکتے ہیں، پھر یہ ہتھار جہل من اللہ اور جہل من الناس کا اگر بقول کثافت ہستنا متصل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہودی ہمیشہ ہر جگہ ذلیل و خوار رہیں گے، بجز اُن دو صورتوں کے کہ یا تو اللہ کے عہد کے ذریعہ ان کے بچے خوریں وغیرہ اس ذلت و خواری سے بھل جائیں یا معاہدہ صلح کے ذریعہ یہ اپنے آپ کو ذلت و خواری سے بچالیں اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معاہدہ صلح کے ذریعہ ذلت و خواری سے نکلنے کی صورت مسلمانوں سے معاہدہ صلح کر کے بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسری قوموں سے معاہدہ صلح کا کر کے اُن کے

ہمارے ذلت و خواری سے محفوظ رہیں۔

یہ سب تقریریں استثنائے متصل کی تقدیر پر ہے، اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس کو استثناء منقطع قرار دیا ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ اپنی ذلت اور اپنی قومی حیثیت سے تو ذلیل و خواری رہیں، مگر قانونِ الٰہی کی دست میں آکر ان کے بعض افراد اس سے محفوظ ہو جائیں گے، یاد دہانی کے لوگوں کا ہمارا لے کر ذلت و خواری پر پردہ ڈال دیں۔

اس طرح سورہ بقرہ کی آیت کی وضاحت سورہ آل عمران کی آیت سے پوری ہو گئی، اور اس سے وہ تمام شبہات بھی دور ہو گئے جو آج کل فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کی بناء پر بہت مسلمانوں کو پیش آتے ہیں کہ قرآن کے قطعی ارشادات سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوگی، اور واقعہ یہ پایا جاتا ہے کہ فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہو گئی، جواب واضح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ حکومت کی حقیقت سے جو لوگ باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حکومت درحقیقت اسرائیل کی نہیں ہے بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی ایک چھائی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، یہ اپنی ذاتی طاقت سے ایک ہینہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے، یوروپین طاقتوں نے اسلامی ہلاک کرکے رکھنے کے لئے ان کے بیچ میں اسرائیل کا نام دے کر ایک چھاؤنی بنائی ہوئی ہے، اور اسرائیلی ان کی نظروں میں ہیں، ان کے شراباں بردار غلام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، صرف قرآن کریم کے ارشاد بخوبی قیام الثانی کے ہمارے ان کا اپنا وجود قائم ہے، وہ بھی ذلت کے ساتھ، اس لئے موجودہ اسرائیلی حکومت سے قرآن کریم کے کسی ارشاد پر ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہودی، نصاریٰ اور مسلمانوں میں سب سے پہلے یہودیوں کی شریعت، ان کی تہذیب سب سے پہلی ہے، اگر پوری دنیا میں فلسطین کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر ان کا تسلط کیسی طرح ہو بھی گیا، تو پوری دنیا کے نقشہ میں یہ حصہ ایک نقطہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے، اس کے بالمقابل نصاریٰ کی سلطنتیں اور مسلمانوں کے دورِ تنزل کے باوجود ان کی سلطنتیں بت پرستوں کی سلطنتیں، لاندہوں کی حکومتیں جو جگہ جگہ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں ان کے مقابلہ میں فلسطین اور وہ بھی آدھا، اور اس پر بھی امریکہ، برطانیہ کے زیر سایہ کوئی تسلط یہودیوں کا ہو جائے تو کیا اس سے پوری قوم یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لگائی ہوئی دائمی ذلت کا کوئی جواب بن سکتا ہے؟

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِيَّانَ

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابین

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ

جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور کام کئے نیک تو ان کے لئے ہوں کا ثواب

عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا يَخَوْفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾

ان کے رب کے پاس، اور نہیں ان پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خلاصہ تفسیر

اس مقام پر یہودیوں کی شرارت کا حال معلوم کر کے سامعین کو یا خود یہود کو یہ خیال گزر سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر غدر پیش کر کے ایمان لانا بھی چاہیں تو غالباً اللہ کے نزدیک قبول نہ ہو، اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں ایک قانون اور ضابطہ لکھ کر دیا کہ یہ حقیقی بات ہے کہ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابین ان سب میں جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اور قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے (موافق قانون شریعت) ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس (پہنچ کر) اور (وہاں جا کر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

فائدہ: قانون کا حاصل ظاہر ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد و اعمال میں خستیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو ہمارے ہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے بعد پوری اگلاط اطاعت بخدی یعنی مسلمان ہونے میں منحصر ہو، مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا حق نجات اخروی ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہو گیا، یعنی ان شرارتوں کے بعد بھی اگر مسلمان ہو جائیں تو ہم سب معاف کر دیں گے۔

اور صابین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے بارے میں چونکہ کسی کو پورا پورا پتہ نہ چلا اس لئے مختلف اقوال ہیں، واللہ اعلم۔

اور اس قانون میں بظاہر تو مسلمانوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی لیکن اس سے کلام پاک میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہو گئی، اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی لیے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے کوئی موافق ہو یا مخالف، جو شخص بھی اطاعت کرے گا امور و عنایت ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے سنا تا تو اصل میں مخالفت کو ہے، لیکن اس میں نہکتا یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر عنایت ہو سو اس کی علت ان سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان کی صفت موافقت پر مدار ہے ہمارے عنایت کا، سو اگر مخالفت بھی خستیار کرے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا، اس لئے مخالفت کے ساتھ موافق کو بھی ذکر کر دیا گیا۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ طُحُّدًا

اور جب لیا ہم نے تم سے اقرار اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کو کہ پکڑو جو

مَا أَتَيْنَكُم بِقُوَّةٍ ۚ وَادْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۶۳﴾

کتاب ہم نے تم کو دی زور سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم ڈرو۔

خلاصہ تفسیر اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول دستار لیا کہ توراہ پر عمل کریں گے اور اس قول دستار لینے کے لئے ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر

(محاذات میں) معلق کر دیا، (اور اس وقت کہا کہ) (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی توراہ) مضبوطی کے ساتھ، اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

فائدہ۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر تورات عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لاکر قوم کوہ دکھائی اور سنائی تو اس میں احکام ذرا سخت تھے، مگر ان لوگوں کی حالت کے مطابق ایسے ہی احکام مناسب تھے، تو ازل تو انھوں نے یہی کہا تھا کہ جب ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں گے کہ یہ میری کتاب ہو تب مانیں گے۔ (جس کا قصہ اوپر گزر چکا ہے) غرض وہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے واپس آ کر انھوں نے گواہی دی، مگر اس شہادت میں (اپنی طرف سے) اتنی آمیزش بھی کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ نسر دیا تھا کہ تم سے جس قدر عمل ہو سکے کرنا بوند ہو سکے معاف ہے، تو کچھ توجہی شرارت کچھ احکام کی مشقت اور کچھ اس آمیزش کا حیلہ ملا، غرض صاف کہہ دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہو سکتا، حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ کوہ طور کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دو، کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا، آخر چار ناچار ماننا پڑا۔

ایک شبہ کا ازالہ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ دین میں تو اکراہ نہیں ہے، یہاں کیوں اکراہ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اکراہ ایمان لانے پر نہیں، بلکہ اذل اپنی خوشی سے ایمان و اسلام قبول کر لینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے، باغیوں کی سزا تمام حکومتوں میں بھی عساکر مخالفت اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے، ان کے لئے ہر حکومت میں دزدی راستے ہوتے ہیں، یا اٹھا قبول کریں، یا قتل کئے جائیں، اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، کفر کی سزا قتل نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُم مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ

پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی ہرمانی

لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۶۴﴾

تو ضرور تم تباہ ہوتے

خلاصہ تفسیر پھر تم اس قول و قرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا تو اس عہد شکنی کا مقتضایا تو یہ تھا کہ ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے، (مگر ہماری عنایت و رحمت عامہ ہر کہ حیات مستعار کے ختم ہونے تک ہمت دے رکھی ہے، لیکن کب تک؟ آخر بعد از مرگ و بال اعمال میں مستلزم ہو گے)

فائدہ۔ حق تعالیٰ کی رحمت عامہ دنیا میں مومن کا فرسب پر ہے، جس کا اثر عینیت اور دنیوی راحت ہی، رحمت خاصہ کا ظہور آخرت میں ہوگا جس کا اثر نجات اور قرب خداوندی ہے۔ بظاہر اس آیت کے جزو آخر کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا بھی عہد شکنی میں داخل ہے، اس لئے ان کو بھی عہد شکنوں میں شامل کر کے بطور مثال فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دنیا میں کوئی عذاب ایسا نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے ایمانوں اور عہد شکنوں پر ہوتا رہا، یہ محض خدا کی رحمت ہے۔ اور چونکہ اب از روئے احادیث ایسے عذابوں کا نہ آنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہی، اس لئے بعض مفسرین نے فضل و رحمت کی تفسیر بعثت محمدیہ سے کی ہے۔ اس معنوں کی تائید کے لئے گزشتہ بے ایمانوں کا ایک واقعہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ

اور تم خوب جان چکے ہو جنھوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا ان

كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنَاهُمْ نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا

سے کہ ہو جاؤ بندر ذلیل، پھر کیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان لوگوں کیلئے جو وہاں

خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۶۶﴾

تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے اور نصیحت ڈرنیوالوں کی واسطے

خلاصہ تفسیر اور تم جانتے ہی ہو ان لوگوں کا حال جنھوں نے تم میں سے (حدیث شرع سے) تجاوز کیا تھا دربارہ (اس حکم کے جو) ہفتہ کے دن کے متعلق تھا کہ اس روز

پہلے کا شکار نہ کری، سویرے سے اُن کو اپنے محکم قریبی یمنی سے مسخ کرنے کے لئے، کہہ دیا کہ قسم
بندہ ذلیل ہیں جاؤ رہنا چاہے وہ بندہ روں کے طالب میں مسخ ہو گئے، سویرے سے اس کو ایک (واقعہ)
عزیزت (اعجاز) بنا دیا ان لوگوں کے لئے جو اس قوم کے معاشرے، اور ان لوگوں کے لئے جو یہ
ماہد کے زمانے میں آئے تھے، اور انہیں اس واقعہ کو موجب نصیحت (دہنایا، خدا سے خوشامدوں
کے لئے۔

فائدہ :- یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا ، بنی اسرائیل کے لئے ہندو کا دین غم اور عبادت کے لئے مقرر تھا اور یہ چھل کا نشان بھی اس روز شروع تھا یہ لوگ سمندر کے کنارے آباد تھے اور چھل کے شرقین تھے ، اس حکم کو نہ مانا ، اور سرکھایا ، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت صورت کا عذاب نازل ہوا جن دن کے بعد وہ سب مر گئے ۔

اس واقعہ کو سمجھنے اور سننے والے روز جسم کے لوگ تھے ، فرمانبردار اور ماسلمان ، تو قاتلوں کے لئے تو یہ واقعہ استغاثہ کے قیام کرنے والا تھا ، اس لئے اس کو نکال فرمایا ، اور مسلمان بنواؤں کو یہ واقعہ فرمانبردار کی پرستش کرنے والا تھا اس کو مٹوئے خلافت فرمایا ۔

معارف ومسائل

[illegible]

لنگر اس سے اُن انہی جنوں کی حرمت ثابت نہیں ہوتی جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں مثلاً ایک سرمرہہ کجڑو کے بے دین و شراب کجڑو خردنا سو میں نے قبل جو، گھراس سے بچنے کا ایک جیلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے بتلا کر کھین کا تیار اور جس سے ذکر و نعت کے ذریعہ خرد و فروخت کر، مثلاً دو سر شراب کجڑو میں دو روکم میں فروخت کر دیں، پھر ان دو روکم میں سے ایک سرمرہہ کجڑو خرد لے، تو یہاں تک حکم شرعی کی تعمیل مقصود نہ، ابطال الحلال ذمہ مقصود نہ واقع ہے، اسے اس طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی فقہائے حرام سے بچنے کا بعض

+

ایسا ہی تیسری مرتبہ بتلائی میں اُن کو کہو ہر دلی کے جیلوں کی طرح کُنا اور کھٹا غلط ہے۔
واقعہ سچ صورت یہ ہوا

پچیس، پھر پرتے ہوئے مام طر پر شکار کھیلنے لگے، تو ان میں دو جہاتیں ہو گئیں، ایک جہات
علا، وصال کی تھی، جنھوں نے ان کو ایسا کرنے سے روکا، یہ باز نہ آئے تو ان سے برادرانہ تعلقات
خلق کے اُن گھل ہو گئے، اور برائی کے دوشے کرنے، ایک میں یہ نافرمانی لوگ ہو گئے،
دوسرے میں علا، وصال ہو گئے، ایک روز ان کو یہ محسوس ہوا کہ میں حصہ میں یہ نافرمان لوگ ہیں، تو
اور باطن میں تامل تو ان باکر دھما تو سب کے سب بندروں کی صورت میں سامنے ہو گئے، تھے، اور
قادر نے فرمایا کہ اُن کے وہاں بند بنادے گئے تھے اور پورے خنزیر کی شکل میں منتقل کر دیے گئے
تھے اور منہ بند رہا ہے کشتہ دار اور قلع دار نے افسانوں کو بچا پتے تھے، اُن کے فریب کہ
روستے میں

مسیح قوم کی نسل
اس معاملہ میں صحیح بات وہ ہے جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت
عبداللہ بن مسعودؓ صحیح مسلم میں منقول ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے زمانے

کے بندوں اور خستہ پر دل کے بچے ہیں اس خضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا یہ دینی
سرخ مشہہ ہے؟ وہی ہیں آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں سچ صورت کا عذاب ازل
کرتے ہیں تو ان کی نسل نہیں پائی، بلکہ چند روز میں ہلاک ہو کر ختم ہوجاتے ہیں، اور پھر فرمایا کہ
بندہ اور خستہ پر دنیا میں پہنچنے سے کبھی موجود رہے (اور آج بھی ہیں، مگر سرخ مشہہ بندہ اور خستہ پر دل
سے ان کا کوئی ٹکڑا نہیں)

اس موقع پر بعض غصہ کرنے والے صحیح بخاری کے حوالے سے بندہ میں زمانہ کی مزا میں عسکری
کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، مگر یہ واقعہ ہمارے صحیح فضول میں موجود ہے، نہ وہ واقعہ صحیح
ہے نہ ہی اسے اس جگہ اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبُحُوا بَقَرَةً

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اٹھ کر ہمارا ہم کو رخصت کر دے ایک کلمہ کہے

قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّنَا مَا لَهُمْ بِهِ شَأْنٌ وَلَٰكِن كُنُوا فِي شَكٍّ ۚ ﴿١٧﴾

وہ کہنے لگے کیا توہم سے پہنسی کرنا ہے کہا پناہ خدا کی کہ ہوں میں جاہلوں میں۔

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا
 اے مجاہدان! میں تم کو ایک نیا سربراہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ان کو حکایت کیا کہ تم میرے

۱۷

وَمِنْكُمْ آيَةٌ لِّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۳۰﴾

اور دکھائے کہ تم کو اپنی قدرت کے لئے ایک قوم کو فکر

خلاصہ تفسیر

اور وہ زمانہ یاد کرو جب تم کو ان میں سے کسی ایک آدمی کا خون کر دیا، پھر
راہی برات کے لئے، ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا
منقولہ صاف ہی کہ تم میں سے جو بد مشیر لوگ، عقل رکھنا چاہتے تھے، اس لئے ذبح بقول کے بعد، ہم نے
حکم دیا کہ اس مقتول کی لاش کو اس رافضو کے گھر سے گھر سے چھوڑ دو چنانچہ چھڑانے سے وہ
زندہ ہو گیا، اسے اللہ تعالیٰ بمقابلہ مسکین کی قیامت کے اس قصے سے استلال اور نظیر کے طور پر فرمایا
ہے کہ اس طرح حق تعالیٰ قیامت میں، مژدوں کو زندہ کر دیں گے، اور اللہ تعالیٰ اپنے نکات اور قدرت
کو دکھلائے ہیں اس توہین پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو اور ایک نظیر سے دوسری نظیر کے انکار سے
باز آؤ۔

فائدہ :- جب اس مرد کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا تو وہ زندہ ہو گیا، اس نے قاتل کا نام بتایا
اور پھر فرمایا میرا

اس جو صرف مقتول کا بیان اس لئے کافی تھا کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی
معلوم ہو گیا تھا کہ قاتل کی کون سی چیز ہے اور حضرت مقتول کے بیان سے بغیر شری شہادت کے کسی پر
قتل کا ثبوت کافی نہیں ہوتا۔

یہاں یہ شبہ کہ ابھی درست نہیں کہ حق تعالیٰ کو تو مردہ زندہ کرنے کی ویسی ہی قدرت تھی
یا مقتول کو زندہ کرنے کیے قاتل کا نام بتایا جا سکتا تھا، پھر اس سامان کی کیا ضرورت تھی، تو بات یہ ہے
کہ حق تعالیٰ کا کوئی فعل ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے نہ ہوتا تھا، بلکہ مصلحت اور حکمت کے لئے ہوتا
ہے، اور ہر افسدہ کی بخت اللہ تعالیٰ ہی کے احاطہ میں آ سکتی ہے، نہ اس کے خلعت میں کہ وہ
کی مصلحت معلوم کریں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر افسدہ کی بخت ہماری ہوش میں آجائے، اس لئے اس کے
پچھے چکر اپنی عمر و پریشان کر کے کہ ہلکا سے بہتر طریقہ تسلیم و سکوت کا ہے۔

لَمْ قَسَتْ فُلُوكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْجِبَارِ أَوْ أَسَدٌ

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد سورہہ ہو گئے ہیں پھر یا ان سے بھی
قَسُوهُ وَإِنْ مِنَ الْجِبَارِ تَوْكَمًا يَّتَفَقَحُ مِنْهُ الْكَذِبُ وَإِنْ

سخت اور چھروں میں تو ایسے بھی ہیں جس سے جاری ہوتی ہیں ہماری

مِنْهَا لَمَّا يَشْفِقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنْ مِنْهَا لَمَّا يَحْطُ مِنْ

ایسے بھی ہیں جو بہت جلد سے اور نہ کھل کر ان سے پانی اور ان میں ایسے بھی ہیں جو گرجتے ہیں

حَسْبِيَ اللَّهُ وَمَا اللَّهُ إِلَّا غَفُورٌ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۳۱﴾

اللہ کے کور سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے ۔

اور ششدر و غلبت سے متاثر نہ ہونے پر شکایت کے طور پر ارشاد ہوتا ہے، ایسے

ایسے واقعات کے بعد چاہئے حکام کو ان کے دل بالکل نرم اور حق تعالیٰ کی

عقبت پر ہوجانے، انہیں، تمہارے دل پر بھی سخت ہے تو ان کو پناہ چاہئے کہ ان کی مثال پتھر

کی سی ہے، یاد رکھو کہ وہ سختی میں ان سے (بگڑا ہوا رہی)، اور ذرا دھمکتا اس وجہ سے کہ

چاہئے کہ جیسے پتھر کو ایسے ہیں جس سے بڑی بڑی، ہماری پھوٹ کر مٹی میں، اور انہیں پتھروں میں پتھر

ایسے ہیں جو حق ہو جائے، پھر ان سے (بگڑا ہوا رہی) نہیں تو ضرور اس، پانی نکل آتا ہے، اور ان میں پتھر

ہیں جیسے ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خوف سے اوپر سے نیچے لا دیا جاتے ہیں، اور وہ خائے قلوب

میں کسی قسم کا اثر نہیں ہوتا، اور اس قیامت سے جزا و عذاب ہوتے ہیں، حق تعالیٰ

تمہارے دل، اعمال سے بے خبر نہیں ہیں، بہت جلد تم کو سزا دے گا یا عطا کرے گا۔

فائدہ :- اس جگہ پر کہ تمہیں ان اثرات بیان کئے گئے ہیں، اولاً ان سے زیادہ پانی نکلنا،

دو کھانا نکلنا، ان دونوں کو کسی کو شبہ نہیں پڑتا، تیسری صورت میں خدا کے خوف سے پتھر کا

نیچے آکرنا، اس میں ممکن ہے کہ کسی شبہ ہو کہ پتھر کو تو عقل اور حس نہیں، ہر سو یہاں یہ

بھروسہ بنا چاہئے کہ خوف کے لئے عقل کی ضرورت نہیں، کیونکہ حیوانات و فطریات میں خوف کا

مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، البتہ جس کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جاوا میں اتنی جڑ میں نہ ہونے کی گاف

دلیل نہیں، کیوں کہ اس حالت پر عورت ہے، اور بہت ممکن ہو کہ ان میں ایسی لطیف حیات چھپی

کا ہم کو ادراک نہ ہوتا ہو، جیسا جو ہر مائع کے احساس کا بہت سے عقلمند کو ادراک نہیں ہوتا،

وہ بعض دلائل سے اس کے قائل ہوتے ہیں، تو دلائل لطیف سے ظاہر نہیں شرک ان کی وفات اور وقت

کیسی طبعاً بھی کم نہیں۔

پھر ہمارے دعوے بھی نہیں کہ ہمیشہ چتر گرنے کی علت خوف ہی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ

نصرایا ہے کہ بعض پتھر اس وجہ سے گر جاتے ہیں اسو بہت ممکن ہے کہ گرنے کے سبب

مختلف ہوں، ان میں سے بعض بھی ہوں اور ایک سبب خوب خدا ہی ہو۔

اس مقام پر بھی قسم کے پتھروں کے ذکر میں ترتیب نہایت لطیف اور افادہ مقصود

بنابت لیجے نماز میں کیا گیا ہے، لیکن بعض چھسڑوں میں تاثر تھا تو سی ہے جس سے نہرین جاری ہو جاتی ہیں جن سے خلوق خداوندہ اٹھاتی ہے، اور ان ریزیدوں کے دل ایسے بھی نہیں رکھ خلوق خدا کی مخلیقت و مصیبت میں گھل جاتیں، اور بعض چھسڑوں میں ان کے کماثر ہوتا ہے جس سے کہ کفر سے پہنچا ہے، تو یہ تجربہ نسبت اول کے کہ نرم ہوتے، اور ان کے قلب ان دو درجہ دوم کے پہنچنے سے بھی سخت ہیں۔

اور بعض چھسڑوں میں گواس و دھکا کا اثر نہیں، مگر جو بھی ایک اثر ہو وہ کہ خوب خدا سے پہنچے کرتے ہیں، گو روپے میں پہلی تیرہوں سے یہ ضعیف تر ہیں، مگر ان کے قلب میں تو کم درجہ اول ضعیف ترین درجہ انفعال بھی نہیں۔

وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ أَفَتَضْمَنُ مَا نَدْعُو بِهَذَا الْقُرْآنِ أَكُلُّ مَوْعِدَةٍ وَكَذَّابٌ عَرِيسٌ
اب کیا تم اسے مسلمانو، قریب رکھتے ہو کہ وہ آئیں ہماری بات اور ان میں ایک فرق تھا
يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ يَنْفِرُونَ مِنْ بَعْضِ مَا عَقِلُوا مِنْكُمْ
کہ سننا تھا اللہ کا کلام پھر بڑل ڈالتے تھے اس کو جان بوجھ کر اور وہ
يَعْلَمُونَ ﴿۵۰﴾
جانتے تھے۔

خلاصہ تفسیر مسلمان بھروں کو مومن بنانے کی جو کوشش کر رہے تھے اور اس میں کلفت اٹھاتے تھے تو یہودی کے حالات، اذھت کا ذکر مسلمانوں کی امید کا انقطاع کر کے ان کی کلفت اس آیت کے ذریعہ دلو فرماتے ہیں،
وایسے مسلمانو، کیا یہ سارے قہقہے لشکر اب بھی تم قریب رکھتے ہو کہ یہ یہودی اٹھائے گئے سے ایمان لے آ رہے، حالانکہ ان سب مذکورہ قصوں سے بڑھ کر ایک اور بات بھی ان سے پہنچی ہے کہ ان میں بھی لوگ ایسے گذرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سننے سے اور کھیر اس کو کچھ کام کر ڈالتے تھے اور اس کو سمجھنے کے بعد دایا کرتے، اور (دلفن یہ کہ یہ بھی) جانتے تھے کہ ہم بڑا کر رہے ہیں، بعض افراحن نفسا میں اس کا رد والی کا باعث ہو جی،
فاصلہ۔ مطلب یہ کہ جو لوگ ایسے بیباک اور اذراغی نفسانی کے اسیر ہوں وہ کسی کے کہنے سننے سے کب باز آنے والے اور کسی کی کب سننے والے ہیں۔
اور کلام اللہ سے مراد یا تو قریت ہر، اور سماع سے مراد بوا اسلہ انبیاء علیہم السلام کے ہے

اور توفیق سے مراد اس کے بعض کلمات، اقتباس یہ ہوں تو انہیں اور کلام سے مراد کلام جو بھان ششرا ویدیوں نے بطور تصدیق توفیق علیہ اسلام کو بطور چرستان تھا، اور سماع سے مراد بوا اسلہ، اور توفیق سے مراد قوم سے یہ نقل کر دینا کہ انہیں انہی تعالیٰ نے یہ بھی مندرجہ اول تھا کہ جو حکم تم سے اوانہ ہوئے وہ معاف ہے۔

اور مذکورہ بالا میں سے کسی امر کا صدور و رومان یہودیوں نے نہ ہوا ہوا حضرت علی (ع) علیہ السلام کے زمانے میں موجود تھے، لیکن چونکہ وہ لوگ بھی اپنے اسلاف کے ان اعمال پر انکار و نفرت نہ رکھتے تھے، اس لئے یہ بھی دیکھ دیکھ رہے ہیں۔

وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ أَفَتَضْمَنُ مَا نَدْعُو بِهَذَا الْقُرْآنِ أَكُلُّ مَوْعِدَةٍ وَكَذَّابٌ عَرِيسٌ
اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہونے اور جب تمہارا ہونے لکھا و سرور کے
بَعْضِ مَا عَقِلُوا مِنْكُمْ اللَّهُ عَلَيْهِ سَمْعٌ يَسْمَعُ
پاس تو کہنے ہیں تم کیوں کہہ دے ہو ان سے بوا بھریا، اللہ نے تمہارا کہ جھٹلا ہیں تم کو
وہ عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۵۱﴾
اس سے تمہارا رب کے آگے کیا تم نہیں سمجھتے۔

خلاصہ تفسیر اور جب ملتے ہیں منافقین یہودی مسلمانوں سے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم کی ایمان لے آئے ہیں اور جب تمہاری میں جاتے ہیں یہ بیٹے (منافق یہودی) دیکھ بیٹے، علانیہ یہودیوں کے پاس تو ان کے ان کی میریت و ہم مشرکی کے مدعی ہوتے ہیں اس وقت اللہ (دوسرے یہودی) ان سے کہتے ہیں کہ تم یہ کیا دلفن کرتے ہو کہ مسلمانوں کو خوشامد میں، وہ باہم ملتے ہیں جو رومان کے مفید مذہب، اللہ تعالیٰ نے (توریت میں) تم پر مکشفت کر دی ہیں اور یہ صلیبت پر مشیدہ رکھتے ہیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ ہم کو حجت میں مظلوم کر دیں گے کہ وہ (جو) یہ مضر ان اللہ کے پاس اس تھا ہی کتاب میں آیا، ہے کیا تم راقن مولیٰ میں بات) نہیں سمجھتے۔
فاصلہ۔ منافقین بھی ایک آہ بات خوشامد میں یہ ایمان کی کجانی جملانے کے لڑ مسلمانوں سے کہہ دیتے تھے کہ تو قریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت آئی ہو یا قرآن ہر کے متعلق خبر آئی ہے، وہی وہی وہی، اس پر دوسرے لوگ ان کو ملامت کرتے تھے۔

أَوْ لَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۱۰﴾
 کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں
 وَبَيْنَهُمْ أَيْمُونُ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِي وَإِنَّهُمْ إِلَّا
 اور بعض ان میں سے بڑے ہیں کہ غیر نہیں دیکھتے کتاب کی سوانہ جو ان آرزوؤں کے اور ان کے
 يَكْتُمُونَ ﴿۱۱﴾ قَوْلِ الْكَافِرِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ وَيُحْمِلُونَ لِيهِمْ
 اس کو نہیں عرفان، سو خرابی ہے ان کو جو کچھ لکھتے ہیں کتاب اپنے اچھے، پھر کہہ کر ان
 يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَسْتَرْوَاهُ كَمَا قَالُوا قَوْلُ
 یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ بیوی اس پر حقو اسامی، سو خرابی ہے ان کو
 لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ آيَاتُ يَهُدْيُهُمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْتُمُونَ ﴿۱۲﴾
 اپنے انہوں کے لئے ہے اور خرابی ہے ان کو اپنی اس کتاب سے .

خلاصہ تفسیر اس کا کہ اس کا علم نہیں ہے کہ کون تمہاری کو سب خبر ہے ان چیزوں کی بھی جن کو وہ
 خلق رکھتے ہیں اور ان کی بھی چیز کا وہ اظہار کرتے ہیں تو اگر منافقین نے تو نہیں
 سے اپنا تمہارے کیا تو کیا اور ان ملامت گروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت و قیود کے معنائیں
 چھپاتے تو کیا، اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں معنائیں سے مسلمانوں کو
 جا بجا مطلع فرمادیا ہے،

اس آیت میں تو یہودیوں کے خواہ وہ کون کا ذکر تھا، آئے ان کے ناخواندہ لوگوں کا ذکر
 اس طرح فرماتے ہیں کہ

اور ان یہودیوں میں بہت سے ناخواندہ دیکھی ہیں جو کئی ظہر نہیں رکھتے، لیکن وہ مسند
 دل خوش کن ہیں (بہت یاد ہیں) اور وہ لوگ کھانا نہیں، (وہ بے نیاد خیالات بکا لیتے
 ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ قرآن کے علماء کی عقل ناقص اور غلط ہے، اور پھر وہ بے ایمان ہیں کہ ہم
 کی کسی ہے، ایسی صورت میں جو بے نیاد خیالات کے خالق و تھیں کہ انہیں کمال تعجب ہو کہ انہیں بے نیاد
 قبول کئے مگر یہ اور نیم چیز ہے اس میں محسوس کہاں .

اور جو کنگہ ان کی تو ہم پرستی میں ان کے علماء کی بیانت بڑا حد تک، اس لئے جرم میں ہیں وہ
 اپنے عوام سے زیادہ ہونے، اسی کا بیان اب یہاں کرتے ہیں۔

و حسب علوم مذکورین قابل زہر تو کچھ ہیں اور ان کے جہل کا اصلی سبب ان کے علماء ہیں،
 تو یہی خرابی ان کی ہوگی جو کچھ ہیں ردل سدا کر، کتاب و قرآن، کہ اپنے انہوں سے (اور) کہیں
 (عوام) کہہ دیتے ہیں کہ یہ (خبر) خدا کی طرف سے (وہوں کی آگاہی ہے) اور (خبر) صرف (وہوں) ہے کہ
 اس زہر سے کہ فقہانہ سے قابل حصول کر لیں سو بڑی خرابی ہو، آدھے لگ ان کی اس (خبر) پر
 کتاب کی بدولت دیکھیں کہ ان کے انہوں نے کھانا تھا اور بڑی خرابی ہوگی ان کو اس وقت، کی
 بدولت دیکھیں کہ وہ وصول کر دیا کرتے تھے۔

فان شاء . عوام کی رضا کوئی لئے غلامت سلطنت بنا دینے سے ان کو کوئی فائدہ نہیں
 وصول ہو جاتا تھا، اور ان کی نظر میں دقت اور وقار بھی رہتا تھا، اس غرض سے تو یہی میں لفظ اور
 معنوی پھر یہاں بھی کرتے رہتے تھے، اس آیت میں اس پر دیکھ سناں غنی۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً وَكُنْ أَتَّخِذْنَاهُمْ
 اور کہتے ہیں ہم کو ہرگز آگ نہ لگے گی مگر چند روز چلے جائے، کہہ دو کیا تم نے یہ
 عِنْدَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ أَفَلَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَتَمَّ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ
 اللہ کے یہاں سے قرار کہ ہرگز غفلت نہ کرے گا انہوں نے قرآن کے یا جوتے ہو اللہ پر

مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۰﴾
 جو تم نہیں جانتے

خلاصہ تفسیر اور یہودیوں نے (وہ بھی) کہا کہ ہرگز ہم کو آتش (دوزخ) چھوئے گی (وہی تو) نہیں
 (ہاں، مگر) بہت (کھوٹے) دوزخ (اور) جہنم پر، خدا کرے یا نہیں (وہی تو) نہیں
 صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ان سے، یہودی مسند و کچھ کلام تو انہوں نے حق تعالیٰ سے (اس کی مشق)
 کوئی معاہدہ لے لیا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ اپنے معاہدہ کے خلاف نہ کریں گے، (یا) معاہدہ نہیں لیا،
 بلکہ وہی ہے، اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لکھی ہے جو جس کی کوئی طبی سند نہ پاس نہیں رکھتے۔
فان شاء . یہودیوں کے اس قول کی تفسیر یہ ہے کہ غفلت تو قرآن کی میں لکھا اس کے ہے کہ
 یہاں صریح ذکر تو نہیں مگر عوامی ہو تو یہودیوں کا دوزخ کے خلاف میں داخل ہو، لیکن اور ان کی وجہ سے
 داعی مذہب نہیں نہ ہوگا، بعد چند سے نہات ہو جائے گی۔

پس یہودیوں کے دعوے کا معاملہ یہ تھا کہ ان کے بڑے دین موسیٰ منسوخ نہیں ہے، لہذا وہ

ترجمہ ہیں، لہذا حضرت علی علیہ السلام درجناب حضور مقبول صل اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کافر نہیں ہوتے، پس اگر کسی حسیان کے سبب دوزخ میں چلے گی تو پھر نکال لئے جائیں گے، اور چونکہ یہ دعویٰ بناں الفاصلہ علیہ السلام کے پیچھے کہ وہی موسیٰ کی بادیت کا دعویٰ خود غلط ہے، لہذا انکار نبوت میری ذمہ داری کے سبب وہ لوگ کافر ہوں گے، اور کفار کے لئے بعد پڑنے دوزخ سے نجات پانا کسی بھی آسمانی کتاب میں نہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے جسے تمیز فرمایا، پس ثابت ہوا کہ دعویٰ عیسیٰ علیہ السلام بلکہ غلط دلیل ہے۔

بَلْ مَنْ مَّكْسَبَ سَيِّئَةٍ وَآحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ

بقرہ نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے سو وہی ہیں دوزخ

النَّارَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۵۱﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

کے درجہ والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو ایمان لائے اور عمل کئے نیک

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۵۲﴾

وہی ہیں جنت کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

خُلَاصَةُ تَفْسِيرِ خَالِدُونَ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۵۱﴾

میں رہنا ضرور کر دیکر گناہ مارا ضابطہ پر کر، جو شخص قصداً بڑی یا چھوٹی گناہ کرے اور اس کو اس کی خطا و قصور اس طرح، احاطہ کرنے کے کہ نہیں ہو سکتی یا (فریخت ہے) سو ایسے لوگ اپنی دوزخ میں رہیں گے، اور وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو لوگ (راشد و صلح پر ایمان لائے اور نیک کام کرنا چاہے) لوگ اپنی بہشت ہوتے ہیں (اور وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے)۔

فَالَّذِينَ خَلَوْا عَنْ مَعَاصِيهِمْ يَوْمَئِذٍ رُحِمُوا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّهِمْ لِيَتُوبَ إِلَيْهِمْ ﴿۲۵۳﴾

گناہ کے ساتھ مخصوص جو کہ لوگ کوئی وجہ سے کوئی بھی صلح مقبول نہیں ہوتا، بلکہ گناہ کے قبل اگر کچھ نیک اعمال کئے بھی ہوں تو وہ بھی مٹائے اور ضبط ہو جائے ہیں، اسی وجہ سے گناہ میں سزا پا دینی ہی ہوگی جس کی سزا بڑی یا چھوٹی ہوگی، مگر اہل ایمان کے کہ ان کو تو ان گناہان کا خود بہت جزا مل چلا ہے، اور دوسرے اعمال میں یہ سبب ان کے ساتھ اعمال میں مدد ہوتے ہیں، پس ان کے وہ لوگ کے اثر سے خالی نہیں، پس احاطہ مذکور ان کی حالت پر مہاروق نہیں آتا۔

خلاصہ یہ کہ جب اس ضابطہ کے دوسرے کا منکر یا بدی چھٹی ہو یا بہت ہو گیا، تو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نام لایا، پس اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی چھٹی ہوئے، اور ان کا انکار کر کے کافر رہیں، پس ان کے لئے اس ضابطہ کے دوسرے وہی خاندان انار ہوں گے، تو ان کا دعویٰ مذکور دلیل اقصیٰ سے باطل غلط۔

وَلَا آخِذَ بِمِثْقَاتِ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ۚ

اور جب ہم نے یا تشراف بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی

وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا وَآلِهِمُ الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ ۚ

اور اے ایمان والے سے سلوک نیک کرنا اور گنہگاروں سے اور یتیموں اور محتاجوں سے اور

قُولُوا لِلنَّاسِ حَسَنًا وَآفِئُوا الصَّلَاةَ وَالْأَنَاءَ وَالزَّكَاةَ ۚ ثُمَّ

کہو سب لوگوں سے نیک بات اور قائم رکھو نماز اور دینے دو دھیر زکوٰۃ پھر

تَوَلَّيْكُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ ۚ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۲۵۴﴾

تم پھر مجھے مگر غور سے سے تم میں اور تم ہی جو پھرنے والے۔

خُلَاصَةُ تَفْسِيرِ كَعِبَادَتِمْ كَرَأَيْتُمْ كَيْفَ كَرِهْتُمْ بَابَ كَيْفَ طَسْرَحَ

خدمت گذاری کرنا اور اہل قربات کی بھی اور بے آپ کے بچوں کی بھی، اور غریب محتاجوں کی بھی اور غلام لوگوں سے (جب کوئی بات دیکھا ہو تو ان کی طرح) اور غریب محتاجوں سے (جس کا اور باندی رکھنا ناکی اور ادا کر کے دینا زکوٰۃ، پھر تم کو قتل و قمار کر کے اس سے پھر گئے، پھر بعد دوسرے چند کے، اور تمہاری تو رسول عادت ہے ان کے ساتھ کر کے ہٹ جاتا۔

فَالَّذِينَ خَلَوْا عَنْ مَعَاصِيهِمْ يَوْمَئِذٍ رُحِمُوا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّهِمْ لِيَتُوبَ إِلَيْهِمْ ﴿۲۵۳﴾

فَالَّذِينَ خَلَوْا عَنْ مَعَاصِيهِمْ يَوْمَئِذٍ رُحِمُوا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّهِمْ لِيَتُوبَ إِلَيْهِمْ ﴿۲۵۳﴾

یہ بعد دوسرے وہی لوگ ہیں جو توبہ سے پہلے پابند ہے، اور توبہ کے منسوخ ہونے سے قبل شریعت موسیٰ کے پابند ہے، جب توبہ توبہ منسوخ ہوگئی تو شریعت محمدی کے منسوخ ہو گئے۔

مَسْئَلَةٌ ۚ اِسْ اَبْت سے معلوم ہوا کہ یہ احکام اسلام اور سابقہ شریعتوں میں مشترک ہیں جن میں توحید، والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کی خدمت اور قائم آسانوں کے ساتھ گفتگو میں نرمی وغیرہ ملتی کرنا اور نماز اور زکوٰۃ سب داخل ہیں۔

معارف و مسائل

فَاتْلُوْهُ۔ اس باب میں ان پر ترجیح کم قوزم تھے، اَوَّلَ قَتْلٍ دیکرنا، دوم اخراج یعنی ترک وطن نہ کرنا، سوم اپنی قوم میں سے کسی کو قید و بند میں گرفتار دیکھیں تو وہ پر خرچ کر کے چڑھا دینا، تو ان کو قتل کے اول کم قوزم کو چھوڑا، اور دوسرے کم کا استہساں کرنے لگے، اور صورت اس کی یہ ہوئی تھی کہ اہل مدینہ میں دو قسم جنس، اوس و خزرج، اور ان میں باہم عداوت رہتی تھی، اور کسی بھی قتال کی فوجت کسی آجائی تھی اور مدینہ کے گرد و فواہ میں یہودیوں کی دو فوج تھیں، بنی نضیر اور بنی نضیر کا، اہل مدینہ اوس و بنی نضیر کے باہم دوستی تھی اور خزرج و بنی نضیر میں باہم بیاد نہ تھا، جب اوس اوسا خزرج میں باہم لڑائی ہوتی تو وہ دینی کی بنا پر خوشتر ربط تو ان کے مددگار ہوتے، اور بنی نضیر خزرج کی طرف ہمداری کرتے، تو جہاں اوس و خزرج ملے جاتے اور غنائ آوارہ ہوتے ان کے دوستوں اور مایوں کو بھی یہ مصیبت پیش آتی، اور ظاہر ہے کہ بنی نضیر ربط کے قتل و اخراج میں بنی نضیر کا بھی ہاتھ ہوتا، اور ایسا ہی بالکس، البتہ یہودیوں و فوجوں جہاں میں سے اگر کوئی جنگ میں قید ہو جاتا تو ہر جماعت اپنے دوستوں کو مال پر ہمتی کر کے اس قیدی کو رہائی دلا دیتے، اور کوئی پوچھتا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو اس کو جواب دیتے کہ اسیر کو، اگر ادا نہ ہو جائے تو واجب ہو اور اگر کوئی قتل و قتال میں مبین و مدکار بنے پراعتراصل کرنا تو کچھ کرنا یا کرنا دوستوں کا ساتھ دینے سے عاجز نہ ہے۔ اسی میں اللہ تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے، اور ان کی جہل و نادانی کا پردہ ہلک فرمایا کہ اس آیت میں جن جماعت قوموں کی املاؤں کا ذکر ہے اس سے اوس و خزرج مراد ہیں، کہ اوس بنی نضیر ربط کی موافقت میں بنی نضیر کے مخالفت تھے، اور خزرج بنی نضیر کی مخالفت میں بنی نضیر ربط کے مخالفت تھے۔

انکم و عدنان و ظہر غنمنا، وہ افغان لانے سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اس میں دو قسم ضائع ہوئے ہیں جسکے اہل کی قبیلہ کے کہ جن اش ضائع کیا، اور دوسرے کو آزار پہنچا کر حق العباد بھی ضائع کر دیا۔

آگے اس جہد شکنی پر ملامت و شکایت کے ساتھ ساتھ سزا کو بھی بالاعتصاف بیان فرمایا کہ

اورشاد ہے۔

کیا تو دینوں کو کہ کتاب (توریت) کے بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض احکام پر ایمان نہیں رکھتے تو کیا سزا ہو نا چاہئے یا اپنے ٹھوس کی جو قسم تو ان میں سے ایسی حرکت کرے جو رسالت کے دعویٰ و زندگانی میں اور در قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دینے جا چکے

اور اللہ تعالیٰ دیکھ، اپنے خیر نہیں ہیں محتالے اعمال و زشت برے۔
فَاتْلُوْهُ۔ ہر چند کہ یہودی جن کا تقدس ذکر ہے، بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمت کا انکار کرنے کی بنا پر کرا فرمایا تھے، مگر یہاں ان کا ذکر نہ کرنا نہیں، بلکہ جن احکام پر عمل نہ کرنے کو کفر سے تعبیر فرمایا ہو، حالانکہ جب تک حرام کو حرام کہے آدمی کا فر نہیں ہوتا، سوا اس شے کا جو اب یہودیوں کو نہایت بہت شدہ ہوتا جو اس پر عداوت شریعہ میں اس کی شدت کے پیش نظر کفر کا اطلاق نہ کر دیا جاتا ہو، اہم پہنچا عداوت و عین میں اس کی مثالیں دن رات دیکھتے ہیں، عین یہیں ذلیل حرکت کر رہے ہوں کہ کہتے ہیں کہ تو تو اہل ہمارے، حالانکہ غالب چار بیسیا نہیں ہے، اس سے مقدم و شدت لغت اور اس کام کی قیامت ظاہر کرنا ہوتا ہے، اور یہاں میں اس حدیث حق شریف الصلانی **مُتَعَبِّتِیْنَ اَفْعَلُوْا مَقْرَفَ وَ فِرَیوْکَ**۔

اس مقام پر بھی دو سزاؤں کا ذکر ہے ان میں سے پہلی سزائیں دنیا میں ذلت و رسوائی تو اس کا وقوع اس طرح ہوا کہ جو صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے سبب بنی نضیر ربط قتل و قید کئے گئے اور بنی نضیر ربط شام کی طرف ہزار ذلت و خواری کمال لینے لگے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اَشْكُرُوْا الْحَیْوةَ الدُّنْیَا بِالْآخِرَةِ ۚ فَلَا

یہ وہی ہیں جنہوں نے مولیٰ دنیا کی آخرت کے بدلے سو نہ ہکا

یُحَقِّقْ عَنْهُمْ الْعَذَابَ ۚ وَلَا هُمْ یُنصَرُوْنَ

ہوگا ان پر عذاب اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔

خلاصہ تفسیر | اور دو سزائیں کے لئے یہ ہو کر یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے احکام کی مخالفت کر کے، دنیاوی زندگی ان کے مزلوں کو لئے لیا ہے، بعض ظلمات، آخرت کے (یعنی) راہِ اطمینان ہے، سو نہ تو سزا دینے والے کی طرف سے، ان کی سزائیں دیکھ، سختی دے گا، اور نہ کوئی دلیل بخار و دوست و دشمن دار، ان کی طرف داری و پیروی کرنے پائے گا۔

وَلَعَلَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا سِیِّئَ الْکُفْبِ وَ قَعَبْنَا مِنْ بَعْدِ بِالرَّسُوْلِ ۚ

اور یہ شک دی ہم نے مومنوں کو کتاب اور پہلے پیچھے اس کے پیچھے رسول

وَاتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْكِتَابَ وَآتَيْنَاهُ أَنْزْلَنا مِنْهُ رُوحَ الْقُدُسِ
اور دینے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو جو ہم نے مریم سے اور قوت دی اس کو روح پاک سے
اَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْكُمْ اَتَيْنَاكُمْ اَنْفُسَكُمْ اَسْتَكْبَرْتُمْ
پھر بھلا کیا جب تمہاری پاس آیا کوئی رسول وہ تم کو جو تمہارا تمہاری کو تو تم تکبر کرتے تھے
فَقَرَّبْنَا كَذِبَتْكُمْ وَفَرَّقْنَا بَيْنَكُمْ وَفَرَّقْنَا بَيْنَكُمْ وَفَرَّقْنَا بَيْنَكُمْ

پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم سے فرق کر دیا

اور ہم نے اے نبی اسرائیل تمہاری ہدایت کے لئے ہمیشہ سے بڑے شے سے
پہلے (پہلے) اور ہم نے اے نبی اسرائیل تمہاری ہدایت کے لئے ہمیشہ سے بڑے شے سے
(درمیان میں) پہلے بعد تمہارے (بزرگ مخالفت) پہنچا دیں کہ پہنچے تھے اور (پھر اس خاندان کے سلسلہ کے
آخر میں) پہلے حضرت عیسیٰ مریم کو نبوت کے واضح دلائل اور معجزات (و ظاہرات) اور ہم نے ان کو روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) سے جو تائید دی (سو اگلے جو جماعت خود ایک
دلیل واضح حق قرار کیا) نبی کی بات نہیں کہ اس پر بھی تم سرکشی کرتے رہے اور (جب کسی
دہلی کوئی پیغمبر تمہارے پاس آیاے احکام لاتے ہیں تو تمہارا دل نہ چاہتا تھا اور جب ہی (تم نے ان
پیغمبروں کی اطاعت سے) تمہارے دل نہ چاہتا تھا اور ان پیغمبروں میں سے (بعضوں کو تو دلوں پر تھام دیتے
تھے) اور بعضوں کو دیکھو کہ اٹھ ہی کر ڈالتے تھے۔

فَاْتَيْنَاكَ بِهَذَا الْكِتَابِ الَّذِي نَحْنُ بِنَاكَ عَلَيْهِ
پھر قرآن کی اس آیت میں: نَزَّلْنَاهُ نَزْلًا مُّجْتَمِعًا الْقُدُسُ (۱۱-۱۲) میں اور حضرت حسن بن علی
کا یہ مفسرہ

وجہ تبارک و تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے عیسیٰ علیہ السلام کی کنی طریقوں سے تائید ہوئی۔ ازل و
ولادت کے وقت میں شہدائے حفاظت کی مٹی، تمہاری کے دم کرنے سے محل بیوی قرار پایا۔
پھر یہود و مسیح کثرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف تھے اس لئے جبرئیل علیہ السلام
حفاظت کے لئے ساتھ رہتے تھے جن کو آخر میں ان کے ذریعے آسمان پر اٹھوا لئے تھے۔ یہود نے
بہت سے پیغمبروں کی تکذیب کی حتی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی تکذیب کی اور حضرت زکریا
و حضرت یحییٰ علیہما السلام کو قتل بھی کیا۔

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي الْآفَاقِ
اور کہتے ہیں ہم اگر کہ سن سکتے یا سمجھ سکتے ہوتے تو ہم آسمانوں پر ہوتے اور
اَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْكُمْ اَتَيْنَاكُمْ اَنْفُسَكُمْ اَسْتَكْبَرْتُمْ
پھر بھلا کیا جب تمہاری پاس آیا کوئی رسول وہ تم کو جو تمہارا تمہاری کو تو تم تکبر کرتے تھے
فَقَرَّبْنَا كَذِبَتْكُمْ وَفَرَّقْنَا بَيْنَكُمْ وَفَرَّقْنَا بَيْنَكُمْ وَفَرَّقْنَا بَيْنَكُمْ

یٰۤاَيُّهَا الْمُنَوِّنَ ۝

گو ایساں لاتے ہیں

خلاصہ تفسیر
اور وہ (یہودی ملحد طرز پر) کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب (راہے) محفوظ ہیں (کہ ان
میں مخالفت مذہب کا جو اسلام ہوا اثر ہی نہیں ہوتا) تو مذہب پر ہم خود
چند ہیں حق تعالیٰ نے انہیں سنا ہے کہ یہ خود علی اور جبرئیل نہیں ہے، بلکہ ان کے کفر کے سبب ان پر غیظ
کی مار ہو کر اسلام جو مذہب حق ہے اس سے نفور اور مٹوش مذہب پر مٹوش اسوہیت ہی
تھوڑا سا بیان دیکھتے ہیں اور تھوڑا سا بیان قبول نہیں، پس (و کا فری ٹھہرتے)
فَاتَيْنَاكَ... تھوڑا سا بیان ان امور کی بابت کہ جو ان کے مذہب اور اسلام میں مشترک ہیں
مشافہہ کا قائل ہوتا۔ قیامت کا قائل ہوتا کہ ان امور کے وہی قائل تھے لیکن خود بہت مجاہد اور قرآن
کے کلام حق ہونے کے منکر تھے اس لئے پورا بیان نہ تھا۔
اور اس تھوڑے بیان کو باغیارت امت ایمان کیا جس کے معنی مطلق یقین کے ہیں (و گو وہ بعض
مشابہہ کے ساتھ میں تعلق ہو اور شرا اس کو ایمان نہیں کہتے) مفسر ماہر ایمان منبر پر چوکی امور وار
فی الشریعہ کے یقین کے ساتھ ہو۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِمْ
اور جب پہنچی ان کے پاس کتاب اللہ کہ بت سے جو سچا بتی ہے اس کتاب کو روکے پانچ

وَلَمَّا كُنُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْهِمُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ أَفْلَحُوا
اور پہلے سے فتح مانگتے تھے کافروں پر۔ پھر جب پہنچا ان کو جس

مَنْعَهُمْ كِتَابُ اللَّهِ عَلَيْهِمْ اَلَمْ يَكُنْ عَلَيْهِمْ
کو یہ بیان رکھا تھا تو اس کے منکر ہو گئے، سو سنت ہے اللہ کی منکر دہوں پر

وَلَمَّا كُنُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْهِمُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ أَفْلَحُوا
اور جب ان کو ایک ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن مجید) جو مخالف اللہ ہے
(اور) اس کتاب کی دہلی تصدیق کرنے والی ہے (جو پہلے سے ان کے

خلاصہ تفسیر

اور جب ان کو ایک ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن مجید) جو مخالف اللہ ہے
(اور) اس کتاب کی دہلی تصدیق کرنے والی ہے (جو پہلے سے ان کے

پاس رہیں تو رات و آفاق کائنات کے قتل و خود ایمان کرنے سے (اور) کفار سے زمین میں سرکشی ہو کر ایک نئی قسمت دے دے میں اور ایک کتاب لائے دے میں، مگر پھر جب وہ چیز آجی جس کو وہ خوب جانتے ہو چکے تھے پس تو اس کا وصاف لکھا کر بھیجے سر دیں، اسی کی بنا پر ایسے مسکروں پر کہ ہاں ہو مگر نصیحت مقصود کے سبب لکھا کریں)

فَاَنْزَلْنَا۔ فشرآن کو جو مصطفیٰ توراة فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ توراة میں ہمیشہ محدث اور نزول فشرآن کی جو پیشینگوئیاں تھیں، ان کا صدق ظاہر ہو گیا، سو توراة کا ماننے والا تو قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں بخیر بننا اور نہ توراة کی تکذیب لازم آئے گی۔ ایک شبہ اور اس کا جواب اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب وہ حق کو پہچان جاتے تھے تو پھر ان کو مومن کہنا کا فرمایا گیا؟

قرآن کا جواب یہ ہے کہ ایمان صرف جانتے کا نام نہیں، بلکہ ماننے کا نام ہے، اور نہ یوں شیطان سب سے زیادہ حق کو جانتا ہے، مگر جاننے کے باوجود لکھا کر کے دے دے اور بھی کھنڈ میں شدت بڑھائی، اسی لئے اہل آیت میں ان کے شکر کی وجہ ان کا عبادت کیا گیا ہے، چنانچہ انہوں نے کہا:

يُسَمِّى الشُّرَكَاءَ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَكْفُرُوا وَاِمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ

بَرٰى حِزْبًا مِّنْهُ جو کہ جس کے بدلے بھلا انھوں نے اپنے آپ کو مکر ہوئے اس چیز کے جو انہوں نے

بَيَّنَّا اَنْ يَّكْفُرَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَىٰ مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَاۤءُوْ

نے اس ضد پر کہ اے اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، سو کلام سے

بِعِصْيَ اَعْلٰى خُصْبٍ ۚ وَلِلْكَفْرِ مِنْ عَذَابٍ مُّهِينٌ ۝۴

معتد پر غصہ اور کافروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا۔

خلاصہ تفسیر۔ اور حالت رہبت ہی ایسی ہے جس کو سخت سزا کر کے (وہ بزم خود) اپنی جانوں کو رخصت کر دے، اور عاقبت آخرت سے، چھڑا جاتے ہیں، (اور وہ حالت) یہ ہے کہ کفر سے رخصت کر دے، پس ایسی چیز کہ جو حق تعالیٰ نے ایک سے بغیر پر، انزال فرمائی (یعنی توراة اور وہ انکار بھی) جنھں (اس) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندہ پر اس کو نظر ہو، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں، انزال فرمائے سو (اس) ضد پر کہ کفر سے، وہ کفر عذاب کا ہے، عذاب کے معنی ہوتے، اور ذلت میں، ان کو نہ یوں کہ ان میں سزا دی جائے کہ عذاب کا، ذلت نہ دی، بلکہ

فَاَنْزَلْنَا۔ ایک غضب کفر و دوسرا حسد، یوں غضب اہل سے غضب فرمایا، عذاب کے ساتھ ہمیں کی قید سے بتا دے مقصود یہ کہ یہ عذاب کفار کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ انہیں انھوں نے مومن کو عذاب اس کو پاک کرنے کے لئے جو بھلا، ذلت کے لئے نہیں۔

آج کے آیت میں جو ان کا قول نقل کیا ہے اس سے ان کا کفر ثابت ہوتا ہے، اور حسد بھی مترشح ہوتا ہے۔

فَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُوْمِنُ بِمَا اَنْزَلَ

اور جب کہا جاتا ہے ان سے امان اس کو اترنے کے بھیجا کہ تو کہتے ہیں ہم ماننے ہیں جو اترے

عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَّآكَ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۚ

ہم براہور ہیں ماننے اس کو جو سراسر کے، یہی حاکم وہ کتاب بھی کہ جو تصدیق کرتی اس کتاب کو

قُلْ فَلِمَ كُفِرْتُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۵

کہہ دے کہ تم کیوں کفر کرتے ہو اگر اللہ کے پیغمبروں کو پہلے سے اگر ایمان رکھتے تھے۔

خلاصہ تفسیر۔ اور جب ان (یہودیوں) سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ ان تمام کتابوں پر جو اللہ تعالیٰ

نے (وہ دین پر) پڑھائی، انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لاؤ ان تمام کتابوں میں فشرآن بھی ہے، اور جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو فشرآن، اس ہی ایک کتاب پر ایمان لائے گے جو ہم (یہودیوں)

پر اور اس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے (انزال کی) ہے (یعنی توراة) اور زاتی، یعنی کتابیں، اس کے علاوہ ہیں دینیہ انجیل اور فشرآن، ان وہب کا وہ لکھا کرتے ہیں، حالانکہ وہ توراة کے

ماسوا کتابیں، لیکن (فی نفس) حق اور دراصل، ہیں، اور فی نفس حق ہونے کے علاوہ، تصدیق کرتی ہیں، پس اس کتاب (کہ قرآن کے پاس ہے) یعنی توراة کی، آپ (یہ بھی) کہتے کہ (حق) پھر کیوں کفر کیا کرتے تھے اللہ کے پیغمبروں کو اس کے پہلے زمانہ میں اگر تم توراة پر ایمان رکھتے دے تھے۔

فَاَنْزَلْنَا۔ یہود نے جو یہ کہا کہ ہم صرف توراة پر ایمان لائے گے دوسری کتاب پر ایمان دلا دی گئی، وہ تو ان کا قول مرئی کفر ہے، اور اس کے ساتھ جو یہ کہا کہ توراة، جو ہم پر انزال کی گئی ہے اس سے حسد مترشح ہوتا ہے، اس کا منہ ممانت ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک نہیں کہ ہم پر انزال نہیں کی گئیں، اس

نے ان پر ایمان نہیں لائے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو عین طرح رد فرمایا ہے:

قول یہ کہ جب اور کتابوں کی حقیقت اور واقعیت بھی دلیل قطعی سے ثابت ہے تو یہ اس کا کیا وجہ ہے! ہاں اگر اس دلیل میں کوئی کلام تھا تو اس کو پیش کر کے کشفی کر لیتے۔ انکار کھنکھائی آ کر کیا وجہ!

دوسرے اور کتابیں مسئلہ قرآن مجید جو قرآن کا مسند ہے تو اس کے انکار سے تو خود قرآن کی تکذیب اور انکار لازم آتا ہے۔

تیسرے یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا تمام آسمانی کتابوں کی زد سے کھو بیہ، پھر تمہارا گروہ کے لوگوں نے جو کئی نبیوں کو قتل کیا جن کی تعلیم بھی قرآن ہی کے احکام کے ساتھ خاص تھی، اور تم ان کا نہیں کو اپنا منہ پڑا دقت دیکھتے ہو، تو براہ راست قرآن کے ساتھ کفر کرنے ہو، اس سے تو تمہارا قوت پڑایا نہ کا دعویٰ بھی غلطاً ظہور ہے، مگر کسی بھی پہلو سے تمہارا قول و فعل صحیح اور درست نہیں۔

آگے بعض اور وجہ و دلائل سے ان یہودیوں کا زور فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن

اور آپ کا تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے سے کر بھر بنایا تم نے، پھر اس کے

بَعْدِي ۖ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿۱۵﴾

مجھے پیچھے، اور تم ظالم ہو۔

خلاصہ تفسیر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام، ہم لوگوں کے پاس صاف صاف دلیلیں (توحید و رسالت کی) دلائل دے دھر، اس پر بھی تم لوگوں نے گواہی دے دی اور بتایا۔ موسیٰ علیہ السلام کے (طریقہ پر جانے کے، بعد اور تم اس پر غریب) سخت تمہارے تھے۔

فائدہ۔ خیانت سے وہ واپس ملا ہیں جو اس آیت سے پہلے جبکہ قرآن نہ ملی تھی، موسیٰ علیہ السلام کے نبی پر حق ہونے پر قائم ہو چکی تھیں مثلاً عصا اور یہ بھڑا، اور پکا پھٹنا وغیرہ۔

روکی تقریر کا اصل ظاہر کو کہ تم دعویٰ تو ایمان کا کرتے ہو اور صریح شرک میں مبتلا ہو جس سے

موسیٰ علیہ السلام لگے خدا تعالیٰ کی صریح تکذیب بھی لازم آتی ہے، ہر سال کو عبودیت کا معاملہ اگرچہ ان یہودیوں کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا جو حضور صلی علیہ وسلم کے زمانے میں نزول

نشر ان کے وقت موجود تھے، مگر چونکہ یہ لوگ اپنے اجداد کے حامی اور طرفدار رہتے تھے،

اس نے فی الجملہ یہ بھی نہیں شامل ہیں۔ اور اس سے یہ بات بھی بخفی ہے کہ جن کے اسلاف نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے کفر کیا، وہ اگرچہ اصل علیہ السلام کے انکار کے مرتکب ہوں تو چنداں عیب نہیں۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَعَقَا فَوْقَ كُلِّ أُتُورٍ خُتُومًا

اور جب ہم نے با قرار تمہارا اور بلند کیا تمہارے اوپر ہر کوہ کو پتھر جو ہم نے

أَتَيْنَاكُمْ نَبُوءَةً وَاسْتَعْمَدُوا كَالْأَسْبَاطِ وَعَصَيْنَا وَأَشْرَكُوا

تم کو یہ دوسرے اور رسول ملے، مٹا ہم نے اور نہ مانا اور پکائی مٹھی ان کے

فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ يَسْمَايَا مَرُكُمْ بِهِ إِنَّمَا كُنْتُمْ

دلوں میں مجتہد ہی کہ تمہاری کیسب آتی کے کفر کے کہہ کر مجری بائیں صحابہ کرم کو ایمان تمہارا

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۶﴾

اگر تم ایمان والے ہو۔

خلاصہ تفسیر اور وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے تمہارا قول و نشر لیا تھا، اور اس قول و قرار لینے کے لئے، پتھر کو تمہارے رسول کے، اوپر لگا کر دیا تھا اور اس وقت ہم دیکھا کہ ان کو جو کچھ احکام، ہم تم کو دیتے ہیں بہت زبردستی ان کے ساتھ لیا اور ان کا کول سے استیصال وقت، انھوں نے دھڑکے لئے زبان سے تو کہہ دیا کہ ہم نے قبول کر لیا اور سن لیا، اور چونکہ واقع میں یہ بات دل سے نہ تھی، اس لئے گویا زبان حال میں بھی کہہ رہے تھے کہ،

ہم نے عمل نہ کیا، اور دھڑکے ان کی اس بددلی کی عقل کے قلوب، لکھنا دینے میں دی گواہی پوسٹ ہو گیا تھا، ان کے کفر سابق، کی وجہ سے (جگہ درجہ) اپنے طور سے آخر کار انھوں نے ایک

بہت پرست قوم کو دیکھ کر خواست کی تھی کہ ہمارے لئے کوئی ایسا ہی بہت موجود ہو کر رہ جائے، آپ فرما دیجئے کہ (دیکھ لیا تم نے اپنے ایمان موعود کے انھوں کو سو) یہ انھوں نے بہت بڑے ہیں

جن کی تعلیم تمہارا ایمان ہو کر رہا ہے، اگر تم زبردستی وہاب بھی باطل ایمان ہو رہے تھے یہ ایمان نہیں ہو۔

فائدہ۔ اس آیت میں جو اسباب اور بیانات مذکور ہیں، ان کی ترتیب کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنے طور سے باہر کر ان سے ایک کلمہ کفر کا قصد درجہ، ہر چند موسیٰ علیہ السلام کی زاری نہ تھی

۱۳ سورہ یقوفہ ۱۳

یہ نہیں کہ اسلام کے بعد دو مسلمانوں کی تعداد کے مقابلے میں، مادنی دنیا میں ان کی تعداد میں زیادہ رہی اگر ایسی بات ہوئی تو وہ خود اس کو خوب اچھلنے لگوں گے جو تم نے جو مسلمانوں کو وعدا نہ تھا کیا تھا اس پہلے ہم پر اسے اترے۔

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُنَّ عَلَىٰ حِدَّتِہِ ۖ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۖ
اور تو دیکھ گا ان کو سب دیکھ گا وہ عین زندگی میں رہے اور زیادہ حریفیں مشرکوں سے بھی
بَيَّوْا أَحَدَهُمْ يُوَفِّرُهُمُ الْفَتْحُ ۚ وَمَا لَهُمْ لَمَّا قَضَىٰ جَزَاءُہِ مِنْ
چاہتا ہے کہ ایک اس میں کا عرصے پر ہزار برس اور نہیں اس کو کچھ نیواں غراب سے
الْعَذَابِ أَنْ يَتَعَفَّرَ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌۢ بِّمَا يَعْمَلُونَ ﴿۹۱﴾
اس قدر جیسا، اور اشر دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

اور وہ لوگ موت کی تباہی غلام کرنے آپ (قرآن کو حیات) دنیویہ کا شریک
خلاصہ تفسیر (اور عام) آدمی سے دیکھی، بڑھ کر پانی ہے، اور اوروں کا تو کیا جو حیات تو یہ
ہو کہ بعض مشرکوں سے بھی بڑھ کر آپ ان کو حیات کا حریف دیکھیں گے، اور ان کی کیفیت، جو
کہ ان میں کا ایک ایک شخص، اس جوش میں ہے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جائے اور وہ بلا لاف
اگر تو عمر ہو جس کی تو کیا، اور مر جائے تو کچھ نہیں بھتا، تو اس کی عمر ہو جائے اور حق تعالیٰ کے
سب چیزیں ان کے اعمال و چیزیں ان کو عذاب ہونے والا ہے

فَلَا تُدْرِكُهُ السَّاعَةُ ۚ اس میں حیرت و شہدائی کی وجہ یہ کہ مشرکوں کو تو آخرت کے منکر تھے، انکی
بہار اور پیش تو کچھ ہے، دنیا ہی ہے، اس لئے وہ اگر طول عمر کی تمنا کریں تو چنداں عجب نہیں، مگر پھر
تو آخرت کے قائل اور پھر جو تو آخرت کی نعمتوں کا اپنے آپ کو مستحق کہتے تھے، پھر کچھ دینا میں
ہے کہ تمنا کریں یہ ہے حیرت و تعجب کی بات۔

پس باوجود اعتقاد آخرت کے طولی عمر کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمت اخروی کا اپنے
آپ کو نہیں سمجھنے کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اس کو بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں
بچ کر نہیں بھٹکا جائے گا، اس لئے جب تک بچے وہیں تک ہی رہیں!

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجِبْرِيلِ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ
کہ جس نے جو کچھ دیکھا وہ عین حیرت ہے، اس نے تو بتایا ہے کہ ہم نے دیکھا کہ اللہ کے حکم سے

مُصَلًِّا قَالِیْمًا یَنْذِرُہٗ وَهُدًى وَبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۲﴾ مَنْ كَانَ
کہ چاہتا تھا کہ اس کو اس کے لئے جو اس کے لئے جو اور راہ دکھاتا، اور خوشخبری سنائی، ایمان آئی، کو جو
عَدُوًّا لِلَّہِ وَمَلَائِکَہٖ وَرُسُلِہٖ وَحَابِرِیْنَ وَمِیْکَلٍ فَإِنَّ اللہَ
کوئی ہوئی دشمن اللہ اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیروں کا اور جبریل اور میکائیل کو اور اللہ

عَدُوًّا لِلْکَافِرِیْنَ ﴿۹۳﴾
دشمن ہو ان کافروں کا۔

خلاصہ تفسیر (بعض یہ دینے حضور صل اللہ علیہ وسلم سے پسند کر جبریل علیہ السلام دی گئی تھی
کہ ان کے سے تو باری عبادت ہے، ہاں تو یہ پر و اوقات اہل دار احکامات شفاء
انہی کے دینے آئے ہے، یہ ان کے لئے خوب ہیں کہ باطن اور رحمت ان کے مشعل ہے، اگر وہ دیکھ لیں
تو یہ مان لیتے، اس میں تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ محفل صل اللہ علیہ وسلم، آپ (قرآن) سے کہنے کے جو
شخص جبریل سے عبادت کے راہ جانے میں اس امر کو قرآن کے دینے میں کیا مدد دیکھ کر اس میں
تو وہ بعض میں (سور مغارت کے طوری) (مقول) نے فرشتوں پاک آپ کے قلب تک پہنچا دیا کہ
خداوند کی حکمت کے رفو کرنے والے کی خصوصیت کیوں دیکھی جاتی ہے، البتہ خود قرآن کو دیکھ کر یہ ہے (س)
اس کی دھڑاں حالت، کہ تصدیق کر رہا ہے کہ ہے قبل ہلال و آسمانی ہستیوں کی اور نہ مائی گردان
و معالج ضروری کی، اور خود خبری مستند ہے ایمان والوں کو اور کتب سادہ کی یہی شان ہوتی ہے،
پس فرشتوں میں کتب سادہ اور قائل اتباع ظہور پھر جبریل علیہ السلام کی عبادت سے اس کو
نہ ماننا ہی حاکم ہے، البتہ اگر وہ منظر عبادت جبریل کا، اس کا فصل یہ کہ حق تعالیٰ کے
نزدیک خود اللہ تعالیٰ سے عبادت رکھنا یا اس کے دوسرے ملاک سے اس کے رسولوں سے، یا
خود میکائیل سے، جس کی دوستی کا ہر دم میں ان سے عبادت رکھنا اور جبریل سے عبادت رکھنا
سب میں آپ شریک نہ جاتے ہیں، اور ان سب عبادتوں کا قانون یہ ہے کہ جو کوئی شخص خدا تعالیٰ کا
دشمن ہو، اور اللہ کے دشمن ہو، اور جبریل کا دشمن ہو، اور میکائیل کا (ہو) تو وہ ان سب کا وبال ہے
ہے کہ اللہ تعالیٰ دشمن ہو کر اپنے کا قول کا۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَیْكَ آیٰتِیْنَ بَیِّنٰتٍ وَمَا یَكْفُرُ بِہَا إِلَّا الْفٰیقُونَ ﴿۹۴﴾
اور ہم نے تم پر آیتیں باریک دیکھیں، اور انکار کرنے والے انکار دی، جو انکار میں ہیں

www.abnmedia.com

خلاصہ تفسیر اور ایمان پورے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ آپ پر کوئی ایسی دلیل واضح نازل نہ ہوئی جس کو ہم بھی جانتے پہچانتے، اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ وہ تو ایک ہی واضح دلیل کو لئے پھرے ہیں، اہم لئے تو آپ کے پاس بیٹے کے دلائل واضح نازل کئے ہیں، دین کو وہ بھی خوب جانتے پہچانتے ہیں، سوان کا انکار نہ جانے کی بنا پر نہیں، بلکہ یا انکار عدول بھی کی عادت کی وجہ سے ہے، اور (فاحسہ) غیور کہ کوئی انکار نہیں کیا کرتا، دلیلوں کا، مگر صرف وہی لوگ جو عدول بھی کے عادی ہیں۔

اَوْ كَلِمَاتٍ وَاَعْلَمُ اَنَّكَ فَرَّقْتَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ اَكْثَرِهِمْ
کیا جب ہمیں پتہ نہیں کہ کوئی قرار تو نہیں دے سکا، کیا جانتے ہیں اس سے بگاڑیں، کڑی یقین

لَا يُؤْمِنُونَ ۝

نہیں کرتے۔

خلاصہ تفسیر ایمان پورہ کچھ دہرایا دیا گیا جو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے باب میں قوراء میں یا گیا تھا، تو انھوں نے خود پہنچنے ہی سے صاف انکار کر دیا، اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ کیا اس جہد لینے سے ان کو انکار ہے، اور ان کی قیہ حالت پر کواضوں نے اپنے مسلم جہدوں کو بھی پورا نہیں کیا، بلکہ جب کسی بھی ایمان لوگوں نے دینی کی متعلق، کوئی جہد کیا ہوگا، ضرور اس کو ان میں سے کسی دیکھیں، مشرقی نے نظر انداز کر دیا ہوگا، بلکہ ان کو دلیل جہد کرنے والوں میں زیادہ تو ایسے ہی تھیں جو دیکھ سکتے تھے، انھیں ہی نہیں رکھتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان سے بڑھا کر فرمایا۔

فَانْظُرْ - اور ایک جماعت کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ بعضے ان میں سے ان کو کوہوار بھی کرتے تھے، حتیٰ کہ اگر میں بنا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے آئے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَأَ
اور جب پہنچا ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تصدیق کرنا اس کتاب کی جو ان کے پاس پر تو یہی ہے
فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ اَوْكُوا الْكِتَابَ وَكُتِبَ عَلَيْهِمُ الْمَعْرُوفُ
دو ایک جماعت نے اہل کتاب سے کتاب اللہ کو اپنی پیشہ سے پہچنے

كَانَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

گو کہ وہ جانتے ہی نہیں۔

خلاصہ تفسیر اس آیت میں ایک خاص عہد کے کیا ذکر فرماتے ہیں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے میں کام تھا، ارشاد ہوتا ہے، اور جب ان کے پاس ایک وعظ اعلان پہنچا، تو انھوں نے اہل کتاب کی طرف سے جو رسول ہونے کے ساتھ، تصدیق بھی کر لی ہے، اس کتاب کی جو ان لوگوں کے پاس ہے (یعنی قوراء کی، کیونکہ اس میں آپ کی نبوت کی خبر ہے، تو اس حالت میں آپ پر ایمان نہ لینا، قوراء پر عمل تھا، جس کو وہ بھی کتاب اللہ جانتی تھی، مگر اوجہ داس کے بھی، اہل کتاب میں کے ایک فرقے نے خود اس کتاب اللہ ہی کو اس طرح پہنچا دیا، وہ ایسے ان کو داس کے مضمون کا یا کتاب اللہ ہونے کا، گویا اسو علم ہی نہیں۔

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكٍ سَلِيفٍ ۖ وَمَا كَفَرُ سَلِيفٍ
اور پیچھے ہوئے اس علم کے جو جڑتے تھے شیطان سلیمان کی بادشاہت کی وقت اور کفر نہیں کیا سلیمان

وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا وَيَعْلَمُونَ اسَاسَ الْيَتْرَةِ وَمَا اُنْزِلَ
لے لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھاتے تھے لوگوں کو جادو، اور اس علم کے پیچھے ہونے

عَلَى الْمَلَائِكَةِ بِبَابِ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يَعْلَمُونَ مِنْ اَحَدٍ
جو اُترتا دو فرشتوں پر شیرا ہوں میں کا نام اُتار دیا، اور تو ہے، اور نہیں سکھاتے تھے وہ

عَلَى نِقُولِ الْاِمَامَاتِ فَنَبَأَهُ فَلَا كُفْرًا وَيَعْلَمُونَ مِنْهُمَا مَا
دونوں نے کئے کسی کو جب تک وہ دیکھتے کہ ہم کو ان میں سے کوئی کافر نہ ہو، اور وہ اس سے نقصان نہیں کرتے

يَقْرِءُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَرَوْحِهِ وَمَا هُمْ بِضَآئِرٍ فِيهِ
جس سے ہدائی ڈالتے ہیں مرد میں اور اس کی عورت میں، اور وہ اس سے نقصان نہیں کرتے

مِنَ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَعْلَمُونَ مَا يَصْرِفُهُمْ وَلَا يَفْقَهُهُمْ
کسی کا بیز حکم اللہ کے، اور سمجھتے ہیں وہ چیز جو نقصان کرے ان کا اور فائدہ دے

وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ
اور خوب جان پہچان میں کہ جس نے اشتیاریا جادو کو نہیں اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ،

کے فرشتہ ہونے پر دلائل قائم کر دیئے گئے، تاکہ ان کے احکامات و ارشادات کی تعمیل و اطاعت ممکن ہو۔

اور یہ کام خیرہ کرام سے اس لئے نہیں دیا گیا کہ اول تو انبیاء اور وہ لوگ جو ان میں ہستیاں
و فصل کرنا اعتقد و تہاد، الگ حیثیت سے گویا انبیاء کرام ایک فرقہ کا درجہ رکھتے تھے، اس لئے ان کو
مشرقیوں کے علاوہ کوئی اور اثر نہ تھا مناسب تھا۔

دوسرے اس کام کی تکمیل بغیر مادہ کے انتقال کی عقل و حکایت کے عادی ہونے کی تھی، اگرچہ نقل کو کفر نہایت شد کے عقل و نقل مسئلہ تادم کے مطابق ایسا ہوسکتا تھا، مگر جو کھنڈت انبیاء کرامؑ منظر جہایت ہوتے تھے، اس لئے ان سے یہ کام لینا مناسب نہ سمجھا گیا، ان کا فرشتوں کو اس کام کے لئے تجویز کیا گیا، کیونکہ کافرانہ دنگوہی میں جو خیر و شر سب پر مشتمل ہوتا ہے، ان فرشتوں سے ایسے کام ہی کیے جاتے ہیں جو جموعہ عالم کے بہت بڑے توبہ و معاصی کا مخرج ہوں، لیکن لازم مفید کے سبب فی ذاتہ شر ہوں، جیسے کسی ظالم دبا یا موذی کافور و خلیفہ کی تشدد اور غور و داغ، اگر کوئی بہت بڑے تودرت و دھوپ ہے، اور شرعی لحاظ سے نادرست و مذموم، مختلف انبیاء کرامؑ بطریق انعام کے کہ اس سے خاص تشہیحات کا کام ہی لیا جاتا ہے، جو خصوصاً دعوتِ انبیاء پر ہی ہوتا ہے، اور گوکہ نقل و حکایت مذکورہ فرض کے لحاظ سے ایک شرعی کام ہی تھا، لیکن پھر بھی ہر احتمال قریب اس امر کے کہ اس میں نقل و حکایت، جس کا جو پر عمل کا سبب نہ ہی جائے، جیسا کہ واقع میں ہوا، اور حضرات انبیاءؑ کو اس کا سبب بواسطہ نقل بنانا بھی پسند نہیں کیا گیا۔

البتہ کلیات شرعیہ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ میں اس معصوم کی تکفیل کر دی گئی،
ان کلیات کے جزئیات کی تفصیلات کو جب حتمی عدالت مفتنہ اسباباً کرام
کے ذریعہ بیان نہیں کی گئیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ مشاف
انیارگام نے یہ بتلائے کہ رشوت لینا حرام ہے، اور اس کی حقیقت بھی بتلادی، لیکن یہ جزئیات نہیں
بتلائے، کہ ایک طریقہ رشوت کا یہ ہو کہ صاحب معاملہ سے یوں چال کر کے نکال دیا جائے، وغیرہ وغیرہ
کیونکہ اس طرح کی تفصیلات بیان کرنے سے تو لوگ اندر گر پڑیں جیسے کہ مجھے ہیں، یا شافعی اسلام عسکر
کی ایسی مثال فرض کیجئے کہ قواعد کلیہ سے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ دست خفیہ کامل جس میں تنگی کے نیچے
یاجب ہیں، مگر ہوتے روپے مل جائیں ناجائز ہے، لیکن یہ نہیں بتلا دیا کہ نکال دینے سے اس
طرح دو روپے ملتے تھے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ فرشتوں نے باقی میں آکر اپنا کام شروع کر دیا، کہ جس کے اصول و فرائض ظاہر کر کے

لوگوں کو اس کے عمل پر دے بچے کی اور سامنے سے نفرت و دوری رکھنے کی سبب اور اتنا سیکھ لیتے کہ
 مامو دیکھ کر باہر نکل کھڑا ہوا تو اس نے کئی بھلائی سیکھ لیتے تھے، اس نے وہ فقر و غنا کی پیمائش
 کو اس وقت شائع کیا جس سے کہ اس کو مطلع کرنے کہ دیکھو بھلائی سیکھنے کے لائق ہیں ان سے
 بہت سیکھ سکتا۔

جب فرشتوں نے کام شروع کیا تو وقتاً فوقتاً ملک و لوگ کی تعداد و مکان کے پاس مشرعوں پہلو اور دو درخواست کرتے گئے کہ ہم کبھی ان اصول و فروع سے مطلع کریجئے تاکہ ادا و نفاذ کے سبب ہمارا معاملہ سلاو میں مستحکم ہو جائیں، اس وقت فرشتوں نے بطور حجت سیاق و سبب اور منظر اصلاح یہ الزام کیا کہ اصول و فروع بتانے سے قبل یہ کبہ یا کرتے تھے کہ دیکھو! یہ بتانے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش بھی مقصود ہے کہ دیکھیں ان پیہڑوں پر مطلع ہو کر کون کون شخص اپنے دین کی حفاظت و اصلاح کرتا ہے، کون کون اس سے بچے، اور کون اپنا دین غریب کرتا ہے، کون کون مشرعوں پر مطلع ہو کر وہی شرع خود اختیار کر لے، جس کا انجام کفر ہے، خواہ غرض عمل ہو یا اعتقاد، دیکھو ہم تم کو نصیحت کئے دیتے ہیں کہ کاجھی نیت سے اطلاع حاصل کرنا اور پھر اس نیت پر پناہ نہ دینا، ایسا نہ ہو کہ ہم سے تو یہ کہہ کر سیکھ لو کہ میں بچنے کے لئے پوچھ رہا ہوں، اور پھر اس کی خرابی میں خودی مستحکم ہو جاؤ، اور ایمان بڑا کر لو۔

اب ظاہر ہے کہ وہ اس سے زیادہ بھرپور ہی ادریکار کر سکتے تھے، مگر جس کو ان سے اس طرح جھڑپ مان کر لیتا ہے اس کے دیر و درجہ وار کے سب اصول و فروغ بیان کر دیتے تھے، کیونکہ ان کا کام ہی یہ تھا۔ اب اگر کوئی جھڑپ کر کے کہے کہ امارہ وہ شہسارے کا فروغ عاجز ہے وہ جانتے چنانچہ بیٹے اس جہد پر قائم نہ رہے، اور اس جادو کو مخلوق کی یا اگلا رسالی کا ذریعہ نہ بنایا، جو فسق و فساد کا ذریعہ بن گیا، تو اس کے استعمال کے کفر ہو ہی، اس طرح سے عاجز کا فریب گئے۔

اس ارشادِ اسلامی اور پھر مخاطب نے غلط فہمی کرنے کی مثال اس طرح جو بھی ذکر کی ہو
 شخص کسی مانتع مستقل و متغیر عالمِ اہل کے پاس جانے کو کچھ کوفت دیم باجدی فلسفہ چھاد بیجے، ناخو
 جی ان شبہات سے محفوظ رہوں جو فلسفہ میں اسلام کے غلات بیان کئے جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی
 جواب دے سکوں، اور اس عالم کو احوال ہو کہ کیا ہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ دھوکہ دے کر چڑھ لے، اور پھر
 ہی خلافِ شرع عقایدِ باطلہ کو تقویت دینے میں اس کو سہماں کرنے لگے، اس امکان کی وجہ سے اس
 نصیحت کر کے کراہیات کرتا اور وہ وعدہ کرے، اور اس نے اس کو چھاد لیا وے، لیکن وہ پھر
 فلسفہ کے غلاتِ اسلامِ انحراف و عقائدِ بے کوفت سمجھنے کو تو تیار ہے کہ اس کی اس حرکت سے اس غل
 کرئی غلاتِ ایرانی مانتع نہیں ہو سکتی اس طرح اس اصطلاحِ محکمہ ان فرشتوں پر بھی نہ کسی شبہ

مکلفات میں نہ ہو سکی۔

اور اس شخص کی عیسیٰ کے بعد غالباً وہ فرشتے آسمان پر چلے گئے ہوں گے، واللہ اعلم
بمقتدرہ الحال و بیان القرآن،

اسکی حقیقت | بڑا کثرت سنت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر ہو و ناموس، خواہ وہ
سبب منہوی ہو جیسے خاص خاص کلمات کا اثر یا غیر محسوس چیزوں کا ہوا، جیسے جنات و شیاطین کا
اثر یا سمیرن میں قوت خیالیہ کا اثر یا محسوسات کا ہو مگر وہ محسوسات غنی ہوں، جیسے مقناطیس کی
مکش لوہے کے لئے جبکہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو، یا داراؤں کا اثر جبکہ وہ داریں غنی ہوں یا
خبر و دستورات کا اثر۔

اس نے جادو کی اقسام بہت ہیں، مگر وہ عام میں عموماً جادو اور جہیزوں کو کہا جاتا ہے جن
میں جنات و شیاطین کے عمل کا دخل ہوا یا قوت خیالیہ سمیرن کا، یا جادو الفاظ و کلمات کا کہ جو کہ یہ
اثر عطا بھی ثابت ہے اور تحریر و شایعہ سے بھی اور قدیم و جدید فلسفہ میں اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ
حروف و کلمات میں بھی یہ طاقت ہے تا اثرات ہوئی ہیں، کہیں خاص حروف یا کلمہ کو کہیں خاص تعداد میں
پڑنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص خاص تاثرات کا شایعہ ہوتا ہے، یا ایسی تاثرات جو کسی انسان یا
جانوروں وغیرہ اعضا یا اس کے ہستیاں کی ہڈوں کے ساتھ کہ دوسری چیزیں شامیل کر کے پیدا
کی جاتی ہیں جن کو وہ عام میں فوٹو کھینچا جاتا ہے، اور جادو میں مشامیل سمجھا جاتا ہے۔

اور اصطلاح قرآن و سنت میں تحریر ایسے عربیہ کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش
کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، پھر شیاطین کو راض کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کہیں ایسے
منہجست سار کرنے جاتے ہیں جن میں کفر و شرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مدد کی گئی ہو یا
کوکب و نجوم کی عبادت اختیار کی گئی ہو جس سے شیاطین خوش ہوتے ہیں۔

کہیں ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اس کا
غول بہنہاں کرنا یا جنابت و نجاست کی حالت میں رہنا، ہمارے سے جہت شائبہ کرنا وغیرہ۔

جو طرہ سے اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد، ان اقوال و افعال سے حاصل کی جاتی ہو،
جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں مثلاً تقویٰ، ہمارے، اور پاکیزگی، بدحواسی سے اجتناب و ذکر اللہ
اور اعمالی بھر۔

اسی طرح شیاطین کی امداد ایسے اقوال و افعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیطان کو پسند ہیں، ان
لئے صورت ایسے ہیں لوگوں کا کامیاب ہونا ہے جو کدے اور دشمن رہیں، یا کسی اور اللہ کے نام سے دور
رہیں، نجیث کاموں کے مادی ہوں، عورتیں بھی ایام جہیز میں یہ کام کرتی ہیں تو نثر ہوتا ہے، یا

شعبہ اور لڑنے یا فتح جالاک کے کام یا سمیرن وغیرہ ان کو باز و محرکہ یا مانگے، و درج المعانی،
بحسبہ کے اسام | اسام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ عربی مختلف قسمیں ہیں،

ایک قسم تو محض لفظ بندہ اور تفہیل ہوتی ہے، جس کی کوئی حقیقت واقعہ نہیں، جیسے معین
شعبہ یا زاپنی یا فتح جالاک سے ایسے کام کہتے ہیں کہ عام لوگوں کی نظر میں اس کو دیکھنے سے قاصر رہتا
ہو یا قوت خیالیہ سمیرن وغیرہ کے ذریعہ کسی کو باخ پر ایسا اثر ڈالا جائے کہ وہ ایک جیسے کہ
آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، مگر اس کی کوئی حقیقت واقعہ نہیں ہوتی، کہیں یہ کام شیاطین
کا اثر سے بھی ہو سکتا ہے، کہ کوئی انھوں اور دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے جس سے وہ ایک فحش و
چیز کو حقیقت سمجھنے لگے، قرآن مجید میں منسوخ جانی سحر و جادو کے جس قسم کا ذکر ہے وہ یہی قسم کا سحر
تھا، جیسا کہ ارشاد ہے،

تَحْنُوتُ وَالْخَلْقِ النَّاسِ (۱۱۶/۱۱۷) | انھوں نے قہر کی آنکھوں پر جادو کر دیا

اور ارشاد ہے،
يُخَلِّصُ إِلَى سَبِيلِ اللَّهِ وَيُخَلِّصُ إِلَى سَبِيلِ اللَّهِ (۱۱۶/۱۱۷) | ان کے سحر سے مرئی مایہ میں خالی رہنے لگے
فصلیہ (۱۱۶/۱۱۷) | لگا کہ وہ دیوانے کے سانپ سے ڈرتے ہیں،

اس میں بخیل کے لفظ سے یہ بتا دیا گیا کہ یہ رستیاں اور لاشیاں جو سحر و جادو نے ڈالی تھیں وہ
سانپ بنی، اور انھوں نے کوئی حرکت کی، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت تنبیہ و تاثیر ہو کر ان
دو لڑنے والے سانپ سمجھنے لگے۔

دوسری قسم اس طرح کی تفہیل اور نظربندی ہے جو بعض اوقات شیاطین کے ر ہوتی ہو
جو قرآن کریم میں اسے ارشاد سے معلوم ہوتی،

هَلْ أَتَى عَلَى الْكَافِرِ نَارُ النَّارِ | نہیں نہیں، نکلا ہوں کہ کس لوگوں پر شیطانی
النَّارِ | ہاں، ہر بہتیاں ہاں دھندے والے مٹا دھندے
آتِ الْكَافِرِ (۲۲۱/۲۲۲) | ہاں کرتے ہیں

نیز دوسری جگہ ارشاد ہے،
وَلَقَدْ أَتَى عَلَى الْكَافِرِ نَارُ النَّارِ (۲۲۱/۲۲۲) | میں شیاطین نے کفر نہت سار کیا، اور ان
کو جادو رکھا لے گئے۔

تیسری قسم یہ کہ سحر کے ذریعہ ایک شخص کی حقیقت، یہ بدل جائے، جیسے کسی انسان یا
جانما کو چھو کر یا جادو بنادیں، اسام راغب اصفہانی، اور کہ جس سے جادو و سحر سے اس سے
اٹھارہ کام کے سحر کے ذریعہ کسی جہیز کی حقیقت بدل جائے، بلکہ جادو کا صرف تفہیل اور نظربندی

ہیں ایک ہو سکتے ہیں، معتزلہ کا بھی یہی قول ہے، مگر جو روایا کی تحقیق یہ ہو کر انقلب اعلیٰ میں مذکور کی عقل بہت متاع ہے نہ شرعی، مثلاً کوئی جسم چتریں بن جائے، یا ایک نور سے دوسری نور کی طرف منتقل ہو جائے۔

اور فلاسفہ کا جو یہ قول مشہور ہو کر انقلاب حقائق ممکن نہیں، اُن کی مراد حقائق سے محال، ممکن، واجب کی حقیقتیں ہیں کہ ان میں انقلاب عقلاً ممکن نہیں، کو کوئی حال ممکن ہیں جائے، یا کوئی ممکن محال ہیں جائے۔

اور قرآن عزیز میں فرعونی ساحروں کے جو کوہ جو تعبیل خسروا دیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر جو تعبیل ہی ہر اس سے ناکارہ و گمراہ ہو، اور بعض حضرات نے محسوس کیا کہ انقلب حقیقت کے ہر اواز پر حضرت کعبہ مبارک کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو مؤلف امام مالکؒ میں بروایت شماع بن عسکیم منقول ہے:

لولا کلمات القرون لجلستنی

الیوم و حساننا

گمراہ ہونے کا نظریہ بڑی طور پر جو قوت بنانے کے ضمن میں بھی ہو سکتا ہے، مگر بلا ضرورت حقیقت کو چھوڑ کر محاذ مزاح لایا نہیں، اس لئے حقیقی اور بظاہر ہی مفہوم اس کا کہیں ہے کہ اگر میں یہ کلمات روزانہ پاندی سے نہ پڑھتا تو یہودی کا جو درگم مجھے گمراہ بنا دیتے۔

اس سے دو باہر ثابت ہو گئی، اول یہ کہ محسوس کردہ انسان کو گمراہ ہونے کا امکان ہر دور سے یہ کہ کلمات وہ پڑھا کرے جسے ان کی تاثیر ہے کہ کوئی باوجود اثر نہیں کرنا، حضرت کعبہؒ جلیل سے جب ان لوگوں نے یہ چھکار کر کلمات کہتے تو آپ نے یہ کلمات بتلائے:

أَفَلَمْ يَدْعُوا إِلَىٰ نَظْمٍ لِّذِي قُوَّةٍ
أَفَلَمْ يَدْعُوا إِلَىٰ نَظْمٍ لِّذِي قُوَّةٍ
أَفَلَمْ يَدْعُوا إِلَىٰ نَظْمٍ لِّذِي قُوَّةٍ
أَفَلَمْ يَدْعُوا إِلَىٰ نَظْمٍ لِّذِي قُوَّةٍ
أَفَلَمْ يَدْعُوا إِلَىٰ نَظْمٍ لِّذِي قُوَّةٍ
أَفَلَمْ يَدْعُوا إِلَىٰ نَظْمٍ لِّذِي قُوَّةٍ
أَفَلَمْ يَدْعُوا إِلَىٰ نَظْمٍ لِّذِي قُوَّةٍ
أَفَلَمْ يَدْعُوا إِلَىٰ نَظْمٍ لِّذِي قُوَّةٍ
أَفَلَمْ يَدْعُوا إِلَىٰ نَظْمٍ لِّذِي قُوَّةٍ
أَفَلَمْ يَدْعُوا إِلَىٰ نَظْمٍ لِّذِي قُوَّةٍ

تمی اللہ علیکم کی نیک یاد کہ انہوں میں سے بڑا کوئی نہیں اور نہ، بڑا کہ انہوں ان کے کلمات کی وجہ سے کوئی نیک یا ناساں آگے نہیں نکل سکا اور نہ بڑا کہ انہوں ان کے نامہ سادہ سنائی گئی کہ میں جانتا ہوں، اور جن کو نہیں جانتا ہوں اس میں چھپنے کے شرع نہیں کرنا، تعالیٰ نے یہ کیا کیا اور جو روایا در پتیا لیا ہے

نظم یہ ہو کہ ہر کسی کے بینوں میں کئی اوقع ہیں۔

بحر اور بحرین میں فرق | جس طرح انبیاء علیہم السلام کے معجزات یا اولیاء کی کرامات سے ایسے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں جو مرادۂ نہیں ہو سکتے، اس لئے ان کو خرقی عادت کہا جاتا ہے، بظاہر محسوس اور جادو سے بھی ایسے ہی آثار مشاہدے میں آتے ہیں، اس لئے بعض جاہلوں کو ان دونوں میں امتیاز نہیں ہو جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ جادو گرد کی تعظیم و تکریم کرتے گھٹتے ہیں، اس لئے دونوں کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔

سو یہ فرق ایک تو اصل حقیقت کے اعتبار سے، ہر اور ایک ظاہری آثار کے اعتبار سے، حقیقت کا فرق تو محسوس اور جادو سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں یہ دائرۂ حسابات الگ کرتی چیزیں نہیں، فرق صرف اسباب کے طور و خطا کا ہے جہاں اسباب ظاہر ہوتے ہیں وہ آثار ان اسباب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، اور کوئی تعجب کی چیز نہیں جاتی، لیکن جہاں اسباب مخفی ہوں تو وہ تعجب کی چیز ہوتی ہے، اور خواہ اسباب کے نہ جانے کی وجہ سے اس کو خرقی عادت سمجھ گئے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ حقیقت ظاہر و باہر کی طرح کسی جن میں شیطانی کے اثر سے ہوتی ہے، ایک خط مشرقی بیت سے آج کا گھبراہٹ کا ایک سانسے آکر گر گیا، تو دیکھنے والے اس کو خرقی عادت کہیں گے، مگر اگر کج نیت و شیطانی کو اپنے اعمال و افعال کی قوت دی گئی ہے، ان کا ذریعہ معلوم ہو تو پھر کوئی خرقی عادت نہیں رہتا، فخلاصہ یہ ہے کہ محسوس ظاہر ہونے والے تمام آثار اسباب طبیعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں، مگر اسباب کے مخفی ہونے کے سبب لوگوں کو مثلاً لاطریقی عادت ہو جاتا ہے، بخلاف مجہود کے کہ وہ بلا واسطہ فعل جن تعالیٰ کا ہوتا ہے، اس میں اسباب طبیعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے تڑو کی آگ کو جن تعالیٰ نے فرما دیا کہ ابراہیمؑ علیہ السلام کے لئے خموشی ہو جائے، مگر خموشی بھی اتنی نہ ہو جس سے تخلیق پختہ، بلکہ جس سے سلامتی حاصل ہو، اس میں کوئی اتنی سے آگ خموشی ہو گئی۔

آج بھی بعض لوگ بدن پر کچھ دوایں استعمال کر کے آگ کے اندر چلے جاتے ہیں، اور مجہود نہیں بلکہ دوایں کا اثر ہے، اور دامن مخفی ہونے سے لوگوں کو جادو کا خرقی عادت کا ہو جاتا ہے۔ یہ بات کہ مجہود بلا واسطہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، خود قرآن عزیز کی تصریح سے ثابت ہے، اور شائد اس کا:

وَمَا تَسْتَعِثُّ بِذِي قُوَّةٍ
وَمَا تَسْتَعِثُّ بِذِي قُوَّةٍ

مگر یوں کی مثل جو آپ نے پیش کیا، درحقیقت کچھ نہیں ہو سکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ تعالیٰ

جادو سے کہ ایک شمی خاک اور لکڑی کے سائے میں آ کر پھر تک پہنچ جاتا اس میں پہنچنے کا کوئی دخل نہیں، یہ خاص حق تعالیٰ کا فعل ہے، یہ مجہود و بدعت میں کیا تھا کہ آپ نے ایک شمی خاک

میں نے ذکر نہیں کیا کیا۔

صرف دوسرے دعوئی خیر خواہی ہی پر کلام کیا گیا ہے، اور اہل کتب کے ساتھ مشرکین کا ذکر مضمون کو قوی اور موثر کرنے کے لئے کیا گیا، کہ جس طرح مشرکین ایضاً حقہ سے خیر خواہ نہیں اس طرح ان کو بھی سمجھو۔

مَا نُنْسخُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْهِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ

جو مسوا کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر اس کے برابر کیا سمجھو کہ

أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٦٠﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ

معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمان

وَالْأَرْضِينَ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٥٠﴾

اور زمین کی اور نہیں تھامے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار ۔

خلاصہ تفسیر | ارتدیل قبل کا واقعہ جب ہوا تو یہ ہونے اس پر ملن کیا، اور مشرکین بھی بعض احکام کی منسوخی پر زبان ملن درواز کرتے تھے، حق تعالیٰ اُن کے ملن

اور اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ ہم کسی آیت کا جو حکم موقوف کر دیتے ہیں (مگر آیت قرآن میں

یا ذہنوں میں باقی ہے، یا اس آیت (ہی) کو روڑہنوں سے، خاموش کر دیتے ہیں تو (یہ کوئی اعتراض

مثلاً بجائے اس کے (دوسری چیز) لے آتے ہیں۔ (اے معترض) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ جی تعالیٰ

ہر شے پر قدرت رکھتے ہیں، (اس لیے) قادر کو مصالح کی رہایت کیا مشکل ہو اور) کیا تجھ کو یہ معلوم

جہیں کو حق تعالیٰ ایسے چاہے جس کو خاص اہلی سلطنت اسماعیل اور زمین پر ہے، ورجب الی الہ اس
 قدرت و سلطنت میں کوئی شریک و ہمسر نہیں ہے تو ان مصلحتوں کی رعایت کر کے دوسرا حکم

دیہے میں کون مزاحمت کر سکتا ہے، غرض مجرم شانی کی تجویز سے بھی کوئی مانع نہیں، اور اس شکم

کے جاری کر دینے میں بھی کوئی مانع نہیں، اور (یہ بھی سمجھ رکھو کہ) مختصراً حق تعالیٰ کے سوا کوئی یا نہ کار

ہیں تو ان احکام پر عمل کرنے کے وقت تمہارے مخالفین کی مزاحمت سے بھی ضرور محفوظ رکھیں گے

انہی کے لئے اس ضرورت سے بڑھ کر کوئی نفع اخروی ملنے والا ہو تو ظاہر اہل مخالف کا مسلط ہو جانا اور بات کو

1

معارف ومسائل

ماتنا فتح یوں آئی ہے اُذْ کَرِیْمًا، اس آیت میں کسی آیت قرآنی کے منسوخ ہونے کی جانی ضرورت نہیں ہوتی سب کو یقین کر دے، فتح کے لئے نصرت میں زائل کرنے اور بھٹکے کے آنے ہیں، اس پر تمام مغیرہ پر امت کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں فتح سے مراد کسی حکم کا ازالہ کرنا یعنی منسوخ کرنا ہے، اور اس کے منسوخ کا کتاب و سنت میں نسخ ایک حکم کے بجائے کوئی دوسرا حکم جاری کرنے کو کہا جاتا ہے، خواہ وہ دوسرا حکم ہی ہو کہ سابق حکم کا اہل غم کو دیا جائے، یا یہ ہو کہ اس کی جگہ دوسرا عمل مثلاً دیا جائے۔

احکام الہیہ میں کج حقیقت و نیک حکم متوازن اور داریوں میں کسی حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری کروینا مشہور و معروف ہے، لیکن انسانوں کے احکام میں کج حقیقت اس لئے ہوتا ہے کہ پہلے کسی غلط فہمی سے ایک حکم جاری کر دیا، بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو حکم بدل دیا، کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ جس وقت سے حکم جاری کیا گیا اس وقت کے حالات کے مناسبت تھا، اور آگے آنے والے واقعات و حالات کا اتنا رد و تضاد تھا جب حالات بدلے تو حکم بھی بدلنا پڑا، یہ دونوں صورتیں احکام خداوندی میں نہیں ہوتیں۔

ایک بری صورت یہی برائی ہے کہ کھردے والے کو اڈل ہی ہے یہی معلوم ہٹاکا حال
پہلیں گے اور اس وقت بچہ مناسب نہیں گا، دوسرا حکم دینا ہوگا، یہ جانتے ہوئے آج تک کھردیا
اور جب بچے کے مطابق حالات بدلے تو اپنی فساد اور دوسرائے کے مطابق کھردی بدل دیا، اسکی
مثال ایسی ہے کہ بریف کے موجودہ حالات کو دیکھ کر کھردے کو ایک اور دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا
کہ دوسرا دوا کے سہارا کرنے کے بعد بریف کا حال بدلے گا، اس وقت بچے دوسری دوا
تجویز کرتا ہوگی، یہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ پہلے دن ایک دوا تجویز کرتا ہے جس دن کے مناسب کچھ
دو دن کے بعد حالات بدلنے پر دوسری دوا تجویز کرتا ہے۔

اللہ جل شانہ کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں موت بھی آخری صورت
نفس کی ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے، ہر آنے والی نبوت اور ہر نازل ہونے والی کتاب چھپل

اللہ جل شانہ کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں موت بھی آخری صورت
نفس کی ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے، ہر آنے والی نبوت اور ہر نازل ہونے والی کتاب چھپل

نبوت اور کتاب کے بہت سے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام جاری کئے، اور اس طرح ایک ہی نبوت و شریعت میں ایسا ہونا ہر ایک کو جو عہد ایک حکم جاری رہا، پھر متعاقباً سے محکم تھا و نہی اس کو بدل کر دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے:

”فہم یسئلون عن نبوتہ قطاً لا یشاخصہ“

”میں نہیں کوئی نبوت نہیں آئی ہر ایک کا“

میں بخدا درود و دعا کیلئے دعا کرتا ہوں

جاہل و مشیقات البتہ کچھ جاہل یہودیوں نے اپنی جہالت سے احکام کو اپنے کے نسخ کو دوسری احکام کے نسخ کی پہلی دونوں صورتوں پر قیاس کر کے یہ کہہ کر صلی اللہ علیہ وسلم پر زبان طعن و راز کی، اسی کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں (ابن جریر، ابی نعیم و غیرہ)

مسلمانوں میں سے منسوخ و معطل کر کے بعض لوگوں نے شاید ان مخالفین کے طعن سے بچنے کی یہ راہ نکالی کہ احکام یا آیتیں منسوخ ہونے کا امکان تو ہے، کوئی امر اس امکان کے لئے مانع نہیں، لیکن پچھلے مشرکین میں نسخ کا وقوع کہیں نہیں ہوا، نہ کوئی آیت مانع ہے، نہ منسوخ۔ یہ قول ابوسلمہ اصفہانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس پر علماء اہل سنت نے ہمیشہ زور دیکر فرمایا کہ تفسیر و وجہ للعائن میں ہے:

واقفقت اہل الشرائع علی
جواز النسخ و وقوعہ و خالففت
اليہود و غیر العیسویۃ فی جوازہ
وقالوا ینسخ عقلاً وایو مسلمہ
الاصحاب فی وقوعہ فقال انه و
ان جاز عقلاً لکنہ لم یقع۔

(رد المحتار ص ۱۵۲۳)

اور امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا:

معرفۃ ہذا الباب اکیفۃ و
فاستہ حلیۃ لا تستغنی عن
معرفة العلماء ولا ینکح الا
الجللۃ الاطیاء۔ (ترمذی مش ۵۱)

مشہور ہے اس جگہ ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ مسجد میں تشریف لائے تو کوئی آدمی وہ خطبہ پڑھا، آپ نے انہیں سے پوچھا یہ کیا کرتا ہے؟ انہوں نے

نے کہا کہ وہ خطبہ نصیحت کر رہا ہے، آپ نے فرمایا نہیں، یہ کوئی وہ خطبہ نصیحت نہیں کرتا، بلکہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں سو بیٹاؤ، پھر اس شخص کو بڑا کر کے چاکر کیا تم قرآن و حدیث کے تاج منسوخ احکام کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں میں نہیں جانتا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمارے حبیب نے کچھ باز آئندہ ہمیں یہاں وہ خطبہ دکھو۔

مشرکین و منافقین میں نسخ کے وجود کو قلع و قمع کے متعلق صحابہ کرام میں سے اتنے آثار و اقوال موجود ہیں کہ ان کو کتب میں نقل ہے، فقیر ابن جریر، ابن کثیر، درمنثور و غیرہ میں اسانید قویہ میرے ساتھ بھی بہت روایات مذکور ہیں، اور روایات ضعیفہ کا ذکر شمار نہیں۔

اسی لئے امت میں یہ مسئلہ ہمیشہ اجماعی رہا ہے، صرف ابوسلمہ اصفہانی اور چند متحرزلے وقوع نسخ کا انکار کیا ہے، جس پر امام رازنی نے تفسیر میں منسوخ و بطل کے ساتھ رد کیا ہے۔ نسخ کے مفہوم میں متقدم و متاخر ہیں، چنانچہ نسخ کے معنی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ایک چیز کے لئے ہے، اور یہ تبدیلی کی پہلے احوال میں منسوخ کی جس طرح ایک حکم یا کلمہ یا نسخہ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لائے میں ہے، جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنا دینا، اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید و شرط یا محدود یا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے، اسلاف امت نے نسخ کو اسی عام معنی میں ہی استعمال فرمایا ہے، جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے، اور جزوی تبدیلی قید و شرط یا ہستثناء و غیرہ بھی اس میں شامل ہے، اسی لئے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآن میں آیات منسوخ یا نسخک شمار کی گئی ہیں۔

حضرات متاخرین نے صرف اُس تبدیلی کا نام نسخ رکھا ہے، جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہوئے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخ کی تعداد بہت گھٹ جائے گی، اسی کا لاف اٹھانے والے یہ حکماء و متقدمین نے تقریباً ان روایات قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا جس میں مولیٰ سے تبدیلی قید و شرط یا ہستثناء و غیرہ کو بھی شامل کیا تھا اور حضرات متاخرین میں علامہ سیوطی نے صرف یہی آیتوں کو منسوخ شمار دیا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ فرمایا ہے، جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل بعید کے نہیں ہو سکتی، یا اس لحاظ سے نہیں ہو سکتا کہ احکام میں اصل بقائے حکم ہے، نسخ غلطی اصل براس لئے ہے چنانچہ آیت کے معمولی یا ہونے کی کوئی ترجیح ہو سکتی ہے، اس میں بلا ضرورت نسخ یا منادوست نہیں۔

لیکن اس ساقبیل کا منشا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ منسلک نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا جس کے ازالہ کی کوشش ہو، دوسرے ایک ملحق رہی، آخری امکان حضرت شاہ ولی اللہ کا ہوا،

جس میں گھٹنے گھٹنے پاؤں رہ گئے، اور اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدی تحقیق ان پاؤں کا بھی خاکہ کر کے باطل و ترک پہنچا دے۔

مسئلہ نسخ کی تحقیق میں ایسا ہی ختم یا کرنا نہ اسلام اور قرآن کی کوئی صحیح خدمت کو اور نہ ایسا کرنے سے صحابہ و تابعین اور پھر چودہ سو برس کے ملا جملہ عقیدہ میں دشمنان کے متعلق تحقیقات کو رد یا کھانسی ہے اور نہ مخالفین کی زبان میں اس سے بند ہو سکتی ہے، بلکہ اس مانے کے طعنوں کے باوجود میں یہ یقیناً رہنا چاہتا ہوں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے، اگرچہ وہ سو برس کا تمام علم امت کہہ سکتے ہوں اور آخر میں اس کا غلط ہونا ثابت ہو جائے، معاذ اللہ! اگر یہ دروازہ کھلے گا تو قرآن اور شریعت سے اس آٹھ جانے گا، اس کی کیا ضمانت ہے کہ کج جو کسی نے تحقیق کی وہ کل غلط ثابت نہیں ہو سکتی؟ مصرعہ میں بعض علماء کی ایسی تحریریں نظر میں گذری ہیں جنہوں نے آیت مذکورہ متعلقاً کچھ متعسفینہ شرطیں پھر لی جو دے ایک قضیہ میں مذکورہ کچھ قضیہ ایضاً اور کچھ کلمات ملتے جلتے، لہذا استدعا ہے کہ صرف امکان نسخ کی دلیل بنا کر اور وقوع سے انکار کیا، حالانکہ تعسف میں شرط اور قضیہ شرطیہ جو تفسیر میں بڑا فرق ہے، اور یہ دیکھ سہل حال جو اسلام اصفہانی اور معتزلہ پیش کرتے ہیں۔

لیکن صحابہ و تابعین کی تفسیریں اور دوسری امت کے تراجم دیکھنے کے بعد اس کو مدلولی شرعاً تو کیا کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا، صحابہ و تابعین نے اس آیت سے وقوع نسخ پر استدلال کیا ہے، اور متعدد واقعات شمار کرتے ہیں۔ (دیکھیں نیز ان خبر پر دیگر)

نہا وجہ ہے کہ امت کے مستفیدین و دشمنان میں کسی نے بھی وقوع نسخ کا مطلقاً انکار نہیں کیا، خواہ حضرت شاہ ولی اللہ نے تطبیق کر کے تعداد کو کم کر دیا، مگر مطلقاً وقوع نسخ کا انکار نہیں کیا۔ اور ان کے بعد بھی انکار علماء و دیوبند بلا استثناء، بعضی وقوع نسخ کے قائل چلے آئے ہیں جن میں سے متعدد حضرات کی مستقل یا سبب زوری تفسیر میں بھی سوچ دیں، کسی نے بھی نسخ کے وقوع کا مطلقاً انکار نہیں کیا، واللہ اعلم و اعلم المسلمین۔

آؤ فقہ حنفیہ پر ضرورت قرأت کے مطابق آیت، اور زنتیہ سے ماخوذ ہے، معنی یہ ہیں کہ کسی نسخ آیت کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ وہ آیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کے ہونے سے باطل ہو جائے، یہی کہ اس کی تفسیر میں واقع اس طرح کے حضرات مفسرین نے ذکر کئے ہیں، اس بخلاصہ کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ آئندہ اس پر عمل کرنا مقصود نہیں۔

نسخ کے متعلق بقیا احکام کی تفصیلات کی یہاں گفتگو نہیں اس کا اصل محل اصول فقہ کی کتاب میں ہیں۔

اَمْ تَرْيَدُونَ اَنْ تَسْأَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سَأَلْتُمْ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ وَ مِنْ تَحْتِ الْكَفْرِ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيْلِ ۝

پھر اور جو کوئی کفر جسے بدلے ایمان کے کر دے، بھکا سیدھی راہ سے۔

خلاصہ تفسیر ایمان ہوئے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عداوتوں کا کہ جس طرح مومن علیہ السلام کو ایک ہی دفعہ قرآن نازل ہوئی اسی طرح آپ قرآن مجید بھی اسی طرح نازل ہوا، اس پر اشارہ ہوتا ہے کہ ان ایسا کرنا چاہتے ہو کہ اپنے رسول پر روت سے رہ جائیں، اور جو کتبیں کر دیا کہ اس کے قبل (مخالفانے بزرگوں کی طرف سے حضرت) مومن علیہ السلام سے بھی راہیں ایسی، اور کتبیں کی جا چکی ہیں، دشمن خدا اقبال کو غلامیہ دیکھنے کی درخواست کی تھی، اور ایسی درخواستیں جن سے صرف رسول پر اعتراض کرنا اور صالح اہل بیت میں مزاحمت کرنا ہی مقصود ہو، اور ایمان لانے کا بھی یہی ارادہ نہ جو زوری کفر کی جہاں ہیں، اور جو شخص ایمان لانے کی بجائے کفر کی راہیں کرے، بلا شک وہ شخص راہ راست سے دور چلا جائے گا۔ اس درخواست کو بچا اس لئے فرما کر کہ فرما میں اللہ تعالیٰ کی کتابیں اور مومن علیہ السلام کے لئے کتبیں ہیں، یہی طریق کا کیا حق ہے کہ وہ کہے کہ یہ بات اس طرح ہو یہ اس طرح ہو اس کا کام قرآن میں ہونا چاہئے۔

ایمان تازہ کر دینا بہتر بات تو تبلیغ حقیت است از کار تو ترجمہ ایمان میں ہے یہی خطاب مسلمانوں سے قرار دے کر اس کا حاصل مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کرنا جو اس کا رسول سے بے جا سوال نہ کیا کریں۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اٰهْلِ الْكِتٰبِ لَوِ يَرُوْۤا نَصْرَكَ مِنْ اٰمِنٍ ۚ

دل چاہتا ہے بہت سے اہل کتاب کا کہ کسی طرح تم کو پھر مسلمان ہونے کے بعد بنادیں

فَقَالُوْۤا حَسْبُوْنَا عِندَ اٰلِهِنَا ۚ هُم مِّنْ اٰمِنٍ ۚ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ

بیب اپنے دل حسد کے بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکا ہے کہ

الْبَقِيَّةُ ۚ فَاَعْقُوْۤا وَاصْفَحُوْۤا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرٍ ۚ اِنَّ اللّٰهَ

حق سو حق در گذر کرد اور خیال میں نہ لاؤ جب تک، بھیجے اللہ اپنا حکم بیشک اللہ

عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ مِّنْهُم مَّا رَزَقْنَاهَا حَقَّهَا ۚ ذَٰلِكُمْ يَوْمَ الْحِسَابِ ۝ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَآمِنُوا

بِرَبِّكُمْ بِقَادِرٍ ۝ اور قائم رکھو نماز اور دینے رہو زکوٰۃ اور جو کچھ
لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ النَّفْسِ الَّتِي حَبَسَ فِي بطنِ امِّهَا ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

آجے مجھ دے اپنے واسطے بطنِ امی کا تو جسے اس کو اللہ کے پاس ، بے شک اللہ

بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے ۔

خلاصہ تفسیر : اور بعض یہود شب و روز مختلف تدبیروں سے دینی اور غیر خواہی کے لیے

میں مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش کیا کرتے تھے ، اور باوجود

اکاس کے اپنی کوس سے باز آتے تھے ، حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس پر متنبہ فرمادیا کہ اپنی

کتاب دین پر چڑھ کر اس سے بہتر سے دل سے چاہتے ہیں کہ تم کو تمھارے ایمان لانے کے لیے پھر

کا فرک ڈالیں ، اور یہ چاہنا کچھ غیر خواہی سے نہیں ایسا کردہ اظہار کرتے ہیں ، بلکہ تمھیں حسد کی

وجہ سے جو کہ تمھاری جائست کسی امر کے سبب پیدا نہیں ہوا ، بلکہ خود ان کے دلوں ہی سے

اوجھ مارتا ہے ، اور یہ بھی نہیں کہ ان کو حق واضح نہ ہوا ، بلکہ حق واضح ہونے کے بعد وہ

ہے ، اب اس پر مسلمانوں کو ان پر غصہ آنے کا حکم تھا ، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ تمیر راب تو

مناہ کر اور درگاہِ گرج تک حق تعالیٰ اس معاملہ کے متعلق ، اپنا حکم (قانون جدید) بھیجیں

ارشاد فرمادے گا کہ ان کی کشتی راتوں کا علاج قانون انتظام میں امام یعنی قتال وجہ سے ہم

جلد کرنے والے ہیں ، اس پر مسلمانوں کو اپنا ضعف اور ان کی قوت نہ دیکھ کر اس قانون کے اجراء

کے متعلق تعجب ہو سکتا تھا ، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ تعجب کیوں کرتے ہو ، اللہ تعالیٰ ہر چیز

دفعہ وہ معمولی پر خواہ عجیب ہو ، قادر ہیں ، اور درست صرف ، تلازمی پابندی سے چلے جاز

اور ان پر زکوٰۃ فرض ہے ، زکوٰۃ دینے جاز ، اور جب وہ قانون آجاتے ہیں ان اعمال صالحہ کے

اس کا بھی امتداد کر لیا ، اور یہ نہ سمجھو کہ جب تک چاہو کہ حکم دے آجے صرف نماز روزہ سے کہ تم لوگ

میں کی رہے گی ، نہیں ، بلکہ جو کچھ کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے چاہو کرتے رہو گے ، حق تعالیٰ

کے پاس دیکھ کر ، اس کو رد و رد و راجع صلہ کے پائو گے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمھارے سب کچھ ہوتے

کاموں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں اور ان میں کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہونے پائے گا ،

فائدہ : اُس وقت کی حالت کا یہی متعنا تھا ، چونکہ حق تعالیٰ نے اس وعدے کو پورا فرمایا

اور جیاد آیات نازل ہوئیں ، جس کے بعد یہود کے ساتھ بھی وہ قانون برپا کیا ، اور ناشائستہ

لوگوں کے ساتھ سبب ثبوت ان کے شاکوئے نقل و جلا وطنی پاجزہ پر عذر آکر کیا گیا ۔

وَقَالُوا لَن يَذَّلْنَنَا بَلْ يَصْرِفُونَ ۚ وَلَسَوْفَ يَرَكُوا لِجَنَّاتِهِمُ الْمُحَرَّمِ ۚ

اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ جازم گے جنت میں عمر جو یوں گے یہودی یا نصرانی ۔

يَذَلُّونَ ۚ أَمَّا يَتُوبُونَ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنْتُمْ مَصْصِينَ ۝

پاکر دے یا نہ فعل ہیں انھوں نے کہوئے آؤ سند اپنی اگر تم چتے ہو ،

بَلْ هُمْ مِّنْ أَتَمِّ الْأَعْمَالِ ۚ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُمْ يُخَيَّرُونَ ۚ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ ۚ

کیوں نہیں ، جس کے ہاتھ کرنا خدا کے لئے ہے ، دیکھنا ان کے لئے ہے کہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۚ وَقَالَتِ الْيَهُودُ

اور نہ ڈر رہے ہیں پر اور نہ وہ غمیں ہوں گے ، اور یہود تو کہتے ہیں کہ

لَيْسَتِ النَّصْرَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَقَالَتِ النَّصْرَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ

نصرانی نہیں کسی راہ پر اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہود نہیں کسی راہ

عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَكْذَابُ لِّكُلِّ بَلَاءٍ لِّبَنٍ لَا يَعْلَمُونَ

ہر باوجود کہ سب پڑھتے ہیں کتاب اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو جاہل ہیں

مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ قَالَ اللَّهُ يَخْتَلِفُ عَلَيْهِمْ يَوْمَ الْآزِمَةِ فِيمَا كَانُوا

انہی کی کس بات اب اللہ حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں

فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝

مختلف ہوتے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر : اور یہود نصرانی دونوں کہتے ہیں کہ یہود میں ہرگز کوئی نہ جائے یا دیکھا جسنہ

ان لوگوں کے جو یہودی ہوں رہے تو یہود کا قول ہے ، یا ان لوگوں کے جو نصرانی

ہوں رہے نصرانی کا قول ہے ، حق تعالیٰ ان کی تردید فرمائے ہوئے ارشاد فرمائے ہیں کہ ، یہ نصرانی

دل بھلائے کی باتیں ہیں اور حقیقت کچھ نہیں ، آپ (ان سے یہ) کہتے کہ را چھا ، اپنی دلیل آؤ

نسلِ سبکی پر پیروی و نعرانی، اللہ کے یہاں
دیکھ کر قیامت میں نسلِ سبکی پر پیروی اور حقِ صالح پر

جو شخص ان بنیادی اصولوں میں سے کسی بھی اصول کو
چھوڑے، خواہ وہ پیروی پرانے نعرانی یا مسلمانی
اور پھر نسلِ سبکی کی قومیت کے ذمہ میں اپنے آپ کو جنت کا حشرکار دیکھے، وہ کبھی سے قریب صرف اس کی فخریہ
ہے، جس کا حقیقت سے دور کیا واسطہ نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی بھی ان ناموں کا سہارا
لے کر قرب نہیں ہو سکتا، نہ مقبول ہو سکتا ہے، جب تک اس میں ایمان و عمل صالح کی گڑبگڑ
پھر اصول ایمان اور اصولِ گمراہی کے زمانے میں مشرک و کفر کا رہے ہیں، البتہ
عمل صالح و مقبول کی قطعیت اور حق پرستی، قرأت کے زمانے میں عمل صالح وہ سمجھا گیا، جو
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قریب کے تعلیم کے مطابق تھا، انجیل کے دور میں عمل صالح عیسیٰ
دہی عمل تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے تعلیم کے مطابق رہتا تھا، اور اب مسلمان
کے زمانے میں دہی عمل صالح کہے جانے کا مستحق ہو گا جو آخر الزماں میں صلی اللہ علیہ وسلم کے
فرمان اور ان کی لافانی ہوئی اللہ کی کتاب قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق ہو گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ پیروں و نعرانی کے اس اشکوت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ
فرمایا کہ وہ دونوں قومیں جہالت کی باتیں کر رہی ہیں، وہ دونوں میں سے کوئی بھی جنت کا حشرکار نہیں
اور دہی دونوں کے مذہب بے بنیاد اور بے اصل ہیں، بلکہ دونوں مذہبوں کی صحیح بنیاد موجود ہے،
خطِ نبوی کا سبب پہلی ہے کہ انھوں نے مذہب و ملت کی اصل روح یعنی عقائد و اعمال ان
نظریات کو چھوڑ کر نسلِ سبکی کی پیروی کو پیروی سمجھ لیا اور کسی کو نعرانی سمجھ لیا۔

جو پیروں کو نسل سے ہونا پیروی کے شریک بناتا ہے، مادہ و شراری میں اپنے آپ کو پیروی بناتا ہے
اس کو پیروی سمجھ لیا گیا، اس طرح نعرانیوں کی قطعیت و تبیین کی گئی، حالانکہ اصول ایمان کو توڑ کر اور
اعمالِ صالحہ سے منقطع کر کے کوئی پیروی پرانے نعرانی، نہ نعرانی، نہ نعرانی۔

مشرک و کفر میں اس اشکوت اور اس فیصلہ کا ذکر مسلمانوں کو سنانے اور سننے کرنے کے
لئے ہے کہ کہیں وہ بھی اس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ ہم تو نسلِ سبکی میں ہیں، ہر فرقہ و جماعت
میں ہمارا نام مسلمان کے خانے میں ہے، اور ہم یہاں سے بھی اپنے کو مسلمان ہی کہتے ہیں، اس لئے
جنت کے نذرانہ تمام انعامی وعدوں کے ہمہ مستحق ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں
سے کئے گئے۔

اس فیصلہ سے ان پر واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص نہ بعض دعوے سے حقیقی مسلمان بنتا ہے،
نہ کہیں مسلمان نام و راج کر کے یا مسلمانی کی ملت سے، یا ان کے شریک پر پیش ہونے کی وجہ سے، بلکہ
مسلمان ہونے کے لئے قرآنِ اسلام ضروری ہے، اور اسلام کے سننے ہی اپنے آپ کو سہرو کرنے

اور سبک دینے کے ہیں، دوسرے اسلامی عمل میں سنت کے مطابق عمل کو درست کرنا۔
لیکن مشرکان کی یہ کہی کہ ہمیں کس تہذیب کے باوجود بہت سے مسلمان اسی پیروی اور نعرانی غلطی کا
شکار ہو گئے کہ تعداد رسول اور آخرت و قیامت سے بالکل ناخالص رہ کر اپنا نسلِ سبکی بنانا مسلمان
ہونے کے لئے کافی سمجھ گئے، اور قرآن و حدیث میں جو وعدے فلاح و دنیا و آخرت کے مسلمانوں کے
کئے گئے ہیں، اپنے آپ کو ان کا حق سمجھ کر ان کے پورے پورے کالے انتظار کرنے لگے، اور جب وہ پورے
ہوتے نظر نہیں آتے تو شرک و حدیث کے وعدوں میں شک کرنے لگے، اس کو نہیں دیکھ کر
مشرکان نے نسلِ سبکی مسلمانوں سے کوئی وعدہ نہیں کیا، جب تک وہ اپنے تمام اداؤں کو اللہ تعالیٰ
اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مانع نہ کریں، اور ان کے بتلائے ہوئے طریقوں پر عمل صالح
کے پابند ہوں، یہی خلاصہ ہے، آیت مذکورہ میں قرآن و حدیث کے وعدوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو
یقین دینے والے تھے، قرآن و حدیث کے وعدوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو یقین دینے والے تھے۔

انجیل پڑھی دیکھا کہ مسلمان طرح طرح کے مصائب آفات کا شکار ہیں اس کو دیکھ کر سب سے
ناواقف لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ان تمام آفات و مصائب کا سبب ہمارا اسلام ہی ہے
لیکن مذکورہ تحریر سے واضح ہو گیا کہ اس کا اصلی سبب ہمارا اسلام نہیں بلکہ ترکِ اسلام ہے، کہ
ہم نے اسلام کا مصرت نام پائی رکھا ہے، اس کے مقابلہ میں اندر میں نہ اخلاق، نہ اعمال، مگر باطن
وضع میں ہم ہیں، نعرانی قوم تھیں، نہ خود

پھر ہمیں کیا حق ہے کہ اسلام اور مسلم کے لئے کئے ہوئے وعدوں اور انعاموں کا سہم
انتظار کریں۔

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم کو یہی نہیں نام تو اسلام کا لینے ہیں، اللہ تعالیٰ اور
اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام تو لیا تو ہیں، اور جو کچھ دیکھ کر اللہ و رسول کی طاعت کرتے ہیں
اس کو اسلام لیتا ہیں پسند نہیں کرتے، وہ تو جانتے ہیں کہ یہ طریق کی قرنی کر رہے ہیں، بڑی بڑی کوششوں
کے مالک بنے ہوئے ہیں، دنیا کی مشقتوں اور تجاروں کے حشرکار بنے ہوئے ہیں، اگر باری باری کی
یہیں پسند نہیں کرتے، یہ کہ ہم ہر جگہ باطن پر پیشانی ہیں تو کفار و فاجر کو اس سے زیادہ سزا ملنی چاہئے
لیکن اگر فرما دے کہ اسلام لایا جائے تو یہ شہر خود بخود رونق ہو جائے گا۔

اولیٰ تو اس لئے کہ دوست اور دشمن کے ساتھ معاملہ کساں نہیں ہو کر، اور دوست کو
قدم قدم اور بات بات پر مل کر کا جائے، اولاد اور شاگرد کو فراڈ یا بات پر سزا دی جاتی ہے لیکن
دشمن کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا اس کو وہیل دی جاتی ہے، اور وقت آنے پر فتنہ پکڑ لیا جاتا ہے
مسلمان جب تک ایمان و اسلام کا نام لیتا ہے، اور اللہ کی عکس و صورت کا دم بھرتا ہے،

دود و ستون کی فہرست میں داخل ہے، اُس کے بڑے اعمال کی سزا عموماً دنیا ہی میں ملادی جاتی ہے۔
 آخرت کا ارادہ ہوا جائے، مخلوق کا فرے کہ اس پر باغیوں اور دشمنوں کا نالہ جاری ہے۔ دنیا کی
 ہل چل سزاؤں سے ان کا پر مذاب لگا نہیں کیا جاتا، ان کو یک نعت مذاسب میں پکڑا جائے گا،
 رسوا کر کے مل جلایا جائے گا، اس رشا کروائی کا بہن مطلب ہو کر دنیا میں سے لئے قید خانہ دار کا فر
 کے لئے جنت ہے ۵

دوسری بات مسلمانوں کے مستقر اور پیشانی اور کفار کی ترقی و آرام کی ہے کہ انہ کو قلعہ
 پر مل کا جا کا خاصہ نہ لگے، ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً
 تجارت کا خاصہ سرمایہ میں زیادتی، دوکان کا خاصہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں
 تو دن رات لگا کر بیماری اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہ دے تو شخص تجارت کے سبب وہ
 بیماری سے تجارت نہیں پاسکتا، اس طرح دو دار و دار کا استعمال کر کے تجارت کا خاصہ سرمایہ کی زیادتی
 حاصل نہیں کر سکتا، کفار کی ذہنی ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان
 انفس و پیشانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ کفار نے جب آخرت کی فکر چھوڑی اور دنیوی طرح دنیا کے
 مال و دولت اور پیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت، زراعت اور حکومت سیاست
 کے مفید راستوں کو خستہ کیا، مضمر مقول سے بچے، تو دنیا میں ترقی حاصل کر لی، اگر وہ بھی ہماری
 طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر پیچھے جاتے اور دنیوی ترقی کے لئے اس کے اصول کے
 مطابق جذبہ جدید کرتے تو ان کا کفر ان کو مال و دولت یا حکومت کا مالک نہ بنا دیتا، پھر ہم
 کیسے سمجھیں کہ بھلا اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہماری ساری فتوحات کے دروازے کھلے!
 اسلام دایانہ اگر بالکل صحیح اصول پہنچی ہو تو اس کا اصل خاصہ اور نتیجہ تجارت آخرت اور جنت
 کی دائمی راستہ ہو، دنیا میں مال و دولت کی فراوانی یا پیش و آرام کی دست اس کے نتیجہ میں حاصل ہونا
 ضروری نہیں، بیگ اس کے لئے اس کے مناسب جذبہ نہ کی جانتے۔

اور یہ بات تجربہ سے ثابت، ہر جہاں ہیں، اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت و حکومت
 سیاست کے اصولی سمجھ کر سیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ان دنیوی غرات و نتائج سے
 غور نہیں رہتا، جو کسی کار کو حاصل ہو رہے ہیں۔

اس سے واضح ہو کر دنیا میں ہمارا انفس و جسم تجارت و مصائب و آفات ہائے اسلام کا
 نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دوسری طرف ان تمام کاموں سے
 شرمونہ لے کر نتیجہ ہے جن کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں زیادتی ہو کر آتی ہے۔

انفسی ہے کہ ہمیں جب روپ والوں کے ساتھ اختلاف کا اتفاق پیش آیا تو ہم نے ان سے

صرف ان کا کفر اور آخرت سے غفلت اور بے حیائی و بداخلاقی تو سب سیکھ لی، لیکن ان کے وہ
 اعمال نہ سیکھیں جن کے وجہ سے وہ دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں، جس مقصد کے لئے کھڑے ہوں اس کے
 پیچھے ان تک کوشش، مصلحت، سہاوت، سہاوت، بات کی سہاوت اور دنیا میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کے
 لئے نئے طریقے جو حقیقت اسلام ہی کی اصلی تعلیمات ہیں، ہم نے ان کو سمجھ کر بھی اس کی نفی
 کرنے کی کوشش نہ کی تو یہ تصور ہائے اسلام کا ہے، بھلا پتا نہ ہو رہا۔

ان غرضتوں کی ان باتوں نے واضح کر دیا کہ نفس نسل طوری اسلام کا نام لے کر دنیا کی نیچے
 پر نہیں پہنچا سکتا، جب تک ایمان اور عملی صلاح کو حاصل طور پر نہ چھوڑ دیا جائے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذِينَ كَرْفِيْنَا اسْمُهُ وَ

اور اس سے بڑا ظالم کو کون ہے جس نے مسجد اللہ کی مسجدوں میں کرنا چاہے وہاں نام اس کا اور

سَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۚ إِنَّكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَذْخُلُوهَا ۚ الْكَافِرِينَ ۝

کوشش کی ان کے اعمال نے میں، ایسوں کو حلق نہیں کہ داخل ہوں ان میں عمر دور کے ہو کر

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

ان کے لئے دنیا میں ذلت ہو اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے، اور اللہ ہی کا کہ

النَّسِيئُ وَالْمَعْرُوفُ ۚ قَاتِلِينَ مَا كَانُوا يُؤْتُونَ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ

مشرق اور مغرب سو جس ملوک تم مذکور وہاں ہی متوجہ ہے اللہ بیک اللہ

وَاتَّقُوا عَزِيزٌ ۝

پہاں کا کٹھن کرنا اور مسکین کا مال

خلاصہ تفسیر
 رعبہ تو سب کا حکم بدلے کے وقت طرح طرح کے اعتراض کر کے کہ یہ تو
 کے دلوں میں شہادت پیدا کرتے تھے، اگر وہ مشہدات عام طور پر قلوب میں اثر
 کرتے تو ان کا لایٰ نتیجہ انکار و رسالت اور ترک نہ ہو سکتا، اور ترک نہ ہونے کا لازم ہے،
 تو گویا یہ یہودی اس طور سے ترک نہ ہوا تو وہاں ہی مساجد خصوصاً مسجد نبوی میں بھی کوشش تھے، اور
 روم کے بعض سلطان جو خلاصہ کی اسلام تھے، اور انسانی کے ان افعال کا انکار نہیں دیکھتے
 تھے، گو وہ نصرانی نہ ہوں، کسی زمانے میں یہود مشام پر چڑھ آئے تھے، فتنہ و قتال بھی ہوا، اور اس
 وقت بعض جہلاء کے اتھے مسجد بیت المقدس کے بے حرم نبوی، اور باقی کی وجہ سے اس میں

دو دوستوں کی فہرست میں داخل ہے، اُس کے بڑے اعمال کی سزا عموماً دنیا ہی میں ملادی جاتی ہے۔
 آخرت کا ارادہ ہوا ہے، مخلوق کا فرے کہ اس پر باغیوں اور دشمنوں کا نالہ جاری ہے۔ دنیا کی
 ہل چل سزاؤں سے ان کا پر مذاب لگا نہیں کیا جاتا، ان کو تک سخت مذاسب میں پکڑا جائے گا،
 رسوا کر کے مل میں ڈال دیا جائے گا، اس رشا کروائی کا بہن، مطلب ہو کر دنیا میں سے لئے قید خانہ دار کا فر
 کے لئے جہت ہے۔

دوسری بات مسلمانوں کے مستقبل اور پیشانی اور کفار کی ترقی و آرام کی ہے کہ انہ کو قحط
 پر مل کا چاٹا کا خاصہ نہ ملے، ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً
 تجارت کا خاصہ سرمایہ میں زیادتی، دوکان کا خاصہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں
 تو دن رات لگا کر بیٹاری اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہ دے تو شخص تجارت کے سبب وہ
 بیماری سے تجارت نہیں پاسکتا، اس طرح دو دار کا استعمال کر کے تجارت کا خاصہ سرمایہ کی زیادتی
 حاصل نہیں کر سکتا، کفار کی ذہنی ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان
 انفس و پیشانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ کفار نے جب آخرت کی فکر چھوڑی اور دنیوی طرح دنیا کے
 مال و دولت اور پیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت، زراعت اور حکومت سیاست
 کے مفید راستوں کو خستہ کیا، مضمر مقول سے بچے، تو دنیا میں ترقی حاصل کر لی، اگر وہ بھی ہماری
 طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر پیچھے جاتے اور دنیوی ترقی کے لئے اس کے اصول کے
 مطابق جذبہ جدید کرتے تو ان کا کفر ان کو مال و دولت یا حکومت کا مالک نہ بنا دیتا، پھر ہم
 کیسے سمجھیں کہ بھلا اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہماری ساری فتوحات کے دروازے کھول دیا!
 اسلام دایاں اگر بالکل صحیح اصول پہنچی ہو تو اس کا اصل خاصہ اور نتیجہ تجارت آخرت اور جنت
 کی دائمی راستہ ہو، دنیا میں مال و دولت کی فراوانی یا پیش و آرام کی دست اس کے نتیجہ میں حاصل ہونا
 ضروری نہیں، بیگ اس کے لئے اس کے مناسب جذبہ نہ کی جانتے۔

اور یہ بات تجربہ سے ثابت، ہر کہ جہاں ہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت و حکومت
 سیاست کے اصولی سمجھ کر سیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ان دنیوی غرات و نتائج سے
 غور نہیں رہتا، جو کسی کار کو حاصل ہو رہے ہیں۔

اس سے واضح ہو کر دنیا میں ہمارا انفس و جسمتیاج اور مصائب و آفات ہمارے اسلام کا
 نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دوسری طرف ان تمام کاموں سے
 شرمونہ لے کر نتیجہ ہے جن کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں زیادتی ہو کر آتی ہے۔

انفسی ہے کہ ہمیں جب روپ والوں کے ساتھ اختلاف کا اتفاق پیش آیا تو ہم نے ان سے

صرف ان کا کفر اور آخرت سے غفلت اور بے حیائی و بداخلاقی تو سب سیکھ لی، لیکن ان کے وہ
 اعمال نہ سیکھیں جن کے وجہ سے وہ دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں جس مقصد کے لئے کھڑے ہوں اس کے
 پیچھے ان تک کوشش، مصلحت، سہائی، بات کی سہائی اور دنیا میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کے
 لئے نئے طریقے جو حقیقت اسلام ہی کی اصلی تعلیمات ہیں، ہم نے ان کو سمجھ کر بھی اس کی نفی
 کرنے کی کوشش نہ کی تو یہ تصور ہمارے اسلام کا ہے، بھلا پتا نہ ہو۔

ان غرضتوں کی ان باتوں نے واضح کر دیا کہ نفس نسل بطور اسلام کام ہونا کہ لینا کسی نیچے
 پر نہیں پہنچا سکتا، جب تک ایمان اور عملی صلاح کو حاصل طور پر چھوڑ دیا جائے۔

وَمِنْ أَهْلِكَ مَنْ مَنِعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُدْخِلَ كَرَفِيْنَا أَسْمُهُ وَ

اور اس سے بڑا اہل کو کہ جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کرنا چاہے وہاں ہم اس کا اور

سَعَىٰ نَحْرًا لِّهَآءَا وَلَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوْهَا لَخَالِفِيْنَ

محوش کی ان کے اعمال نے میں، ایسوں کو حلق نہیں کہ داخل ہوں ان میں عمر دور کے ہو کر

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خَيْرٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰﴾ وَلِلَّهِ

ان کے لئے دنیا میں ذلت ہو اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے، اور اللہ ہی کا کہ

النَّبِيُّ وَالْعَرَبُ فَإِنَّمَا تَوَلَّوْا قَوْمَهُ جَاهِلِيْنَ إِنَّ اللَّهَ

مشرق اور مغرب سو جس ملزم تم مذکور وہاں ہی متوجہ ہے اللہ، بیگ اللہ

وَأَمَّا عَسَىٰ

پہاں تکلفوں کر خدا اور مسیح کے جانور

رہو تو سب کا حکم بدلے کے وقت طرح طرح کے اعتراض کر کے کہ ہم لوگوں

کے دلوں میں شہادت پیدا کرتے تھے، اگر وہ مشہدات عام طور پر قلوب میں فر

کرتے تو ان کا لایٰ نتیجہ انکار و رسالت اور ترک نہ ہو سکتا، اور ترک نہ ہونے سے مسجد کی دیواری لازم ہے،

تو گویا یہ یہودی اس طور سے ترک نہ ساز اور دیواری مساجد خصوصاً مسجد نبوی میں بھی کوشش تھے، اور

روم کے بعض سلطان جو خلاصہ کی اسلام تھے، اور انسانی ان کے افعال کا انکار میں نہ کرتے

تھے گو وہ نصرانی نہ ہوں، کسی زمانے میں یہود مشام پر چڑھ آئے تھے، فکل و قتال بھی ہوا اور اس

وقت بعض جہلاء کے اتھے سے مسجد بیت القدس کی بے حرمی ہوئی، اور باطنی کی وجہ سے اس میں

دقت بعض جہلاء کے اتھے سے مسجد بیت القدس کی بے حرمی ہوئی، اور باطنی کی وجہ سے اس میں

دقت بعض جہلاء کے اتھے سے مسجد بیت القدس کی بے حرمی ہوئی، اور باطنی کی وجہ سے اس میں

دقت بعض جہلاء کے اتھے سے مسجد بیت القدس کی بے حرمی ہوئی، اور باطنی کی وجہ سے اس میں

دقت بعض جہلاء کے اتھے سے مسجد بیت القدس کی بے حرمی ہوئی، اور باطنی کی وجہ سے اس میں

دقت بعض جہلاء کے اتھے سے مسجد بیت القدس کی بے حرمی ہوئی، اور باطنی کی وجہ سے اس میں

دقت بعض جہلاء کے اتھے سے مسجد بیت القدس کی بے حرمی ہوئی، اور باطنی کی وجہ سے اس میں

دقت بعض جہلاء کے اتھے سے مسجد بیت القدس کی بے حرمی ہوئی، اور باطنی کی وجہ سے اس میں

نماز و غیرہ کا ہوتا ہے جس نہ ہوا اس طرح یہ نصایح کے اسطاف ترک نماز اور دینی الہی مسجد کے باقی ہوئے اور نصایح پر جو عدم انکشاف کا الزام دیا گیا اس ارشاد کا نام بطیس تھا اور نصایح کو ختم ہوا تو نگارندہ تھا کہ اس میں یہودیوں کی تحلیل ہوئی تھی اور یہی بدعت عبادت رکھتے تھے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ سے پہلے جب مکہ معظمہ میں داخل ہو کر مسجد النور کا طواف اور نماز اور اس فرمان چاہی تو مشرکین مکہ نے آپ کو نہ جانے دیا یہاں تک کہ آپ اس سال وہاں تشریف لے آئے تو اس طرح یہ مشرک بھی بن کر ہجرام کی ویرانی میں گرفتار ہوئے اس طرح تعالیٰ نے عیدہ عوم سے اس کی تہنیت اور برائے ظاہر شرعانی میں اور اس شخص سے زیادہ اور کوئی ظالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجد میں انہیں مکہ کی مسجد حرام مدینہ کی مسجد بیت المقدس کی مسجد اور سب مسجدیں آگیں ان کا ذکر دار عبادت کئے جانے سے بند کرے اور ان رساہد کے ویران (اور معل) ہوئے ان کے بارے میں کوئی کوشش نہ کرے ان لوگوں کو تم بھی بے ہیبت (اور بیباک) ہو کر ان (رساہد) میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا اور لکھ جاتے تو نہایت عظمت و حرمت رکھتے جاتے جب بیباک ہو کر اندر جاتے تک کا اجتہاد نہیں تو اس کی چنگ حرم کا حق کب حاصل ہوا اسی کو نظر فرمایا ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسولی نصیب ہوگی اور ان کو آخرت میں بھی سزا عظیم ہوگی

دیو دئے تہب دیل قبلہ کے حکم پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمان اس جہت سے دوسری جہت کی طرف کیوں پھر گئے اس کا جواب حق تعالیٰ دیتے ہوئے فرماتے ہیں امین اور اللہ ہی کی ملوک ہیں (سب پیشیں) مشرق بھی اور مغرب بھی (اور وہ اس کا مکان نہیں)

پس جب وہ انگ ہیں جس جہت کو چاہیں قبلہ مقرر کریں کیونکہ حکمت تعین قبلہ میں مشافہہ مابین کالاتفاق بیست اور اتباعی خاطر ہے اور یہ حکمت ہر جہت سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا حکم دین میں وہی مشین ہو جائے گی اس البتہ اگر مہرود کی ذات نعوذ باللہ کسی جہت خاص کے ساتھ مقید ہو تو فرض دہش کی وجہ سے اسی جہت میں قبلہ عبادت بننے کا اصرار نہ کیا تھا لیکن وہ ذات پاک کسی جہت کے ساتھ مقید و محدود نہیں جب یہ بات ہے تو تم لوگ جس طرح میں مشرک کرو اور دوسرے دینی اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا کفر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود تمام بات ارشاد کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اساطیر کی شان کے لائق ہے لیکن اذو جہیل و فیر محدود ہونے کے پھر بھی جہت عبادت کو ضعیف اس لئے فرمایا کہ وہ کامل طور پر ہے اگر ہر شے کے مصالح کو خوب جانتے ہیں یا چکر ان کے علم میں یہ تعین بعض مصالح سے تھی اس لئے اس کا حکم دیا

۱۔ اور انی مساجد میں کوشاں گرد کی دنیا میں تو یہ رسائی ہوئی کہ مساجد میں قریش انی مساجد کی رسلطنت کی رعا اور باج گذار بنیں اور طراب آخرت تو کافر ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے ہی اور دینی مساجد میں کوشش کے سبب یہ عذاب اور بھی سخت دہشیدہ ہو جائے گا اور آپ کی آیت میں جو ان تینوں مشرقوں کے حق پر ہونے کا دعویٰ مذکور ہوا تھا اس قصہ سے اسکی تردید کا ایک گروہ معلوم بھی نہیں آیا کہ ایسے ایسے افعال کر کے صاحب حق ہونے کا دعویٰ بڑے مشہم کی بات ہے

۲۔ تعین قبلہ کی ایک حکمت بطور مثال اور بیان کی گئی اس سے بعض مخالفین اسلام کا یہ اعتراض کہ مسلمان کعبہ پرست ہیں باطل اٹھ گیا جواب کا خلاصہ یہ ہو اگر عبادت و پرستش تو خدا تعالیٰ کی ہے لیکن عبادت کے وقت کعبہ کی قلب کی ضرورت کو نیز مابین کی ہیبت اجاگر کر بھی اس کی سبب میں دخل نہ درجنا چہ وہوں ہمیں خبر و شہادہ سے ثابت ہیں اس لئے اس کی سبب اور اجتماع ہیبت حاصل کرنے کے لئے تعین جہت شروع ہوئی لہذا اس اعتراض کو شہید کر کے انہیں نشان نہیں اور اگر اس پر کوئی اپنی برأت کے لئے یہ دعویٰ کرے کہ ہم بھی بتوں کو سامنے اس قصد و غرض سے رکھتے ہیں تو اقول قرآنی برأت کے دعوے سے مسلمانوں پر مذکورہ اعتراض نہیں ٹوٹتا وہ بدستور حق رہا جو اس مقام پر مقصود اصلی ہے

۳۔ عام مسلمانوں اور عام کافروں کی حالت فقیتش کرنے سے عدم پرستش کے دعوے میں مسلمانوں کا راست گروہ اور دوسروں کا دروغ گروہ باہر وقت ہر شخص کو معلوم ہو سکتا ہے قبر سے علی سبیل التزلزل کہا جاتا ہے کہ اگر اس دعوے کی سچائی مان لی جاتے پھر بھی اس تعین اور تعینہ کے لئے کسی غیر مندرجہ شریعت کا حکم پیش کرنا لازم ہے اور یہ جزا اہل اسلام کے دوسروں کے پاس مفقود ہے

۴۔ اور ترجہ فقیر کے من میں یہاں حکمت کے لئے یہ فرق مشافہہ امتا دیا گیا ہر قواس کی وجہ یہ ہو کہ احکام خداوندی کی بھینس اور مصلحتیں انھما را در استعجاب کے ساتھ اس کے ادراک میں نہیں آ سکتیں سو اس حکم میں بھی ہزاروں بھینس ہوں گی ایک دے کے سمجھ جانے سے ان پر ملنا اور دوسروں کی لغت نہیں ہو سکتی

۵۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ اور حری اللہ کا ہے اور اس طرح یہ جو فرمایا ہے کہ وہ جہیل ہو اور ایسے ہی جو مضامین ہوں ان سب میں زیادہ کھو کر یہ ذکر کرنا چاہئے کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا پر ادراک کسی بندہ سے ممکن نہیں اسی طرح اس کی صفات کی حقیقت متعین سے عاج ہے

اجمالاً ان سب پر ایمان لے آؤ، اس سے زیادہ کا انسان مکلف نہیں۔

عناقشکار کس نشود دام باز حسین

کایجا همیشه پلو بدست است وام‌ها

معارف و مسائل

ان دو آیتوں میں دو اہم مسئلوں کا بیان ہے، پہلی آیت ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

واقعہ یہ کہ زمانۂ اسلام سے پہلے جب یہودیوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تو مردم کے انصاف نے اس سے انتقام لینے کی خاطر عراق کے ایک چھوٹی سی بادشاہ کے ساتھ مل کر اپنے بادشاہ طحسوس کی سرکردگی میں شام کے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کو قتل و غارت کیا اور قوت کے لئے جلاوطنے، بیت المقدس میں خجاسات اور تیرہ ہائیڈل رہے، اس کی عمارت کو خراب و دیوان کر دیا، بنی اسرائیل کی قوت و شوکت کو باطل یا امان اور دم کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک بیت المقدس اسی طرح ویران و مہدمد رہا تھا۔

فادون اعلیٰ رضی اللہ عنہ کے ہمدم جب خاتمِ دواؤں فتح ہوئے تو آپ کے حکم سے بیت المقدس کی دیوار پر تعمیر کرائی گئی، نہادہ دوازہ کعبہ پر ایک کعبہ شام بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں رہا، پھر ایک عرصہ کے بعد بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا، اور قریباً سو سال پہلے یورپیوں نے اس پر قبضہ کیا، تاکہ کچھ عرصہ بعد جبرسری میں مسلمانانِ صلاح الدین الیون نے اس کو فتح کیا۔ دوسری نصرتی کی اس گستاخانہ حرکت پر کہ تو رات کو چلا گیا اور بیت المقدس کو خراب کیا، کہے کہ اس کی بے حرشی کی بابت ازل ہوئی۔

فوق العتدات آن حضرت عائشہؓ کی ماں کا ہے، اور حضرت ابن زبیرؓ کو دوسرے مفسر نے آیت کا شائبہ نزول ہی تسلیم کیا ہے کہ جب مشرکین مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعہ حدیبیہ کے وقت حصار میں داخل ہونے اور طواف کرنے سے روک یا تو یہ آیت نازل ہوئی۔
ابن جریر نے پہلے روایت کو اور ابیہیؓ نے دوسری کو ترجیح دی ہے۔

.....

مفسرین نے اس مجرہ میں بارخانیہ کا نام بہت نصرت کیا، اس سے معروف بہت نصرت تو اس کو

زاد حضرت محمدی علیہ السلام سے بہت پہلے ہے، یہ کہیں ہے کہ یوں ہی کسی «شہزادہ» کو بخت نصر لائے گئے تھے یوں؟
(محمد شفیع)

قُولِي وَجَعَلْتُ قُطْرَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ قُولُوا
وَجُوهَكُمْ قُطْرَةً (١٢٤)

ترجمہ: اُمّیں کو قید کیا جائے گی کہ دلِ دوست کی وجہ سے سارے آسمان کی طرف مُردا ہٹھا کر دیکھنے لگیں۔
 دکھائیں اور فرشتہ حکم لے آئے، ہر سب دیکھ رہے ہیں، اس نے اب ہر آپ کو اس قید
 کی طرف متوجہ کر دی ہے جس کو آپ جانتے ہیں، اس نے آپ کو آپ اپنا چہرہ خُدا میں
 مسجدِ حرام کی طرف کیا کر دی، اور جسے کعبہ آپ ہی کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ تمام امت
 کے لئے ہے جس کو دیکھا گیا کہ کمالِ کمال میں بھی موجود ہوا یہاں تک کہ خود بیت المقدس کے
 اندر بھی پہنچا تو خدائے میں اپنا بیٹا مسجدِ حرام کی طرف کیا کر دے

الفرق آیت مذکورہ و بقیۃ المشرکین و النعمانی نے انتقال قبلہ کی ہر کسی حقیقت کو واضح کر دیا کہ اس کا منشا بیت اللہ یا بیت القدس کی ممانہ اللہ پر عیش نہیں، اور نہ ان کو دینوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک مخصوص ہے، بلکہ اس کی ذات ماعے عالم برصغیر اور ہر سمت میں اس کی توجہ یکساں ہے، پھر جو کسی خاص مکان یا سمت کو مخصوص کیا جا جائے اس میں اور نہ کسی بحثیں ہیں۔

آیت مذکورہ کے اس معنوں کو واضح اور دلنشین کرنے میں کے لئے شاید اخصفیت حاصل شدہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو جو جنت کے اداں میں سوار ستون ہونے تک بہت المقدس کی طرف متذکر کے سازا دار کرنے کا حکم دے کر علی طور پر بتلا دیا گیا کہ ہماری قوت پر ہر طر ہے، اور لوافل میں اس حکم کو ہمیشہ کے لئے جاری رکھا کہ سفر میں کوئی شخص کسی سواری شق اوث، گھوڑے وغیرہ پر سوار ہو تو اس کو اجازت ہے کہ سواری پر بیٹھ ہوئے اشارہ سے نقل نماز کرے، اور اس کے لئے قبلہ کی طرف توجہ نہ کرنا بھی ضروری نہیں جس طرف اس کی سواری چل رہی ہے اس طرف توجہ کر لینا کافی ہے بعض مغربی نے آیت لَا یُؤْتُوا الذِّمَّةَ وَتَجِدُ اَنَّ اَقْسَى النَّاسِ فِیْ غُلَاظِ الْکُفْرِ لَرَدِّ رُکُوعِ تَکْبِیْرٍ کے تحت حکم صرف ان سواریوں کا ہے جن پر سوار ہو کر بیٹھے ہوئے قبلہ کی طرف توجہ نہ کرنا دشوار ہے اور جن سواریوں میں سوار کو قبلہ کی طرف توجہ کر لینا دشوار نہیں، جیسے چلنے، پانی کا جہاز، ہوائی جہاز، ان کا دیہی حکم ہے جو حالت حضرنہ توجہ قبلہ کا ہے، اگر نقل نماز نہیں ان میں پھر جسے مانے تو توجہ نہ کرنا بھی جائز ہے، والدین نماز کی حالت میں چلے گا یا جہاز کا توجہ نہ کرنا ہے اور نمازی کے لئے گھماؤ نہ ہو کہ وہ بھی قبلہ توجہ چھوڑے، تو اس حالت میں نماز پوری کر لے،

اسی طرح چنان مٹا دیا کہ سب سے پہلے معلوم نہ ہو، اور رات کی اندھیری وغیرہ کی وجہ سے سب سے پہلے کرنا بھی دشوار رہا اور کوئی جملہ لے والا بھی نہ ہو تو دانا بھی یہی حکم ہے کہ وہ اپنا اندازہ اور طریقہ

لگا کر جس طرف کو بھی چھین کر لے گا وہی سمت اس کا قبلہ قرار دی جائے گی، غنازادہ کر لے کے بعد اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اس نے فطرت میں غنازادہ کی ہے، تب بھی غناز صیح ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

آیت کے اس بیان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل اور جزئیات مذکورہ کے استقبال قبلہ کے حکم شرعی کی پوری حقیقت واضح ہو گئی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ ۖ بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَ

در کتبہ اشرف دکن، اولاد وہ تر سب انوں سے پاک ہو، جگر اس کا ہے جو کہ ہے آسمان اور

الْأَرْضِ كُلِّ لَهَا قِنْتُوْنَ ۝ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا

میں میں سب اس کے تابع دار ہیں ، نیا پیدا کرنے والا ہے آسمان اور زمین کا اور جب

فَضَى امْرَأًا نَمَّا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٢٤﴾

علم کرنا ہے کسی کام کو تو یہی فرمائیں اسکو کہہ جا پس وہ ہو جائیں

اربعویں یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور انعامی حضرت

عقلا نعمہ، سیر عینی علیہ السلام کو اور مشرکین عرب ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں، جدید مختلف

یاد میں ان اقوال کی جبروتی کمی ہے، جن اعلیٰ اس قول کی نہایت اور بطلان کا بیان فرماتے ہیں،

کہہ دیاں کے تو اولاد ہونا عقلاً ممکن نہیں، کیونکہ دُرُعال سے خالی نہیں، باقوا اولاد غیر جنس ہوگا اور با

جلس ہدی، اگر غیر جلس ہو تب تو نا جلس اولاد ہونا عیب رکھتا اور حق تعالیٰ عیب پاک ہیں، عقلاً بھی

یہاں سے ہمیں جیسا سہارا مذکور کا بھی مدلول ہے، اور اگر بعض ہر تو اس لئے باطل ہے کہ

ان معانی کا کوئی ایسا نہیں کیونکہ جو صفات کمال کو لازم ذات واجبہ سے ہیں وہ اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔

یہ سید بھی سید اہل ان کی سرور کی مانی دے رہا ہے اس سے میرا سید ذات فدا،
 ہو گا اور جو غور، حقیقت، الازم حقیقت، ہو رہا کہ ان شاء اللہ کمر راستہ حقیقت، میں،

شریک نہ ہوا، لہذا، مجھ سے ہوتا بھی باطل ہو گیا، اب صفات کمال صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ مختص

برنے کی دیلیس مذکور ہوتی ہیں، ازل یہ کہ، خاص اللہ تعالیٰ کے ملوک ہیں جو کچھ بھی آسمانوں اور

میں میں (موجودات الہی) اور دوستگیریہ کہ ملوک ہونے کے ساتھ) سب ان کے محکوم بھی ہیں

راہیں مل گئیں ان تصورات و تدبیرات سے ملکر، اور جو کچھ انہیں ہوا سنا، اور احاطہ ہم سے ہو گیا تو

—

کوئی ملک نہ ہو جس سے یہ کفن نکلتا ہو (یعنی اس کا کوئی اور زمین کے اور حصے پر یہ کربا کاوی
بھی قدرت ایسی عظیم و عجیب ہے کہ جس کسب کا کام کا مسئلہ پیدا ہو گا کرنا ہے) پھر اگرنا چاہتے ہیں تو
ہیں (یعنی بات ہے کہ اس کو دشمن، فرما دیتے ہیں کہ جو باہر ہو وہ (اس طرح) ہو جائے وہ ان کے
آلات و اسباب اور متاع اور زمینوں کی ضرورت نہیں پڑے گی، اور یہ چاروں امر بجز حق تعالیٰ کے
کسی میں نہیں پائے جاتے، اور یہ مذہبیان اولاد کے بھی مسلمات سے متناہ ہیں دلیل سے مستعد نہ
اختصاص بھی ثابت ہو کر حجت تمام ہو گئی)

۱۔ خاص خاص کاموں پر خاص خاص ملائکہ کو مقرر کرنا مثلاً بارش، روزی و دیگر اور
فوائد اس طرح اسباب اور مواد اور قوسی سے کام لیتا ہے، سب کس بھیخت خداوندی پرستی
ہو کر ہے، اس لئے نہیں کہ کوئی انہیں اسباب و قوت کو حاجت روا مان کر استغاثت و مدد کے
طلبگار ہوں۔

۲۔ بیضاوی نے کہا ہے کہ پہلے شرع میں اللہ تعالیٰ کو سب اول ہونے کی وجہ سے باپ
کہا کرتے تھے، چاہوں نے ولادت کے منے سمجھے، اس لئے یہ عقیدہ نکلا، ایسا کہنا کفر قرار دیا گیا
دفعہ فساد کی مصلحت سے ایسا عقول کے استعمال کی باطل اجازت نہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُعْلِمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ
اور کہتے ہیں وہ کہ جو کہہ نہیں جانتے کیوں نہیں بات کرتے ہے اور یاہیں آئی یاہیں آئی کھاتے
كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَوْلِهِمْ تَأْتِينَا آيَةٌ
اس طرح کہ کہہ ہیں وہ کہ جو کہہ نہیں جانتے آئی کیوں آئی ہے ایک ہے جس دل
قُلُوْهُمْ هُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۱۵﴾
ان کے لئے ہے کہہ ہم نے بیان کر دی نشانیاں آئی کیوں کے واسطے جو یقین لاتے ہیں

خلاصہ تفسیر اور دیکھئے، چاہوں دیکھو درخشاں اور شوکتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
مقابلہ میں، ان کہتے ہیں کہ دعویٰ اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتے خواہ
فرشتوں کے بغیر خود فرشتوں سے کلام فرماتے ہیں، یا فرشتوں کے واسطے ہے، جیسے پیغمبروں سے
بطور وحی بات کرتے ہیں، اور اس کلام میں یا تو خود ہم کو احکام بتا دیں، یا خود رسول کی ہر سو
طورت ہی نہ دے، یا کہ ان کو انتہائی کہہ کر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہائے رسول ہیں، تو ہم ان کی
ہی رسالت کے قائل ہو کر ان کی اطاعت کرتے گئیں، یا کہ کلام نہیں کرتے تو، ہائے اس کوئی اور

ہی دلیل و محبوب رسالت کی آجائے (حق تعالیٰ ان کو اس بات کا جاننا نہ دے گا کہ جتنا کہ
اس طرح وہ دہا ہوں، توگ بھی کہنے چلے آئے ہیں، جو ان سے پہلے ہو گئے ہیں، ان ہی کا سارا جاننا
قول رسو معلوم ہو کر یہ قول کوئی باقت اور بارک بینی پرستی نہیں، بلکہ ان ہی انک دیا جائے، ہم
لانا اس قول کا منشاء اور سبب بیان فرماتے ہیں کہ ان سب داغے پہلے چاہوں گے، قلوب
رک نہیں ہیں، یا ہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، اس لئے سبک بات ہم ایک ہی سے پیدا ہوئی، پھر
ناخاس قول کا جواب دیتے ہیں، اور چونکہ اس قول کا حبشہ داؤل حاققت معنی تھا، کہ اپنے کو اس
لیاقت پر ہم نہ ملا کر اور انبیاء کا بنانا چاہتے تھے، جو باطل ہی پر ہی ایسا لگتا ہے، اس لئے اس
احقاد بات کو نظر انداز کر کے صرف دوسرے پر کہ جواب ارشاد ہوتا ہے کہ تم کو ایک دلیل کہنے
پہرے ہو، ہم نے تو بہت سی دلیلیں (رسالت محمدیہ کے ثبوت میں) صاف صاف بیان کر دی ہیں
دگر وہ ان کو ان کے لئے داغے رکائی ہو چکی ہیں، جو یقین اور اطمینان حاصل کرنا، چاہتے ہیں اور
چونکہ معترضین کو محض عداوت اور کہہ مقصود ہے اس لئے حق تعالیٰ کی نظر سے ان کو عقیق ہی منظور
نہیں، سو ایسوں کی تسک و تسلی کا کوئی ذمہ دار ہے نہ۔

فائدہ: یہود و نصاریٰ قرآنی کتاب تھے، ان میں ادبی علم بھی تھے، اس کے باوجود جو ان کو
اللہ تعالیٰ نے جاہل بنسرا کر دیا تھا، ان کو اس لئے کہ باوجود کہ عقلی اور قوسی دلائل کثرت سے قائم کر دیئے گئے تھے
پھر بھی جو اظہار کرنے ہمارے تھے، وہ بات نہیں توادر کیا تھا، اور یہ چاہوں ہی کی بات کہلا چکی
بلکہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو جاہل بنسرا دیا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْئَلُ عَنْ أَصْحَابِ
جہنم کہہ ہم نے تجھ کو بھیجا کہ تو حق بشارت دینے والا اور نذرانہ دینے والا اور تجھ سے ہم نہیں دوزخ
الْحَجَّاجِينَ ﴿۱۶﴾
جس رہتے والوں کی۔

خلاصہ تفسیر اور دیکھئے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ربو العالمین اور کائناتیا ہے کہ خدا کو
آپ کو اس حجاب اور عدا کی بدولت دل و عقل پیش آتی، اور ان کے ایمان نہ دینے
کی کوئی صورت، مجموعی دیکھنے کے سبب آپ معلوم اور دیکھو خاطر ہو جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ
آپ کی عقل کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے رسول، ہم نے آپ کو ایک چہادین دے کر خلق کی
طوت، بھیجا ہے کہ ماننے والوں کو، تو حق خبری سستا کر دے اور نہ ماننے والوں کو سزا دے،

ڈرانے رہے، اور آپ سے دروغ میں جانے والوں کی باز پرس نہ ہوگی، ورنہ لوگوں نے کیوں نہیں منسوب کیا، اور کیوں دروغ میں گئے، آپ اپنا کام کرتے رہے، آپ کو کسی کے سامنے یا نہ جانے کوئی ٹکڑی نہیں کرنی چاہئے،

وَكُنْ رَاضٍ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَسْبَحَ بِمَلَكُمُ

اور ہرگز راضی نہ ہوں گے تجھ سے یہود اور نصاریٰ جب تک تو ملک نہ ہو ان کے دین کا،

قُلْ لَّانْ هُدًى اللَّهُ هُوَ الْهُدًى وَلَئِنْ أَتَعْتَّ أَهْوَاءَ هَمَمٍ بَعْدَ

تو کہہ دے جو راہ اللہ بتلے وہی راہ سیدھی ہے اور اگر تیرا غم تو تباہی کی راہ ہے اگلی خواہشوں کی راہ

الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا كَافٍ ۝۱۳۰

اس علم کے جو تجھ کو پہنچا، تو برا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنے والا اور مددگار۔

خلاصہ تفسیر اور کس خوش نہ ہوں گے آپ سے یہ یہود اور نہ یہ نصاریٰ، جب تک کہ آپ

دعا نہ کرنا خواستہ ان کے مذہب کے ریاکاروں، یہود نہ ہو جائیں والدین یہود نہ ہو،

پس ان کا راضی ہونا محال ہے، اور اگر کبھی اس قسم کی بات ادا کی جائے یا حال سے منحرف ہو تو،

آپ (وصاف) کہہ دیجئے کہ وہاں حقیقت میں جاہلیت کا رویہ راستہ تو جس کو خدا نے دیکھا

کا راستہ، بتلا دیا ہے، اور درحقیقت یہ ایسا راستہ صرف اسلام ہوتا ثابت ہو چکا ہے، پس یاد رکھنا

وہی رہا، اور یہ امر اگر آپ غور فرمائیں ان کے مذہب کے پیرو ہوجائیں محال اس لئے ہے کہ وہ اس سے

ایک حال لازم آتا ہے، کہ اگر آپ ان کے غلط خیالات کا اتباع کرتے ہیں تو جس کو وہ اپنا

مذہب سمجھتے ہیں عرصہ کچھ غریب سے اور کچھ منسوخ ہو جائے سے اب وہ محض چند غلط خیالات

کا مجموعہ رہ گیا ہے، اور پھر اتنا تاریکی میں کیسی حالت میں کہ، ظلم ظلمی ثابت ہوئی، آپ کے حسب تو

دائیں حالت میں تو، آپ کا کوئی خدا سے چلنے والا نہ رہے، مددگار نہ ہو، بلکہ تو یہ پیچہ قبر میں گرفتار

ہو جائے لازم آئے، اور یہ لازم محال ہے، کیونکہ وہ لائق تعقیب سے دردمندانہ حق تعالیٰ آپ سے

ثابت ہے، پس غضب محال ہے، اور اتباع کا مذکور سے یہ لازم آتا تھا، اس لئے اتباع مذکور میں محال

اور بدوی اتباع کے ان کا راضی ہونا غیر ممکن، تو ایسے امر کی امید کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے

اس سے دل نہ خالی کر لینا چاہئے :

الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ يَتْلُونَهُ حَتَّىٰ تَلَذَّذُوا بِهِ ۚ وَلَكُمْ يَوْمَئِذٍ

وہ لوگ جن کو دین نے کتاب دے کر پڑھنے میں جو حق پر اس کے پڑھنے کا وہی اس پر نہیں لائے ہیں

بِهِ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَإِنَّكَ لَمِنْ الْخَاسِرِينَ ۝۱۳۱

اور جو کفر میں مبتلا ہوگا اس سے تو وہی وہی نقصان پائے والے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر اس آیت سے پہلے کی آیت میں معاذ میں اہل کتاب کا ذکر اور منافقین کے

ایمان سے کل مایوسی کا بیان تھا، اس کے بعد حسب عادت قرآنی العبادۃ

اہل کتاب کا بیان ہے، جنہوں نے حق راغب ہو جانے کے بعد جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

کی تعظیم کی، اور آپ کا اتباع محض پیار کیا، پس ارشاد ہے، جن لوگوں کو ہم نے کتاب و فرات و

انجیل دی، ان پر یہ کہ وہ اس کی تلاوت داس طرح کرے کہ وہ اس طرح تلاوت کا حق ہے، ذکر و توبہ

ملیہ کو ہم مضامین میں صرف کیا، اور توبہ ارادہ کو ہم اپنا حق میں یہ سوال کیا، ایسے لوگ

ابنابت آپ کے اس رویہ میں اور علم حق پر ایمان لے آئے ہیں، اور جو شخص زمانے کا رکن کا فائدہ

کرنے کا، خود ہی اپنے لوگ خسارہ میں رہیں گے، کہ ایمان پر جو عزات عطا ہوئے ہیں ان سے محروم

رہیں گے !

يَسْبِي إِسْرَآءِيلَ أَذْكَرَ ۖ إِنَّا نَعْتَصِي النَّبِيَّ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ

اے بن اسرائیل! یاد کرو اسیان ہمارے جو ہم نے تم پر کئے اور اس کو کہ ہم نے

أَنِي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝۱۳۲ وَالْقُرْآنُ وَمَا لَا تَعْبَرُونَ ۚ

تم کو برائی دی اہل عالم پر ، اور دُور امدادی سے کہ حکام آئے کوئی شخص کسی

عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَ

کی طرف سے ذرا بھی اور نہ قبول کیا جاوے گا اس کی طرف بدلہ اور نہ کا آؤ اس کو سفارش اور

لَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝۱۳۳

نہ ان کو مدد پہنچے ! ! !

خلاصہ تفسیر اور یہ آیت تک بنی اسرائیل کے متعلق جن خاص مضامین کا بیان کرنا مقصود تھا

وہ تو ختم ہوئے، اب ان مضامین کی ابتدائی تہمید کے اجمال کے یہ سارے

ان کے دل میں بات چڑی، اور عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہاں بھیڑ کر چلے جانے کا حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملے۔ اس کو سن کر حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ میرا چھپا ہوا خردن سے جاتا ہے، جس نے آپ کو یہ حکم دیا کہ وہیں بھی خلیانے ڈکے گا، ابراہیم علیہ السلام نے حکم خداوندی کی تعمیل میں یہاں سے چل کر کوفہ پہنچ کر شہر خیراں پہنچا اور اس کی والدہ کا خیال لگا ہوا تھا، جب راستہ کے کوڑے پہنچے جہاں سے حضرت ابراہیم نے دیکھ سکیں تو غصہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی جو سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر ۲۵ تا ۲۷ میں اس طرح مذکور ہے:

رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْكَلِمَةَ آيَةً
وَأَجْعَلْ فِي الْقُرْآنِ الْحَكِيمِ
(سورة البراقه ۱۱۳: ۳۵)

اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا دیجئے اور مجھ کو اور میرے خاص فیصلوں کو جنت کی عبادت سے بچائے رکھئے۔

یعنی اسے جیسے رب میں اپنی اولاد کو
 آپ کے عزیز محرم کے قریب ایک میدان میں
 جو راحت کے قابل نہیں آپ کا رب ناموں
 اسے جیسے رب نامہ روز نماز کا ہر سہ ماہی
 آپ کچھ لوگوں کے خواب کی کی طرف
 مائل کر دیتے، اور ان کو پہل کھانے کو دیکھ
 نامہ روز نماز کے

[illegible]

سابقہ حکم جس کی بنا پر پشام سے ہجرت کر کر حضرت انسبیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو یہاں بھیجا گیا تھا اس میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ میرے گھر کو پاک رکھنا، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے والدین کو پاک رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ظاہری نجاسات اور گند سے بھی پاک رکھا جائے اور باطنی نجاست کو خوراک سے پاک بھی فرمایا کہیں متغصوبے، اس نے یہاں شہر کے چرواہوں شرمشاہین ابن بن اولیٰ تو اس کشتی کے محفوظ کاموں رہنے اور جانے اس سے بولنے کی دعا فرمائی، پھر یہ دعائیہ کہے اور میری والدہ کو خوراک و پیت پستی سے بچائے کیونکہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو صرف حق تعالیٰ کا وہ مقام حاصل تھا جس میں انسان کا پناہ دینا بھی نافذ آتا ہے، اپنے تمام افعال و اعمال اور ارادوں کو یہ محسوس کرتا ہوں کہ سب کچھ حق تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہی اس کی مشیت و ارادہ سے سب کام ہوئے ہیں، اس نے خوراک و خوراک سے بیت اللہ کو پاک رکھنے کا

حکیم لکھا، اس میں حق تعالیٰ ہی سے اسرار و ملقب کی، اس دعا کے اندر کفر و شرک سے محفوظ رہنے کی تلقین، ایک خاص مذہب پر بھی ہوسکتا ہے کہ جو جب بیت اللہ کی تعظیم و تحکیم کا حکم جہاں جاتا ہے بھی بخاک کے آئندہ چل کر کوئی نادانقت اس بیت اللہ میں کر رہو نہ بنائے، اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو جائے، اس لئے یہ دعا فرمائی کہ جو کراور میری اولاد کو شرک سے محفوظ رکھا جائے اس کے بعد شریعہ غرار کی باتوں اور اس کی والدہ پر شفقت کے پیش نظر یہ دعا فرمائی کہ میرے ان کو آپ کے حکم کے مطابق آپ کے محرم کے پاس شہر فرما دیا ہے، یہ کسی بے فکر و زراعت کے قابل بھی نہیں، جہاں کوئی اپنی محنت سے سرور یافتہ زندگی حاصل کرے، اس لئے آپ ہی اپنا فضل سے ان کو سہارا بخاریز قیام دے۔

یہ دوا مکہ کے حضرت غلیل علیہ السلام کو اپنے وطن شام کی طرف روانہ ہو گئے، اور حضرت اجڑا کا چمکہ وقت قراس توشہ کہار دہانی کے ساتھ کبھی ہو حضرت غلیل اندر چھوڑ کر تھے، پانی ختم ہونے کے بعد خود بھی پاس سے چھین اور شیر بھی پی کر، اس وقت پانی کی تلاش میں ان کا ٹھکانا اور بھی کسی کو مغار بھیسی کو مہرہ پر چڑھ کر اداواران دونوں کے درمیان دو دوڑ کر راستہ سے گزرا، تاکہ حضرت اسماعیل انھوں کے سامنے آجائیں، عام مسلمانوں میں معروف ہے اور کچھ میں مقارنہ کے درمیان میں گزرا، آج بھی اس کا یادگار ہے۔

اس وقت کے آخر میں حضرت جبریل امینؑ کو حکیم خاندان دیکھ دیے وہاں ہوتا اور چشمہ زردم کا جاری کرنا اور پھر قبلہ جہنم کے کچھ لوگوں کا یہاں آکر قیام ہونا اور حضرت انصیل علیہ السلام کے جوان ہونے کے بعد قبلہ جہنم کی ایک بی بی سے شادی ہو جانے سے صحیح بخاری کی روایت میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، روایت حدیث کے مجموعے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً سورۃ ق کی آیت میں جو بیت اللہ کو آباد کرنے اور پاک صاف رکھنے کا حکم حضرت خلیل اللہ کو ملا اس وقت اتنا ہی عمل مقصود تھا کہ اس جگہ کو حضرت انصیل اور ہاجرہ علیہا السلام کے ذریعہ آباد کر دیا جائے، اس کے مخاطب صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، کیونکہ انصیل علیہ السلام ابھی شیر خوار کے عالم میں تھے، اس وقت بیت اللہ کی تعمیر ہو رہی کا حکم دیا تھا سورۃ البقرہ کی آیات جو اس وقت زیر نظر ہے و قد بنی کافکاً ایضاً یہ حدیث و انصیل بن علی علیہ السلام نبیؑ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت انصیل علیہ السلام کو بھی شریک کر دیا گیا ہے مگر اس وقت کا ہے جب کہ حضرت انصیل علیہ السلام جوان اور متاہل ہو چکے تھے، اس وقت دونوں کو بیت اللہ کا عمر دیا گیا۔

میں بخاری کی روایت میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام حسب عادت حضرت ماجرا

مرتبه متعلق بنادر و گاروگ بار بار اس کی طوط جانے اور دھونے کے آواز و مندرجہ جے، امام شریعہ حضرت صاحبزادے فرمایا ایضاً بعض منہا و طوطا (رقول) میں کوئی آدمی اس کی زیارت سے کسی چیز نہیں پوچھے بلکہ ہر مرتبہ پہلے سے زادہ زیارت و طوطا کا شروع کرے اور منہا علانے فرمادے کہ یہ غلبہ کی علامت میں ہے کہ وہ اس سے دھونے کے بعد پھر وہاں جانے لگے گا شروع دل میں پائے نہ چاہئے مام طور اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ پہلے مرتبہ جتنا شوقی زیارت بہت آسان ہو تاکہ دوسری مرتبہ کے لئے اس شوق میں اضافہ ہو جائے اور چون بار بار زیارت کرتا رہتا ہے یہ شوق اور جہت بڑھ جاتا ہے۔

[illegible]

۲۔ لفظ اثناساں جو ماضی میں جاتے اس کے معنی میں ہو، اور لفظ جہت سے مراد صرف بہت اشد میں خدا کے نہیں بلکہ ہر باحرام مرد ہے، قرآن کریم میں بہت اشد اور کعبہ کا لفظ کعبہ لکھ کر ہر باحرام مرد نے لکھ کر وہی شہادہ صریح دہن کیے اور شاپے، **عَلَيْهِ السَّلَامُ** (۱۵: ۹۰) اس میں لفظ کعبہ لکھ کر ہر باحرام مرد مانگا گیا ہے، کیونکہ اس میں ذکر و تشریفاتی کا ہے اور یہی کعبہ لکھ کر تشریفاتی نہیں ہوئی، اور نہ وہاں تشریفاتی کرنا جائز ہے، اس نے معنی بہت کے ہر کوئی کہہ کر حرم مکہ کو جاتے اس بنا دیا ہے، اور جہت سے اثناساں سے مراد دو گویوں کو حکم دینا کہ ہر باحرام مرد حرم مکہ قتل و قتال اور انتقام سے بالاتر رکھیں۔ (ابن زلی)

احکام و مسائل متعلقہ حرم محترم

۱۔ لفظ مشابہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو یہ خاص فضیلت بخش کر رکھ دی ہے۔

چنانچہ زمانہ جاہلیت میں بھی عربوں کے ہاتھ میں مفتاب اور بڑی کھنجر کا رواج رہا۔ مگر حضرت
ان میں سے کسی شخص کا حرم میں اپنے باپ اور بھائی کا قاتل بھی کسی کو قتل و انتقام نہیں لیتے تھے، اور ہم
جنگ و قتال کو بھی حرم میں حرام سمجھتے تھے، فریضہ اسلام میں بھی مگر اس طرح قاتل رکھا گیا، منہج
سکوکے وقت مرنے چند غصوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اور حق حرم میں
قتال کو جائز کیا گیا تھا، مگر اس وقت پھر پیغمبر کے لئے حرام کر دیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فتح مکہ کے خطبہ میں اس کا اعلان فرما دیا (صحیح بخاری)

ابہدہ اپسند کر کوئی شخص حرم کے اندر ہی کوئی ایسا جرم کرے جس پر حد و قصاص اسلامی شریعت کی مدد سے مائدہ ہذا پر تو حرم اس کو اس میں نہیں دے گا، بلکہ اس پر اجماع امت

مردود و قصاص جاری کے جائز ہیں گے ۱) حکام اہل کفران جہت میں وقت غری، کیونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كُنْتُمْ تَحِبُّونَ

(۱۵۸:۲)

اے ایمان والو! اگر تم نے لوگ حرم میں متلاش کئے

البتہ یہاں ایک مسئلہ اترتا ہے جو میں نے مختلف فیہ ہوا وہ یہ کہ کوئی شخص یا برسر جرم کے حرم میں پناہ لینے، قرآن کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا، اس میں بعض ائمہ اس پر بھی حرم میں حدود و قصاص کی سزاؤں جاری کرنے کا حکم دیتے ہیں، اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کو سزا سے چھوڑا تو نہیں، کیونکہ اگر یہ گویا حرم کے سزا سے بچنے کا راستہ کھل جائے گا، اور عالم میں فساد برپا ہو جائے گا، اور حرم جرموں کا ٹھکانا بن جائے گا، لیکن احترام حرم کے سبب حرم کے اندر زندگی بگڑ جائے گی، بلکہ اس کو پرکھنا بھی جائز نہ ہو، اس لئے یہ مسئلہ کے بعد مسئلہ طہاری کی جائے گی۔

۳۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ۚ إِنَّكَ أَنتَ بِنَظَرٍ ۚ اے نبی! صبر کر اپنے رب کے حکم کے لئے، کیونکہ تیرے سامنے ہے اور وہ تجھ پر نظر کرتا ہے۔ اور اس کو تعزیر بیت اللہ کے وقت اپنے ہتھمال کیا تھا، صحیح بخاری

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اسے پھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نقش دیکھا ہے، مگر لوگوں کے کثرت چھوٹے اور آٹھ لگانے سے اب نشان ہکا پڑ گیا ہے (قرطبی)۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مقام ابراہیم کی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ پورا حرم مقام ابراہیم ہے، لیکن چونکہ اس سے مراد یہ ہو کر ہوا کہ عید کی روز رکتیں ہیں جو مقام ابراہیم پر پڑنے کا حکم آیت میں ہے، اس حکم کی تعمیل پورے حرم میں کسی جگہ بھی یہ رکتیں پڑنے سے ہو جائیں گی، اس پر کثرت قیاسات متفق ہیں۔

۴۔ آیت مذکورہ میں مقام ابراہیم کو معنی بنانے کا حکم ہے اس کی وضاحت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ اربعین میں اپنے قول و فعل سے اس طرح فرمادی کہ آپ طواف کے بعد مقام ابراہیم کے پاس پہنچے جو بیت اللہ کے سامنے تھوڑے فاصلے سے دکھایا ہوا ہے وہاں پہنچ کر یہ آیت تلاوت فرمائی، وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ۚ اے نبی! صبر کر اپنے رب کے حکم کے لئے، اس طرح درگت نماز میں کہ مقام ابراہیم کو وہاں میں رکھتے ہوئے بیت اللہ کا استقبال ہو جائے، رجوع سلم، اسی لئے فقہاء امت نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو مقام ابراہیم کے چھپے متصل جگہ ملے، وہ کہنے کی فاصلہ بھی جب اس طرح نکلا ہو کہ مقام ابراہیم میں اس کے سامنے رہے، اور بیت اللہ کی قرائم حکم کی طرف سے قبول ہو جائے گی۔

۵۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ طواف کے بعد کی دو رکتیں واجب ہیں (وخاصاً دوسرا تکملہ طوافی)

البتہ ان دو رکتوں کا خاص مقام ابراہیم کے چھپے اور اگر اس وقت عید کا حرم میں کسی دوسری جگہ بھی اور گھرے تو کافی ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان رکتوں کا بیت اللہ کے (دوازہ) سے متصل پڑنا بھی ثابت ہوا، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی یہ بیان کیا ہے، پھر پناہ منقول ہے (وہیں) اور طوافی قاضی نے کتاب مناسک میں فرمایا ہے کہ یہ دو رکت طواف تو واجب ہیں، اور سنت ہے، چونکہ مقام ابراہیم کے چھپے اور ان کا جہاں بھی کسی دیکھ وہاں ادا کر کے پورا حرم میں یا حرم باہر جہاں بھی ممکن ہو اور اگر کہنے سے واجب ادا ہو جائے گا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ اربعین میں حضرت ام سلمہؓ کو ایسا ہی اتفاق ہوا کہ ان کو واجب طواف نماز پڑھنے کا وہاں موقع نہ ملا تو مسجد حرام تک مکہ مکرمہ سے نکلے کے بعد ادا کیا، اور بعد از صلا حرم سے باہر آکر اپنے گھر پر واپس ملے کے نزدیک کوئی دم بھی واجب نہیں ہوتا، صرف اہم ناکت واجب دم کے قابل ہیں (وہاں تک طوافی) ۱۔ تفسیر ابن کثیر، اس میں بیت اللہ کو پاک کرنے کا حکم ہے جس میں ظاہری غیاسات اور گندی سے طہارت بھی داخل ہے، اور باطنی غیاسات کفر و شرک اور اخلاقی رد و ذلہ فیض و وحدہ عرض و دہوا و تکبر و غرور و ماریہ و نام و نحو سے پاک بھی شامل ہوا، اور اس میں حکم طہارت کیلئے لفظ تبتیہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ حکم تمام مساجد کے لئے عام ہے، کیونکہ ساری مساجد بیت اللہ شریف جیسے گراں قدر ہیں، (تفسیر ابن کثیر، ۱/۲۳۱)

حضرت فاروقیؒ نے علامہ شافعیؒ کے بعد میں ایک شخص کی آواز سنی، تو فرمایا تمہیں خبر نہیں کہ تم کہاں کھڑے ہو (قرطبی) یعنی چونکہ کعبہ و حرام چاہتے ہیں اس میں غیر شریف اور اولیٰ جند نہیں کرنا چاہئے، مابقی ہے کہ اس آیت سے جس طرح بیت اللہ کا تمام ظاہری اور باطنی غیاسات سے پاک رکھنا ضروری ہے، اس طرح تمام مساجد کو بھی پاک رکھنا واجب ہے، یعنی مساجد میں داخل ہونے والوں پر فہم ہے کہ اپنے بدن اور پیروں کو بھی تمام غیاسات اور بدو کی چیزوں سے پاک صاف رکھیں اور اپنے دلوں کو شرک و فحشاء اور تمام اخلاقی رد و ذلہ، تکبر و وحدہ، فیض و دہوا و غرور کی غیاسات سے پاک کر کے داخل ہوں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی شخص پیش بسن و رجوع ہوا پھر مسجد کرمہ میں نہ جائے، اور مسجد کے چاروں طرف کو مسجدوں میں داخل ہونے سے منع فرمایا ہے، کوئی سے غیاسات کا خلاف نہ جتا ہے۔

۶۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ۚ اے نبی! صبر کر اپنے رب کے حکم کے لئے، اور بیت اللہ کی قرائم حکم کی طرف سے قبول ہو جائے گی۔

خاز سے مقدم ہے دکار میں اس جس پر کماؤں عالم سے جانے والے حجاج کے لئے طہارت
پانہیت نماز کے افضل ہے، جو حجے پر بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق پانہ سے منسوخ ہو
یا نقل (رجس)

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ

اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب بتا اسی کو شہر اس کا اور روزی دے اسی کے لئے
مِنَ الشُّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ وَاللَّهُ وَالْيَوْمُ الْآخِرُ قَالَ وَمَنْ

داروں کو جو سے جو کرے ان میں سے ایمان لائے انہی پر اور قیامت کے دن یہ فرمایا اور

كَفَرًا فَمَتَّعَهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ

کفر ہے اس کو جس نے کفر کیا اور وہ بھلا کر دھوکا دیا کہ جہنم میں اور وہ

الْمَصِيرُ ۚ وَلَا يَذَرُهُمُ الْقَوْمَ عِندَ الْبَيْتِ وَ

بڑی جگہ ہے یہ جگہ، اور یاد رکھو جب ائمہ نے ابراہیمؑ بنیادی خاد گھبراہٹ کی اور

اسْتَعِیْلَ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا

وَسْمِعِیْلَ ۖ عَاكِرٌ فِيهِ آدَمُ وَدَاوُدُ وَيُوسُفُ ۚ وَأَلْقَانُ ۚ وَالْأَوَّلُ وَآدَمُ

وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةٌ مُسْلِمَةٌ لَكَ ۚ

بنا کر اور کریم کو حکم بر دار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرما اور اپنی

وَارْزُقْنَا إِنَّا سَاغِدُونَ لَكَ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَّابِعُ الرَّحِيمُ ۝

اور سلام کرنا چاہتے ہیں کہ اور ہم کو کھانا کر چٹک قوی ہو تو قبول کر پورا ہرمان۔

خلاصہ تفسیر

اور ۱۷۰ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے، جس وقت ابراہیمؑ علیہ السلام نے
روما میں عرض کیا کہ اے میرے رب یہ درگاہ اس زمین کو ایک دعا دار
شہر بنا دیجئے اور شہر میں کیسا امن دارانہ والا اور اس کے لئے داروں کو چھوڑنے کی قسم ہے اسی
عاقبت پچھراور میں سب لئے داروں کو پس کتنا خاص اہل کو رکھتا ہوں، جو ان میں اللہ تعالیٰ

پہلا روز قیامت ہے ایمان لگنے والے اور ان کو آپ جانیں اہل ایمان نے ارشاد فرمایا کہ جو کر
روز قیامت خاص نہیں ہے اس لئے ثمرات سب کا دن کا مومن کو بھی، اور اس شخص کو بھی جو
کافر ہے واپس جاتے آخرت کے کہ اہل ایمان کے ساتھ خاص ہی ہو اس واسطے کہ قصہ کر
دیجے کہ کافر کی انصاف سے روز قیامت دنیا میں، تو خوب آرام برتاؤں گا لیکن پھر وہ بد مرگ ہونگا
کشتن کشتن عذاب و درشتی میں پہنچاؤں گا اور اس شخص کی جگہ تو بہت بڑی ہے (اللہ بجاوے) اور
وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے، جبکہ انصاف ہے کہ ابراہیمؑ علیہ السلام دوسری خاد گھبراہٹ کی اور ان کے
ساتھ، اسٹیل علیہ السلام بھی دار میں کہتے جاتے تھے اے ہاتھ پر درگاہ اور خدمت اہم سے
پہل فرمائیے، بلاشبہ آپ خوب سننے والے، جانتے والے ہیں اور ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے
کوہلے ہیں، اے ہمارے پر درگاہ اور ہم دونوں پر دعا کرتے ہیں کہ ہم کو اپنا اور زیادہ
مصلح بنا دیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی طاعت پر اور دوسروں
ہم کو ہمارے ج (دعوت) کے احکام بھی بتا دیجئے اور ہمارے حال پر ہمارے ساتھ، توجہ رکھئے اور
فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمائے والے، ہر دانی کرنے والے۔

معارف مسائل

حضرت فہیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اشہد کہ راہ میں فترائیاں دیں، مال و مال
اہل و عیال اور غور اپنے نفس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے تعین احکام ربانی میں مسامت
کے چرکا ناے چلی گئے وہ محتاسب و درگاہ میں ہیں۔

اس کے ساتھ اہل و عیال پر شفقت و محبت ایک طبع اور فطری امر ہونے کے ساتھ
مکرم ربانی بھی ہے، مذکورہ الصبر آیات اس کا منظر ہیں، انصاف لہنے اہل و عیال کیلئے دین دنیا
کی آسائش و راحت کے لئے دعائیں مانگی ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کی دعا میں دعا کو شروع لفظ سب سے کیا ہے، جس کے معنی ہیں اے میرے
ہاتھ والے اہل و عیال میں دعا مانگنے کا سلیقہ صحیح ہے، کہ خود یہ الفاظ حق تعالیٰ کی رحمت اور
لطف و کرم کو متوجہ کرنے پر مؤثر ہوا ہے، پھر سب سے پہلے دعا یہ فترائیاں کہ اس شہل میدان
کو جس میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل و عیال کو لا دیا ہے آپ ایک شہر بنا دیں
تاکہ یہاں کی سکونت میں ان کو راحت ہو اور ضرورت پاتے زندگی با سائیکہ میں رہیں، یہی دعا
سورۃ ابراہیم میں خذ الْاٰمَنَاتِ اٰمِنًا کے الفاظ سے آئی ہے، جس میں اللہ کو اللع لام کے ساتھ ذکر
کیا ہے، جو عربی زبان کی اصطلاح میں مقررہ کہلا کا ہے، فرق کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلے دعا جو آیت

خاز سے مقدم ہے دکار میں اس جس پر کماؤں عالم سے جانے والے حجاج کے لئے طواف
بہ نسبت نماز کے افضل ہے، جو حجے کی کسبت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے منسرف ہو
یا نقل (رجس)

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ

اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب بنا اس کو ٹھہرا اس کا اور دروزی دے اس کے لئے
مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ وَاللَّهُ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ

داروں کو جو سے جو کرے ان میں سے ایمان لائے انہی اور قیامت کے دن یہ فرمایا اور

كَفَرًا فَمَتَّعَهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ

کفر ہے اس کو کئی لمحہ پہنچاؤ گا تو ملے دونوں جہانوں کو جہنم اور جہنم کے عذاب میں اور وہ

الْمَصِيرُ ۚ وَلَا يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ

بڑی جگہ ہے یہ جگہ، اور یاد رکھو جب ائمہ نے ابراہیم بنیادی خاد گھبراہ کی اور

اسْتَعِذَّ بِرَبِّنَا فَقَبَّلَ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا

وَسْمِعِیْلَ، عا کرتے تھے اور دروگہ ہوا توں کہ ہم سے جیکہ قومی ہوتے دلا جانے والا اور دروگہ

وَأَجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ۚ

بنا کر اور کریم کو حکم بر دار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرما کر دار اپنی

وَارْزُقْنَا إِنَّا سَاغِدُونَ لَكَ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَّابِعُ الرَّحِيمُ ۝

اور ملازم کرنا یہ حج کرنے کے اور ہم کو کھانا کر جیکہ قومی ہو تو قبول کر بھراؤ میراں۔

خلاصہ تفسیر

اور ۱۷۰ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے، جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے
روما میں عرض کیا کہ اے میرے رب دروگہ اس دنوں کو ایک دلا دار
شہر بنا دیجئے اور شہر میں کیسا امن دلا دار اس کے لئے دلا داروں کو پہلوں کی قسم ہے کسی
عاقبت پیچہ را در میں سب لئے دلا داروں کو کیسے کہنا بلکہ خاص ان کو کہنا ہوں، جو ان میں اللہ تعالیٰ

پہلوں دروگہ قیامت میں ایمان لگتے ہوں را بقول کو آپ جانیں اہل ایمانی نے ارشاد فرمایا کہ جو کر
روزگار یا خاص نہیں ہے اس لئے ثمرات سب کا دل کا منوں کو بھی، اور اس شخص کو بھی جو
کا فر ہے وائبر خات آخرت چ کہ اہل ایمان کے ساتھ خاص ہی ہو اس واسطے لئے قصہ کر
دیجہ کہ کا فر کی انھوں سے روز لین دنیا میں، تو خوب آرام برتاؤں گا ولیکن پھر وہ بد مرگ ہونگا
کشتاں کشاں عذاب و در شا میں پہنچاؤں گا اور اس شخص کی جگہ تو بہت بڑی ہے (اللہ بجاوے اور
وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے، جبکہ انھار ہے کہ ابراہیم علیہ السلام دوسری خاد گھبراہ کی اور ان کے
ساتھ، اسٹیل علیہ السلام بھی دار میں کہتے جاتے تھے اے ہاتھ پر دروگہ را یہ خدمت اہم سے
قبول فرمائیے، بلاشبہ آپ خوب سنتے دالے، جانتے دالے ہیں اور ہمارے دلا دہنتے ہیں ہمارے قبول
کوہلے ہیں، اے ہاوسے پر دروگہ را در وہم و دلوں میں دعا کرتے ہیں کہ ہم کو اپنا اور دلا دار
ملیج بنا دیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی ملیج ہو اور دوسرا
ہم کو ہاوسے ج (دروگہ) کے حکام بھی بنا دیجئے اور ہاتھ حال بر در ہائی کے ساتھ، توجہ رکھئے اور
فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فسرانے دالے، ہر دلائی کرنے دالے۔

معارف مسائل

حضرت فہیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اشہد کہ راہ میں فسر اپنا دیں، حال دناں
اہل و عیال اور غور اپنے نفس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے تعیلی احکام ربانی میں مسامت
کے چرکا ناے چلی گئے وہ عجب سب دروگہ میں ہے۔

اس کے ساتھ عیال و عیال پر شفقت و محبت ایک طبع اور فطری امر ہونے کے ساتھ
مکرم را بنی میں ہے، مذکورہ الصداکات اس کا منہل ہیں، انھوں نے اپنے اہل و عیال کیلئے دین دنیا
کی آسائش و راحت کے لئے دعائیں مانگی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دناں اور غور شروع لفظ سب سے کیا ہے، جس کے معن ہیں اے میرے
ہاتھ دالے ان الفاظ میں دلا مانگنے کا سلیقہ صحیح ہے، کہ غور یہ الفاظ حق تعالیٰ کی رحمت اور
لطف و کرم کو متوجہ کرنے پر مؤثر دلا ہی، پھر سب سے پہلی دعا یہ فسر را کہ اس شہل میدان
کو جس میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل و عیال کو لا دلا ہے آپ ایک شہر بنا دیں
تاکہ یہاں کی سکونت میں اُن کو راحت و جو را ضروریات زندگی با سائی میسر آجائیں، پہلی دعا
سورۃ ابراہیم میں ھٰذَا الْبَلَدُ آمِنٌ کے الفاظ سے آئی ہے، جس میں البین کو لطف لام کے ساتھ ذکر
کیا ہے، جو عربی راہن کی اصطلاح میں مرقہ کہلا کا ہے، فرق کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی دعا جو آیت

سورۃ بقرہ میں بتلے گا کہ لفظ اَنّی پر اے کی تفسیر بھی صحیح ہے مگر کچھ بھی شہرنا پس تھا اسوقت بدلی کو بفرما
اعتقاد ہے کہ وہ یہ حال کیا اور دوسری ماہیہ اسوقت کی کہ جو کچھ کسی انسان کی اذیت ہو تو اس کا قریب ہے
کو دور اور کچھ کی آخری آیت میں ہے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَقِبُ الْاَیْکَیْنِ اَشْیَئِیْنِ وَ اِشْیَئِیْنِ (۱۲۸: ۱۲۷)
جس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دعا حضرت اَنّیٰ کی یہ پیشکش ہے بدلی کی ہے، اور حضرت اصفیٰ حضرت
انصاری سے تیرہ سال بعد میں پیدا ہوئے (ابن کثیر)

دوسری دعا میں اس سے بڑا کہ اس شہر کو اس والا شہر بنا دیجئے، یعنی جو قتل و غارتگری سے
کنکار کے تسلط سے آزاد تات، اسے امن و محفوظ رہے۔

حضرت غلیل اللہ کی دعا، قبول ہوئی، اور مکہ مکرمہ ایک ایسا آباد شہر ہو گیا کہ اس کی
اپنی آبادی کے علاوہ ساری دنیا کا مروجہ کیا گیا، اطراف عالم میں سلطان و پادشاہ پچھتے کو اپنی دست
بڑی سادقت کیجئے ہیں، اور مائیں و مغربہ بھی ہو گیا کہ بیت اللہ کے خلاف کسی قوم اور کسی
بادشاہ کا اس پر تسلط نہیں ہو سکا، اصحاب قبل کا واقعہ خود قرآن میں مذکور ہے، کہ انھوں نے بیت
پر حملہ کیا قصد کیا تو پورے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

یہ شہر قتل و غارتگری سے بھی بڑا محفوظ تھا آیت ہے، اسلام سے پہلے بھی راء جاہلیت والے
کتنی ہی ہنسنا بیروں اور کفر و شرک کی رموز میں مبتلا ہونے کے باوجود بیت اللہ اور اس کے ماحول
حرم کی تعلیم دیکھ کر کہ ایسا مذہب پسند نہ کیجئے تھے کہو کہ کسی دشمن کو مل جانے حرم میں اس
قصاص یا انتقام نہ لینے تھے، لکن کچھ حرم کی تعلیم دیکھ کر بھی پورے عرب میں عام تھی، اسی لئے کہ
والے ملک شام اور یمن سے تھاری اور آمد و براء تک سلسلہ کئے تھے اور کوئی ان کی راہ میں ماسک
نہ ہوتا تھا۔

حدود حرم میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فائدوں کو بھی امن دیا ہے، اس میں شکار جائز نہیں
ایسا ہی با فائدوں میں بھی یہ قدرت اُنّی اسکا پسند فرمادیا ہے کہ حد و حرم میں اگر جانور آپ کو
محفوظ سمجھتا ہے کسی شکاری آدمی سے نہیں گھبرا۔

حرم عظیم کے ماموں ہونے کے یہ احکام جو دعا اور ایک ایسی کتابچہ میں راء جاہلیت سے
نام نہ ملے آئے تھے، اسلام اور قرآن نے ان کو ازاد و کھلا اور تقویٰ پر پائی، ماحول
پرست اور پھر واسطہ کے ظلم کو ہٹا دیا اور پکاریوں سے جو قتل و قتل حرم میں ہوا ازل تو وہ خدا اسلام کا
نام لینے والوں کے ہاتھوں ہوا، کوئی ان کو فراموش نہ کرے، اور کوئی غصہ خود اپنے گھر کو آگ لگائے تو
وہ امن کے متالی نہیں، اس کے علاوہ یہ واقعہ شاذ نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر
آج تک ہزاروں سال کی مدت میں گئے ہیں، اور قتل و قتل کے بعد ایسا کرنے والوں کا کھانا

بھی مرگے مائے اعلیٰ۔

خلاصہ یہ ہے کہ دعا بابرہی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو ایک ماموں شہر اور تمام
دنیا کے لئے اس کی جگہ قدرتی طور پر بھی بنادی ہے، یہاں تک کہ قتل کو بھی حرم میں داخل
ہونے کی قدرت نہ ہوگی، اور شرعی طور پر بھی یہ احکام جاری فرمادیجئے کہ حرم میں با کسی قتل و
قتل تو کیا فائدوں کا کشاکش بھی حرام کر دیا گیا۔

تیسری دعا، یہ فرمائی کہ اس شہر کے باشندوں کو پھلوں کا رزق عطا فرمائیے، مکہ مکرمہ
اور اس کے آس پاس کی زمین دیکھی باغ و چمن کی عقل بھی، خدا وں دور دور تک پانی کا نام نہ لے
تھا، مگر حق تعالیٰ نے دعا بابرہی کو قبول فرمایا، اور مکہ کے قریب ہی طاقت کا ایک ایسا خط
بنادیا جس میں ہر طرح کے بہتر پھل بکثرت پیدا ہوتے اور مکہ مکرمہ اگر فروخت ہوتے ہیں،
بعض اسرائیلی روایات میں بڑا طاقت واصل ملک شام کا خط تھا، جس کو بکھ خانہ دی چڑھنے
نے یہاں پیش کر دیا۔

کتبہ ابراہیم | حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں یہ نہیں فرمایا کہ مکہ اور اس کے ماحول
مکہ اور پھلوں کی زمین باقی کاشت بنادینے، بلکہ دعا، یہ فرمائی کہ جو چیزیں پیدا کیں اور ہوں مگر کھیں
پر پکاریں، اس میں شاید یہ راز ہو کہ حضرت غلیل نے نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد کا کشاکش یا باغیانی
کے کاموں میں مشغول ہو جائے، کیونکہ ان کو اس شہر آباد کرنے کا مشا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام
نے خود یہ ستر بار بار اَنّی اَنّی اَنّی اللہ کو جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت غلیل علیہ السلام اپنی اولاد
کا اصل مشغولیت اللہ کی حفاظت اور نماز کو رکنا چاہتے تھے، ورنہ کیا مشکل کا خود کو مکہ مکرمہ کو
ایسا گلزار بنا دیا تاکہ وطن و بیروت اس پر رشک کرے۔

دقیق طرات تمام ضروریات | لفظ غرات جو ترو کی جمع ہے اس کے معنی پھل کے ہیں، اور لقا بر اس سے
زندگی کو مشابہت ہے | ملازمتی کے پھل ہیں، لیکن سورۃ قصص آیت نمبر ۵ میں اس دعا
کی قبولیت کا لفظ ان الفاظ میں فرمایا ہے، یَبْقِیَ الْاَیْیَہُ قَسْرَتٌ عَظِیْمَیْنِ اِنِ الْفَاظِیْنِ اَیْکَیْنِ تو
اس کی تفسیر یہ ہے کہ خود دیکھ میں پھل پیدا کرنے کا وہ نہیں، بلکہ دوسرے مقامات سے یہاں
لائے جائیں گے، کیونکہ لفظ عظیمی کا بھی مفہوم ہے، دوسرے شلوات کل شجر جن میں فرمایا، بلکہ
شلوات عظیم شمع فرمایا، اس تفسیر لغتی سے ذہن اس طرط جابگہ کے یہاں غرات کو عام نام مقصود
ہے، کیونکہ ترو طوط میں ہر چیز سے حاصل ہونے والی پیسہ دار کو کہا جاتا ہے، ورنہ خود سے پیدا
ہونے والے پھل جس طرح اس میں داخل ہیں اس طرح مینشوں سے حاصل ہونے والا کل سال
بہن مینشوں کے طرط ہیں اس طرح مختلف دستکاریوں سے بننے والا سامان کن دستکاریوں کے

صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک ہی معنوں ایک ہی طرح کے الفاظ میں آیا ہے، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں نشر فی لائے کے مقاصد آپ کے عہد نبوت و رسالت کے فرائض منصبی میں بیان کیے گئے ہیں، ایک تلاوت آیات، دوسرے تعلیم کتب و حکمت، تیسرے لوگوں کا تزکیہ اعلیٰ اور دنیوی۔

پہلو متعلق تلاوت آیات بیان کی بات قابل غور کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہوا بلکہ تعلیم اعلیٰ و اعلیٰ سے، یہاں تلاوت و تعلیم کو ایک ایک بیان کرنے سے یہ حاصل ہوا کہ تشرآن کریم میں جس طرح معانی مقصود ہیں اس کے الفاظ بھی مستقل مقصود ہیں، ان کی تلاوت و حفاظت فرض اور اہم عبادت ہے، یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا واسطہ شاگرد اور مخالف خاص وہ حضرات تھے جو نبی زبانی کے نہ صرف جاننے والے بلکہ اس کے فصیح و بلیغ خلیفہ اور شاہ بھی تھے ان کے سامنے قرآن ولی کا پڑھنا بھی جائز اور اہل بیت علیہ السلام کے ہر والد کے مندرجہ ذیل فریضہ و عبادت کے لئے ضروری تھا کہ وہ تلاوت و حفاظت کے لئے دوسرا مقصد رسالت قرار دینے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ محل کے اعتبار سے یہ دو فرض مقصد ایک ہی ہو جاتے ہیں، اس میں غور کیا جائے تو دراصل یہی کچھ کے سامنے آتیں گے، اولیٰ یہ کہ تشرآن کریم و دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب نہیں جس میں صرف معانی مقصود ہوتے ہیں، الفاظ ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اگر مولیٰ تکرار و تہذیب بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، ان کے الفاظ بغیر معنی کیے ہوئے پڑھنے و پڑھنا اہل لغو و فضول ہے بلکہ تشرآن کریم جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں، اور الفاظ قرآن کے ساتھ خاص خاص احکام مشرعیہ میں شملت ہیں، یہی وجہ ہے کہ اصول فقہ میں تشرآن کریم کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ هو الشیء واللعن جیسا یعنی تشرآن نام ہے الفاظ اور معنی دونوں کا جس سے مسلم ہو کہ اگر معانی تشرآن کے الفاظ قرآن کے علاوہ دوسرے الفاظ یا دوسری زبان میں لکھا جائے تو وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں اگرچہ معانی یا اہل صحیح و درست ہی ہوں، ان معانی پر قرآن کو بدلے ہوئے الفاظ میں اگر کوئی شخص نماز میں پڑھے، تو نماز ادا نہ ہوگی، اسی طرح وہ تمام احکام جو تشرآن سے شملت ہیں اس پر اہتمام نہیں ہوں گے، قرآن کریم کی تلاوت کا جو ثواب احادیث صحیحہ میں وارد ہے وہ بدل ہوئی زبان یا بدلے ہوئے الفاظ پر رتبہ نہیں ہوگا، اور اسی لئے فقہائے امت نے قرآن کریم کا صرف ترجمہ بلا معنی تشرآن کے سمجھنا اور چاہنے کو منکر فرمایا ہے، جس کو عورت میں اردو کا تشرآن یا انگریزی کا قرآن کہنا چاہیے، یہ کیونکہ وہ حقیقت جو تشرآن اردو یا انگریزی میں نقل کیا گیا وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں۔

خلاصہ یہ ہو کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تعلیم کتب

سے علوہ تلاوت آیات کو جدا گانہ فرض تشرار دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ تشرآن کریم میں جس طرح اس کے معانی مقصود ہیں، اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں، کیونکہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے، معانی کی نہیں، اسی لئے جس طرح رسول کے فرائض میں معانی کی تعلیم و اعلیٰ ہے، اسی طرح الفاظ کی تلاوت و حفاظت بھی ایک مستقل فرض ہے، اس میں شبہ نہیں کہ تشرآن کریم کے نزول کا اصل مقصد اس کے بتائے ہوئے نظام زندگی پر عمل کرنا اور اس کی تعلیمات کو سمجھنا اور سمجھانے، بعض اس کے الفاظ تلاوت لینے پر قناعت کر کے بیٹھ جانا قرآن کریم کی حقیقت سے بے خبری اور اس کی بے قدری ہے۔

فرض کریم کے الفاظ اگرچہ کچھ جگہوں پر جائز و ناجائز ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ جب تکائیں، بلکہ موجب ثواب عظیم ہیں۔ ایک تشرآن کریم کے الفاظ کے معانی نہ سمجھنے کی طرح اس کے الفاظ پڑھنا فضول ہے، یہ اس لئے واضح کر دیا ہوں کہ آجکل بہت سے علما و فاضلین قرآن کریم کو دوسری کتابوں پر قیاس کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کہ کتاب کے معنی نہ سمجھیں تو اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھنا نا وقت ضائع کرنا ہے، مگر قرآن کریم میں ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآن الفاظ اور معنی دونوں کا نام ہے، جس طرح ان کے معانی کا سمجھنا اور اس کے دینے ہوتے احکام پر عمل کرنا فرض اور اعلیٰ عبادت ہے اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی ایک مستقل عبادت اور ثواب عظیم ہے۔

دوسرا مقصد تعلیم کتب یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام جو معانی تشرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے اور سمجھنے والے تھے، انھوں نے محض معنی سمجھ لینے اور فصل کر لینے کو کافی نہ سمجھا، سمجھنے اور اعلیٰ کرنے کے لئے تو ایک مرتبہ پڑھ لینا کافی تھا، انھوں نے ساری عزت و قدر قرآن کو حذر جان بنائے رکھا، سمجھنے سمجھانے پر زور دیا کہ قرآن کو بچہ ختم کرنے تھے، لیکن وہ دن میں اور کثر حضرات تھے، دن میں پڑھ تشرآن کے عادی تھے، اور ہر مہینہ میں تشرآن ختم کرنے کا تو پوری اہمیت کا حامل رہا ہے، قرآن کریم کی سات منزلیں اسی ہفتہ واری معمول کی علامت ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام علیہ السلام پر تلاوت کا کہ جس طرح قرآن کے معانی کا سمجھنا اور عمل کرنا اصل عبادت ہے، اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی عبادت اور ایک اعلیٰ عبادت اور موجب انوار و برکات اور برائے سعادت و نجات ہے، اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تلاوت آیات کو ایک مستقل حیثیت دی گئی، مقصد یہ ہو کہ جو مسلمان فی الحال معانی تشرآن کو نہیں سمجھتے وہ اس بے تعلیمی میں مبتلا نہ ہوں، کہ الفاظ کو فضول سمجھ کر اس سے بھی محروم ہو جائیں، کوشش کرتے رہنا ضروری ہے کہ وہ

قرآن کے معانی کو سمجھیں تاکہ قرآن کریم کے حقیقی انوار و برکات کا مشاہدہ کریں، اور نزولِ قرآن کا اصلی مقصد یہ رہا ہو، قرآن کو معاذ اللہ جتنے منتر کی طرح صرف مجاہد پھر تک میں نہال کی چیز نہ بنائیں، اور بقول اقبال مرحوم سورۃ یس کو صرف اس کام کے لئے نہ سمجھیں کہ اس کے پڑھنے سے مرے دلے کی جان سہلست سے بھل جاتی ہے۔

خلاصہ حکام یہ ہو کہ اس آیت میں قرآن میں رسول بیان کرتے ہوئے تلاوتِ آیات کو مستقبلِ فرض کی حیثیت دے کر اس پر تنبیہ کر دی گئی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کی تلاوت اور ان کی حفاظت اور ان کو شیک اسباب و وجہ میں پڑ نہ جائیں پر وہ نازل ہوئے ہیں، ایک مستقبلِ فرض ہو، اس طرح تلاوتِ آیات کے فرض کے ساتھ تعلیمِ کتاب کو جدا گانہ فرض قرار دینے سے ایک دوسرا ہم نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن ہی کے لئے صرف عربی زبان کا جان لینا کافی نہیں بلکہ تعلیمِ رسول کی ضرورت ہے جیسے کہ تمام علوم و فنون میں یہ بات معلوم و مشاہدہ کی گئی ہے کہ کتاب کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے محض اس کتاب کی زبان جانتا بلکہ زبان کا ہر جزو نامی کافی نہیں جب تک کہ اس میں کوئی ماہر استاذ سے حاصل نہ کیا جائے، مثلاً اچھل ڈاکوڑی، ہو میو پیٹنگ اور ایلی پیٹنگ کی کتابیں عموماً انگریزی زبان میں ہیں، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ محض انگریزی زبان میں مہارت پیدا کر لینے اور ڈاکوڑی کی کتابوں کا مطالعہ کر لینے سے کوئی شخص ڈاکوڑی نہیں بن سکتا، انگریزنگ کی کتاب میں پڑھنے سے کوئی انگریز نہیں بن سکتا، بڑے فنونِ قرآنی جگہ پر ہیں، معمولی درجہ تک اہلِ علم کی یہ عادت ہے کہ وہ سیکھتے ہوئے حاصل نہیں کر سکتے، آج تو ہر صنعت و حرفت پر سینکڑوں کتابیں بھی لکھی ہوئی ہیں، تو لو کہہ کر کہ بھائے کے طریقے بتاتے ہیں، لیکن ان کتابوں کو دیکھ کر نہ تو کوئی روزی بناتا ہے نہ باورچی یا دوار، اگر محض زبان جان لینا ہی کی ہے حاصل کرنے اور اس کی کتاب سمجھنے کے لئے کافی ہے تو دنیا کے سب فنون اس شخص کو حاصل ہو جاتے جو ان کتابوں کی زبان جانتا ہے، اب ہر شخص ضرور کہہ سکتا ہے کہ معمولی فنون اور ان کے سمجھنے کے لئے جب محض زبان دانی کافی نہیں، تعلیمِ استاد کی ضرورت ہے تو معنائیں قرآن پر علومِ اہلیہ سے لے کر طبیعیات، فلسفہ تک تمام گہرے دینِ علوم پر مشتمل پر وہ ممکن ضروری زبان جان لینے سے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں، اور اگر یہی ہوتا تو ہر شخص عربی زبان سیکھ لے وہ معارفِ قرآن کا ماہر سمجھا جائے تو آج بھی ہزاروں بہرہ بردار اور نفع رانی خوب مالک میں عربی زبان کے فہمے ماہر ہوں یہ وہ سب سے بڑے مفید قرآن مانے جاتے، اور چند رسالت میں اور قبولِ بولہ لب و قرآن کے ماہر سمجھے جاتے۔

فرض ہے کہ قرآن کریم نے ایک طرف تو رسول کے فرائض میں تلاوتِ آیات کو ایک

مستقل فرض قرار دیا، دوسری طرف تعلیمِ کتاب کو جدا گانہ فرض قرار دے کر بتلادیا کہ محض تلاوتِ آیات کا شایع لینا ہر شے قرآن کے عربی زبان جاننے والوں کے واسطے بھی کافی نہیں بلکہ تعلیمِ رسول ہی کے ذریعہ قرآن کی تعلیم کا صحیح طریقہ حاصل ہو سکتا ہے، قرآن کو تعلیماتِ رسول سے جدا کر کے خود سمجھنے کی فکر خود فرضی کے سوا کچھ نہیں، اگر معنائیں قرآن کو بتلانے بھائے کی ضرورت نہ ہو تو رسول کو پیسے ہی کی کوئی حاجت نہ تھی، اللہ کی کتاب بھی دوسری طرح بھی انسان اور ملک پر پڑھائی جاسکتی تھی، مگر اللہ تعالیٰ علمِ حکیم ہیں، وہ جانتے ہیں کہ معنائیں قرآن کی تعلیم و تعلیم کے لئے دینا کے دوسرے علوم و فنون سے زیادہ تعلیمِ استاد کی ضرورت ہے، اور یہاں پر ماہرِ استاد بھی کافی نہیں، بلکہ ان معنائیں کا استاد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جس کو حق تعالیٰ نے بذاتِ وحی شرفِ بھلائی حاصل ہو، جس کو اسلام کی اصطلاح میں نبی و رسول کہا جاتا ہے، اس لئے قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجنا کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ قرآن کریم کے معانی و احکام کی شرح کر کے بیان فرمائیں، ارشاد ہے: ﴿يُثَبِّتُ لِلنَّاسِ مَنَاسِكَ وَيُذَكِّرُهُمْ﴾ ۱۲۹: ۱۲۹ ﴿لِقَوْلِهِمْ﴾ آپ کو اس لئے بھیجا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطالب بیان فرمیں، تعلیمِ کتاب کے ساتھ آپ کے فرائض میں دوسری چیز تعلیمِ حکمت بھی دیکھی گئی ہے، اور میں نے اوپر بتلایا ہے کہ حکمت کے عربی زبان کے اعتبار سے اگرچہ کئی معنی ہو سکتے ہیں، لیکن اس آیت میں اور اس کے ہم معنی دوسری آیات میں عموماً دو معنائیں نے حکمت کی تفسیر منبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے جس سے واضح ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ میں قرآن کا سمجھا نا دینا بتلادیا فرض ہے، اسی طرح بغیر تفسیر کے اصول و آداب جن کا نام سنت و احکام کی تعلیم بھی آیت کے فرائض میں بھی داخل ہے اور اس لئے اس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ﴿لَا تُفَوِّضُ﴾ متنبہ میں تو مسلم بن ناکر بھیجا گیا ہوں، اور یہ ظاہر ہو کہ جب آپ کا مقصد وجودِ معلم ہوتا ہے، تو آپ کی امت کا مقصد وجودِ معلم اور طالب علم ہونا لازم ہو گیا، اس لئے ہر مسلمان مرد و عورت بوجہ شیعہ مسلمان ہونے کے ایک طالب علم ہونا چاہئے جس کو تعلیماتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گھن ہوا، اگر علمِ قرآن و سنت کی مکمل تحصیل اور اس میں مہارت کے لئے محنت و فرصت نہیں ہے تو کوئی کچھ بعد ضرورت علم حاصل کرنے کی فکر نہ کرے۔

﴿يُثَبِّتُ لِلنَّاسِ مَنَاسِكَ وَيُذَكِّرُهُمْ﴾ ۱۲۹: ۱۲۹ ﴿لِقَوْلِهِمْ﴾ اس آیت میں تفسیر میں تفسیر ہے، جس کے معنی ہیں، ظاہری و باطنی غیاسات سے پاک کرنا، ظاہری غیاسات سے تو عام مسلمان واقف ہیں، باطنی غیاسات کھنڈ اور حشر، ظہر اور احکام کی اور احکام و فاسد، غیر حیرت و حسد و بغض، حب و دنیا و غیرہ ہیں، اگرچہ علمِ طہر و قرآن و سنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آگیا ہے، لیکن تفسیر کو آپ کا

اور جنوب سے شمال تک ساری دنیا میں لگا کر، فصلی شریطہ علیٰ ارض و سماویہ اجماعیہ وسلم تسلیم کیا
سیزہ نبود من صلی و صام و قعد و صام۔

وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَى مِلَّةٍ أُخْرَىٰ فَلَهُ مِثْلُ مَا يَخْلُقُ
اور کوئی ہے جو چھوڑے ابراہیم کے مذہب سے مگر وہی نے اس میں اپنا چاہا کہ اور ایک
اصطَفَيْنَاهُ فِي الدِّينِ إِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۵۹﴾

ہم نے ان کو منتخب کیا دنیا میں اور وہ آخرت میں مسکون ہیں

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۶۰﴾ وَوَعَىٰ
یاد رکھو جب اس کو کہا اس کے رب کو کھجور داری کر تو بلا کر میں کھجور داری نہاں عالم کے پروردگار کا اور کسی
بِمَا أَمَرَ بِهِمْ رَبِّي وَرِثَ لَكُمْ نَجْوَاهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ
کریم ابراہیم اپنے جہوں کر اور یعقوب بھی کہلہ جڑ بیشک ایشہ بھی کر دیا ہے تم کو

الَّذِينَ فَلَا كَمُؤْمِنٌ إِلَّا وَاسْتَمْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۶۱﴾
وہ سو تم ہرگز عداوت مگر مسلمان۔

سَفِيفَةٌ ۚ مَعْرُومِينَ ۚ وَلِلَّهِ نَفْسُهُ عَنِ آيَةِ قَوْلِ الْغَنَاءِ
اور شہدہ بالغفل علی قول یعنی ان کو ذیہین اور مغفل بہ امانتوں صفہ متعذرا
نفسہ کشفہ بالضعف والکونہ ضعیف معنی ما یعدی ای صول و هو قول الزجاج، ترجمہ ابراہیم
اس پر مبنی واسطے سفیفہ نفسہ کے معنی پہلی توجہ کے اعتبار سے وہ بھی جو غافلہ تفسیر میں ملے گا پہلی بات یہ کہ
حق پر اور دوسری توجہ پر مبنی پہلی توجہ کے لقب ابراہیم سے اور دوسری توجہ پر مبنی کہ چاہتے نفس سے بھی
جائے جو ایمانی اس کو خود اپنی ذات کی بھی خبر نہ ہو کہ کیا ہوں۔

اور ملت ابراہیم سے توحیدی و دروادی کر کے گھبراہٹ ذات ہی سے امن ہوا
خلاصہ تفسیر اور دینی حسرت کے تاک کو کہ کر امن نہ کیا جائے جس کی یہ شان ہو کہ اس
کی بدلتا ہے ان اور ابراہیم علیہ السلام کو دہندہ رسالت کے لئے اور دنیا میں منتخب کیا اور
اس کی بدلتا وہ آخرت میں بڑے لائق و فاضل میں شکر کے جاتے ہیں دین کے لئے سب ہی
مجھ ہے اور یہ انتخاب مجدد رسالت کے لئے اس وقت ہوا تھا جب کائنات سے ان کے پروردگار
کے دہلور ابراہیم کے، فرما کر تم (حق تعالیٰ کی) اطاعت اختیار کیا کرو، انھوں نے عرض کیا کہ کون

اطاعت اختیار کرے رب العالمین کی رہیں اسی اطاعت کے تحت سبھا کرنے پر ہم نے ان کو شرف
نیزت دیدیا خواہ اس وقت ہو یا بعد چننے اور اسی ملت موضوع پر قائم رہنے کا حکم
کر گئے ہیں اور ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹوں کو اور داسی طرح یعقوب علیہ السلام بھی اپنے بیٹوں
کو جس کا یہ معنوں تھا کہ میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین اور اسلام و اطاعت حق کو تمہارے
لئے منتخب فرمایا ہے سو تم وہم و گم نہ کرو اس کو مت چھوڑو اور اگرچہ اسلام کے اور کسی حالت
پر جان مت دینا۔

معارف مسائل

سابقہ آیات میں ملت ابراہیمی کے بنیادی اصول اور ان کے اتباع کی تاکید اور ان کے اخلاق
کی ترغیب کی گئی ہے جس میں یہود و نصاریٰ کے اتباع کی ملت ابراہیمی کے ضلع و دھول کی تردید
اور صرف حسب اسلام کا لقب ابراہیمی کے مطابق ہونا اور دین اسلام کی حقیقت اور یہ کہ
وہ تمام انبیاء کا مشترک دین ہے، ذکر کیا گیا ہے۔

ذکورہ آیات میں انبیاء علیہم السلام کا پہلی اولاد کی دینی اور دنیائی تربیت کی طرف
خاص توجہ اور اہتمام کیا ہے، پہلی آیت میں ملت ابراہیمی کی فضیلت اور اس کی وجہ سے حضرت
ابراہیم علیہ السلام کا دنیا و آخرت میں شرف اور بزرگی بتلایا گیا کہ اس کی نسبت سے اخلاق کرنے کو
استقامت حاصل ہو گیا ہے، ارشاد ہے، وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَى مِلَّةٍ أُخْرَىٰ فَلَهُ مِثْلُ مَا يَخْلُقُ
یعنی ملت ابراہیمی سے ڈور مگر اپنی طرف دہی شخص کر سکتا ہے جس میں ذرا عقل نہ ہو کیونکہ یہ ملت
بین دین فطرت ہے، کوئی مسلم الفطرت انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا، آگے اس کی وجہ بیان
فرمائی کہ اس ملت کا شرف اور فضیلت اس سے ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہ نے اس کی نسبت کی
وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں عزت و بزرگی عطا فرمائی، اور آخرت میں بھی، دنیا کی
عزت و بزرگی کا لاشاہدہ نور ساری ذیلیہ کر لیا اور خود جیسا صاحب اقتدار بادشاہ اور اس کی
قوم اس کیلئے بزرگی کے غوث کھڑی ہوئی اور اپنے اقتدار کے سامنے عوامل ان کے خلاف تہلیل
کر لئے، آخر میں آگ کے ایک جڑے انبار میں ان کو ڈال دیا، مگر دنیا کے سامنے عا ملو دانی
طاقتیں جو قدرت والے کے تابع و فرمانبردار ہیں اس نے سامنے غرضی منصوبوں کو خاک میں
ملا دیا، آگ ہی کو اپنے خلیل کے لئے گلزار بنادیا، اور دنیا کی ساری قومیں ان کا لیا سامنے چھوڑ
چو گئیں، دنیا کے سامنے موسیٰ اور کار فرماں تک کہ بے پرست ہیں اس بے شک کی عزت
کر لئے چلے آئے، مشرق میں عرب بہر حال اولاد ابراہیم تھے، بے پرستی کے باوجود حضرت ابراہیم

لیکن یہ سب غلط فہمی یا جھوٹے دعوے تھے، حقیقت میں مسیح محمد ہی آخری و درمیں مسیح
ابراہیم اور دین فطرت کے مطابق تھے۔

خلاصہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ شاذ کی طرف سے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے
اور جتنی کتابیں اور شریعتیں نازل ہوئے ان سب کی روح اسلام یعنی اطاعت حق ہے جس کا
محل یہ ہے کہ نفسان خواہشات کے مقابل میں فرائض کی اطاعت اور اتباع نبوی کو چھوڑ کر
اتباع کسی کی پابندی۔

اوس سے کہ کج اسلام کا نام لینے والے لکھنؤ سلاقی بھی اس حقیقت سے بیگانہ ہو گئے
اور دین و مذہب کے نام پر بھی اپنی خواہشات کا اتباع کرنا پاتے ہیں، انھیں قرآن و حدیث
کی صرف وہ تفسیر و تفسیر رکھی معلوم ہوتی ہے جو ان کی خواہش کے مطابق ہو، ورنہ یہ کوشش ہوتی ہے
کہ جائز شریعت کو کھینچ تلی کر لیں اور اپنی افسوسناک خواہشات کے بتوں کا لباس بنا لیں
کہ دیکھنے میں دین و مذہب کا اتباع نظر آئے، اگرچہ وہ حقیقت میں خالص اتباع ہوئے اور خواہشات
کی پیروی کی ہے۔

سورۃ اذہجہ اول ہشتاں پیشانیم

چند پروغذ و محبت دین مسلمان ہنس

خائف انسان یہ نہیں جانتا کہ یہ پچھلے اور ناطق مخلوق کے سامنے تو جیل بکھی ہیں، مگر زبان
کے سامنے جس کا علم و ذہن کو محیط جہر جوں کے چھپے ہوئے ارادوں و سبیلوں کو دیکھتا اور جانتا
ہے اس کے آگے جو خالص اطاعت کے کوئی چیز کارگر نہیں ہے

کارا باطن آدمی جملہ راست

بانداز و پروغذ و محبت کے راست

حقیقی اسلام یہ ہے کہ اپنی اوجھڑا اور خواہشات سے باطل خالی الذہن ہو کر انسان
کواس کی تلاش ہو کہ حضرت جنہل شاذ کی دھانسی کا نام ہے، اور اس کا قرآن میرے لئے کیا ہے،
وہ ایک فرد یا فرد غلام کی طرح گوش برآزار ہے، کہ کس طوط چلنے کا اور کس کام کا حکم ہوتا ہے،
اور اس کام کو کس انداز سے کیا جائے، جس سے وہ مقبول ہو اور میرا لگ راضی ہو، اسی کا نام عبادت
بن گیا ہے۔

دردام حقیق و سوسہ اہتر میں ہے ست

ہمشدار و گوش را بہ پیام سروش دار

اسی جذبہ اطاعت و محبت کا کمال انسان کی ترقی کا تقویٰ مقام ہے، جس کو مقام قربیت

کہا جاتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام علیہ السلام کا خطاب پاتے
ہیں اور سید المرسلین خاتم الانبیاء علیہم السلام کو عینی کا خطاب ملتا ہے، اسی عہدیت اور
اطاعت کے ذریعہ رجات پرست کے اولیاء و اقطاب و ابدال کے درجہات و درجے ہوتے ہیں، اور کسی
حقیقی توحید ہے جس کے عمل ہونے پر انسان کے خوف و امید صرف ایک اللہ جل شانہ کے ساتھ
وابستہ ہو جاتے ہیں۔

امید و ہراسش نہا شد و رگس

ہمیں ست بنیاد و توحید و بس

غرض اسلام کے معنی اور حقیقت اطاعت حق ہے، اور اس کا راستہ صرف اتباع
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں منحصر ہے جس کو قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس طرح ارشاد فرمایا
فَلَا تَقُولُ لَمْ يَأْتِكُمْ مَوْثِقٌ
يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَادٍ يَدْعُوهُمْ
فَعَلُوا لَاحِقًا فِي الْيَوْمِ
وَالْآخِرِ
فَلَا تَقُولُ لَمْ يَأْتِكُمْ مَوْثِقٌ
يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَادٍ يَدْعُوهُمْ
فَعَلُوا لَاحِقًا فِي الْيَوْمِ
وَالْآخِرِ
فَلَا تَقُولُ لَمْ يَأْتِكُمْ مَوْثِقٌ
يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَادٍ يَدْعُوهُمْ
فَعَلُوا لَاحِقًا فِي الْيَوْمِ
وَالْآخِرِ

فَلَا تَقُولُ لَمْ يَأْتِكُمْ مَوْثِقٌ
يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَادٍ يَدْعُوهُمْ
فَعَلُوا لَاحِقًا فِي الْيَوْمِ
وَالْآخِرِ

وَلَا تَقُولُ لَمْ يَأْتِكُمْ مَوْثِقٌ
يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَادٍ يَدْعُوهُمْ
فَعَلُوا لَاحِقًا فِي الْيَوْمِ
وَالْآخِرِ

مسئلہ آیت مذکورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی،
اور ان سے عہد لیا، وہ یہ تھا کہ اسلام کے سوا اور کسی طاقت اور کسی مملکت پر مدعا، مراد اس کی ہے
ہو کہ اپنی زندگی میں اسلام اور اسلامی تعلیمات پر چٹکی سے عمل کرتے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارا
سب سے اسلام ہی پر فرمائے، جیسا کہ یسوع مسیح نے فرمایا تھا کہ میں جہنم کے پند
دہوں، اسی حالت پر تمہاری موت بھی ہوگی، اور اسی حالت میں عیش میں قائم ہو گئے، اللہ جل شانہ
کی عبادت میں ہے کہ جو بندہ نیکی کا قصد کرتا ہے، اور اس کے لئے اپنے حقوق کے مطابق کوشش
کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق دیتے ہیں، اور یہی کام اس کے لئے آسان کر دیتے ہیں۔

اس معاملہ میں اُس حدیث سے شبہ نہ کیا جائے جس میں یہ ارشاد ہے کہ بعض آدمی جنت کے
کام اور اہل جنت کے عمل پر پیش کرنا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس شخص اور جنت کے درمیان صرف ایک
پتھر کا فاصلہ رہ جاتا ہے، مگر جس کی تقدیر غالب آجاتی ہے، اور اپنی دوزخ کے سے کام کرنے لگتا
ہے، اور انعام کار دوزخ میں جاگتا ہے، اسی طرح بعض آدمی دوزخ کے کام میں مشغول رہتا ہے،
یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک پتھر کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر تقدیر غالب آتی
ہے اور آخر عمر میں اہل جنت کے کام کرنے لگتا ہے، اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے بعض الفاظ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ فیما بینہم ولا تناسس یعنی جس نے جو بھروسہ نہ کیا کہ وہ آخر میں دوزخ کے کام میں لگا اور حقیقت اس کے پہلے کام بھی دوزخ ہی کے عمل تھے، مگر لوگوں کے ظاہر میں اور دیکھنے میں وہ اہل جنت کے عمل معلوم ہوتے تھے، اسی طرح جو دوزخ کے اعمال میں مشغول رہا آخر میں جنت کے کام کرنے لگا، وہ حقیقت وہ اہل ہی سے جنت کے کام میں تھا، مگر ظاہر ظہور میں لوگ اس کو گناہگار سمجھتے تھے (ابن کثیر) خلاصہ یہ ہے کہ جو ایک کام میں مشغول ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور عادت کی بنا پر یہی امید رکھنا چاہیے کہ اس کا خاتمہ بھی اسی ہی پر ہوگا۔

أَمْ كُنْتُمْ شُرَكَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ

کیا تم موجود تھے جس وقت قریب آئی یعقوب کے موت جب کہا اپنے بیٹوں کو تم

مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا لَنَعْبُدَ إِلَهَكَ وَآلَهُ أَبَاكَ

کس کی عبادت کرو گے میرے بعد تو نے ہم بتا دی کہ تیرے رب کی اور تیرے باپ اور

إِبْرَاهِيمَ وَاسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهًا وَاحِدًا ۖ وَتَعْبُدُوهُ

کے رب کی جو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق ہیں، وہی ایک ہی ہے اور ہم سب اسی کے

مُسْلِمُونَ ۚ بَلَّغْ أَمْرًا قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كُنْتَ وَكَفَّ

فرمانہ داریں، وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی ان کے واسطے ہے جو انھوں نے کیا اور تم

مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ۚ وَلَا تَسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

واسطے جو تم نے کیا اور تم سے پہلے نہیں ان کے کاموں کی۔

خلاصہ تفسیر

کیا تم لوگ کسی معجزہ عجیب نفس سے مدد کی ضرورت نہ کرتے ہو یا تم خود اس وقت موجود تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا اور آپ انھوں نے اپنے بیٹوں سے رنجیدہ دعا بدھ کر لے، پھر چاکر تم لوگ میرے دمرنے کے بعد جس چیز کی پرستش کرو گے، انھوں نے دلائل قاطعہ، جواب دیا کہ ہم اس ذات (پاک) کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ، حضرت ابراہیم و اسماعیل و اسحاق علیہم السلام پر مشفق کرتے آئے ہیں، میں دیکھتا ہوں جو وعدہ و وعظ کر رہے ہیں، اور ہم (حکام میں) اسی کی اطاعت پر آمادہ ہیں، گے، یہ ان بزرگوں کی ایک جماعت تھی جو اپنے زیادتیوں کو

چکی، ان کے کام ان کا کیا ہوا کرتے تھا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا کرتے تھا، اور تم سے ان کے کے ہونے کی پوچھ بھی نہ ہوگی اور دلائل و ثبوت بھی ہونا چاہیے کہ تم کو قلعہ پہنچایا تو بڑی دوسری

معارف مسائل

سابقہ آیات میں ملت ابراہیم اور اسلام کی حقیقت کا بیان تھا، اب آیات مذکورہ میں ایک اور اصولی بات قابل نظر ہے کہ ملت ابراہیم کچھ ہے یا اسلام ہے پوری قوم بلکہ ساری دنیا کے لئے ہدایت نامہ ہے، پھر اس میں اولاد ابراہیم و یعقوب علیہم السلام کی کیا خصوصیت ہوگی کہ آیات مذکورہ میں ان کو خاص خطاب فرمایا گیا، اور اللہ تعالیٰ کے ان دونوں بزرگ و پیروں نے اپنی اولاد کو بطور وصیت خاص اس کی ہدایت فرمائی۔

اس سے ایک قویہ معلوم ہو کہ اولاد کی محبت اور ان کی بھلائی کی فکر مقام رسالت نہایت بلکہ مقام نبوت کے بھی متنازع نہیں، اللہ تعالیٰ کا وہ خلیل جو ایک وقت اپنے رب کا اشارہ پا کر اپنے چہیتے چنے کو زنج کرنے کے لئے کہہ سکتا نظر آتا ہے، وہی دوسرے وقت اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی سائنس اور بھلائی کے لئے اپنے رب کے دماغ میں بھی کرتا ہے، دنیا سے رخصت ہونے کے وقت اپنی اولاد کو وہ چیز دے کر جاتا ہے جو اس کی نفس میں سب سے بڑی نعمت ہو یعنی اسلام آیت مذکورہ دھڑکتے ہوئے آواز ہے کہ تَعْبُدُونَ لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا ۖ وَتَعْبُدُوهُ ۚ بَلَّغْ أَمْرًا قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كُنْتَ وَكَفَّ ۚ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

ہے، ان کے نزدیک اصل دولت ایمان اور عمل صالح یا اسلام ہے۔ جس طرح عام انسان اپنی موت کے وقت یہ چاہتا ہے کہ جو بڑی سے بڑی دولت ان کے پاس ہے وہ اولاد کو دے جائیں، ایک سرمایہ دار تاجر کی جگہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ میری اولادوں اور بیٹوں کی ایک ہزار، ان کو امپورٹ اور ایکسپورٹ کے بڑے بڑے فاسنس ملیں، لاکھوں اور کروڑوں کینیک بیلنس ہو، یا ایک سرسود والا انسان یہ چاہتا ہے کہ میری اولاد کو کچھ جسے اور بڑی خواہش ملے یا ایک صنعت پیشہ آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد اسکی صنعت میں کمال حاصل کرے، اس کو اس کے اپنی عمر بھر کے بڑے بڑے مسئلے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین اولاد کے سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ اصل اور داخلی احوال و دولت سمجھتے ہیں وہ ان کی اولاد کو پوری پوری مل جائے، ان کے لئے دماغ میں کرتے ہیں، اور درکشیشیں بھی آخر وقت میں وصیت اسی کی کرتے ہیں جیسا کہ

آیات مذکورہ سے واضح ہے۔

اور وہ کچھ کئی دولت دین و راحت و
سکھانے کے برابر نہیں

جس طرح ان کی دنیوی پرورش اور ان کے دنیوی آرام و راحت کا انتظام کرتے ہیں اس طرح
لگتا ہے کہ زیادہ ان پر لازم ہے کہ اولاد کی نظریں، عملی اور حقیقی تربیت کریں، بڑی اساتذین
اور بڑے اعمال و مشائخ سے ان کو بچانے میں سعی بلیغ کریں، کہ اولاد کی سچی محبت اور عملی تفریح
ہو، یہ کوئی عقل کی بات نہیں کہ ایک انسان اپنے بچہ کو دھوپ کی گرمی سے بچانے کے لئے
توساری توڑا فی خرچ کرے اور رانچی آگست اور ڈراپے بچانے کے لئے کوئی دھیان نہ دے، اس کے
ہاتھ سے جانیں بچانے میں تو سارے ذرائع اور وسائل ہمسال کرے، اور ہندوئی کی گولی کا نشانہ
بننے سے اس کو نہ بچائے۔

ایثار علیہم السلام کے اس طرز عمل سے ایک اصولی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ والدین کا
فرغن اور اولاد کا حق ہے کہ سب سے پہلے ان کی صلاح و فلاح کی فکر کی جائے ان کے بعد دوسروں
کی طرف توجہ کی جائے، جس میں دو نکٹیں ہیں :

اول یہ کہ بچہ اور بچہ کی تعلیم کی بنا پر وہ نصیحت کا اثر زیادہ جلد اور آسانی سے متجرب
کر سکیں گے، اور پھر وہ ان کی تحریک اور اصلاحی کوشش میں ان کے دست و بازو ہیں کہ اشاعت
حق میں ان کی معین ہوں گے۔

دوسرے اشاعت حق کا اس سے زیادہ سہل اور مفید راستہ کوئی نہیں کہ ہر گھر کا زوار

آوی اپنے اہل و عیال کو حق بات سکھانے اور اس پر عمل کرانے کی سعی میں دل و جان سے لگے شیخ

کے اس طرح تبلیغ و تعلیم اور اصلاح و تربیت کا دائرہ عمل سب سے صرف گھروں کے ذمہ داروں

تک آجاتا ہے، ان کو سکھانا پوری قوم کو سکھانے کے ہم معین ہو جاتا ہے، قرآن کہہ لے اس

تفصیلی اصول کے پیش نظر ارشاد فرمایا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ شُعْرًا
وَأَخْلِفُوا عَقْدَكُمْ كَمَا كُنْتُمْ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک
آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ شُعْرًا

وَأَخْلِفُوا عَقْدَكُمْ كَمَا كُنْتُمْ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ

يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ شُعْرًا

وَأَخْلِفُوا عَقْدَكُمْ كَمَا كُنْتُمْ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ

يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

آنے والی نسلوں کے لئے ہم سے آپ کو کہیں سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ :

وَأَلْبَنِيكُمْ عَلَيْهِ بِمَا نَزَّلْتُ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُفْقَهُونَ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مادی دنیا کے رسول ہیں، اور دین کی جاہلیت قیامت تک

جو چاہیں مل کر رہیں ہماری مغفرت تو ہمارے آباء و اجداد کے اعمال سے جو جانے کی اس طرح آجکل کے بعض سستی خاندان کے لوگ اس خیال میں رہتے ہیں کہ ہم اولاد رسول ہیں ہم جو چاہیں مل کر رہیں ہماری مغفرت ہی ہوگی۔

مشرکین کہیں نے اس مضمون کو بار بار مختلف عنوان سے بیان فرمایا ہے، اولاً قُلْ تِلْكَ اَنْفُسُ الْاِلٰهَيْنِهَا اَوْ تِلْكَ اَنْفُسُ ذَاوَدَ وَ اٰدَمَ الْاٰخَرٰی (۱۶، ۱۷) وغیرہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”میں بنی آدم، ایسا ہے جو کہ قیامت کے روز اور لوگ تو اپنے اپنے اعمال ماحول دیکھیں اور ہم اعلیٰ ماحول سے غفلت برقرار نہ رہت میرے نسب کا بھروسہ لیکر آؤ اور میں اس روز تم سے یہ کہوں کہ میں جنس اللہ کے غراب بن گیا ہوں۔“

اور دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

مَنْ تَكَلَّمَ بِدَمٍ عَشْرَةَ لَحَاقٍ مُسْتَرْغَبٌ
یہی شخص اس کے عمل نے بھی ۱۰۰ بار
پچھ لے گا۔

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَاهُوهُمْ اَوْ لَوْ نُنْصِيْهِمْ لَهَادُوا كُلَّ بَنٍ مِّلَّةٍ اٰتٰهُمْ

اور کہتے ہیں کہ جو ہمارے بیورو یا نصرانی تو حق ہمارے راہ راست کہہ دے کہ ہرگز نہیں بگڑے ہم نے انہیں

خِیْنًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ؕ قُلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اَنْزَلَ اِلَيْنَا

کہ راہ ہر ایک کی جو ایک ہی بات کا تھا اور تمہارے کہنا تو ایسی ہی، ہم نہ کہیں ایمان لائے اللہ پر اور احرام

وَمَا اَنْزَلَ اِلٰی اٰبِهٖمْ وَاشْتَعِلُوا شَئْبُلًا وَلَا سَبَاطًا وَمَا

اور جو آگزا، ابراہیم پر اور اسمعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور جو سلا

اٰتٰی مُوسٰی وَعِیْسٰی وَمَا اَوْفٰی السَّیِّئُوْنَ مِنْ تَعْلِيْمِهِ لَا تَخْرُجُ فِیْہِمْ

موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف ہم فرق نہیں کرتے

اَحَدٍ مِنْهُمْ ؕ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ ؕ

ای سب ہیں اسے ایک ہیں اور ہم اس کی طرف ہمارے فرما رہے ہیں

ہم ایک نفس جو مل کر رہے ہیں اس کی ذمہ داری اس پر ہے۔

خدا کسی کا جوہر قیامت کے روز کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا۔

”اور یہ بیورو نصرانی لوگ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ ہم لوگ بیورو یا نصرانی (وہ جو یہود نے کہا تھا) یا نصرانی جو ہمارے ذمہ لٹاؤ نے کہا تھا، ہم بھی ماہ

روح پر چڑھاؤ گے، (وہ جو صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (جو اب میں) کہہ دیجئے کہ ہم تو بیورو یا

نصرانی ہمیں دہوں گے، بلکہ ملت ابراہیم دینی اسلام پر رہیں گے، جس میں بھی کام نہیں،

اور ملت بیورویت و نصرانیت کے، جن میں ملادہ عورت ہونے کے اس کے مفلوج ہو چکے کے

سبب اب اس میں بھی آگئی، اور ابراہیم علیہ السلام مشرک بھی تھے، (مسلمانو: بیورو نصرانی

کے جواب میں جو تم نے اجمالاً کہا ہے کہ ملت ابراہیم پر رہیں گے، اس قسٹ کی تفصیل بیان کرنے

کے لئے کہہ دو کہ دس ملت پر رہنے کا حاصل یہ ہے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (دھم) پر

ہر کسی جو جانتا ہے اس پر واسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، بھیجا گیا اور اس (دھم) پر بھی جو

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسماعیل اور حضرت یعقوب علیہم السلام) اور اللہ تعالیٰ

اور میں جو میرے ہیں ان کی طرف (واسطہ دی کے) بھیجا گیا، اور اس (دھم) اور میرے، جو

حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام، کو دیا گیا، اور اس پر بھی جو کہ اور انبیاء علیہم

السلام) کو دیا گیا، ان کے پروردگار کی طرف سے (سرمہ ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان

ہی، اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (دوسرے سے ایمان

لائے میں، تعریف نہیں کرتے کہ کسی پر ایمان رکھیں کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے فضل

پہن (مضمون نے ہم کو یہ دینی بتلایا، ہم نے سخت پار کر لیا) ہمیں یہ حاصل ہے اس ملت کا جس پر

ہم فخر ہیں جس میں کسی کو صلاؤ نکھار دوسرے کی گفائش نہیں)۔

معارف مسائل

اولاد یعقوب علیہ السلام کو ذی کریم نے لفظ اساط سے تعبیر فرمایا ہے، یہ جیسے سب کے سب کے

من قبیلہ اور جماعت کے ہیں، ان کو سب کا کہنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے منقبض

بارہ تھے پھر ہر ایک کی اولاد ایک مستقل قبیلہ بن گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نسل میں یہ برکت دی کہ جب

حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس سفر گئے تو بارہ بھائی تھے، اور جب فرعون کے مقابلہ کے بعد موسیٰ

علیہ السلام کے ساتھ ان کی اولاد بنی اسرائیل نکلے تو ہر بھائی کی اولاد و ذریعوں افراد و پشتل قبیلے تھے،

اور دوسری برکت اولاد یعقوب علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی کہ دوش انبیاء کے عہدار

باقی سب انبیاء، رسول ان کی اولاد میں پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے علاوہ باقی انبیاء حضرت آدم

علیہ السلام کے بعد نوح، شیت، یونس، صالح، لوط، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، اسمعیل اور محمد صلی

صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

خلاصہ تفسیر

آیت (ان ہیہود و نصاریٰ سے) فرما رہے کہ کیا تم لوگ (اب بھی) ہم سے جنت ملنے جانے پر حق تعالیٰ کے معاملوں کو ہم کو قیامت میں نہ بخشیں گے، حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا (سب کا) رب اور مالک ہیں، اور یہیت میں تو تمہارے ساتھ کوئی شخصیت نہیں پیدا تھا جسے یقین و دعوت سے انحصار منہور ہوتا ہے، مثل ابن ابیہ (اللہ) اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ملے گا اور تم کو تمہارا کیا ہوا ملے گا؟ یہاں تک تو تمہارے نزدیک بھی مسلم ہے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم نے صحت حق تعالیٰ کو خوشنودی کے لئے اپنے (دین) کو شرک (فیوض) خاص کر رکھا ہے (مختلف تمہارے طریقہ موجود ہے کہ ملاہ صریح ہونے کے خود شرک سے بھی مخلوق ہے جیسا ان کے اقوال و عبارات اللہ و کتب میں اللہ سے ظاہر ہے، اور اس میں ہم کو اللہ تعالیٰ نے ترجیح دی ہے پھر ہم کو قیامت نہ ہونے کے کیا معنی) یا اب بھی اپنے حق پر ہونے کے ثابت کرنے کو کہیں، بلکہ جانتے ہو کہ اگر ہم اور تمہارا حق اور تعاقب اور اولو متعقب (دین) جو املا گیارہ سے ہیں یہ سب حضرات (ہو) اللہ تعالیٰ سے (اور اس سے) برا سزا و موافقت طریق اپنا حق پر ہونا ثابت کرتے ہو اس کے جواب میں اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک اتنی مختصر بات اس سے کہہ دیجئے کہ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا وہ واقعہ و طریق حق تعالیٰ اور ظاہر ہے کذا ہی زیادہ واقعہ ہے، اور وہ ان انبیاء کا ملت اسلام پر ہونا ثابت کر دیجئے ہیں، جیسا اہل ادیان کے گناہ اور جہالت ہیں یہ کافر بھی مگر جہالت ہے اس سوائے شخص سے زیادہ ظالم کوں ہوگا جو ایسی شہادت کا انکار کرے جو اس کے پاس کتاب اللہ پہنچی ہو اور اسے اہل کتاب اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ہوئے سے بھیجیں ہیں، ابھی جب یہ حضرت یسوع و نصاریٰ تھے، سو تمہارے طریق دین میں ان کے موافق کتب ہوئے پھر تمہارے طریق پر ہونا ثابت نہ ہوا، یہ ان بزرگوں کی، ایک جماعت بھی جو (اپنے زمانے میں) گذر گئی، ان کے کام ان کا کیا ہوا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا اور تم سے ان کے کئے ہوئے کے یہ بھی جو تو نہ ہو گئے (اور جب خالی مذکور ہیں نہ ہوگا تو اس سے تم کو کچھ فتنہ پہنچاؤ تو کتنا

معارف و مسائل

جن لوگوں کی حقیقت | وَتَخْرُجُ لَهُ مَخْلُصُونَ، اس میں اسے مسلک کی ایک خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ کے لئے نکلے گا، انھیں کے معنی حضرت مسیح پر جبروت سے بگڑے ہیں کہ انسان اپنے دین میں مخلص ہو کر اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ مقرر کرے، اور اپنے عمل کو انھیں کے لئے کرے، لوگوں کے دکھلانے یا ان کی مدح و شکر کی طرف نظر نہ ہو۔
بعض بزرگوں نے فرمایا کہ انھیں ایک ایسا عمل ہو جس کو تو فرشتے پہچان سکتے ہیں اور دشیطان وہ صرف بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک واسطہ ہے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاةُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَهُمْ

اب کیوں ہے بیوقوف لوگ کو کس چیز نے بھروسہ دیا مسلمانوں کو
عَنْ قَبْلِهِمْ اَلَيْكَ اَكْثَرُ اَعْيَادًا كُلَّ يَوْمٍ لِلَّهِ الْفَنَاءُ وَالْمَغْرِبُ

ان کے قبلے سے ہم پر وہ تھے تو کبر الہی کا ہے مشرق اور مغرب

يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ۔

خلاصہ تفسیر | جب کہ قبلہ نماز مقرب ہو کر ہوگا نماز ترک ہو گیا تو لوہہ ناگوار ہے (اب تو قبلہ سے رکعت المقدس تھا جس طرف چلے متوجہ ہو کر گئے تھے کس بات نے (دوسری سمت کی طرف، چل دیا اب جواب میں) افراد کچھ کسب و کسب (مستحق خواہ) مشرق (دیں اور خواہ) مغرب (دیں) اللہ ہی کے ملک ہیں (اللہ تعالیٰ کو مال کا داختار ہے جس سمت کو چاہیں مقرر فرما دیا کسی کو منصب عتد دریافت کرنے کا نہیں ہے، اور سیدھا طریق احکام شریعہ کے اب میں کسی اعتقاد ہے، لیکن بعضوں کو اس راہ کے اختیار کرنے کی توین نہیں ہوتی، خواہ خواہ ملتیں و قومیں نے پہلا کرتے ہیں البتہ) جس کو خدا ہی راہنے افضل سے (چاہیں) (یہ) سیدھا طریق بتا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں مخالفین کا اعتراض در بارہ تخریل قبلہ نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، اس اعتراض اور جواب سے پہلے قبلہ کی حقیقت اور اس کی تصریح بھی مٹیں بیجے، جس سے سوال وجواب کا جھنڈا آسان ہو جائے۔

قبلہ کے لغتی معنی ہیں سمت و توجہ، یعنی جس طرف رخ کیا جائے، یہ ظاہر ہے کہ مؤمن کا رخ ہر عبادت میں صرف ایک اللہ و وحدہ لا شریک کی طرف ہوتا ہے، اور اس کی ذات پاک مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی قیدوں اور سمتوں سے بالاتر ہے، وہ کسی خاص سمت میں نہیں، اس کا ارشاد میں خاص طور پر یہ ہوتا تھا کہ کوئی عبادت کرنے والے کسی خاص رخ کا پابند نہ ہوتا، جس کا اس کو ملتا تھا پابستنا نماز میں اپنا رخ اس طرف کر لیتا، اور ایک ہی آدمی کسی وقت ایک طرف اور کسی وقت کسی

خلاصہ تفسیر آیت (ان ہیورد نصاریٰ سے) فرما دیتے کہ کیا حق کو گناہ (دب بھی) ہم سے بہت کئے جانے جو حق تعالیٰ کے معاملوں کو ہم کو قیامت میں نہ بخشے گے،

مالک کو دہارا اور رضا (سب کا) رب اور مالک، اب اسور بیت میں جو تھا ہے ساتھ کوئی شخصیت نہیں پیدا تھا ہے یعنی دعوتوں سے انحصار منہم ہوتا ہے، مثل ابن ابی اسد اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ہے گا اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ہے گا یہاں تک جو تھا ہے نزدیک بھی مسلم ہے، اور دانشمندی کا شکر ہے کہ ہم نے صحت حق تعالیٰ کو خوشنودی کے لئے اپنے (دین) کو مشرک نہیں کیا، خاص کر گناہ ہے (کلمات) تھا ہے ملحقہ موجودہ کے کہ ملاہ صریح ہونے کے خود مشرک سے بھی مخلوق ہے جیسا ان کے اقوال و عبارات میں اللہ و روح ابن اللہ سے ظاہر ہے، اور اس میں ہم کو اللہ تعالیٰ نے ترجیح دی ہے ہم کو قیامت نہ ہونے کے کیا معنی؟ یا رب میں اپنے حق پر ہونے کے ثابت کرنے کو بھی، کہہ جاتے ہو کہ اگر ہم اسور اور جلیل اور احسان اور یعقوب اور اولو مغرب (دین) جو املا گیا ہو ہے ہیں یہ سب حضرات) ہو اور تھاری تھے، اور اس سے بڑا سزا مواقت طریق اپنا حق پر ہونا ثابت کرتے ہو اس کے جواب میں اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک اتنی مختصر بات ہے، کہہ دیجئے کہ اچھا ہے بتاؤ کہ تم بڑا دورہ واقعہ و واقعہ تعالیٰ اور ظاہر ہے کذا کی زیادہ واقعہ ہے، اور وہ ان انبیاء کا ملت اسلام پر ہونا ثابت کر کے ہیں، جیسا میں اور دیگر لوگ ہیں اور جہلتے ہیں یہ کافر بھی مگر جہلتے ہیں سو اپنے شخص سے زیادہ ظالم کن ہو گا جو ایسی شہادت کاٹنا کرے جو اس کے پاس کوئی خاص اللہ بھی ہو اور اسے اپنی کتاب اللہ تعالیٰ تھامے گئے ہوتے سے بچر نہیں ہیں، اب میں جب یہ حضرت یسوع اور نصاریٰ تھے، سو ستر طریق دین میں ان کے موافق تب ہوئے، پھر خدا تعالیٰ پر ہونا ثابت نہ ہوا، یہ ان بزرگوں کی، ایک جماعت جو حق پر اپنے زمانے میں، گذر گئی، ان کے کام ان کا کیا ہوا اور آؤں گا اور تھامے کام تھا اور کیا ہوا اور آؤں گا، اور تم سے ان کے کئے ہوئے کے کہ میں جو تو نہ ہوئی (اور جب خالی ذکر بھی نہ ہو گا تو اس سے تم کو کچھ فتنہ پہنچاؤں گا)

معارف و مسائل

جنس و کیفیت | وَتَخْرُجُ لَكَ مَخْلُصُونَ، اس میں اسب مسلک کی ایک خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ کے لئے نکلے، انھوں نے صفت حضرت مسیح پر جوڑنے سے بگڑتے ہیں کہ انسان اپنے دین میں نکلے ہو کہ اللہ کے سوا کسی کو مشرک نہ مقرر تھے، اور اپنے عمل کو خاص اللہ کے لئے کرنا، لوگوں کے دکھلانے یا ان کی مدح و شکر کی طرف نظر نہ ہو۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ انھوں نے ایک ایسا عمل بھی کرنا کہ تو فرشتے پہچان سکتے ہیں اور دشیطان وہ صرف بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک واسطہ ہے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَهُمْ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو دیا مسلمانوں کو

عَنْ قَبْلِهِمْ اَلَيْكَ كَانُوا عِبَادًا كُلٌّ لِّرَبِّهِ النَّشْرُ وَالْمَغْرِبُ

ان کے قبل سے ہم پر وہ تھے تو کہ اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب

يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ۔

خلاصہ تفسیر | جب کہ قبلہ نماز مقرب ہو کہ ہر دو کا ملازم تک ہو گیا تو لوہہ ناگوار ہے (اب تو قبلہ سے رکعت المقدس تھا، جس طرح پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کسی بات نے (دوسری سمت کی طرف، چل دیا) جواب میں) افراد کچھ کسب و کسب (مستحق خواہ) مشرق (دیں) اور (خواہ) مغرب (دیں) اللہ ہی کے ملک ہیں (خدا تعالیٰ کو مال کا داختار ہے جس سمت کو چاہیں مقرر فرما دیا)

کسی کو منصب عتد دریافت کرنے کا نہیں ہے، اور سیدھا طریق احکام مشرعی کے اب میں کسی اعتقاد ہے، لیکن بعضوں کو اس راہ کے اختیار کرنے کی توین نہیں ہوتی، خواہ خواہ ملتیں و ملتوں نے پہلا کرتے ہیں البتہ، ان کو خدا تعالیٰ اپنے فضل سے (چاہا) ہیں (یہ) سیدھا طریق بتا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں مخالفین کا اعتراض در بارہ تخریل قبلہ نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، اس اعتراض اور جواب سے پہلے قبلہ کی حقیقت اور اس کی تصریح بھی سن لیجئے، جس سے سوال و جواب کا جھنڈا آسان ہو جائے۔

قبلہ کے لغتی معنی ہیں سمت و توجہ، یعنی جس طرف رخ کیا جائے، یہ ظاہر ہے کہ مؤمن کا رخ ہر عبادت میں صرف ایک اللہ و خدا کے لئے مشرک لڑکی طرف ہوتا ہے، اور اس کی ذات پاک مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی قیدوں اور ستروں سے بالاتر ہے، وہ کسی خاص سمت میں نہیں، اس کا ارشاد میں خاص طور پر یہ ہونا تھا کہ کوئی عبادت کرنے والے کو اس کا رخ کا پابند نہ ہوتا، جس کا میں نے پہلے بیان کیا تھا، اس طرف رخ کرنا، اور ایک ہی آدمی کو کئی وقت ایک طرف اور کئی وقت کئی

طرف رخ کرتا تو وہ بھی بے جا نہ ہوتا۔

لیکن ایک دوسری محبت الہیہ اس کی مقتضی ہوئی کہ تمام عبادت گزاروں کا رخ ایک ہی طرف ہونا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ عبادت کی مختلف قسمیں ہیں، بعض انفرادی ہیں، بعض اجتماعی، ذکر اللہ اور روزہ وغیرہ انفرادی عبادات ہیں جن کو خلوت میں اور انفرادی کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے، اور نماز اور حج اجتماعی عبادات ہیں جن کو جماعت و اجتماع و اعلان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، ان میں عبادت کے ساتھ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے آداب کا بتلانا اور سکھانا بھی پیش نظر ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اجتماعی نظام کا سب سے بڑا بنیادی اصول افراد کثرت کی وحدت اور یک جہتی ہے، یہ وحدت عینی زیادہ قوی سے قوی ہوگی اتنا ہی اجتماعی نظام مستحکم اور مضبوط ہوگا، انفرادیت اور تشتت اجتماعی نظام کے لئے سبب قائل ہے، پھر نقطہ وحدت متعین کرنے میں ہر متمدن ہر زمانہ کے لوگوں کی مختلف راہیں رہی ہیں، کسی قوم نے نسل اور نسب کو نقطہ وحدت قرار دیا، کسی نے وطن اور جبرائیلی خصوصیات کو، کسی نے رنگ اور زبان کو۔

لیکن دین الہی اور شرائع انبیاء علیہم السلام نے ان غیر اختیاری چیزوں کو نقطہ وحدت بنانے کے قابل نہیں سمجھا، اور نہ درحقیقت یہ چیزیں ایسی ہیں جو پورے افراد انسانی کو کسی ایک مرکز پر جمع کر سکیں، بلکہ جتنا غور کیا جائے یہ وحدتیں درحقیقت افراد انسانی کو بہت سی کثرتوں میں تقسیم کر ڈالنے اور آپس میں ٹکراؤ اور اختلافات کے اسباب ہیں۔

دین اسلام نے جو درحقیقت تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے وحدت کا اصل نقطہ فکر و خیال اور عقیدہ کی وحدت کو متعارف دیا، اور کروڑوں خداؤں کی پرستش میں بٹی ہوئی دنیا کو ایک ذات حق وحدۃ لا شریک لہ کی عبادت اور اطاعت کی دعوت دی جس پر مشرق و مغرب اور ماضی و مستقبل کے تمام افراد انسانی جمع ہو سکتے ہیں، پھر اس حقیقی فکری اور فطری وحدت کو عملی صورت اور قوت دینے کے لئے کچھ ظاہری وحدتیں بھی ساتھ لگائی گئیں، مگر ان ظاہری وحدتوں میں بھی اصول یہ رکھا گیا کہ وہ عملی اور اختیاری ہوں، تاکہ تمام افراد انسانی ان کو اختیار کر کے ایک رشتہ اخوت میں منسلک ہو سکیں، نسب، وطن، زبان، رنگ وغیرہ اختیاری چیزیں نہیں ہیں جو شخص ایک خاندان کے اندر پیدا ہو چکا ہے وہ کسی طرح دوسرے خاندان میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو پاکستان میں پیدا ہو چکا وہ بھارت یا افغانستان میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو کالا ہے وہ اپنے اختیار سے گورا، اور جو گورا ہے وہ اپنے اختیار سے کالا نہیں ہو سکتا۔

اب اگر ان چیزوں کو مرکز وحدت بنایا جائے تو انسانیت کا سیکڑوں بلکہ ہزاروں ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم ہو جانا ناگزیر ہوگا، اس لئے دین اسلام نے ان چیزوں کو جن سے تمدنی

مفاہد وابستہ ہیں ان کا پورا احترام رکھتے ہوئے ان کو وحدت انسانی کا مرکز نہیں بننے دیا، کہ یہ وحدتیں افراد انسانی کو مختلف کثرتوں میں بانٹنے والی ہیں، ان اختیاری امور میں اس کی پوری رعایت کی کہ فکری وحدت کے ساتھ عمل اور صورتی وحدت بھی قائم ہو جائے، مگر اس میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ مرکز وحدت ایسی چیزیں بنائی جائیں جن کا اختیار کرنا ہر مرد و عورت لکھے پڑھے اور ان پڑھے شہری اور دیہاتی امیر و غریب کو یکساں طور پر آسان ہو، یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے تمام دنیا کے لوگوں کو لباس اور مسکن کھانے اور پینے کے کسی ایک طریقہ کا پابند نہیں کیا، کہ ہر جگہ کے موسم اور طبائع مختلف اور ان کی ضروریات مختلف ہیں، سب کو ایک ہی طرح کے لباس یا شعار یا یونیفارم کا پابند کر دیا جائے تو بہت سی مشکلات پیش آئیں گی، پھر اگر یہ یونیفارم کم سے کم تجویز کر دیا جائے، تو یہ اعتدال انسانی پر ظلم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے عمدہ لباس اور عمدہ کپڑوں کی بے حرمتی ہوگی، اور اگر اس سے ناگزیر کسی لباس کا پابند کیا جائے تو غریب مفلس لوگوں کو مشکلات پیش آئیں گی۔

اس لئے شریعت اسلام نے مسلمانوں کا کوئی ایک شعار یا یونیفارم مقرر نہیں کیا، بلکہ مختلف قوموں میں جو طریقے اور ادوار لباس کی رائج تھیں ان سب پر نظر کر کے ان میں سے جو صورتیں اسراف، بجا یا نفرد وغیرہ یا کسی غیر مسلم قوم کی نقالی پر مبنی تھیں، صرف ان کو ممنوع قرار دے کر باقی چیزوں میں ہر فرد اور ہر قوم کو آزاد اور خود مختار رکھا، مرکز وحدت ایسی چیزوں کو بنایا گیا جو اختیاری بھی ہوں اور آسان اور سستی بھی، ان چیزوں میں جیسے جماعت نماز کی صف بندی، ایک امام کی فعل و حرکت کی محمل پابندی، حج میں لباس اور مسکن کا اشتراک وغیرہ ہیں۔

اسی طرح ایک اہم چیز سمت قبلہ کی وحدت بھی ہے، کہ اگرچہ اللہ جل شانہ کی ذات پاک ہر سمت و جہت سے بالاتر ہے، اس کے لئے مشن جہت یکساں ہیں، لیکن نماز میں اجتماعی صورت اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تمام دنیا کے انسانوں کا رخ کسی ایک ہی جہت و سمت کی طرف ہونا ایک بہترین اور آسان اور بے قیمت وحدت کا ذریعہ ہے، جس پر سارے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے انسان آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں، اب وہ ایک سمت و جہت کو لے کر جس کی طرف ساری دنیا کا رخ پھیرا جائے، اس کا فیصلہ اگر انسانوں پر چھوڑا جائے تو یہی ایک سب سے بڑی بنا، اختلاف و نزاع بن جاتی ہے، اس لئے ضرور تھا کہ اس کا تعین خود حضرت حق جل و علا شانہ کی طرف سے ہوتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارا گیا، تو فرشتوں کے ذریعہ بیت اللہ کعبہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی، حضرت آدم اور اولاد آدم علیہ السلام کا سب سے پہلا قبلہ یہی بیت اللہ اور خانہ کعبہ بنایا گیا

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي

بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّ هُوَ الَّذِي تَلْعَلْنَ

سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مکہ

جو کہ میں ہی برکت والا، ہدایت والا جہاں اولیٰ

نوح علیہ السلام تک سب کا قبلہ یہی بیت اللہ تھا، طوفانِ نوح علیہ السلام کے وقت پوری دنیا غرق ہو کر تباہ ہو گئی، بیت اللہ کی عمارت بھی منہدم ہو گئی اور ان کے بعد حضرت خلیل اللہ اور ابراہیم علیہما السلام نے دوبارہ بحکمِ خداوندی بیت اللہ کی تعمیر کی، اور یہی ان کا اور ان کی امت کا قبلہ رہا، اس کے بعد انبیاء بنی اسرائیل کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا اور بقول ابوالعالیہ انبیاء سابقین جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی عمل ایسا کرتے تھے کہ محض بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی۔ (ذکرہ القزلبی)

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نماز فرض کی گئی تو بقول بعض علماء ابتداءً آپ کا قبلہ آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خانہ کعبہ ہی قرار دیا گیا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کرنے کے بعد اور بعض روایات کے اعتبار سے ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائیے، صبح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ سترہ میں بیت المقدس کی طرف نماز ادا کرنا مسجد نبویؐ میں آج تک اس کی علامات موجود ہیں، جہاں کھڑے ہو کر آپ نے بیت المقدس کی طرف نماز ادا فرمائی تھیں۔ (قرطب)

حکیم خداوندی کی تعمیل کے لئے توسیۃ الرسل، سزا پاۓ اطاعت تھے، اور حکیم خداوندی کے مطابق نمازیں بیت المقدس کی طرف ادا فرما رہے تھے، لیکن آپ کی طبعی رغبت اور دلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا قبلہ پھر وہی آدم علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ قرار دیدیا جائے، اور چونکہ عادتہ اللہ یہی ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کی مراد اور خواہش و رغبت کو پورا فرماتے ہیں۔

تو چنان خواہی خدا خواہد چنیں

می دهد یزدان مرا در متفتین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ امید تھی کہ آپ کی تمنا پوری کی جائے گی، اور اس لئے انتظارِ وحی میں آپ بار بار آسمان کی طرف نظروں اٹھا کر دیکھتے تھے، اسی کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے :

مَنْ شَرَى قَلْبًا وَجْهَكَ فِي
السَّمَاءِ فَلَنَوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا
قَوْلٍ وَجْهَكَ سَطَرَ الْمُسْجِدِ
الْحَرَامِ (١٣٢: ١٣)

”تم دیکھ رہی ہیں آپ کا بارگاہِ آسمان کی طرف
 نظر اٹھانا، سو ہم آپ کا قبلہ ہی بدل دیں گے
 جو آپ کو پسند ہے اس لئے آئندہ آپ نمازیں
 اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف کیا کریں“

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کا اظہار مفسر ماکر اس کو پورا کرنے کا حکم دے رہا گیا ہے، کہ آئندہ آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں۔

نماز میں خاص بیت اللہ کا استقبال ضروری نہیں
اس کی سمت کا استقبال بھی بیرونی دنیا کیلئے کافی ہے

میں ہاں ایک فقہی نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں
کعبہ یا بیت اللہ کے بجائے لفظ مسجد حرام کا استعمال
فرمایا گیا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ بلادِ عیدہ کے رہنے والوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عین بیت اللہ
کی محاذات پائی جائے، بلکہ سمتِ بیت اللہ کی طرف رُخ کر لینا کافی ہے، ہاں جو شخص مسجد حرام
میں موجود ہے یا کسی قسری پہاڑ پر بیت اللہ کو دیکھ رہا ہے، اس کے لئے خاص بیت اللہ ہی کی
طرف رخ کرنا ضروری ہے، اگر بیت اللہ کی کوئی چیز بھی اُس کے چہرے کے محاذات میں نہ آئی
تو اس کی نماز نہیں ہوتی، بخلاف ان لوگوں کے جن کے سامنے بیت اللہ نہیں کہ ان کے واسطے سمت
بیت اللہ یا سمتِ مسجد حرام کی طرف رُخ کر لینا کافی ہے۔

بہر حال ہجرت مدینہ سے سولہ سترہ مہینے بعد پھر آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کو بنایا گیا اس پر جہود اور بعض مشرکین و منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ ان کے دن کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں، ان کا قبلہ بھی روز بروز بدلتا رہتا ہے۔

قرآن کریم نے ان کا یہ اعتراض آیت مذکورہ میں نقل فرمایا، مگر ساتھ ہی عنوان یہ رکھا کہ یقیناً لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، اور ان کی بیوقوفی اس جواب سے واضح ہوگئی جو اس کے بعد ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے: **قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْمُشْرِكُونَ وَالْمُغْرِبُ بِأَيِّدِي مَوْتَ يَسْأَلُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ** یعنی آپ فرمادیجئے کہ مشرکوں کے ہیں مشرق اور مغرب وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلائے گا۔

اس میں استقبال قبلہ کی حقیقت کو واضح فرمادیا کہ کعبہ اور بیت المقدس کی کوئی خصوصیت بجز اس کے نہیں کہ حکم ربانی نے ان کو کوئی امتیاز دے کر قبلہ بنا دیا، وہ اگر چاہیں تو ان دونوں کے علاوہ کسی تیسری چیز کو بھی قبلہ بنا سکتے ہیں، پھر جب کو قبلہ بنا دیا گیا اس کی طرف رخ کرنے میں جو کچھ فضیلت اور ثواب ہو اس کی روح حکم جل شانہ کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں، جو انی کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا بنیادی اصول ہے، اور اسی لئے دوسری آیت میں اور زیادہ واضح فرمایا کہ :

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ
قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ
لَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ

(البقرة: ١٧٧)

اس میں ذاتی کوئی نیکی اور ثواب نہیں کہ تم مشرق کی طرف رخ کرو یا مغرب کی طرف، لیکن نیکی اللہ پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت کرنے میں ہے۔

اور ایک آیت میں فرمایا:

فَاتَّبِعُوا مَا تَوَكَّلُوا فَتَحْمَدُ
اللَّهُ (۱۱۵:۱۲)

تین تم اللہ کے فرمان کے مطابق جس طرف
بھی رخ کرو اللہ تعالیٰ کی توجہ اسی طرف ہونے لگی۔

ان آیات نے قبلہ اور استقبال قبلہ کی حقیقت کو بھی واضح فرمادیا کہ اس میں ان مقامات کی کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان میں فضیلت پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان کو حق تعالیٰ نے قبلہ بنانے کے لئے خستیار فرمایا، اور اس کی طرف رخ کرنے میں ثواب کی وجہ بھی صرف یہی ہے کہ حکم ربانی کی اطاعت ہے، اور شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قبلہ میں تغیر و تبدل منظرانے کی یہ بھی حکمت ہو کہ عملی طور سے لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ قبلہ کوئی بت نہیں جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اصل چیز حکم خداوندی ہے وہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا آگیا تو اس کی تعمیل کی، پھر جب کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم مل گیا تو اس کی طرف رخ کرنا عبادت ہو گیا، اس کے بعد والی آیت میں خود قرآن کریم نے بھی اس حکمت کی طرف اشارہ کیا جس میں فرمایا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ مَلِكًا
إِلَّا لِنُعَلِّمَ مَنْ يَشَاءُ الرِّسُولَ
مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ (۱۲۳:۱۲)

تین جن قبلہ پر آپ پہلے رہ چکے ہیں اس کو
قبلہ بنانا تو محض اس بات کو ظاہر کرنے کے
لئے تھا کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
اتباع کرتا اور کون پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

اس حقیقت قبلہ کے بیان سے ان بیوقوف مخالفین کا بھی پورا جواب ہو گیا جو قبلہ کے بارے میں تغیر و تحول کو اصول اسلام کے منافی سمجھتے اور مسلمانوں کو طعن دیتے تھے، آخر میں ارشاد فرمایا:

يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ اس میں بتلادیا ہے کہ سیدھی راہ یہی ہے کہ انسان حکم حق جل شانہ کے لئے کربستہ منتظر رہے، جو حکم مل جائے اس پر بے چون و چرا عمل کرے اور یہ سیدھی راہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل کتاب کو مسلمانوں کے ساتھ سبکے بڑا احسن دین چیسزوں پر ہے، ایک یہ کہ ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لئے مخصوص کرنے کا حکم ساری امتوں کو ملا تھا، یہود نے شیجر کا دن مقرر کر لیا، اور نصاریٰ نے اتوار کا، اور حقیقت میں عند اللہ وہ جمعہ کا روز تھا، جو مسلمانوں کے انتخاب میں آیا، دوسرے وہ قبلہ جو تحول کے بعد مسلمانوں کے لئے مقرر کیا گیا، اور کسی امت کو اس کی توفیق نہیں ہوئی، تیسرے امام کے پیچھے آئیں کہنا کہ یہ تینوں خصلتیں صرف مسلمانوں

کو مبستر ہوئیں اہل کتاب ان سے عروم ہیں۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول

الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدٌ ا ط

تم پر گواہی دینے والا۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے متبعان محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے جو درہر پہلو سے (ہدایت اعتدال پر ہے) تاکہ دنیا میں شرف و امتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا شرف ظاہر ہو کہ تم ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے، اور فریق ثانی ان کی مخالف قویں ہوں گی ان مخالف لوگوں کے مقابلہ میں گواہ (تجویز) ہو اور (شرف بالائے شرف یہ ہوا کہ تمہارے قابل شہادت اور مبستر ہونے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں) اور اس شہادت سے تمہاری شہادت معتبر ہونے کی تصدیق ہو، پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمہ کا حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو اور مخالفین مجرم قرار پا کر سزا یاب ہوں، اور اس امر کا اعلیٰ درجہ کی عزت ہونا ظاہر ہے۔

معارف مسائل

امت محمدیہ کا خاص اعتدال [لفظ وسط یعنی اوسط ہو، اور خیر الامور اور افضل الاشیاء کو وسط کہا جاتا ہے، تردی میں بردایت ابو سعید خدریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ وسط کی تفسیر عدل سے کی گئی ہے، جو بہترین کے معنی میں آیا ہے (قرطبی) اس آیت میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ایک امتیازی فضیلت و خصوصیت کا ذکر ہے، کہ وہ ایک معتدل امت بنائی گئی، اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے مسلمانوں کو وہ قبلہ عطا کیا جو سب سے اشراف و افضل ہو، اسی طرح ہم نے امت اسلامیہ کو ایک خاص امتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ اس کو ایک معتدل امت بنایا ہے، جس کے نتیجہ میں ان کو میدان جہش میں یہ امتیاز حاصل ہو گا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی امتیں جب اپنے انبیاء کی ہدایت و تبلیغ سے منکر جائیں گی، اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی، نہ کسی نبی نے ہمیں کوئی ہدایت کی، اُس وقت امت محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش

ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائیں، اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی متعدد و بھرپوری کوشش کی، مدعی علیہم امتیں امت محمدیہ کی گواہی پر جرح کریں گی کہ اس امت محمدیہ کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا، اس کو ہمارے معاملہ کی کیا خبر، اس کی گواہی ہمارے مقابلہ میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

امت محمدیہ اس جرح کا یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہ تھے، مگر ان کے واقعات و حالات کی خبر ہمیں ایک صادق مصدق رسول نے اور اللہ کی کتاب نے دی ہے، جس پر ہم ایمان لائے اور ان کی خبر کو اپنے معائنہ سے زیادہ و قیح اور سچا جانتے ہیں، اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں، اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہوں گے، اور ان گواہوں کا ترکیب و توثیق کریں گے کہ بیشک انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری تعلیم کے ذریعہ ان کو یہ صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی، اور مسند احمد کی متعدد احادیث میں مجملًا اور مفصلًا مذکور ہے۔

الغرض آیت مذکورہ میں امت محمدیہ کی اعلیٰ فضیلت و شرف کا راز یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ امت معتدل امت بنائی گئی ہے، اس لئے یہاں چند باتیں قابل غور ہیں۔

اعتدال امت کی حقیقت، اہمیت (۱) اعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہیں، (۲) وصع اعتدال کی یہ اہمیت اور اس کی کچھ تفصیل کیوں ہے کہ اس پر مدار فضیلت رکھا گیا (۳) اس امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معتدل ہونے کا واقعات کی روش سے کیا ثبوت ہو، ترتیب لہر ان تینوں سوالوں کا جواب یہ ہے۔
۱۔ اعتدال کے لفظی معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ عدل سے مشتق ہے، اس کے معنی بھی برابر کرنے کے ہیں۔

۲۔ وصع اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف و فضیلت کا معیار قرار دیا گیا، ذرا تفصیل طلب ہے، اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے، دنیا کے جتنے تھے اور پڑانے طریقے جسمانی صحت و علاج کے لئے جاری ہیں، طبی یونانی، ویدک، ایلوپیتھک، ہومیو پیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدن انسانی کی صحت اعتدالی مزاج سے ہے، اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہو رہی بدن انسانی کا مرض ہے، خصوصاً طبی یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہو، انسان کا بدن چار خلط خون، بلغم، سودا، صفراء سے مرکب اور انہی چاروں جنسالات سے پیدا شدہ چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں، گرمی، ٹھنڈک، خشکی اور ترری، جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاج انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں وہ بدن انسانی کی صحت تندرستی

کہلاتی ہے، اور جہاں ان میں سے کوئی کیفیت مزاج انسانی کی حد سے زیادہ ہو جائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے، اور اگر اس کی اصلاح و علاج نہ کیا جائے، تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہو جاتا ہے اس محسوس مثال کے بعد اب روحانیت اور اخلاقیات کی طرف آئیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے، اور اس مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ روحانی موت ہے، اور یہ بھی کسی صاحب بصیرت انسان پر محقق نہیں کہ جو ہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے، وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء و اخلاط یا ان کی کیفیات حرارت و برودت نہیں، کیونکہ ان اجزاء و کیفیات میں تو دنیا کے سارے جانور بھی انسانیت کے ساتھ شریک بلکہ انسانیت سے زیادہ حصہ رکھتے والے ہیں۔

جو ہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آفتے کائنات مانا گیا ہے، وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت و برودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے، جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے، دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں، اور اس کا معین کر لینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں، کہ وہ انسان کا روحانی اور اخلاقی کمال ہے، جس نے اس کو محنت و کم کائنات بنایا ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے۔

آدمیت لحم وشم و پوست نیست

آدمیت جسز رضاء و دست نیست

اور اس وجہ سے وہ انسان جو ہر شرافت و فضیلت کی بے قدری کر کے اس کو ضائع کرتے ہیں ان کے لئے میں فرمایا ہے۔

ایستکہ می بینی جنسلا ب آدم اند

نیستند آدم جنسلا ب آدم اند

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ انسان کا جو ہر شرافت اور مدار فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کمالات ہیں، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بدن انسانی کی طرح روح انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے، اور جس طرح بدن انسانی کی صحت، اس کے مزاج اور اخلاط کا اعتدال ہے، اسی طرح روح کی صحت بھی اور اس کے جنسلا ب کا اعتدال ہے، اس لئے انسان کامل کہلائے گا جس میں صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو، یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے، اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا، اس لئے انسانی کامل کے اولین مصداق

آپ ہی ہیں، اور جس طرح جسمانی علاج معالجہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ ہر پستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک حکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے، اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں جنسالاتی اعتدال پیدا کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجی گئیں اور بہت ضرورت مادی طاقتیں بھی عطا کی گئیں، جن کے ذریعہ وہ یہ قانون اعتدال دنیا میں نافذ کر سکیں، اسی معنیوں کو قرآن کریم نے سورۃ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

فَعَلَّيْنَا سُلَاطَنَا بِالنَّبِيِّينَ وَ
أَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا
الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ
لِلنَّاسِ (۲۵: ۵۷)

”یعنی ہم نے پیغمبروں پر اپنے رسول نشانیاں
دے کر اور انہیں ان کے ساتھ کتاب اور
ترازہ تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو سکیں
اور ہم نے انکار لوہا اس میں سخت لڑائی، ہراؤ
لوگوں کے کام چلتے ہیں۔“

اس میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں جنسالاتی اور عملی اعتدال پیدا کریں، کتاب، اخلاق، اور روحانی اعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی، اور ترازو معاملات دین میں علی اعتدال پیدا کرنے کے لئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترازو سے مراد ہر شے کی شریعت ہو، جس کے ذریعہ اعتدال حقیقی معلوم ہوتا ہے، اور عدل و انصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی اصل غرض و حکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور عملی اعتدال پر قائم کیا جائے، اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

امت محمدیہ میں قوم کا اعتدال اس بیان آپ نے یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ امت محمدیہ علی صلابۃ والصلوۃ کی جو فضیلت آیت مذکورہ میں بتلائی گئی، وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا یعنی ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے، یہ بولنے اور لکھنے میں تو ایک لفظ ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہو سکتے ہیں ان سب کے لئے حاوی اور جامع ہے۔

اس میں امت محمدیہ کو امت وسط یعنی معتدل امت فرمایا کہ یہ بتلادیا کہ انسان کا جو صبر شرافت و فضیلت ان میں بدرجہ کمال موجود ہے، اور جس غرض کیلئے یہ آسمان و زمین کا سارا نظام ہوا اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ امت اس میں ساری امتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔

قرآن کریم نے اس امت کے متعلق اس خاص وصف فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورۃ اعراف کے آخر میں امت محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا:-

وَمِمَّنْ جَعَلْنَا أُمَّةً يَتَّبِعُونَ
بِالْحَقِّ وَيَبْهِتُونَ ذُرِّيَّتَهُ
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّمَن
عَلِمَ (۱۸۱: ۷)

”یعنی ان لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہو،
ایک ایسی امت ہے جو سچے راہ بتلاتے ہیں اور
اس کے موافق انصاف کرتے ہیں۔“

اس میں امت محمدیہ کے اعتدال روحانی و اخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع و اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں، جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورۃ آل عمران میں امت محمدیہ کے اسی اعتدال مزاج اور اعتدال روحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

مُحَمَّدٌ مَّغْلُوبٌ أَمَّا بِخِزْيَانِ
النَّاسِ فَأَمْرُهُمْ بِالْغَيْرِ وَذِي
مُنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَهُمْ
يُؤْتُونَ (۱۱۰: ۳)

”یعنی سب امتوں میں بہتر ہو جو عالم میں
بھی گمنام ہو، محکم کرتے ہو اپنے کاموں کا اور
منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور اللہ پرست
لاتے ہو۔“

یعنی جس طرح ان کو رسول سب رسولوں میں افضل نصیب ہونے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا ہمت مند مزاج اور اعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا کہ وہ سب امتوں میں بہتر امت قرار پائی، اس پر علوم و معارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، ایمان و عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں ان کی فتر بانیوں سے سرسبز شاداب ہوں گی، وہ کسی مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوں گی، بلکہ اس کا دائرہ عمل سارے عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہو گا، گویا اس کا وجود ہی اس لئے ہو گا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انہیں جنت کے دروازوں پر لاکھڑا کر دے، اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں اس کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ امت دوسروں کی خیر خواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرض منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، بُرے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ النَّبِيَّ يَجِدُوا فِيهِ حَقَّ مَطْلَبِ دِينِ اس کا نام ہے، کہ سب طلباءوں کی خیر خواہی کرے، پھر بُرے کاموں میں کفر و شرک

بدعات، رسوم قبیحہ، فسق و فجور اور ہر قسم کی بد اخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، اُن سے روکنا بھی کئی طرح ہوگا، کبھی زبان سے کبھی ہاتھ سے، کبھی قلم سے، کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا چارہ اس میں داخل ہوگا۔ یہ صفت جس قدر عموماً و اہتمام سے امت محمدیہ میں پائی گئی پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۳۔ اب دوسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس امت کے توسط و اعتدال کا واقعہ سے ثبوت کیا ہے، اس کی تفصیل طویل اور تمام امتوں کے اعتقادات، اعمال و اخلاق اور کارناموں کا موازنہ کر کے بتلانے پر موقوف ہے، اس میں سے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

اعتقادی اعتدال: سب سے پہلے اعتقادی اور نظری اعتدال کو لے لیجئے، تو پہلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسولوں کو اس کا بیٹا بنا لیا، اور ان کی عبادت اور پرستش کرنے لگے، وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ (۳۰، ۹۱)، اور دوسری طرف انہی قوموں کے دوسرے افراد کا یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسول کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برکتوں کے باوجود جب اُن کا رسول ان کو کسی جنگ و جدوجہد کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں خَاذِبٌ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلْ إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (۲۴: ۵۵) یعنی جاسیے آپ اور آپ کا پروردگار وہی مخالفین سے قتال کریں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی ایذا میں پہنچاتے ہیں۔

خلافت امت محمدیہ کے وہ ہر ترن ہر زمانے میں ایک طرف تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عشق و محبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان و مال اور اولاد و آبرو سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

سلام اُس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں

بڑھاتے ہیں ٹکڑا سر فرشتوں کے قتل میں

اور دوسری طرف یہ اعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو با ایں ہمہ کمالات و فضائل عبد اللہ و رسولہ مانتے اور کہتے ہیں، وہ آپ کے مدائح و مناقب میں بھی یہ بیان رکھتے ہیں، جو قصیدہ برترہ میں فرمایا ہے

ذِي مَا لَا عَشَّةَ النَّصْلَانِي فِي نَيْتِهِمْ وَاحْتِكُمُ بِمَا شِئْتُمْ مِنْ عَائِلَةِ احْتِكُمُ

یعنی اس کلمہ کفر کو تو چھوڑ دو جو نصاریٰ نے اپنے نبی کے مانے میں کہہ دیا، کہ وہ معاذ اللہ خود

خدا یا خدا کے بیٹے ہیں، اس کے سوا آپ کی مدح و ثناء میں جو کچھ کہو وہ سب حق و صحیح ہے۔

جس کا خلاصہ کسی نے ایک مصرع میں اس طرح بیان کر دیا ہے

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عمل اور عبادت میں اعتدال: اعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے، اس میں ملاحظہ فرمائیے پہلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنی شریعت کے احکام کو چند ٹکڑوں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے، رشتہ میں نیکر آسانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے، یا غلط فتوے دیئے جاتے ہیں اور طرح طرح کے جیلے پہانے کر کے شرعی احکام کو بدلا جاتا ہے، عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے اور دوسری طرف عبادت خانوں میں آپ کو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنہوں نے ترک دنیا کر کے رہبانیت اختیار کر لی، وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھتے اور سختیلا جیلے ہی کو عبادت و ثواب سمجھتے ہیں۔

امت محمدیہ نے اس کے خلاف ایک طرف رہبانیت کو انسانیت پر ظلم قرار دیا، اور دوسری طرف احکام خدا و رسول پر مرٹنے کا جذبہ پیدا کیا، اور قیصر و کسری کے تخت و تاج کے مالک بن کر دنیا کو یہ دکھلا دیا کہ دیانت و سیاست میں یا دین و دنیا میں برتری نہیں، مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا بلکہ اس کی بھکاری بازاروں اور دفنوں پر بھی ہے، اور وزارتوں اور امارتوں پر بھی، اس نے بادشاہی میں فیکری اور فیکری میں بادشاہی سکھائی۔

چو فقر اندر لباس شاہی آمد

ز تدبیر عبید اللہ آمد

معاشرتی اور تمدنی اعتدال: اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، تو پہلی امتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اعتدالی دیکھیں گے کہ انسانی حقوق کی کوئی پرواہ نہیں، حق ناحق کی کوئی بحث نہیں، اپنی اغراض کے خلاف جس کو دیکھا اس کو کھل ڈالنا، قتل کر دینا، لوٹ لینا سب بڑا کمال ہے، ایک زمین کی چراگاہ میں کسی دوسرے کا اونٹ ٹھس گیا، اور وہاں کچھ نقصان کر دیا تو عرب کی مشہور جنگ حرب بنو سہل تلوہس جاری ہوئی ہزاروں انسانوں کا خون ہوا، عورتوں کو انسانی حقوق دینا تو کجا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کہیں بچپن ہی میں ان کو زندہ درگور کر دینے کی رسم تھی، کہیں مردہ شوہروں کے ساتھ شتی کر کے جلا ڈالنے کا رواج تھا، اس کے بالمقابل دوسری طرف یہ سفیانہ رحم دلی کہ کیرے نکوڑوں کی ہتھیا کو حرام سمجھیں، جانوروں کے ذبیحہ کو حرام قرار دیں، خدا کھال کئے ہوئے جانوروں کے گوشت و پوست سے نفع اٹھانے کو ظلم سمجھیں، امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے ان سب بے اعتدالیوں کا خاتمہ کیا، ایک طرف انسان کو انسان کے حقوق بتلائے، اور نہ صرف صلح و دوستی کے وقت بلکہ عین میدان جنگ میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت سکھائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے، اور دوسری طرف ہر چیز کی حد مقرر فرمائی، جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دیا، اور اپنے حقوق کے

معاشرہ میں درگزر اور عفو و چشم پوشی کا سبق سکھایا، دوسروں کے حقوق کا پورا اہتمام کرنے کے آداب سکھلائے۔

اقتصادی اور مالی اعتدال: اس کے بعد دنیا کی ہر قوم و ملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اقتصادیات کا ہے، اس میں بھی دوسری قوموں اور امتوں میں طرح طرح کی بے اعتدالی نظر آئیں گی، ایک طرف نظام سرمایہ داری ہے جس میں حلال و حرام کی قیود سے اور دوسرے لوگوں کی خوش حالی یا بد حالی سے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لینا سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے، تو دوسری طرف شخصی اور انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے جرم قرار دیا جاتا ہے، اور غور کرنے سے دونوں اقتصادی نظاموں کا حاصل مال و دولت کی پرستش اور اس کو مقصد زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔

امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں بھی اعتدال کی عجیب و غریب صورت پیدا کی، کہ ایک طرف تو دولت کو مقصد زندگی بنانے سے منع فرمایا، اور انسانی عزت و شرافت یا کسی منصب و عہد کا مدار اس پر نہیں رکھا، اور دوسری طرف تقسیم دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے جن سے کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ لے، قابل اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقف عام رکھا، مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کا مکمل احترام کیا، حلال مال کی فضیلت اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلائے، اس کی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقبل بیان کو چاہتی ہے، اس وقت بطور مثال چند نمونے اعتدال اور بے اعتدالی کے پیش کرنے تھے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے جس سے آیت مذکورہ کا مضمون واضح ہو گیا، کہ امت محمدیہ ایک معتدل اور بہترین امت بنایا گیا ہے۔

شہادت کے لئے عدل **إِنَّكُمْ كُنْتُمْ أُمَّةً عَلَى النَّاسِ**، یعنی امت محمدیہ کو وسط اور عدل و ثقہ نفع ہونا شرط ہے اس لئے بنایا گیا کہ یہ شہادت دینے کے قابل ہو جائیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عدل نہیں وہ قابل شہادت نہیں، عدل کا ترجمہ ثقہ یعنی قابل اعتماد کیا جاتا ہے، اس کی پوری شرائط کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

اجماع کا حجت ہونا: قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اجماع امت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے کیونکہ جب اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء و شرا و دے کر دوسری امتوں کے بالمقابل انکی بات کو حجت بنادیا، تو ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہی، اور عمل اس پر واجب ہے، اس طرح کہ صحابہ کا اجماع تابعین پر اور تابعین کا اجماع تبع تابعین پر حجت ہے۔

اور تفسیر منطبری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس امت کے جو افعال و اعمال متفق علیہ ہیں وہ سب محمود و مقبول ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ یہ امت وسط اور عدل ہے۔

اور امام جصاص نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے، اجماع کا حجت ہونا صرف قرن اول یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کیونکہ آیت میں پوری امت کو خطاب ہے، اور امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف وہ نہ تھے جو اس زمانے میں موجود تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی امت ہیں تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہو گئے، جن کا قول حجت ہے، وہ سب کسی خطا اور غلط پرستی نہیں ہو سکتے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعِ

اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے قبۃ کے جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع

الرَّسُولِ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى

رسول کا اور کون پھر جگہ سے الٹے پاؤں اور بے شک یہ بات بھاری ہوتی عمر ان پر

الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ أَيْمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ

جن کو راہ دکھائی اللہ نے اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا ایمان بیشک اللہ

بِالنَّاسِ لَرَّءَوْفٌ شَرِّ حَلِيمٌ

لوگوں پر بہت شفیق نہایت مہربان ہے

خلاصہ تفسیر اور اصل میں تو شریعت محمدیہ کے لئے ہم نے کعبہ ہی قبلہ تجویز کر رکھا تھا (اور جب سمت قبلہ پر آپ (چند روز قائم) رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض

اس مصلحت کے لئے تھا کہ ہم کو ظاہری طور پر بھی معلوم ہو جاوے کہ اس کے مقرر ہونے سے یا بدلنے سے یہود اور غیر یہود میں سے کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کر ہٹتا جاتا ہے اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے اس امتحان کے لئے اس عارضی قبلہ کو مقرر کیا تھا، پھر اصلی قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا، اور یہ قبلہ کا بدلنا (منحرف لوگوں پر)

ہوا بڑا ثقیل رہا، مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے وسیع طریق کی ہدایت فرمائی ہے جس کا بیان اوپر آچکا ہے کہ احکام الہیہ کو بے چون و چرا قبول کر لینا ان کو کچھ بھی گراں نہیں ہوا، جیسا پہلے اس کو خدا کا حکم سمجھتے تھے اب اس کو سمجھنے لگے اور وہم نے جو کہا ہے کہ بیت المقدس قبلہ غیر اصلی تھا، اس سے کوئی شخص یہ دوسرے نہ لائے بس تو جتنی نمازیں ادھر پڑھی ہیں ان میں ثواب بھی کم ملا ہوگا، کیونکہ اصلی قبلہ کی طرف نہ تھیں، سو اس دوسرے کو دل میں نہ لانا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان رکے متعلق اعمال مثلاً نماز کے ثواب کو منافع اور ناقص کر دیں (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو دلیچے لوگوں پر بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں تو ایسے شفیق مہربان پر یہ گمان کب ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی قبلہ کا اصلی یا غیر اصلی ہونا تو ہم ہی جانتے ہیں، تم نے تو دونوں کو ہمارا حکم سمجھ کر قبول کیا، اس لئے ثواب بھی کسی کا کم نہ ہوگا۔

معارف و مسائل

کعبہ کے قبلہ نماز ہونے کی اس میں صحابہ و تابعین کا اختلاف ہو، کہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں ابتدا رکب ہوئی جب نماز فرض ہوئی اس وقت قبلہ بیت اللہ تھا، یا بیت المقدس حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ اول ہی سے قبلہ بیت المقدس تھا، جو ہجرت کے بعد بھی سولہ ستروہینہ تک باقی رہا، اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے احکام نازل ہو گئے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مکہ مکرمہ میں یہ رہا، کہ آپؐ حجرا سو اور رکن بیانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے، تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی استقبال ہو جائے، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا، اس لئے تحویل قبلہ کا اشتیاق پیدا ہوا (ابن کثیر)

اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہوئی مکہ مکرمہ میں تو مسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا، کیونکہ حضرت ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی رہا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، بیت اللہ ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر ہجرت کے بعد آپؐ کا قبلہ بیت المقدس قرار دیدیا گیا، اور مدینہ منورہ میں سولہ ستروہینہ آپؐ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، اس کے بعد پھر آپؐ کا جو پہلا قبلہ تھا یعنی بیت اللہ اس کی طرف نماز میں توجہ کرنے کا حکم آگیا، تفسیر ترمذی میں بحوالہ ابو عمر واسی کو اصح القولین قرار دیا ہے، اور حکمت اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد چونکہ قبائل یہود سے سابقہ پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لئے انہی کا قبلہ باذن خداوندی اختیار کر لیا، مگر پھر تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اپنی ہیست دیکھ

سے باز آنے والے نہیں تو پھر آپؐ کو اپنے اصل قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم مل گیا، جو آپؐ کو اپنے آباء ابراہیم و اسمعیل کا قبلہ ہونے کی وجہ سے طبعاً محبوب تھا۔ اور قرطبی نے ابو العالیہ ریاحی سے نقل کیا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کا قبلہ بھی بیت اللہ کی طرف تھا، اور پھر ابو العالیہ نے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک یہودی سے مناظرہ ہو گیا، یہودی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ صحفہ بیت المقدس تھا، ابو العالیہ نے کہا کہ نہیں، موسیٰ علیہ السلام صحفہ بیت المقدس کے پاس نماز پڑھتے تھے مگر آپؐ کا رخ بیت اللہ ہی کی طرف ہوتا تھا، یہودی نے انکار کیا تو ابو العالیہ نے کہا کہ اچھا میرے تمہارے جھگڑے کا فیصلہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کر دے گی، جو بیت المقدس کے نیچے ایک پہاڑ پر ہے، دیکھا گیا تو اس کا قبلہ بیت اللہ کی طرف تھا۔

اور جن حضرات نے پہلا قول اختیار کیا ہے ان کے نزدیک حکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں تو مشرکین سے ہستیاں اور ان سے مخالفت کا اظہار کرنا تھا، اس لئے ان کا قبلہ چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا، پھر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود و نصاریٰ سے ہستیاں اور ان کی مخالفت کا اظہار ضرور ہوا تو ان کا قبلہ بدل کر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا، اسی اختلاف اقوال کی بناء پر آیت مذکورہ کی تفسیر میں بھی اختلاف ہو گیا، کہ الْقِبْلَةُ الَّتِي كُنْتُمْ عَلَيْهِ تَحْتَمِلُ سَعَاءَ مَا رَدَّ، قول اول کی بناء پر اس سے مراد بیت المقدس ہے، جو آپؐ کا قبلہ اولیٰ تھا، اور قول ثانی کی بناء پر اس سے مراد کعبہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہی آپؐ کا پہلا قبلہ تھا۔

اور مفہوم آیت کا دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ ہم نے تحویل قبلہ کو آپؐ کا اتباع کرنے والے مسلمانوں کے لئے ایک امتحان قرار دیا ہے، تاکہ ظاہر طور پر بھی معلوم ہو جائے کہ کون آپؐ کا صحیح فرمانبردار ہے اور کون اپنی رائے کے پیچھے چلتا ہے، چنانچہ تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد بعض ضعیف الایمان یا وہ جن کے دلوں میں کچھ نفاق تھا اسلام سے پھر گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا کہ یہ تو اپنی قوم کے دین کی طرف پھر گئے۔

بعض احکام متعلقہ

کئی سنت کو قرآن کے ذریعہ جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ تشران کریم میں کہیں اس کی تصریح بھی منسوخ کیا جاتا ہے نہیں ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل اور ہجرت یا بعد ہجرت بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ اس کا ثبوت صرف احادیث اور سنت نبویہ ہی سے ہے، تو جو چیز سنت کے ذریعہ ثابت ہوئی تھی اس آیت قرآن نے اس کو منسوخ کر کے

آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنادیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حدیث رسول بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی ہے، اور یہ کہ کچھ احکام وہ بھی ہیں جو شتران میں مذکور نہیں، صرف حدیث سے ثابت ہیں، اور قرآن ان کی شرعی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ اسی آیت کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو نمازیں باہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں وہ بھی معتبر اور مقبول عند اللہ ہیں۔

خبر واحد جبکہ شتران قویہ اس کے ثبوت پر موجود، بخاری و مسلم اور تمام معتبر کتب حدیث میں متعدد صحابہ کرامؓ ہوں اس سے شترانی حکم منسوخ سمجھا جاسکتا ہے کی روایت سے منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا، اور آپؐ نے عصر کی نماز جانب بیت اللہ پڑھی، اور بعض روایات میں اس جگہ عصر کے بجائے ظہر مذکور ہے (ابن کثیر) تو بعض صحابہ کرامؓ یہاں سے نماز پڑھ کر باہر گئے، اور دیکھا کہ قبیلہ بنی سہلہ کے لوگ اپنی مسجد میں حسب سابق بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں تو انھوں نے آواز دے کر کہا کہ اب قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو گیا ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بجانب بیت اللہ نماز پڑھ کر آئے ہیں، ان لوگوں نے درمیان نماز ہی اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا، تو یہ سنت مسلم کی روایت میں ہے کہ اس وقت عمرؓ میں جو پھل صفوں میں تھیں آگے آگئیں اور مرد و جوانی صفوں میں تھے پیچھے آگئے، اور جب رخ بیت اللہ کی طرف بدلا گیا تو مرد و عورتیں صفیں آگے اور عورتوں کی پیچھے ہو گئیں (ابن کثیر)

بنو سہلہ کے لوگوں نے تو ظہر یا عصر ہی سے تحویل قبلہ کے حکم پر عمل کر لیا، مگر قبائے میں یہ خبر اگلے دن صبح کی نماز میں پہنچی، جیسا کہ بخاری و مسلم میں ہر ایت ابن عمرؓ مذکور ہے، اہل قبائے نے بھی نماز ہی کے اندر اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا (ابن کثیر و جصاص)

امام جصاصؒ نے یہ متعدد روایات حدیث نقل کر کے فرمایا:

هذه اخبار صحيحة مستفيض في إيدى	یعنی یہ حدیث اگرچہ اصل سے خبر واحد ہے
أهل العلم قد تلقوا بالقبول فصل	مگر قرآن قویہ کی وجہ سے اس نے درجہ تواتر کا
في حيز التواتر الموجب للعلم	حاصل کر لیا ہے، جو علم یقین کا موجب ہوتا ہے

مگر حنفیہ اور ان کے متفق فقہاء جن کا ضابطہ یہ ہے کہ خبر واحد سے کوئی قطعی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا ان پر یہ سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ اس حدیث کی شہرت اور تلقی بالقبول تو بعد میں ہوئی، بنو سہلہ اور اہل قبائے کو تو اچانک ایک ہی آدمی نے خبر دی تھی، اس وقت اس حدیث کو درجہ شہرت تو اترا حاصل نہیں تھا، انھوں نے اس پر کیا عمل کر لیا، جصاصؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات اور سب صحابہ کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رغبت یہ ہے کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنادیا

اور آپ اس کے لئے دعا بھی کر رہے ہیں، اس رغبت و دعا کی وجہ سے ان حضرات کی نظر میں بیت المقدس کا حکم آئندہ باقی نہ رہنے کا احتمال ضرور پیدا ہو گیا تھا، اس احتمال کی وجہ سے بقاء قبلہ بیت المقدس غلط ہو گیا تھا، اس کے منسوخ کرنے کے لئے یہ خبر واحد کا کافی ہو گئی، ورنہ محض خبر واحد سے کوئی شترانی قطعی فیصلہ منسوخ ہو جانا معقول نہیں۔

آلہ بحر الصوت کی آواز پر نمازیں | صحیح بخاری باب ما جاء في القبلة میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں نقل و حرکت مفسد نماز نہ ہو پائے لال | جو قبائے میں تحویل قبلہ کا حکم پہنچے اور ان لوگوں کے بحالت نماز بیت اللہ کی طرف پھر جانے کا واقعہ ذکر کیا، اس پر علامہ عینی حنفی نے تحریر فرمایا ہے:-

فيه جواز لتعليم من ليس في	یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص
الصلوة من هو فيها	نماز میں شریک نہیں وہ کسی نماز پڑھنے والے
(عدة القاری، ص ۱۳۸ ج ۳)	کو تعلیم و تلقین کر سکتا ہے

نیز علامہ عینی نے دوسری جگہ اس حدیث کے ذیل میں یہ الفاظ لکھے ہیں، وفيه استماع المتعلمي للعلم من ليس في الصلوة فلا يصح حصوله (الی) حکم الاستنباط الطحاوی (عدة القاری، ص ۱۳۲ ج ۳)

اور عام فقہاء حنفیہ نے جو حاج صلوٰۃ کسی شخص کی اقتداء اور اتباع کو مفسد نماز کہا ہے جو عام متون و شروح حنفیہ میں منقول ہے، اس کا منشاء یہ ہے کہ نماز میں غیر اللہ کے امر کا اتباع موجب فساد نماز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اتباع امر الہی کا کرے مگر اس اتباع میں کوئی دوسرا شخص واسطہ بن جائے وہ موجب فساد نہیں۔

فقہاء نے جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کوئی شخص جماعت میں شریک ہونے کے لئے ایسے وقت پہنچے کہ اگلی صف پوری ہو چکی ہے، اب پچھلی صف میں تنہا رہ جائے تو اس کو چاہئے کہ اگلی صف میں کسی آدمی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لے، اس میں بھی یہی سوال آتا ہے کہ اس کے کہنے سے جو پیچھے آجائے گارہ نماز میں اتباع امر غیر اللہ کا کرے گا، اس لئے اس کی نماز فاسد ہو جانی چاہئے، لیکن درمختار باب الامامة میں اس مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا تم نقل تصحیح عدم الفساد فی مثلہ من جند من الصف فتأخروا من خلفه فليحرس، اس پر علامہ طحاویؒ نے تحریر فرمایا: لا تغفروا مثل مثل أمرو اللہ، یعنی اس صورت میں نماز فاسد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اس شخص نے آنیوالے کے حکم کا اتباع نہیں کیا، بلکہ امر الہی کا اتباع کیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو پہنچا ہے، کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو اگلی صف والے کو پیچھے آجانا چاہئے۔

اسی طرح شربلانیؒ نے شرح وہبانیہ میں اس مسئلہ کا ذکر کر کے پہلے فساد نماز کا قول نقل کیا

پھر اس کی تردید کی اس کے الفاظ یہ ہیں: اِذَا قِيْلَ يٰصَلِّ تَقَدَّمَ فَتَقَدَّمَ رَالِي (فصدت صلواتہ لانہ امتثل امر غیر اللہ فی الصلوٰۃ لان امتثالہ انما هو لا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) فلا یضراہ

ان تمام آیات ثابت ہوا کہ اگر کوئی نمازی ایسے شخص کی آواز پر عمل کرے جو اس کی پیش نمازی میں شرکت نہیں تو اس کی وضو میں ایک یہ کہ خود اس شخص کی ولایت اور اتباع مقصود ہو یہ تو مفسد نماز ہے، لیکن اگر اس نے کوئی حکم شرعی بتلایا اور اس کا اتباع نمازی نے کر لیا تو وہ درحقیقت امر الہی کا اتباع ہے، اس لئے مفسد نماز نہیں ہوگا، اسی لئے طحاوی نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ اقول لوقیل بالتفصیل بین کونہ امتثل امر الشارع فلا یضد بین کونہ امتثل امر الداخل مراعاتہ لخالطہ من غیر نظر لامر الشارع فتفسد لکان حشا طحاوی علی الدہ ص ۲۳۶ ج ۱

اب مسئلہ زیر بحث یعنی آلہ بحکم الصوت کا فیصلہ کر لینا آسان ہو گیا، کیونکہ وہاں اس آلے کے اتباع کا دور دور بھی وہم نہیں ہو سکتا، ظاہر ہے کہ اتباع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا ہوتا ہے کہ جب امام رکوع کرے تو رکوع کر دے، جب سجدہ کرے تو سجدہ بھی سجدہ کر دے، اس آلہ سے ضرر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اب امام رکوع میں گیا، یا سجدہ میں جا رہا ہے، اس علم کے بعد اتباع امام کا کرتا کر نہ کہ اس آلے کے حکم کا، اور اتباع امام ایک حکم الہی ہے، اور یہ کلام اس بنیاد پر ہے کہ آلہ کبر الصوت کی آواز کو عین امام کی آواز نہ مانی جاتے بلکہ اس کی نقل و حکایت قرار دیا جاتے، اور اہل فن اس کی آواز کو عین آواز امام کہتے ہیں، ان کی تحقیق پر تو کوئی اشکال جواز صلوٰۃ میں نہیں ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر احقر کا ایک مستقل مسئلہ رسالہ بھی شائع شدہ ہے اس کو دیکھ لیا جائے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ اٰیٰمَاتِكُمْ ۖ يٰۤاٰمَنُوْنَ یہاں اگر ایمان سے مراد اس کے معروف معنی لئے جائیں تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ تخیل قبلہ پر جو بعض بیوقوف لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دین سے مخرب ہو گئے اور ان کا ایمان ہی ضائع ہو گیا، اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں، بے وقوف لوگوں کے کہنے پر کان نہ دھریں۔

اور بعض روایات حدیث اور اقوال سلف میں اس جگہ ایمان کی تفسیر نماز سے کی گئی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جو نمازی سابق قبلہ بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ضائع کرنے والا نہیں، وہ تو صحیح و مقبول ہو چکیں، تخیل قبلہ کے حکم کا پھیل نمازوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ صحیح بخاری میں بروایت ابن عازبؓ، اور ترمذی میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت المقدس کو بنا دیا گیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ جو مسلمان اس عرصہ میں انتقال کر گئے جب کہ نماز بیت المقدس کی طرف ہو کر کرتی تھی، اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنا

ان کو نصیب نہیں ہوا ان کا کیا حال ہوگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں نماز کو ایمان کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ ان کی نمازیں سب صحیح و مقبول ہو چکی ہیں، ان کے معاملہ میں تخیل قبلہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰہَا ۚ

جسک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھتا ہے منہ کا آسمان کی طرف، سو اللہ بہیریں گے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف چاہیں گے

قَوْلٍ وَجْهِكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا

اب پھر منہ اپنا طرف مسجد الحرام کے اور جس جگہ تم ہو کر دو پھر منہ اسی کی

وُجُوْهُكُمْ شَطْرَ ۚ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اٰوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ

طرف، اور جن کو لی ہے کتاب اللہ جانتے ہیں کہ ہیں

الْحَقُّ مِنْ رَبِّہُمْ ۚ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۳﴾

ٹھیک بران کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر آپ جو دل سے کعبہ کے قبلہ ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، اور امید دہی میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھتے ہیں کہ شاید فرشتہ حکم لے آوے ہو،

آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھتا ہے دیکھ رہے ہیں اور چونکہ ہیں آپ کی خوش پورا کرنا منظور ہو اس لئے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو اس قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے، جو آپ کو پسند ہو (لو پھر ہم حکم ہی دیتے ہیں کہ، اب اپنا چہرہ نماز میں مسجد حرام کی طرف کیا کیجئے اور یہ حکم صرف آپ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ سب لوگ پیغمبر بھی اور امتی بھی) جہاں کہیں موجود ہو (خواہ دینہ منورہ میں یا اور جگہ، یہاں تک کہ خود بیت المقدس میں بھی) اپنے چہرہ کو اس (مسجد حرام) کی طرف کیا کر دے اور اس قبلہ کے معترف ہونے کے متعلق، یہ اہل کتاب بھی بالعموم اپنی کتابوں کی پیشگوئی کی وجہ سے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ اس طرح ہوگا، یقیناً جانتے ہیں کہ یہ حکم بالکل ٹھیک ہے (اور ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے) مگر عناد امانتے نہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہے۔

معارف مسائل

اس آیت کے پہلے جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہشتیان کعبہ کا ذکر ہے، اس اشتیاق کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں اور سب میں کوئی تعارض نہیں وہ سب وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی اور عطاء نبوت سے پہلے اپنی طبیعت و فطرت سے ملتے ابراہیمی کے تابع کام کرتے تھے، اور نزول وحی کے بعد قرآن نے بھی آپ کی شریعت کو ملتے ابراہیم کے مطابق تشرار دیا، اور حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیل علیہما السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا، اس لئے آپ کی دلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بھی وہی کعبہ بیت اللہ قرار دیا جائے۔ یہ وجہ بھی تھی کہ قبائل عرب بھی چونکہ ملتے ابراہیمی کو کم از کم زبان سے مانتے تھے اور اس کی پیروی کے مدعی تھے، کعبہ کے قبلہ مسلمین ہو جانے سے ان کے اسلام کی طرف مائل ہو جانے کی توقع تھی، اور سابق قبلہ بیت المقدس میں جو موافقت اہل کتاب کی توقع کی جاسکتی تھی وہ سولہ سترہ مہینے کے محل کے بعد منقطع ہو چکی تھی، کیونکہ یہود و عیسائیوں کو اس کی وجہ سے کوئی اسلام سے قرب ہونے کے بجائے بُعد ہی بڑھا تھا۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ یعنی کعبہ کو قرار دیا جائے، اور چونکہ معتبران بارگاہ الہی انبیاء علیہم السلام اپنی کوئی خواہش اور کوئی درخواست حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس وقت تک پیش نہیں کرتے جب تک اُن کو یہ درخواست پیش کرنے کی اجازت کا علم نہ ہو جائے، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا کرنے کی اجازت پہلے مل چکی تھی، اور آپ اس کی دعا کر رہے تھے اور اس کی قبولیت کے امیدوار تھے، اس لئے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تھے، کہ شاید کوئی فرشتہ حکم لے کر آجائے، آیت مذکورہ میں اس کیفیت کا بیان مفسر مکر پہلے تو قبولیت دعا کا وعدہ فرمایا، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَكُمْ لَعْنَةُ الْكَافِرِينَ اِذْ يَنْزِلُ الْاَنۡزِلُ فَرَا دِيَا، قَوْلًا وَجْهًا، اس طرز عمل میں ایک خاص لطف تھا، کہ پہلے وعدہ کی خوشی حاصل ہو، پھر ایسا وعدہ کی خوشی تند مکر ہو جائے (یہ سب مضمون قرطبی، جصاص، منہرجی سے لیا گیا ہے)

مسئلہ استقبال قبلہ | یہ تحقیق پہلے آپ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اجل شاذ کے اعتبار سے تو ساری سمتیں اور ساری جہات برابر ہیں، قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ، لیکن مصالح امت کے لئے بقائنا و تحکمت کسی ایک جہت کو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لئے قبلہ بنا کر سب میں ایک دینی وحدت

کا عمل مظاہرہ مقصود تھا، وہ جہت بیت المقدس بھی ہو سکتی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنانا تجویز کر لیا گیا، اور اسی کا حکم اس آیت میں دیا گیا، اس کا مقتضی یہ تھا کہ اس جگہ قَوْلًا وَجْهًا اِلَى الْكَعْبَةِ اِذْ اِلَى بَيْتِ اللّٰهِ فرمایا جاتا، مگر قرآن حکیم نے عزرا بدل کر شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے الفاظ اختیار فرمائے، اس سے کئی اہم مسائل استقبال قبلہ کے بارہ میں واضح ہو گئے۔

اول یہ کہ اگرچہ اصل قبلہ بیت اللہ ہے جس کو کعبہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اصل بیت اللہ کا استقبال اسی جگہ تک ہو سکتا ہے جہاں تک بیت اللہ نظر آتا ہے، جو لوگ وہاں سے دور ہیں، اور بیت اللہ ان کی نظروں سے غائب ہے اگر ان پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ عین بیت اللہ کی طرف رخ کرو تو اس کی تعمیل بہت دشوار ہو جائے، خاص آلات و رحاات کے ذریعہ بھی صیح سمت کا صحیح دور کے شہروں میں مشکل اور غیر یقینی ہو جائے، اور شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مدار سہولت و آسانی پر رکھا گیا ہے، اس لئے بجائے بیت اللہ یا کعبہ کے مسجد حرام کا لفظ رکھا گیا جو بہ نسبت بیت اللہ کے بہت زیادہ وسیع رقبہ پر مشتمل ہے، اس کی طرف رخ پھیر لینا درود و رُح تک لوگوں کے لئے آسان ہے۔

پھر ایک دوسری سہولت لفظ شَطْر اختیار کر کے دیدی گئی، ورنہ اس سے مختصر لفظ اِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تھا، اس کو چھوڑ کر شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرمایا گیا، شَطْر دُوعْنِ کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک نصف ہے، دوسرے سمت ہے، باتفاق مفسرین اس جگہ شَطْر سے مراد سمت ہے، تو اس لفظ نے یہ بتلادیا کہ بلاد بعیدہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ خاص مسجد حرام ہی کی طرف ہر ایک کا رخ ہو جائے تو نماز درست ہو بلکہ سمت مسجد حرام کافی ہے (بھر محیط)

مثلاً مشرقی ممالک ہندوستان و پاکستان وغیرہ کے لئے جانب مغرب مسجد حرام کی سمت ہے تو مغرب کی جانب رخ کر لینے سے استقبال قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا، اور چونکہ گرمی، سردی کے موسموں میں سمت مغرب میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے اس سمت کو سمت مغرب و قبلہ تشرار دیا ہے، جو موسم گرماد سرما کی دونوں مخرجوں کے درمیان ہے، اور قواعد ریاضی کے حساب سے یہ صورت ہوگی کہ مغرب صیف اور مغرب شتا کے درمیان ۴۸ ڈگری تک سمت قبلہ تشرار دی جائے گی، یعنی ۲۴ ڈگری تک بھی اگر دائیں یا بائیں مائل ہو جائے تو سمت قبلہ فوت نہیں ہوگی، نماز درست ہو جائے گی، ریاضی کی تدبیر اور مشہور کتاب شرح چغتائی باب رابع صفحہ ۶۱ میں دونوں مشربین کا فاصلہ یہی ۴۸ ڈگری قرار دیا ہے۔

حضرت والد صاحب نے جو اہل فقہاء کا دوسرا قول ذکر کیا ہے کہ ۴۵ درجے دائیں یا بائیں مائل ہونے سے سمت قبلہ فوت نہیں ہوگی۔ محمد تقی

سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے اس سے ان لوگوں کی جہالت بھی واضح ہو گئی جنہوں نے ہندوستان د
شرقا آلات رصدیہ اور حسابات ریاضیہ پر مدار نہیں
ڈگری کا دیکھ کر یہ فیصلہ کر دیا کہ ان میں نماز نہیں ہوتی یہ سراسر جہالت
ہے، اور بلاوجہ مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا کرنا ہے۔

شریعت اسلامیہ چونکہ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے اور پوری دنیا کے مالک
کے لئے ہے، اس لئے احکام شرعیہ کو ہر شعبہ میں اتنا آسان رکھا گیا ہے کہ ہر گاؤں، جنگل، پہاڑ،
جزیرہ میں بسنے والے مسلمان اس پر اپنے مشاہدہ سے عمل کر سکیں، کسی مرحلے میں حسابات، ریاضی، یا مہلک
وغیرہ آلات کی ضرورت نہ پڑے ۴۸ ڈگری تک کی وسیع سمت مغرب اہل مشرق کا قبلہ ہے، اس
میں پانچ دس ڈگری کا فرق ہو بھی جائے تو اس سے نمازوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کی ایک حدیث سے اس کی اور وضاحت ہو جاتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ما بین المشرق و
المغرب قبلۃ (مداء الترمذی عن ابی ہریرۃ) یعنی مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے، آپ کا یہ
ارشاد مدینہ طیبہ والوں کے لئے تھا، کیونکہ ان کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان جانب جنوب
واقع تھا، اس حدیث نے گویا خط الاستوا کے لفظ کی تشریح کر دی کہ مسجد حرام کی سمت کافی
البتہ بناؤ مسجد کے وقت اس کی کو شش بہتر ہے کہ ٹھیک بیت اللہ کے رخ سے جتنا قریب ہو سکے
وہ کر لیا جائے، صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کا طریقہ تو اس دریافت کے لئے سیدھا سادہ یہ تھا
کہ جس جگہ صحابہ کرام کی بنائی ہوئی کوئی مسجد ہوتی اس سے اس کے قرب و جوار کی مسجدوں کا رخ سیدھا
کر لیا، پھر ان کے قرب و جوار کا ان کے ذریعہ، اسی طرح تمام عالم میں مساجد کا رخ تجویز کیا گیا ہے،
اس لئے بلاد بعیدہ میں سمت قبلہ معلوم کرنے کا صحیح طریقہ جو سلف سے چلا آتا ہے یہ ہے کہ جن بلاد میں
مساجد قدیمہ موجود ہیں ان کا اتباع کیا جائے، کیونکہ اکثر بلاد میں نو حضرات صحابہ و تابعین نے مساجد
کی بنیادیں ڈالی ہیں، اور سمت قبلہ متعین فرمائی ہے، اور پھر انہیں دیکھ کر دوسری بستیوں میں مسلمان
نے اپنی اپنی مساجد بنائی ہیں۔

اس لئے یہ سب مساجد مسلمین سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے کافی و کافی ہیں، ان میں بلاوجہ
شبہات فلسفہ کا لاشرعا محذور نہیں، بلکہ مذموم اور موجب تشویش ہے، بلکہ بسا اوقات ان تشویشات
میں پڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ و تابعین اور عامۃ المسلمین پر بدگمانی ہو جاتی ہے، کہ
ان کی نمازیں اور قبلہ درست نہیں، حالانکہ یہ باطل محض اور سخت جسارت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم کے مشہور و معروف عالم ابن رجب حنبلیؒ اسی بنا پر سمت قبلہ میں آلات رصدیہ اور دقیقاً
ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں، ولاحظہ

واما علم التیسیر فاذا تعلم منه ما
یحتاج الیہ للاستہلال و معرفۃ
القبلۃ والطرق کان جائزاً عند
الجمهور ومانعاً علیہ فلا حرج
الیہ وھو یغفل عما ھو اھم منه
وربما اذی التذقین فیہ الی اساقۃ
النفل بمتعاریب المسلمین امصالح
کما وقع فی ذلک کثیر من اھل ہذا
العالم قد یمازحون بذا وذلک یغضی
الی اعتقاد خطاء الصغابۃ والتابعین
فی صلوۃ اتھم فی کثیر من الامصار
وھو باطل وقد انکر الامام احمد
الاستدلال بالعکس وقال اتسا
در ما بین المشرق والمغرب قبلۃ
فرمایا کہ حدیث شریف میں صرف، ما بین المشرق والمغرب قبلہ آیا ہے، یعنی مشرق و مغرب کے
کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے۔

لیکن علم تیسیر پر اس کو اس قدر محال کرنا چاہیو
کے نزدیک جائز ہے جس سے راہ یابی اور قبلہ
اور راستوں کی شناخت ہو سکے، اس سے
زیادہ کی ضرورت نہیں کہ وہ بعض زیادہ کھنگام
امور ضروریہ کا غفل کرے گا، اور بعض مرتبہ
تدقیقات فلکیہ میں پڑنا عامۃ بلاد اسلامیہ
میں جو مسلمانوں کی مسجدیں ہیں ان کے متعلق گمانی
پیدا کر دینا برا اس فن میں مشغول ہونیوالوں کو
ہمیشہ اس قسم کے شبہات پیش آتے ہیں اس پر
یہ بھی اعتقاد پیدا ہو گا کہ بہت شہروں میں صحابہ
تابعین کی نمازیں غلط طریقہ پر تھیں اور یہ بالکل
فہر باطل ہے، امام احمد نے (سنن) جبندی
رحمہ اللہ کو کہا ہے بلاد میں قطب کہتے ہیں سمت
قبلہ اس سے استدلال کرنے کو منع کیا، اور
کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے۔

اور جن جگہات یا نوآبادیات وغیرہ میں صاحب قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں شرعی طریقہ جو سلف
صحابہ و تابعین سے ثابت ہے یہ ہو کہ شمس و قمر اور قطب وغیرہ کے مشہور و معروف ذرائع سے اندازہ قائم
کر کے سمت قبلہ متعین کر لی جائے، اگر اس میں معمولی انحراف و میلان بھی ہے تو اس کو نظر انداز کیا جاوے
کیونکہ حسب تصریح صاحب بدائع ان بلاد بعیدہ میں تحری اور اندازہ سے قائم کردہ جہت ہی قائم مقام
کعبہ کے ہے، اور اسی پر احکام دائر ہیں، جیسے شریعت نے نیند کو قائم مقام خروج بیچ کا قرار دے کر اسی پر
نقض رضو کا حکم کر دیا، یا سفر کو قائم مقام مشقت کا قرار دے کر مطلقاً سفر پر رخصتیں مرتب کر دیں
حقیقت مشقت ہو یا نہ ہو، اسی طرح بلاد بعیدہ میں مشہور و معروف نشانات و علامات کے ذریعہ جو
سمت قبلہ تحری و اندازہ سے قائم کی جائے گی وہی شرعاً قائم مقام کعبہ کے ہوگی، علامہ محمد العلوئم
رسائل الارکان میں اس مضمون کو بالفاظ ذیل بیان کیا ہے:

والشرط وقع المسامحۃ علی حسب | اور استقبال قبلہ میں شرط ضروری صرف یہ

ما یزى المصلی ریح غیر مأمورین
بالمسامتہ علی ما یحکم بہ الأوامر
الرصدیة ولہذا افتوان الاخر
المفسدان یتجاوز المشرق و
المغارب (رسائل الارکان ص ۵۲)

ہر کہ نمازی کی رات اور اندازہ کے موافق کعبہ
کے ساتھ مسامتہ (مجاہزات) واقع ہو جائے
اور ہم اس کے ملکیت نہیں کہ وہ درجہ
و مجاہزات کا پیدا کریں جو آلات رصدیہ
کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ

علامہ کاشغری بہرہ کو انحراف مفسد و صلوٰۃ وہ ہر جس میں مشرق و مغرب کا تفاوت ہو جائے

اس مسئلہ کی مکمل تشریح اور حسابات کے ذریعہ استخراج قبلہ کے مختلف طریقے اور ان کی شرعی
حیثیت پر مفصل کلام میرے رسالے "سمت قبلہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔"

وَلِیْنِ اَتِیْتَ الذِّیْنَ اَوْثَوْا الْكِتَابَ بِكُلِّ آیَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ

اور اگر تولاے اہل کتاب کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ مانیں گے تیرے قبلہ کو

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةِ بَعْضٍ وَلِیْنِ

اور نہ تیرے ان کا قبلہ اور نہ ان میں ایک دوسرے کا قبلہ اور اگر تو چلا

اَتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذَا لَیْنٌ

ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہوا ان

الظالمین ﴿۵﴾

بے انصافوں میں۔

خلاصہ تفسیر اور راجد ان لوگوں کے سب کچھ سمجھنے کے ان کی ضد کی یہ حالت تھی کہ اگر آپ

راہ (ان اہل کتاب کے سامنے تمام دنیا بھر کی) دلیلیں جمع کر کے پیش کر دیں
جب بھی آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور ان کی موافقت کی امید اس لئے نہ رکھیں چاہے کہ
آپ کا قبلہ بھی منسوخ ہونے والا نہیں، اس لئے آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے، (پس
کوئی صورت موافقت کی باقی نہیں رہی) اور جیسا ان اہل کتاب کو آپ سے ضد ہے ان میں باہم
بھی موافقت نہیں کیونکہ ان کا کوئی (فریق) بھی دوسرے (فریق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا،
مثلاً یہود نے بیت المقدس لے رکھا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کی سمت کو قبلہ بنا رکھا تھا اور

خدا نخواستہ آپ تو کسی طرح ان کے قبلہ منسوخ غیر مشروع کرنے ہی نہیں سکتے، کیونکہ اگر آپ
ان کے (ان) نفسانی خیالات کو (مگر وہ اصل میں بھم آسانی رہے ہوں لیکن اب بوجہ منسوخ ہونے
کے ان پر عمل کرنا محض نفسانی تعصب ہو، سو اگر آپ ایسے خیالات کو اختیار کر لیں (اور وہ بھی)
آپ کے پاس علم قطعی یعنی وحی (آئے پیچھے، تو یقیناً آپ (نعمہ اللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں
جو کہ تارکین حکم ہیں، اور آپ کا ظالم ہونا بوجہ معصوم ہونے کے محال ہے، اس لئے یہ بھی محال ہے
کہ آپ ان کے خیالات کو جن میں سے ان کا قبلہ بھی ہے قبول کر لیں)۔

معارف مسائل

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کے لئے آپ کا قبلہ
بیت اللہ ہی رہے گا، اس سے یہود و نصاریٰ کے ان خیالات کا قطع کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں کے
قبلہ کو تو کوئی تشرار نہیں، پہلے بیت اللہ تھا، پھر بیت المقدس ہو گیا، پھر بیت اللہ ہو گیا، اب
بھی ممکن ہے کہ پھر دوبارہ بیت المقدس ہی کو قبلہ بنالیں۔ (بحسرحیط)

وَلِیْنِ اَتِیْتَ اَهْوَاءَهُمْ میں یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہ فرض محال کے ہے
جس کے وقوع کا کوئی احتمال نہیں، اور دراصل سننا نامت محمدیہ کو ہے، کہ اس کی خلافت و رزی
ایسی چسپور کہ خود رسول بھی بغرض محال ایسا کریں تو وہ بھی ظالم قرار پائیں۔

الَّذِیْنَ اَتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ یَعْرِفُوْنَهُ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ

جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو

وَ اِنْ فَرِیْقًا مِنْهُمْ لَیَكْفُرْنَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَیَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾

اور بیشک ایک فرقہ ان میں سے چھپاتے ہیں حق کو جان کر، حق وہی ہے

مَنْ تَرٰ بِكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۷﴾

جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو مشک لانے والا۔

خلاصہ تفسیر اس سے پہلے آیت میں اہل کتاب کا قبلہ مسلمین کو دل میں حق جاننے اور زبان

سے نہ ماننے کا ذکر تھا، اس آیت میں اپنی اہل کتاب کا صاحب قبلہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا بیان ہے

جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراة و انجیل) دی ہے وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو (تورات و انجیل میں آئی ہوئی بشارت کی بناء پر بحیثیت رسالت) ایسا بے شک و شبہ پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں، (کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچان کر بھی سب مسلمان نہیں ہوتے، بلکہ بعض تو ایسا ان کے آتے) اور بعض ان میں سے (ایسے ہیں کہ اس) امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اخفاء کرتے ہیں (حالانکہ) یہ امر واقعی من جانب اللہ (ثابت ہو چکا) ہے سو ایسے امر واقعی ثابت من اللہ میں ہر فرد کو کہا جاسکتا ہے کہ ہرگز شک و شبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

معارف مسائل

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول پہچاننے کی تشبیہ اپنے بیٹوں کو پہچاننے کے ساتھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ جس طرح اپنے بیٹوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں، ان میں کبھی شبہ و شبہا نہیں ہوتا، اسی طرح تورات و انجیل میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کی واضح علامات و نشانات کا ذکر آیا ہے اس کے ذریعہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یقینی طور سے جانتے پہچانتے ہیں، ان کا انکار محض عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ پوری طرح پہچاننے کے لئے بیٹوں کی مثال دی گئی ہے، ماں باپ کی مثال نہیں دی حالانکہ آدمی اپنے ماں باپ کو بھی عادتاً خوب پہچانتا ہے، وجہ یہ ہے کہ بیٹوں کی پہچان ماں باپ کی پہچان کی نسبت بہت زیادہ ہے، کیونکہ انسان اپنے بیٹوں کو ابتداً پیدائش سے اپنے ہاتھوں میں پالتا ہے، اس کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہوتا جو ماں باپ کی نظر سے اوچھل رہا ہو، بخلاف ماں باپ کے کہ ان کے اعضاء مستورہ پر اولاد کی کسی نظر نہیں ہوتی۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہاں بیٹوں کو بیٹا ہونے کی حیثیت سے پہچاننا مراد نہیں، کیونکہ اس نسبت تو انسان پر مشتبہ ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو اور یہ بیٹا اپنا نہ ہو، بلکہ مراد ان کی شکل و صورت وغیرہ کا پہچاننا ہے کہ بیٹائی الواقع اپنا ہو یا نہ ہو، مگر جس کو بحیثیت بیٹے کے انسان پالتا ہے اس کی شکل و صورت کے پہچاننے میں کبھی اشتباہ نہیں ہوتا۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّئُهَا فَاسْتَذِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا

اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہر مین قبلہ کردہ، منہ کرتا ہے اس طرف سو تم بہت کرو نیکیوں میں جہاں کہیں تم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا جَمِيعًا إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۵۰﴾ وَمِنْ

ہم کو کراتے حکام کو اکٹھا، بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے، اور جس جگہ سے

حَيْثُ خَرَجْتَ قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ طَوَّافَةٌ

تو خطہ سرگرد کر اپنا مسجد حرام کی طرف اور بے شک ہیں حق ہے

لَلْحَقِّ مِنْ رَبِّكَ طَوَّافَةٌ مَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۵۱﴾ وَمِنْ حَيْثُ

برے رب کی طرف سے اور اللہ ہے خبر نہیں تمہارے کاموں سے، اور جہاں سے تو

خَرَجْتَ قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ طَوَّافَةٌ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ

نکلے منہ کر اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہو کر منہ کر د

قُولُوا وَجْهَكُمْ شَطْرَهُ لَا إِلَهَ إِلَّا يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا

اسی کی طرف تاکہ دے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع مگر جو

الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ذَلِكُمْ لَعْنَتِي

اُن میں ہے انصاف ہیں، سو اُن سے لڑو ان کے اعتراضوں سے، نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ کمال

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۲﴾

کروں تم پر فضل اپنا اور تاکہ تم پاؤ راہ سیدھی۔

خلاصہ تفسیر اور دوسری حکمت تخیل قبلہ میں یہ ہر کہ مادۃ اللہ جاری ہو کہ ہر فرد پہلے

نفس کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ عبادت میں، منہ کرتا

رہا ہے، چونکہ شریعت محمدیہ بھی ایک مستقل دین ہے، اس کا قبلہ بھی ایک خاص ہو گیا، جب حکمت

سب پر ظاہر ہو چکی (سورۃ مسلمانوں) تم (اب اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دین کے) نیک کاموں میں آگے

بڑھنے کی کوشش کرو (کیونکہ ایک روز اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ) تم خواہ کہیں ہو گے

(لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو اپنے اجلاس میں حاضر کر دیں گے (اس وقت نیکیوں پر جزا اور اعمال

بد پر سزا ہوگی اور) بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور اس حکمت کا مقتضار بھی

یہی ہے کہ جس طرح حضرات کعبہ کی طرف رخ ہوتا ہے اسی طرح اگر مدینہ سے یا اور کہیں سے (جس جگہ

سے بھی) کہیں سفر میں، آپ باہر جاویں تو (بھی) اپنا چہرہ (سنازمیں) مسجد حرام کی طرف رکھ لیجئے،

(غرض حضور و سفر سب حالتوں کا یہی قبلہ ہے) اور یہ (حکم عام قبلہ کا) بالکل حق (اور صحیح) ہے (اور)

منجانب اللہ (ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے ذرا بخیر نہیں۔

تخیل قبلہ کی تیسری حکمت اور (مکرر مکرر کہا جاتا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جاویں (اور

حضرت بدر جہ اولیٰ) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام کی طرف رکھتے، اور (اسی طرح سب مسلمان بھی سن لیں کہ) تم لوگ جہاں کہیں (موجود) ہو اپنا چہرہ (نماز میں) اسی (مسجد حرام) کی طرف رکھا کرو (اور) یہ حکم اس لئے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ (ان مخالفت) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں (اس) گفتگو کی مجال نہ رہے، (کہ اگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی موعود آخر الزماں ہوتے تو ان کی علامات میں تو یہ بھی ہے کہ ان کا اصلی قبلہ کعبہ ہوگا، اور یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں، یہ تیسری حکمت ہے تو یہ قبلہ کی، ہاں، مگر ان میں جو (بالکل ہی) بے انصاف ہیں وہ اب بھی کٹھ جھتی بھالیں گے، کہ یہ کیسے نبی ہیں جو اتنے نبیوں کے خلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، لیکن جب ایسے مہمل اعتراضوں سے دین حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا) تو ایسے لوگوں سے (ذرا) اندیشہ نہ کرو (اور ان کے اعتراضوں کے جواب کی فکر میں مت پڑو) اور تمہ سے ڈرتے رہو (کہ میرے احکام کی مخالفت نہ ہونے پائے کہ یہی مخالفت البتہ تم کو مضرب ہے) اور (ہم نے ان سب احکام مذکورہ پر عمل کرنے کی توفیق بھی دی) تاکہ تم پر جو کچھ (میرا انعام) (اکرام متوجہ) ہے (تم کو آخرت میں داخل بہشت کر کے، اس کی تکمیل کرو دو) اور تاکہ (دنیا میں) تم راہ (حق) پر (یعنی اسلام پر قائم رہنے والو) میں (رہو) جس پر وہ تکمیل نعمت مرثب ہوتی ہے)

معارف مسائل

تحويل قبلہ کی حکمتیں [مذکورہ آیات میں تحويل قبلہ کیلئے الفاظ قول و جہلک شطۃ المسجد الحرام تین مرتبہ آئے ہیں اور جہلک شطۃ کو لڑا و جہلک شطۃ دو مرتبہ اس تکرار کی ایک عام وجہ تو یہ ہے کہ تحويل قبلہ کا حکم مخالفین کے لئے تو شور و شغب کا ذریعہ تھا، اسی اخذ مسلمانوں کے لئے بھی عبادت کا ایک عظیم انقلاب تھا، اگر یہ حکم تاکیدات کے ساتھ بتکراہ لایا جاتا تو قلوب کا اطمینان و سکون آسان نہ ہوتا، اس لئے اس حکم کو بار بار دہرایا گیا، جس میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ یہ تحويل آخری اور قطعی ہے، اب اس کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

بیان قرآنی کے علامہ تفسیر میں جو تعلیق کی مشورہ کی ہے اور قطعی بھی اسکی ایک ایسی تفسیر نقل کی ہے جس سے تکرار محض نہ رہے مگر فرمایا کہ پہلی مرتبہ جو حکم آیا قول و جہلک شطۃ المسجد الحرام و جہلک شطۃ کو لڑا و جہلک شطۃ یہ حکم حالت حضر کا ہے، کہ جب آپ اپنی جگہ معین ہیں تو آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں اور پھر بے رمی امت کو اسی کا حکم دیا گیا، اور جہلک شطۃ کا مفہوم اس تقریر پر یہ ہوگا کہ اپنے وطن اور شہر میں جس جگہ بھی ہوں استقبال بیت اللہ ہی کا کرنا ہے، یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

پھر دوسری مرتبہ جو اپنی الفاظ کے ساتھ حکم آیا اس سے پہلے میں جہلک شطۃ کے الفاظ نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حکم وطن سے نکلنے اور سفر کی حالت کے لئے ہے، اور چونکہ سفر کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں، کبھی چند روز کے لئے کسی بستی میں قیام کیا جاتا ہے، کبھی سفر قطع کرنے کا سلسلہ ہوتا ہے، ان دونوں حالتوں کو عام کرنے کے لئے تیسری مرتبہ پھر ان الفاظ کے ساتھ و جہلک شطۃ کا اضافہ کر کے بتلادیا کہ سفر کی کوئی بھی حالت ہو ہر حال میں استقبال مسجد حرام ہی کا کرنا ہے اس تیسری مرتبہ کے اعادہ کے ساتھ تحويل قبلہ کی ایک حکمت کا بھی جوڑ لگا دیا گیا کہ مخالفین کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ تو قورات و انجیل کی تصریحات کے مطابق کعبہ ہونا چاہئے، اور یہ رسول کعبہ کے بجائے بیت المقدس کا استقبال کرتے ہیں۔

وَلَئِنْ وَجَّهْتُمْ مَوَازِينَہَا۔ وَجَّهْتُمْ بحسب لواز کے معنی لغوی، جس چیز کی طرف رخ کیا جائے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد قبلہ اور حضرت ابی بن کعبؓ کی قدرت میں اس جگہ وجہت کی بجائے قبلہ بھی منقول ہے، مراد آیت کی جہوز مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ ہر قوم کا قبلہ جس کی طرف وہ عبادت میں رخ کرتے ہیں مختلف ہے، خواہ مخواہ انبیا اللہ ان کو ایسا ہی حکم ملا ہے یا انھوں نے خود کوئی جانب مقرر کر لی ہے، ہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ مختلف قوموں کے قبلے مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، تو اسی حالت میں اگر نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی خاص قبلہ معسر رکھ دیا گیا تو انکار و تعجب کی کیا بات ہے۔

مذہبی مسائل میں فضول بحثوں فَاَسْبَغُوا اَلْخُیُوتَاتِ۔ اس سے پہلے جملہ میں یہ فرمایا تھا کہ مختلف قوموں سے اجتناب کی حدایت کے مختلف قبلے ہیں، کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے اپنے قبلہ کے حق ہونے پر ان لوگوں سے بحث فضول ہے، اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہو کہ اس بحث سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، تو پھر اس فضول بحث کو چھوڑ کر اپنے اصلی کام میں لگ جانا چاہئے، اور وہ کام ہے نیک کاموں میں دوڑ دھوپ اور آگے بڑھنے کی کوشش اور چونکہ فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنا اور مسابقت الی الخیرات میں شغلی کرنا، عموماً آخرت سے غفلت کے سبب ہوتے ہیں، جس کو اپنی آخرت اور انجام کی فکر و درپیش ہو رہے کبھی فضول بحثوں میں نہیں الجھتا، اپنی منزل طے کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس لئے اگلے جملے میں آخرت کی یاد دلانے کے لئے ارشاد فرمایا، اِنَّ مَا تَلْکُمْ لُوَاٰیَاتِ یُکْمِلُ اللّٰہُ جَمِیْعًا، جس کا مطلب یہ ہے کہ بحثوں میں ہرجیت اور لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کی فکر سب چند روزہ دنیا کے لئے ہو اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اقوام عالم کو ایک جگہ جمع کر کے حساب لیں گے، عقلمند کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات اس کی فکر میں صرف کرے۔

ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مبذول فرمائی ہو ایسی ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں قرطبی نے فرمایا کہ گمنا آرمینا کا کاف یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورہ انفال میں گمنا آخر جنگ اور سورہ حجر کے آخر میں گمنا آخر لڑنا علی المؤمنین آیا ہے۔

قَدْ كُذِّبَتْ بِنَا وَأَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَبِينَ آیات
ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا رمی نے اس کے متعلق فرمایا ہے
بر زبان تسبیح در دل گناہ حسرت
ایں چنین تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمانؓ سے کسی ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان کو تو اپنی طاعت میں لگایا (شرطی)

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہو، کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمان ہندیؓ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، فرمایا اس لئے کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؓ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

فمن لم یطعہ لم یرحہ
کثر صلواتہ و تسبیحہ

یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو۔

ذکر اللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خوزیمہ منذاذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی تفصیل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی اس کے احکام حلال و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی رنفل، نماز روزہ وغیرہ کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر) اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے مذاہب نجات دلانے میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث قدسی بروایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہونے ملتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

اے مسلمانو! مدد و صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر

الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۳﴾

کرنے والوں کے ساتھ ہو

رابطہ، تحویل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دواثر تھے، ایک مذہب اسلام پر اور اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جاتا ہے، اور یہی آیتوں میں اس اعتراض کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طابع اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں بیخ اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیت آئندہ میں تخفیف حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

اسے ایساں دانو، طبیعتوں میں غم ہلکا کرنے کے واسطے میں صبر اور نماز سے سہارا (اور مدد) حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے

ساتھ رہتے ہیں، راہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت ہو، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی۔

ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مبذول فرمائی ہو ایسی ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں قرطبی نے فرمایا کہ گمنا آرمینا کا کاف یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورہ انفال میں گمنا آخر جنگ اور سورہ حجر کے آخر میں گمنا آخر لڑنا علی المؤمنین آیا ہے۔

فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ، ذکر کے اصل معنی یاد کرنے کے ہیں جن کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا رمی نے اس کے متعلق فرمایا ہے

بر زبان تسبیح در دل گناہ حسرت
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمانؓ سے کسی ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان کو تو اپنی طاعت میں لگایا (شرطی)

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہو، کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمان ہندیؓ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، فرمایا اس لئے کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؓ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

فمن لم يطيع الله لم يرد الله
كثرة صلواته وتبليحه

یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو۔

ذکر اللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خوزیمہ منذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی تفصیل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی اس کے احکام حلال و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی رنفل، نماز روزہ وغیرہ کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر) اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے مذاہب نجات دلانے میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث قدسی بروایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہوش ملتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر مطالعہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

اے مسلمانو! مدد و صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر

الصَّبْرِ ۝۵۳

کرنے والوں کے ساتھ ہو

رابطہ، تحویل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دواثر تھے، ایک مذہب اسلام پر دواثر اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جاتا ہے، اور دوسری آیتوں میں اس اعتراض کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طابع اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں بیخ اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیت آئندہ میں تخفیف حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

اسے ایساں والو، طبیعتوں میں غم ہلکا کرنے کے واسطے میں صبر اور نماز سے سہارا (اور مدد) حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے

ساتھ رہتے ہیں، راہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت ہو، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی۔

معارف مسائل

صبر اور نماز ہر شے کا اصل | اِسْتَعِيْنُوا بِالصَّلٰوةِ وَالصَّلٰوةِ | اس آیت میں یہ ہدایت ہے کہ انسان کی اور ہر مخلیق کا علاج میں تمام حوائج و ضروریات کے پورا کرنے اور تمام آفات و مصائب کا علاج کو دور کرنے کا نسخہ اکسیر و دوا ہے۔ مرکب ہی ایک صبر اور دوسرے نماز، اور اس نسخہ کے تمام حوائج اور تمام مصائب کے لئے عام ہونے کی طرف قرآن عظیم نے اس طرح سے اشارہ کر دیا ہے کہ اِسْتَعِيْنُوا کو عام چھوڑا ہے، کوئی خاص چیز ذکر نہیں فرمائی، کہ فلاں کام میں ان دونوں چیزوں سے مدد حاصل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے انسان کی ہر ضرورت میں مدد حاصل کی جاسکتی ہو، تفسیر منظر ہی میں اس عموم کو واضح کر دیا، اب اس درجہ کی نفع کے دونوں اجزاء کو سمجھ لیجئے۔

میرے اصل حقیقت صبر کے اصل معنی اپنی نفس کو روکنے اور اس پر قابو پانے کے ہیں، قرآن و سنت کی اصطلاح میں صبر کے تین شعبے ہیں، ایک اپنے نفس کو حرام و ناجائز چیزوں سے روکنا، دوسرے طاعات و عبادت کی پابندی پر مجبور کرنا، تیسرے مصائب و آفات پر صبر کرنا، یعنی جو مصیبت آگئی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا، اور اس کے ثواب کا امید دار ہونا، اس کے ساتھ اگر تکلیف و پریشانی کے اظہار کا کوئی کلمہ بھی منہ سے نکل جائے تو وہ صبر کے منافی نہیں۔ (ذکرہ ابن کثیر عن سعید بن جبیر)

یہ تینوں شعبے صبر کے فرائض میں داخل ہیں، ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہے کہ تینوں طرح کے صبر کا پابند ہو، عوام کے نزدیک صرف تیسرے شعبے کو تو صبر کہا جاتا ہے، دوسرے جو صبر کی اصل اور بنیاد میں عام طور پر ان کو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں صابرین انہیں لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں، بعض روایات میں ہے کہ محشر میں نماز کی جائے گی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گزرے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں گے، اور ان کو بلا احتیاج جنت میں داخلہ کی اجازت دیدی جائے گی، ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ آیت قرآن اِنَّمَا يَتَوَقَّى الصَّابِرُونَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۱۰:۳۹) سے بھی اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔

نماز، دوسرا جز اس نسخہ کا جو تمام انسانی ضروریات کو پورا کرنے اور تمام پریشانیوں اور آفتوں سے نجات دلانے میں اکسیر ہے نماز ہے، صبر کی جو تفسیر ابھی لکھی گئی ہے اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ درحقیقت نماز اور تمام عبادات صبر ہی کے جزئیات ہیں، مگر نماز کو جدا گانہ بیان اس لئے کر دیا کہ تمام عبادات میں سے نماز ایک ایسی عبادت ہے جو صبر کا مکمل نمونہ ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں نفس کو عبادت و طاعت پر مجبور بھی کیا جاتا ہے، اور تمام معاصی و مکروہات سے

بلکہ بہت سے مباحات سے بھی نفس کو بحالت نماز روکا جاتا ہے، اس لئے صبر جس کے معنی نفس کو اپنے قابو میں رکھ کر تمام طاعات کا پیرو اور تمام معاصی سے محنت و بیزار بنانا ہے، نماز اس کی ایک علی تمثیل ہے۔

اس کے علاوہ نماز کو انسان کی تمام حاجات کے پورا کرنے اور تمام آفتوں و مصیبتوں سے نجات دلانے میں ایک خاص تاثیر بھی ہے، گو اس کی وجہ اور سبب معلوم نہ ہو، جیسے دواؤں میں بہت سی ادویات کو مؤثر بالخاصہ تسلیم کیا جاتا ہے، یعنی کیفیات حرارت و برودت کے حساب سے جیسے کسی خاص مرض کے ازالہ کے لئے بعض دوائیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں، جیسے درد گردہ کے لئے فرنگی دانہ کو یا تھ یا مٹھ میں رکھنا، اور بہت سے امراض کے لئے عود صلیب وغیرہ کو گلے میں ڈالنا مؤثر بالخاصہ ہے، سبب نامعلوم ہے، لوہے کو کھینچنے میں مقناطیس مؤثر بالخاصہ ہے، وجہ معلوم نہیں اس طرح نماز تمام انسانی ضروریات کی کفالت اور تمام مصائب سے نجات دلانے میں مؤثر بالخاصہ ہے، بشرطیکہ نماز کو نماز کی طرح آداب اور خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھا جائے، ہماری جو نمازیں غیر مؤثر نظر آتی ہیں، اس کا سبب ہمارا قصور ہے کہ نماز کے آداب اور خشوع و خضوع میں کوتاہی ہوتی ہے، در نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی ہم پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور اس کی برکت اللہ تعالیٰ اس ہم کو پورا فرمادیتے تھے، حدیث میں ہے: اِذَا حُزِبَ عَنْ رُفْعِ اِلَى الصَّلٰوةِ | یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ضرورت پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرما کرتے تھے،

میرا نماز تمام مشکلات و مصائب | اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ | اس کلمہ میں اس کا راز بتلادیا گیا ہے کہ صبر نجات کا سبب اس لئے ہے کہ صبر حل مشکلات اور دفع مصائب کا سبب کیسے بنتا ہے، ارشاد کا حاصل اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتا ہے، یہ ہے کہ صبر کے نتیجے میں انسان کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ رب العزت کی طاقت ہو اس کا کولسا کام رک سکتا ہے اور کونسی مصیبت اس کو عاجز کر سکتی ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ

اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مرے ہیں بلکہ وہ زندے ہیں لیکن

لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَكُنْتُمْ لَكُمْ بَشِيرٌ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصِ

تم کو خبر نہیں، اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو کھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور نقصانوں سے

مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالشَّمْرِتِ وَبَنِي الصِّدِّيقِينَ ۝۱۵۵ الدِّينِ

ان کے اور جانوں کے اور میروں کے اور خوش خبری دے مہر کرنے والوں کو کہ جب

إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ، قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝۱۵۶ أُولَٰئِكَ

پہنچے ان کو مصیبت تو کہیں ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹ کر جائیں گے ایسے ہی

عَلَيْهِمْ صَلَواتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

وہوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر۔

رابطہ | اوپر ایک خاص ناگوار واقعہ میں صبر کی تعلیم اور صابرین کی فضیلت بیان فرمائی تھی، آیات آئندہ میں اور بھی بعض واقعات خلافت طبع کی تفصیل اور اس میں صبر کی ترغیب اور فضیلت بیان فرماتے ہیں، جن میں قتل و قتال مع الکفار کا مضمون مقدم فرماتے ہیں، دوسرے، اول بوجہ اعظم ہونے کے، کہ اعظم پر صبر کرنے والا اصغر پر بدرجہ اولیٰ صبر کرے گا، دوسرے خاص طور پر مناسب مقام ہونے کی وجہ سے، کیونکہ معترضین مذکورین کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا،

خلاصہ تفسیر | اور جو لوگ اللہ کی راہ میں دین کے واسطے قتل کئے جاتے ہیں ان کی ایسی فضیلت ہو کہ ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولیٰ مردوں کی طرح) مڑے ہیں، بلکہ وہ لوگ ایک ممتاز حیات کے ساتھ زندہ ہیں، لیکن تم (اپنے موجودہ) حواس سے (اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے، اور (دیکھو) ہم (صفیٰ رضا و تسلیم میں جو کہ مقتضایا ایمان کا ہے) تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے (جو کہ هجوم مخالفین یا نزول حوادث و شدائد سے پیش آوے) اور (کسی قدر فقر و) فاقہ سے اور (کسی قدر) مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے (مثلاً) مویشی مر گئے یا کوئی آدمی مر گیا یا بیمار ہو گیا یا پھل اور کھیتی کی پیداوار تلف ہو گئی، پس تم صبر کرنا، اور جو لوگ ان امتحانوں میں پورے اتر آؤں اور مستقل رہیں تو آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے (جن کی یہ عادت ہے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ ردل سے سمجھ کر یوں) کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال و اولاد حقیقہ) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک میں (اور مالک حقیقی کو اپنی ملک میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہے، اس سے ملوک کا تنگ ہونا کیا معنی) اور ہم سب (دنیا) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں، سو یہاں کے نقصانوں کا بدلہ وہاں جاکر مل رہے گا، اور جو مضمون بشارت کا ان کو سنایا جائے گا وہ یہ ہے کہ ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے (مبذول) ہوں گی اور (سب پر بالاشترک) عام رحمت بھی ہوگی، اور یہی لوگ ہیں جن کی حقیقت حال تک (رسائی ہو گئی) کہ حق تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک اور نقصان کا تدارک کر دینے والا سمجھ گئے۔

معارف مسائل

شہداء اور انبیاء کی حیات برزخی یہ قوسب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی رو سے ہر مرنے والے کو اور اس کے درجات میں تفاضل برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ قبر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مومن و کافر یا صالح و فاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیات برزخی کے مختلف درجات ہیں ایک درجہ قوسب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجہ انبیاء و صالحین کے لئے مخصوص ہیں، اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر علماء کے مقالات و تحقیقات بے شمار ہیں، لیکن ان میں سے جو بات اقرب الی الکتاب والسنن اور شہادت سے پاک ہو، اس کو سیدی حضرت بحیم الامت تمھاروی نے بیان القرآن میں واضح فرمایا ہے، اس جگہ اسی کو نقل کرنا کافی معلوم ہوا۔

ف: ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے شہید کہتے ہیں، اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دوسرے مردوں کی سی موت سمجھنے کی نہایت کی گئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے، اور اسی سے جزاء و سزا کا ادراک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس حیات میں اور مردوں سے ایک گونہ امتیاز ہو اور وہ امتیاز یہ ہو کہ اس کی یہ حیات آثار میں اور دوسروں سے قوی ہے، جیسے انگلیوں کے اگلے پورے اور ایڑی، اگرچہ دونوں میں حیات ہے، اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں، لیکن انگلیوں کے پوروں میں حیات کے آثار احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں، اسی طرح شہداء میں آثار حیات عام مردوں سے بہت زیادہ ہیں، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلاف معمولی مردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے، کہ اس کا جسم باوجود مجموعہ گوشت و پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثل جسم زندہ کے صبح سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو احیاء کہا گیا، اور انکو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی مانعت کی گئی، مگر احکام ظاہرہ میں وہ عام مردوں کی طرح ہیں، ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے، اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کر سکتی ہیں، اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ سلامت جسم کے علاوہ اس حیات برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں، مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، ان کی ازواج دوسروں کے نکاح میں نہیں آ سکتیں۔

پس اس حیات میں سب قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء پھر اور معمولی مردے،

البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء و صالحین بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں، سو مجاہدہ نفس میں مرنے کو بھی معنی شہادت میں داخل سمجھیں گے، اس طور پر وہ بھی شہداء ہو گئے، یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام مسردوں کے اعتبار سے ہے، شہداء کے ہر تہہ و دو سرے لوگ صالحین و صدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے اس کی نیت خالص نہ ہو، جس پر مدار ہے قتل کے شہادت ہونے کا، اور صرف قتل شہادت نہیں ہو اور اگر فحشا ایسا شہید خاک خوردہ پایا جاوے جس کا قتل فی سبیل اللہ اور اس کا جامع شرائط شہادہ ہونا دلیل قطعی تو اثر وغیرہ سے ثابت ہو جس کا شبہ صاحب روح المعانی کو ہو گیا ہے، تو اس کی وجہ میں کہا جاوے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ کہ انبیاء و شہداء کے جسم کو زمین نہیں کھائی، یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کر سکتی، اجزاء ارضیہ مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ان کے جسم کا متاثر ہو کر فنا ہو جانا پھر بھی ممکن ہے، کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام افواج کی دعائیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں، اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متاثر ہو جائے تو اس آیت کے منافی نہیں۔

چنانچہ دوسرے اجسام مرکبہ مثل اسلحہ و ادویہ و اغذیہ و اغلاط و اجسام بیہلہ مثل آب آتش و باد کی تاثیر انبیاء علیہم السلام کے اجساد میں بھی ثابت ہے، اور شہداء کی حیات بعد المات انبیاء کی حیات قبل المات سے اتنی نہیں، اور بعض حصّہ ارض میں بعض اجزاء غیر ارضیہ بھی شامل ہو جاتے ہیں، جس طرح دوسرے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہو جاتے ہیں، سو اگر ان اجزاء غیر ارضیہ سے ان کے اجساد متاثر ہو جاویں تو اس سے ان احادیث پر اشکال نہیں ہوتا، جن میں حرمت اجساد علی الارض وارد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہے کہ امتیاز اجساد شہداء کے لئے یہ کافی ہے کہ دوسری اموات زیادہ مدت تک ان کے اجساد خاک سے متاثر نہ ہوں، گو کسی وقت میں ہو جاویں، اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جائے کہ ان کی محفوظیت اجساد کی خارق عادت ہے، اور خرق عادت کی دونوں صورتیں ہیں، حفظ متبادل و حفظ طویل، اور چونکہ عالم برزخ حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مرکب نہیں ہوتا اس لئے لا تشعرون فرمایا گیا کہ تم ان کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

معنا یہ ہے کہ آسان ف، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہندوں کا امتحان ہوتا ہے، اس کی حقیقت کرنے کی خاص تدبیر آیت وَاِذْ اٰتٰنَا اِبْرٰہِیْمَ رُجُلًا نّٰفِیْسًا لِّیُّبْلٰیہٗ اَمْرًا وَّہُوَ عَلٰی شَرِّ النَّاسِ لَہٗ فٰہِشٌ واقع ہونے سے پہلے ان کی خبر دینے میں یہ فائدہ ہوا کہ صبر آسان ہو جاتا ہے، ورنہ دفعہ کوئی صدقہ

پڑنے سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے، اور یہ خطاب ساری امت کو ہے تو سب کو کچھ لینا چاہئے کہ دنیا دارا لہن ہے (یعنی محنتوں اور تکلیفوں کی جگہ ہے) اس لئے یہاں کے حوادث کو عجیب اور بعید نہ سمجھا جائے تو بے صبری نہ ہوگی، اور چونکہ یہ لوگ نفس عمل صبر میں سبب شریک ہیں، اس لئے اس کا صلہ مشترک تو عام رحمت ہے، جو نفس صبر پر موعود ہے، اور چونکہ مقدار اور شان اور خصوصیت ہر صابر کے صبر کی جدا ہے، اس لئے ان خصوصیات کا صلہ جدا خاص غنائتوں سے ہوگا، جو ان خاص خصوصیات پر موعود ہیں، جیسے دنیا میں مواقع انعام پر دعوت طعام تو عام ہوتی ہے، پھر روپے اور جوڑے ہر ایک کو ملے، قدر اعلیٰست و الخدمت دینے جاتے ہیں۔

معصیت میں اتنا بد نہ کرنا چاہئے | صابرین کی طرف نسبت کر کے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ مصیبت کے تو تسکین قلب کا بہترین علاج ہے | وقت اناللہ وانا الیہ راجعون کہا کرتے ہیں، حقیقت میں مقصود اس کی تعلیم سے یہ ہے کہ مصیبت و انوں کو ایسا کہنا چاہئے، کیونکہ ایسا کہنے میں ثواب بھی بڑا ہے، اور اگر دل سے سمجھ کر یہ الفاظ کہے جائیں تو غم درخ کے دور کرنے اور قلب کو تسلی دینے کے معاملہ میں بھی اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَابِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوْ اعْتَمَرَ

بے شک صفا اور مروہ نشانیوں میں سے ہیں اللہ کی سوجھ بوجھ کر بیت اللہ کا یا عمرہ

فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطُوْفَ بِہِمَا وَاَوْ مَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَاِنَّ اللّٰہَ

تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ

شَاکِرٌ عَلَیْمٌ ﴿۱۵۸﴾

قدر دان ہے سب کچھ جاننے والا

رابط آیات متقدمہ میں وَاِذْ اٰتٰنَا اِبْرٰہِیْمَ رُجُلًا نّٰفِیْسًا سے درر تک خانہ کعبہ کا فضل ذکر ہوا ہے، جس کے اوّل میں خانہ کعبہ کے جائے عبادت ہونے کا بیان تھا، اور اس کے آگے دعائے ابراہیم کی حکایت تھی کہ انھوں نے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں احکام مناسک سکھلا دیے جاویں، اور مناسک میں حج و عمرہ بھی داخل ہے، پس بیت اللہ کا معبد ہونا جیسے اس کے قبلہ نماز بنانے سے ظاہر کیا گیا اسی طرح حج و عمرہ میں بیت اللہ کو مقصد بنا کر اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔

اب آیت آئندہ میں اس کے مقصد حج و عمرہ بننے کے متعلق ایک معنون کا بیان ہے، وہ یہ کہ

صفاد مردہ دو پہاڑیاں مکہ میں ہیں، حج و عمرہ میں کعبہ کا طواف کر کے ان کے درمیان میں دوڑتے چلتے ہیں، جس کو سعی کہتے ہیں، چونکہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہی جڑی جڑی تھی، اور اس وقت صفاد مردہ پر کچھ مورتیاں رکھی تھیں، اس لئے بعض مسلمانوں کو شبہ پڑ گیا کہ شاید یہ رسوم جاہلیت سے ہو، اور موجب گناہ ہو اور بعض جاہلیت میں بھی اس کو گناہ سمجھتے تھے، ان کو یہ شبہ ہو کہ شاید اسلام میں بھی گناہ ہو، اللہ تعالیٰ کو یہ شبہ دفع فرما، مقصود ہے، پس مضمون سابق میں کعبہ کے قبلہ نماز ہونے پر اعتراض کفار کا دفع کرنا مقصود تھا، اور مضمون لاحق میں کعبہ کے مقصد حج و عمرہ ہونے کے متعلق ایک امر یعنی صفا و مردہ کی سعی پر خود مسلمانوں کے شبہ کا ازالہ فرمانا مقصود ہے، یہ وجہ دونوں مضمونوں میں ربط کی ہے۔

خلاصہ تفسیر (صفاد مردہ کی سعی میں کوئی شبہ نہ کر رہا کیونکہ تحقیقاً صفا و مردہ داران کے درمیان میں سعی کرنا) منجملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا اس کا عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں (جیسا تم کو شبہ ہو گیا) ان دونوں کے درمیان سعی کے معروف طریقہ کے مطابق آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے اور گناہ کیا بلکہ ثواب ہوتا ہے) کیونکہ یہ سعی تو شرعاً امر خیر ہے) اور رہائے میان کا ضابطہ ہے کہ جو شخص خوشی سے کوئی امر خیر کرے تو حق تعالیٰ اس کی بڑی قدر دانی کرتے ہیں اور اس خیر کرنے والے کی نیت و خلوص خوب جانتے ہیں، (پس اس ضابطہ کی دوسری سعی کرنے والے کو بمقدار اخلاص ثواب عنایت ہوگا)۔

معارف مسائل

بعض لغات کی تحقیق شاعر ابواللہ، شاعر جمع ہے شعیرہ کی، جس کے معنی علامت کے ہیں، شاعر اللہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیے، حج کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت میں خاص خائف کعبہ کا قصد کرنے اور وہاں افعال مخصوصہ کے ادا کرنے کو حج کہا جاتا ہے، عمرہ کے لفظی معنی زیارت کے ہیں اور اصطلاح شرع میں مسجد حرام کی حاضری اور طواف سعی کو کہا جاتا ہے۔

صفاد مردہ کے درمیان حج اور عمرہ اور سعی کا طریقہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور یہی امام احمد کے سن واجب ہے، نزدیک سنت متجہ ہے، اور مالک اور شافعی کے نزدیک فرض ہے، اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک واجب ہے، کہ ترک سے ایک بکری ذبح کرنا پڑتی ہے۔

آیت مذکورہ کے الفاظ سے یہ شبہ نہ کرنا چاہئے کہ اس آیت میں تو صفا و مردہ کے درمیان سعی کرنے کے متعلق صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ وہ گناہ نہیں، اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت

ہو کہ سعی مباحات میں سے ایک مباح ہے، وجہ یہ ہے کہ اس جگہ عنوان لا یمتنعہ کا سوال کی مناسبت سے رکھا گیا ہے، سوال اسی کا تھا کہ صفا و مردہ پر بتوں کی مورتیں رکھی تھیں اور اہل جاہلیت انہی کی پوجا پاٹ کے لئے صفا و مردہ کے درمیان سعی کرتے تھے، اس لئے یہ عمل حرام ہونا چاہئے، اس کے جواب میں فرمایا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، چونکہ یہ دراصل سنت ابراہیمی ہے کسی کے جاہلانہ عمل سے کوئی گناہ نہیں ہو جاتا، یہ فرمانا اس کے واجب ہونے کے منافی نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْكِتَابِ وَالْهُدَىٰ مِنْ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اتارے صحت حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے

بَعْدَ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ

کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں ان پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں

الْعَالَمُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّاهُ فِي الْكِتَابِ

ان پر لعنت کرنا ہے، مگر جنہوں نے توبہ کی اور درست کیا اپنے کلام کو اور بیان کر دیا حق بات کو قرآن کو معاف

عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا

کرتا ہوں اور میں ہوں بڑا صابر کریم لا نہایت مہربان، بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور مر گئے

وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ

کافر ہی انہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں اور لوگوں کی

أَجْمَعِينَ ۝ خُلِدَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَ

سب کی، ہمیشہ رہیں گے اسی لعنت میں نہ ہلکا ہوگا ان پر ہے عذاب اور

لَهُمْ يُنْظَرُونَ ۝

وہ ان کو ہلکتے دیکھ رہے ہیں۔

ربط اور بحث قبلہ کے ضمن میں صاحب قبلہ کی نبوت کے متعلق اہل کتاب کی حق پوشی کا مضمون مذکور تھا، اس آیت میں اَلَّذِينَ اَقْبَلُہُمْ اِلَيْکَ یَعْرِضُوْنَہُ اِلٰی ذٰلِکَ لَیَکْتُمُوْنَ اَلْحَقَّ آئے اس مضمون کی تکمیل کے واسطے حق کو چھپانے والوں کی اور کتمان حق پر اصرار کرنے والوں کی وعید اور توبہ کرنے پر معافی کا وعدہ ارشاد فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اخفاء کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کے لئے) ہادی ہیں (اور اخفاء بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان (مضامین) کو کتاب (الہی تورات و انجیل) میں نازل فرما کر عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمت خاصہ سے ان کو بعید کر دیتے ہیں) اور (دوسرے بہتر سے) لعنت کرنے والے بھی (جن کو اس فعل سے نفرت ہی ان پر لعنت بھیجتے ہیں) کہ ان پر بددعا کرتے ہیں (ہاں) مگر جو لوگ (ان اخفاء کرنے والوں میں) اپنی اس حرکت سے (توبہ یعنی حق تعالیٰ کے رو برو گذشتہ سے معذرت) کر لیں اور (جو کچھ ان کے اس فعل سے خرابی ہو گئی تھی) آئندہ کے لئے اس کی اصلاح کر دیں (اور اس اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان اخفاء کئے ہوئے مضامین کو عام طور پر) ظاہر کر دیں (تاکہ سب کو اطلاع ہو جائے) اور ان پر لوگوں کو گمراہ کرنے کا بار نہ رہے اور اظہار معتبر عند الشرع یہ ہے کہ اسلام کو قبول کر لیں، کیونکہ اسلام نہ لانے میں نبوت محمدیہ کے متعلق عوام پر بھی حق مخفی رہے گا، وہ یہی سمجھیں گے کہ اگر نبوت حق ہوتی تو یہ کتاب جاننے والے لوگ کیوں نہ ایمان لاتے، خلاصہ یہ کہ یہ لوگ مسلمان ہو جاویں، تو ایسے لوگوں (کے حال) پر میں (عنایت سے) متوجہ ہو جاتا ہوں (اور ان کی خطا معاف کر دیتا ہوں) اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کر لینا، اور مہربانی فرماتا (کوئی توبہ کرنے والا ہونا چاہئے) البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام نہ لادیں، اور اسی حالت غیر اسلام پر جاویں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی بھی سب کی (ایسے طور پر برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی رشتہ میں رہیں گے (جہل یہ کہ وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے، اور ہمیشہ کا جہنم میں رہنے والا ہمیشہ ہی خدا کی خاص رحمت سے دور بھی رہے گا اور ہمیشہ ملعون رہنا یہی ہو، اور ہمیشگی لعنت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داخل ہونے کے بعد کسی وقت (ان پر) سے (جہنم کا) عذاب ہلکا (بھی) نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے کے قبل) ان کو (کسی میعاد تک) ہلکت دی جائے گی (کیونکہ میعاد اس وقت دی جاتی ہے، جب کہ مقدمہ میں گنجائش ہو اور گنجائش نہ ہونے پر اول ہی پیشی میں حکم سزا ہو جاتا ہے)۔

معارف مسائل

علم دین کا اظہار اور پھیلانا واجب | آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کا چھپانا سخت حرام ہے | جو ہدایات و نذات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا انا

بڑا جرم عظیم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے، اس سے چند احکام حاصل ہوئے :-

اول یہ کہ جس علم کے اظہار اور پھیلانے کی ضرورت ہے اس کا چھپانا حرام ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَمِعَ عَنْ عَلِيٍّ يَكْتُمُهُ كَلَّمَتهُ	یعنی جو شخص دین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہو
الْجَمْعَةُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے اگر وہ
يَلْجَأُ مِنْ النَّارِ (رواہ ابوہریرہ)	اس کو چھپا کر قیامت کے روز اس کے منہ میں
وَمِنْ النَّارِ (ابن ماجہ)	اللہ تعالیٰ آگ کا نظام ڈالیں گے۔

حضرات فقہاء نے فرمایا کہ یہ وعید اس صورت میں ہے جب کہ اس کے سوا کوئی دوسرا آدمی مسئلہ کا بیان کرنے والا وہاں موجود نہ ہو، اور اگر دوسرے علماء بھی موجود ہوں تو گنجائش ہے کہ یہ کہہ دے کہ دوسرے علماء سے دریافت کر لو (قرطبی، جصاص) دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جس کو خود صحیح علم حاصل نہیں اس کو مسائل و احکام بتانے کی جرأت نہیں کرنا چاہئے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ علم کو چھپانے کی یہ سخت وعید انہیں علوم و مسائل سے متعلق ہے، جو قرآن و سنت میں واضح بیان کئے گئے ہیں اور جن کے ظاہر کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہر وہ باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ایسے مسائل و احکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے، اور وہ کتاب علم کے حکم میں نہیں ہو آیت مذکورہ میں لفظ مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدًى سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ایسے ہی مسائل کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سننا دے گے جن کو وہ پورا طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنہ میں مبتلا کر دو گے (قرطبی)۔

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ عوام لوگوں کے سامنے صرف اتنے ہی علم کا اظہار کر دو جس کو ان کی عقل و فہم برداشت کر سکے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تکذیب کریں، کیونکہ جو بات ان کی سمجھ سے باہر ہوگی، ان کے دلوں میں اس سے شبہات و خدشات پیدا ہوں گے، اور ممکن ہے کہ اس سے انکار کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر کلام کرے، جس شخص کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اس کے سامنے ایسے مسائل بیان ہی کر دو اسی لئے حضرات فقہاء بہت سے مسائل کے بیان کے بعد کہتے ہیں هَذَا مِنْ غَيْرِ وَ لَا يُعْرَى

یعنی یہ مسئلہ ایسا ہو کہ اہل علم کو خود تو سمجھ لینا چاہئے مگر عوام میں پھیلا نا نہیں چاہئے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَقْتَتُوا إِلَهُكُمْ أَهْلَكُمْ
فَتَقْطِلُوا هَمَزًا وَلَا تَقْتَتُوا هَاتِي
عَائِدًا أَهْلَهَا فَتَقْطِلُوا هَاتِي

یعنی حکمت کی بات کو اپنے لوگوں سے نہ روکو جو اس بات کے اہل ہوں اگر تم نے ایسا کیا تو ان لوگوں پر ظلم ہوگا اور جو اہل نہیں ہیں ان کے سامنے حکمت کی باتیں نہ رکھو کیونکہ اس صورت میں اس حکمت پر ظلم ہوگا۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی کافر کو جو مسلمانوں کے مقابلہ میں مناظرے کرتا ہو یا کوئی مبتدع گمراہ جو لوگوں کو اپنے غلط خیالات کی طرف دعوت دیتا ہو اس کو علم دین سکھانا اُس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ ظن غالب ہو جائے کہ علم سکھانے سے اس کے خیالات درست ہو جائیں گے۔

اسی طرح کسی بادشاہ یا حاکم وقت کو ایسے مسائل بتلانا جن کے ذریعہ وہ رعیت پر ظلم کرنے کا راستہ نکال لیں جائز نہیں، اسی طرح عوام کے سامنے احکام دین میں رخصتیاں اور جیلوں کی صورتیں بلا ضرورت بیان نہ کرنا چاہئے جس کی وجہ سے وہ احکام دین پر عمل کرنے میں حیلہ چلنے کے مادی بن جائیں (قرطبی)

حدیث رسول بھی قرآن صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہو کر انھوں نے فرمایا اگر قرآن کی حکمت میں ہے ۱۱۱ یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا، آیت سے مراد یہی آیت ہے جس میں کتاب علم پر لعنت کی وعید شدید مذکور ہے ایسے ہی بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی بعض روایات حدیث کے ذکر کرنے کے ساتھ ایسے ہی الفاظ فرمائے کہ اگر قرآن کریم کی یہ آیت کتاب علم کے بارے میں نہ ہوتی تو میں یہ حدیث بیان نہ کرتا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ہی کے حکم میں ہے، کیونکہ آیت میں تو کتاب کی وعید اُن لوگوں کے لئے آئی ہے جو قرآن میں نازل شدہ ہدایات و بینات کو چھپائیں، اس میں حدیث کا صراحت ذکر نہیں، لیکن صحابہ کرامؓ نے حدیث رسول کو بھی قرآن ہی کے حکم میں سمجھ کر اس کے انکار کرنے کو اس وعید کا سبب سمجھا بعض گناہوں کا وبال ایسا ہوتا ہے کہ یَنْكُتُ اللَّهُ عَنْكَ فَيُغْفِرُ لَكَ مَا تَرَىٰ مِنْ عَذَابٍ لِّمَنْ يَغْفِرُ اللَّهُ عَنْكَ میں قرآن کریم نے لعنت کرنے والوں کو اس پر ساری مخلوق لعنت کرتی ہو کہ متعین نہیں کیا کہ کون لوگ لعنت کرتے ہیں، امام تفسیر مجاہدؒ اور عکرمہؒ نے فرمایا کہ اس عدم تعین سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر مخلوق ان پر لعنت کرتی ہے، یہاں تک کہ تمام جانور اور حشرات الارض بھی اُن پر لعنت

کرتے ہیں، کیونکہ ان کی بد اعمالی سے ان سب مخلوقات کو نقصان پہنچتا ہے، حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللّٰهُ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَلَهُ أَجْرُ عَشْرَةِ أَضْعَافٍ أَوْ أَكْثَرُ (قرطبی بحوالہ ابن ماجہ باسناد حسن)

بعض شخص پر لعنت اس وقت تک جائز ہے کہ اس کا کفر پروردگار کے لفظ سے جصاص اور قرطبی وغیرہ نے نہیں جب تک اس کے کفر پروردگار کا یقین ہو یہ استنباط کیا ہے کہ جس کافر کے کفر کی حالت میں مردے کا یقین

نہ ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں اور چونکہ ہمیں کسی شخص کے خاتمہ کا یقینی علم ہونے کا اب کوئی ذریعہ نہیں اس لئے کسی کافر کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کافروں پر نام لے کر لعنت کی ہے آپ کو ان کی موت علی الکفر کا منجانب اللہ علم ہو گیا تھا، البتہ عام کافروں، ظالموں پر بغیر تعین کے لعنت کرنا درست ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جب لعنت کا معاملہ اتنا شدید ہو کہ کسی کافر پر بھی مقرر ہو جائے جب تک اس کا یقین نہ ہو جائے کہ اس کی موت کفر ہی پر ہوگی، تو کہیں مسلمان پر یا کسی حال اور پر لعنت کیسے جائز ہو سکتی ہے، اور عوام اس سے بالکل غفلت میں ہیں خصوصاً عورتیں کہ بہت بات پر لعنت کے الفاظ اپنے متعلقین کے متعلق استعمال کرتی رہتی ہیں، اور لعنت صرف لفظ لعنت ہی کے کہنے سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ہم معنی جو الفاظ ہیں وہ بھی لعنت ہی کے حکم میں ہیں، لعنت کے اصلی معنی خدا تعالیٰ کی رحمت سے دور کرنے کے ہیں، اس لئے کسی کو مردود و رائدہ و رگلا و اندمار وغیرہ کے الفاظ کہنا بھی لعنت ہی کے حکم میں ہے۔

وَالْفُكْمُ إِلَهُ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ﴿٢١٣﴾

اور معبود ہم سب کا ایک ہی معبود ہے کوئی معبود نہیں اس کے سوا بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں

وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ

اور کشتیوں میں جو کہ لے کر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کما کی چیزیں اور پانی میں جس کو کہ اتارا

اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ

اللہ نے آسمان سے پھر چلایا اس سے زمین کو اس کے مرچنے پیچھے اور

ارشاد فرمایا:

فَأَشْنَسْتُ لِمَنِي الْأَرْضَ كُلَّهَا وَنَارَ الْفُجَارِ
تَعْلِيْقُ رُؤْنِ ۝ (۱۸: ۱۲۳)

تین ہم نے ہی پانی کو زمین کے اندر ٹھہرا دیا،
اگرچہ میں اس کی بھی قدرت تھی کہ بارش کا
برسنے کے بعد بہہ کر ختم ہو جاتا۔

مگر قدرت نے پانی کو اہل زمین انسان اور جانوروں کے لئے کہیں کھلے طور پر تالابوں اور
حوضوں میں جمع کر دیا، کہیں پہاڑوں کی زمین میں پھیلی ہوئی رگوں کے ذریعہ زمین کے اندر اتار دیا اور
پھر ایک غیر محسوس پائپ لائن ساری زمین میں بچھا دی، ہر شخص جہاں چاہے کھود کر پانی نکال لیتا اور
اور اسی پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بحر منجمد بنا کر برت کی صورت میں پہاڑوں کے اوپر لا دیا، جو
سڑنے اور خراب ہونے سے بھی محفوظ ہے، اور آہستہ آہستہ پھیل کر زمین کے اندر قدرت رقی
پائپ لائن کے ذریعہ پورے عالم میں پہنچتا ہے، غرض آیت مذکورہ میں قدرت کا ملہ کے چند مظاہر
کا بیان کر کے توحید کو ثابت کیا گیا، علماء مفسرین نے ان تمام چیزوں پر تفصیلی بحث کی ہے،
دیکھتے جھآص، قلبی وغیرہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ

اور بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو ان کی محبت ایسے رکھتے ہیں جیسے

كُحِبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ

محبت اللہ کی اور ایمان والوں کو ان سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی، اور اگر دیکھ لیں یہ

ظَلَمُوا إِذْ يَرُونَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ

ظالم اس وقت کو جبکہ دیکھیں عذاب کہ قوت ساری اللہ ہی کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ

شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝ (۱۹)

کا عذاب سخت ہے۔

رابطہ | ادھر کی آیات میں توحید کا اثبات تھا، آگے مشرکین کی غلطی اور وعید کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر | اور ایک آدمی وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک

(خدائی) قرار دیتے ہیں (اور ان کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں اور) ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت
اللہ سے (رکھنا) ضروری ہے، (یہ حالت تو مشرکین کی ہے) اور جو مومن ہیں ان کو صرف اللہ تعالیٰ
کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے، (کیونکہ اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہو جاوے کہ میرے معبود سے
مجھ پر کوئی ضرر چڑے گا تو فوراً محبت منقطع ہو جاوے، اور مومن باوجود اس کے کہ نافع و ضار
حق تعالیٰ ہی کو اعتقاد کرتا ہے، لیکن پھر بھی محبت و رضا اس کی باقی رہتی ہے، و نیز اکثر مشرکین
مصیبت شدیدہ کے وقت اپنے شرکاء کو چھوڑ دیتے ہیں، اور مومنین من حیث الایمان
مصیبت میں بھی خدا کو نہ چھوڑتے تھے، اور محاورات میں ایسے قضایا باعتبار حالت غالبہ کے
بھی صادق ہوتے ہیں) اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں) کسی مصیبت
کو دیکھتے تو اس کے وقوع میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے،
اور دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، چنانچہ اس مصیبت کو نہ کوئی روک سکا نہ ٹال سکا
اور نہ ایسے وقت میں اور کوئی یاد رہا، اور اس مصیبت کی شدت میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے،
کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں) کہ دارا بزار ہے (اور بھی) سخت ہوگا، (تو اس طرح غور کرنے
سے تراشیدہ معبودوں کا عجز اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت مشکف ہو کر توحید و ایمان اختیار
کر لیتے)

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ

جب کہ بزار ہو جاوے گئے وہ کہ جن کی پیروی کی تھی ان سے جو کہ ان کے پیروں ہوتے تھے اور دیکھیں گے عذاب

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝ (۲۰) وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّا

اور منقطع ہو جاوے گئے ان کے سب علاقے، اور کہیں گے پیروں کیا اچھا ہوتا جو ہم کو دنیا کی طرف

كُرِّهَ فَتَنَبَّرْنَا بِمَنُومًا كَمَا تَبَرَّأَ وَمَا نَدَّكَ لَكَ يَوْمَئِذٍ اللَّهُ

لوٹ جانا بل جانا تو پھر ہم بھی بزار ہو جاتے آگے جیسے یہ ہم سے بزار ہو گئے، اسی طرح بد دکھائے گا اللہ

أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝ (۲۱)

ان کو ان کے کام حسرت دلانے کو اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں نار سے۔

رابطہ | ادھر پر عذاب آخرت کو سخت فرمایا ہے آگے اس سخن کی کیفیت کا بیان فرماتے ہیں۔

غیر اللہ کے تقرب کے لئے جانوروں کو چھوڑ دینا اور اس عمل کو موجب برکت و تقرب سمجھنا، اور ان جانوروں کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا معاہدہ کر لینا اس کو دائمی سمجھنا یہ سب افعال ناجائز اور ان کا کرنا گناہ ہے۔

تو حاصل مطلب آیت کا یہ ہو کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حلال بنایا ہے ان کو بہتوں کے نام کر کے حرام نہ بناؤ، بلکہ اپنی حالت پر چھوڑ کر کھاؤ پیو، اور اگر ایسی حرکت چہالت سے ہو جائے تو اصلاح نیت کے ساتھ تجدید ایمان اور توبہ کر کے اس حرمت کو ختم کرو، اس طرح ان جانوروں کو قطعاً حرام قرار دینا تو گناہ ہوا، مگر غیر اللہ کے نام پر کر دینے سے یہ مردار اور بھس کے حکم میں ہو گیا، نجاست کی وجہ سے حرمت ثابت ہو گئی۔

مسئلہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے چہالت یا عقلیت سے کسی جانور کو کسی غیر اللہ کے ساتھ نامزد کر کے چھوڑ دیا تو اس کی توبہ یہی ہے کہ اپنے اس خیال حرمت کے رجوع کرے اور اس فعل سے توبہ کرے، تو پھر اس کا گوشت حلال ہو جائے گا، واللہ اعلم۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا آَلْفَيْنَا

اور جب کوئی ان سے کہے کہ کتابعداری کرو اس حکم کی چونکہ نازل فرمایا اللہ نے تو کہتے ہیں ہرگز نہیں ہم تو باعداری

عَلَيْهِ آبَاءُ نَاوَلُواكَانَ آبَاءُ هُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ

کرچہ اکی جس پر دیکھا ہم نے اپنے باپے ادوں کو بھلا اگرچہ ان کے باپے ان سے نہ سمجھتے ہو کچھ بھی اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ،

وَمِثْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمِثْلِ الَّذِينَ يَنْبَغِي بِمَا لَا يَتَمَعُ إِلَّا دُعَاءٌ

اور مثال ان کافروں کی ایسی ہر جیسے بکائے کوئی شخص ایسی چیز کو جو کچھ نہ تھے سوائے پکارنے

وَنِدَاءٌ صَمٌّ بَلَّمُ عُنَى فَمَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ

اور چلانے کے بہرے گو گئے اندھے ہیں سورہ کچھ نہیں سمجھتے۔

خلاصہ تفسیر اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم (اپنی پیغمبر

کے پاس) بھیجا ہے اس پر چلو تو جواب میں کہتے ہیں (کہ نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (کیونکہ وہ لوگ اس طریقہ کے اختیار کرنے میں مامور من اللہ تھے، حق تعالیٰ ان پر رد فرماتے ہیں) کیا ہر حالت میں یہ لوگ اپنے باپ دادا ہی کے طریقہ پر چلیں گے)

اگرچہ ان کا باپ دادا (دین کی) نہ کچھ سمجھ سکتے ہوں اور نہ کسی آسمانی کتاب کی ہدایت رکھتے ہوں، وَمِثْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمِثْلِ الَّذِينَ يَنْبَغِي بِمَا لَا يَتَمَعُ إِلَّا دُعَاءٌ

کیفیت (تافہمی میں) اس (جانور) کی کیفیت کے مثل ہے (جس کا ذکر اس مثال میں کیا جاتا ہے) کہ ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے، جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی (پرہیز) بات نہیں سنتا (اسی طرح) یہ کفار (بھی) ظاہری بات چیت تو سنتے ہیں، لیکن کام کی بات باطل، بہرے میں (گویا سننا ہی نہیں) گونگے ہیں (کہ کبھی ایسی بات زبان ہی پر نہیں آتی) اندھے ہیں (کہ کبھی نفع نقصان نظری نہیں آتا) سو (جب سارے ہی جو اس شخص ہیں تو) سمجھتے (سمجھاتے) کچھ نہیں۔

معارف مسائل

اس آیت سے جس طرح باپ دادوں کی اندس تقلید و اتباع کی مذمت ثابت ہوئی اسی طرح جائز تقلید و اتباع کے شرائط اور ایک ضابطہ بھی معلوم ہو گیا، جس کی طرف دو لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے لَا يَعْقِلُونَ اور لَا يَهْتَدُونَ، کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ ان آباء و اجداد کی تقلید و اتباع کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ انھیں نہ عقل تھی نہ ہدایت، ہدایت سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح طور پر نازل کئے گئے، اور عقل سے مراد وہ جو بذریعہ اجتہاد و تصور شرعی سے استنباط کئے گئے۔

تو وجہ ان کے اتباع و تقلید کے عدم جواز کی یہ ہے کہ نہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے احکام ہیں اور نہ اس کی صلاحیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے احکام نکال سکیں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ جس عالم کے متعلق یہ اہلینان ہو جائے کہ اس کے پاس مشرک و سنت کا علم ہو، اور اس کو درجہ اجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو احکام صراحتہ قرآن و سنت میں نہ ہوں ان کو تفصیل قرآن و سنت سے بذریعہ قیاس نکال سکتا ہے، تو ایسے عالم مجتہد کی تقلید و اتباع جائز ہے، نہ اس لئے کہ اس کا حکم ماننا اور اس کا اتباع کرنا ہے، بلکہ اس لئے کہ حکم اللہ کا ماننا اور اسی کا اتباع کرنا ہے، مگر چونکہ ہم براہ راست اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہو سکتے، اس لئے کسی عالم مجتہد کا اتباع کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ہو سکے۔

جاہلانہ تقلید اور اندمہ مجتہدین اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مطلق تقلید ائمہ مجتہدین کے خلاف کی تقلید میں فرق اس طرح کی آیات پڑھ دیتے ہیں وہ خود ان آیات کے صحیح مدلول سے واقف نہیں۔

امام شریعتی نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں تقلید آبائی کے منوع ہونے

کا جو ذکر اس سے مراد باطل عقائد و اعمال میں آباء و اجداد کی تقلید کرنا ہے، عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ میں تقلید اس میں داخل نہیں، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں ان دونوں چیزوں کی وضاحت سورۃ یوسف میں اس طرح آئی ہے:

إِنِّي كُنْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ
بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي الْأُبْرَهَمَ
إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ (۱۲۳: ۳۸-۳۹)

اس میں پوری وضاحت سے ثابت ہو گیا کہ آباء کی تقلید باطل میں حرام ہے، حتیٰ میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔

امام سترطین نے اسی آیت کے ذیل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کے متعلق بھی مسائل و احکام بیان کئے ہیں اور فرمایا ہے:

تعلق قوم بهذه الآية في ذم التقليد
والى، وهذا في الباطل صحيح اما
التقليد في الحق فاصل من اصول
الدين وعصمة من عصم المسلمين
يلجاء اليها الجاهل المقصر عن
درك النظر
(قطبی ص ۱۹۳ ج ۲)

کچھ لوگوں نے اس آیت کو تقلید کی مذمت میں پیش کیا ہے اور یہ باطل کے معاملہ میں تو صحیح ہو، لیکن حق کے معاملہ میں تقلید سے اس کا کوئی تعلق نہیں حق میں تقلید کرنا تو دین کے اصول میں سے ایک مستقل بنیاد ہے اور مسلمانوں کے دین کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ دین کے معاملہ سے تقلید ہی پر اعتماد کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا

اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا

بَلَاءُ إِن كُنْتُمْ إِتَاةَ تَعْبُدُون ۚ (۱۰) إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ

اگر تم اسی کے بندے ہو، اس نے تم پر بھی حرام کیا ہے مردہ جانور اور

الدَّمَ وَلَحْمَ الْخَيْزِرِ وَمَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللَّهِ فَمَن اضْطُرَّ غَيْرَ

اپر اور گوشت سور کا اور جس جانور پر ناک پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا پھر جو کوئی بے اختیار ہو جائے

بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۴)

ذوقا فرمایا کہ اگر زیادتی تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان

خلاصہ تفسیر

اوپر اہل طہیات کے معاملہ میں مشرکین کی غلطی بتلا کر ان کی اصلاح اور اس پر ادائے شکر کی تعلیم بھی ہے۔ اس غلطی میں مشرکین کی موافقت نہ کرنے لگیں اس کے ضمن میں اہل ایمان کو اپنے انعامات کا ذکر لے ایمان والو! (ہماری طرف سے تم کو اجازت ہو کہ) جو شرع کی رو سے پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (برقوت) اور (اس اجازت کے ساتھ) یہ حکم ہو کہ حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو، (زبان سے بھی ہاتھ پاؤں سے خدمت و طاعت بجالا کر بھی اور دل سے ان نعمتوں کو منجانب اللہ سمجھ کر بھی) اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو (اور یہ تعلق ہو نامسلم اور ظاہری پس و پیش شکر بھی ثابت ہے)۔

رابطہ اور پر تو اس کا بیان تھا کہ حلال کو حرام مت کرو، آگے یہ مذکور ہوتا ہے کہ حرام کو حلال مت سمجھو، جیسا کہ مشرکین اس میں مبتلا تھے، مثلاً مردار جانور اور ایسے جانور جن کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، مشرکین ان کو کھایا کرتے تھے، اس سے منع کیا گیا، اسی کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں، ان کے سوا دوسرے جانور دل کو اپنی طرف سے حرام قرار دینا غلطی ہے، اس سے بچھلے مضمون کی تائید ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف (ان چیزوں کو) حرام کیا ہے اور ان چیزوں کو حرام نہیں کیا جن کو تم اپنی طرف سے حرام کر رہے ہو، جیسا کہ گذرا یعنی (مردار جانور) کو (جو باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مر جاوے) اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سب اجزاء کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا ہو (ان سب کو بیشک حرام کیا ہے) پھر بھی (اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (جو کس بہت ہی) بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ تو رکھانے میں) طالب لذت ہو، اور نہ (قدر ضرورت و حاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان چیزوں سے کھانے میں بھی) اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور رحیم کہ ایسے وقت میں یہ رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز میں بھی گناہ اٹھا دیا)

معارف مسائل

حلال کھانے کی برکت اور آیات مذکورہ میں جیسے حرام کھانے کی ممانعت کی گئی ہے اسی طرح حرام کھانے کی سخت حلال طیب چیزوں کے کھانے اور اس پر شکر گزار ہونے کی ترغیب بھی ہے، کیونکہ جس طرح حرام کھانے سے اخلاقِ رذیلیہ پیدا ہوتے ہیں، عبادت کا ذوق جاگرتا ہے، دعا قبول نہیں ہوتی، اسی طرح حلال کھانے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے، اخلاقِ رذیلیہ سے نفرت، اخلاقِ فاضلہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے، عبادت میں دل لگتا ہے، گناہ سے دل گھبراتا ہے، دعا قبول ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب رسولوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے،

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ (۵۱:۳۳)

اور نیک عمل کرو

اس میں اشارہ ہے کہ نیک عمل کرنے میں رزقِ حلال کو بڑا دخل ہے، اسی طرح قبولِ دعا میں حلال کھانا معین اور حرام مانع قبول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے لوگ طویل سفر پریشان حال اللہ کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں، اور یارب یارب کہاتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، مینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام، غذا ان کی حرام، ان حالات میں ان کی دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے (صحیح مسلم، ترمذی، از ابن کثیر)

إِنَّمَا حَرَّمَ، کلمہ انما صر کے لئے آتا ہے، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف وہ چیزیں حرام کی ہیں، جن کا آگے ذکر کیا جاتا ہے، اس کے سوا کچھ حرام نہیں، اس آیت میں تو لفظ انما سے اس کی طرف اشارہ ہوا، اور دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بھی آیا ہے، قُلْ لَا أَجِدُ فِينَا أَوْحِيَ إِلَيَّ مَحْرُومًا عَلَى طَائِعَةِ الْآيَةِ (۱۵:۷) اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ میری وحی میں بجسز ان چند چیزوں کے جن کا ذکر آگے کیا گیا ہے، اور کوئی چیز حرام نہیں۔

مگر اس پر اشکال یہ ہو کہ دوسری آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے ان چند چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، تو یہ حصر اور حرمت نامہ ہی کی نفی کیسے درست ہوگی؟

جواب یہ ہو کہ یہاں مطلق حلال و حرام کا بیان نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حالت و حرمت کا بیان ہے جن کے بائے میں مشرکین مکہ اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے، پھل آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھ لیتے

تھے، یا اپنے اور پر حرام کر لیتے تھے، اس کی مخالفت کی گئی تھی، اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم چستنا ب نہیں کرتے، اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے پرہیز کرتے ہو، اس لئے اس جگہ حصر مطلق نہیں، بلکہ اضافی ہے مشرکانہ عقائد کے بالمقابل۔

آگے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہ چار چیزیں یہ ہیں: میتہ (مردار)، خون، لحم خنزیر، وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر چاروں چیزوں کی مزید تشریحات خود قرآن کریم کی دوسری آیات اور احادیث صحیحہ میں آئی ہیں جن کو ملائے کے بعد ان چاروں چیزوں کے احکام حسب ذیل ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

میتہ جس کو ارد میں مردار کہتے ہیں، اس سے مراد وہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لئے از روئے شرع ذبح کرنا ضروری ہے، مگر وہ بغیر ذبح کے خود بخود مر جائے، یا گلا گھونٹ کر یا کسی دوسری طرح چوٹ مار کر مار دیا جائے تو وہ مردار اور حرام ہو، لیکن خود قرآن کریم کی دوسری آیت أُجِلَّ تَكْفُصِيْدُ الْبَخْرَةِ (۹۶:۵) سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لئے ذبح کرنا شرط نہیں، وہ بلا ذبح بھی جائز ہے، اس بناء پر احادیث صحیحہ میں مچھلی اور ٹڈی کو میتہ سے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے، ایک مچھلی دوسرے ٹڈی، اور دو خون حلال کر دیئے گئے، جگر اور طحال (ابن کثیر، از احمد، ابن ماجہ، دارقطنی)

معلوم ہوا کہ جانوروں میں سے مچھلی اور ٹڈی بغیر ذبح کے حلال ہیں، خواہ وہ خود مر جائیں یا کسی کے مارنے سے مر جائیں، البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے خود پانی کے اوپر آ جائے وہ حرام ہے (جصاص)

اسی طرح وہ شکاری جانور جو قابو میں نہیں کہ ذبح کر لیا جائے اور اس کو بھی بسم اللہ پڑھ کر تیر وغیرہ دھار دار چیز سے زخم لگا دیں تو بغیر ذبح کے حلال ہو جاتا ہے، مطلقاً زخمی ہو جانا کافی نہیں، کسی آلہ جارح تیز دھار سے زخمی ہونا شرط ہے۔

بندوق کی گولی سے شکار مسئلہ: بندوق کی گولی سے کوئی جانور زخمی ہو کر قبل ذبح مر جائے تو وہ ایسا ہے جیسے پتھر یا لاٹھی مارنے سے مر جائے، جس کو قرآن کریم کی دوسری

آیت میں مَوْقُوْدٌ کہا گیا ہے، اور حرام قرار دیا ہے، ہاں مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا جائے تو حلال ہو جائیگا۔

مسئلہ: آجکل بندوق کی ایک گولی نوکدار بنائی گئی ہے، اس کے متعلق بعض ماہر کا خیال ہے کہ تیر کے حکم میں ہے، مگر جہور علماء کے نزدیک یہ بھی تیر کی طرح آلہ جارح نہیں

بلکہ غارتہ پر جس سے بارود کی طاقت کے ذریعہ گوشت پھٹ جاتا ہے، در نہ خود اس میں کوئی دھار نہیں جس سے جانور زخمی ہو جائے اس لئے ایسی گولی کا شکار بھی بغیر ذبح کے جائز نہیں مسئلہ: آیت مذکورہ میں مطلقاً میتہ کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، یہی حکم تمام نجاسات کا ہے کہ جیسے ان کا استعمال حرام ہے اُن کی خرید و فروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے۔ یہاں تک مردار جانور یا ناپاک کوئی چیز یا اختیار خود جانور کو کھلانا بھی جائز نہیں، ہاں ایسی جگہ رکھ دے جہاں سے کوئی کتابی خود کھالے، یہ جائز ہے، مگر خود اٹھا کر ان کو کھلانا جائز نہیں۔ (جصاص، قریبی وغیرہ)

مسئلہ: اس آیت میں میتہ کے حرام ہونے کا حکم عام معلوم ہوتا ہے، جس میں میتہ کے تمام اجزاء شامل ہیں، لیکن دوسری آیت میں اس کی تشریح علی ظاہر قطعہ کے الفاظ کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ مردار جانور کے وہ اجزاء حرام ہیں جو کھانے کے قابل ہیں، اس لئے مردار جانور کی ہڈی، بال جو کھانے کی چیز نہیں وہ پاک ہیں، اور ان کا استعمال جائز ہے، آیت قرآن کریم میں اَصْنُوا ذِئْبًا وَبَارِعًا وَاشْعَارَهَا اَنَّا نَأْكُلُهَا وَمَتَاعًا اِلَىٰ حِينٍ (۸۰: ۱۶) میں اُن جانوروں کے بالوں کو مطلقاً جائز الانتفاع قرار دیا ہے ذبیحہ کی شرط نہیں (جصاص)۔ کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی ہوتی ہے اس لئے وہ دباغت سے پہلے حرام ہے، مگر دباغت دینے کے بعد حلال اور جائز ہے، احادیث صحیحہ میں اس کی مزید تصریح موجود ہے (جصاص) مسئلہ: مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں، ان کا استعمال کسی طرح سے جائز نہیں، اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

مسئلہ: یورپ وغیرہ سے آئی ہوئی چیزیں مابون وغیرہ جن میں چربی استعمال ہوتی ہے، ان سے پرہیز کرنا احتیاط ہے، مگر مردار کی چربی ہونے کا علم یقینی نہ ہونے کی وجہ سے گنجائش ہے، نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابہ کرام ابن عمر، ابو سعید خدری، ابو موسیٰ اشعری نے مردار کی چربی کا صرف کھانے میں استعمال حرام قرار دیا ہے، خارجی استعمال کی اجازت دی ہے، اس لئے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (جصاص)

مسئلہ: دودھ کا بغیر بنانے میں ایک چیز استعمال کی جاتی ہے، جس کو عربی زبان میں اِنْفُز کہا جاتا ہے، یہ جانور کے پیٹ سے نکالی جاتی ہے، اس کو دودھ میں شامل کرنے سے دودھ جم جاتا ہے، اب اگر یہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا ہو تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، مذبح جانور کا گوشت چربی وغیرہ سب حلال ہیں، لیکن غیر مذبح جانور کے پیٹ سے لیا جائے تو اس

میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام عظیم ابو حنیفہ اور امام مالک اس کو پاک قرار دیتے ہیں، لیکن صاحبین امام ابو یوسف و محمد اور ثوری وغیرہ اس کو ناپاک کہتے ہیں۔ (جصاص، قریبی) یورپ اور روس کے غیر اسلامی ملکوں سے جو بغیر بنا ہوا آتا ہے اس میں غیر مذبح جانور کا انفوس استعمال ہونے کا احتمال غالب ہے، اس لئے جمہور فقہاء کے قول پر اس سے پرہیز کرنا چاہئے امام عظیم اور امام مالک کے قول پر گنجائش ہے، ہاں یورپ سے آئے ہوئے بعض غیر ایسے بھی ہیں جن میں خنزیر کی چربی استعمال ہوتی ہے، اور ذبہ پر لکھا ہوا ہوتا ہے، وہ قطعاً حرام اور نجس ہیں۔

خون کے دوسری چیزیں جو آیت مذکورہ میں حرام قرار دی گئی ہے وہ خون ہے لفظ دم بمعنی خون مسئلہ: اس آیت میں اگرچہ مطلق ہے، مگر سورۃ النعام کی آیت میں اس کے ساتھ مَشْفُوح یعنی پینے والا ہونے کی شرط ہے، اَوْ ذَمًا مَشْفُوحًا (۱۲۰: ۱۶) اس لئے باتفاق فقہاء خون منجمد جیسے گردہ، کلی وغیرہ وہ حلال اور پاک ہیں۔

مسئلہ: جب کہ حرام صرف پینے والا خون ہے تو جو خون ذبح کے بعد گوشت میں لگا رہ جاتا ہے وہ پاک ہے، فقہاء و صحابہ و تابعین اور امت کا اس پر اتفاق ہے، اسی طرح مچھر، مکھی، کھمبل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں، لیکن زیادہ ہو جائے تو اس کو بھی دھونا چاہیے (جصاص) مسئلہ: جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے، اور جس طرح تمام نجاسات کی خرید و فروخت بھی اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے، اسی طرح خون کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، اس سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حرام ہے، کیونکہ الفاظ قرآنی میں مطلقاً دم کو حرام فرمایا ہے، جس میں اس کے استعمال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔

مریض کو دوسرے کا خون تحقیق اس مسئلہ کی یہ کہ انسانی خون انسان کا جزء ہے، اور جب بدن دینے کا مسئلہ سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا اصل تقاضا تو یہی ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا درودجہ سے حرام ہو، اول اس لئے کہ اعضاء انسانی کا احترام واجب ہے، اور یہ اُس احترام کے منافی ہے، دوسرے اس لئے کہ خون نجاست غلیظہ ہے اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے۔

لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات میں شریعت اسلام کی دی ہوئی ہولتوں میں غور کرنے سے امور ذیل ثابت ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ خون اگرچہ جزء انسانی ہے، مگر اس کو کسی دوسرے انسان کے بدن میں منتقل

کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کاٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، بجائے کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے، اس لئے اس کی مثال دودھ کی سی ہو گئی جو بدن انسانی سے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے نکلتا اور دوسرا انسان کا جز بنتا ہے اور شریعت اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے، اور ماں پر اپنے بچوں کو دودھ پلانا واجب کیا، جب تک وہ بچوں کے باپ کے نکاح میں رہی طلاق کے بعد ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بچوں کا رزق ہیا کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، وہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلواتے، یا ان کی ماں ہی کو معاوضہ دیکر اس سے دودھ پلواتے، قرآن کریم میں اس کی واضح تصریح موجود ہے:

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَارْزُقُوهُنَّ
أُجُورَهُنَّ ۚ (۶۵-۶۶)

خلاصہ یہ ہے کہ دودھ جزیرہ انسانی ہونے کے باوجود بوجہ ضرورت اس کے استعمال کی اجازت بچوں کے لئے دی گئی ہے، اور علاج کے طور پر بڑوں کے لئے بھی، جیسا کہ عالمگیری میں ہے:

وَلَا بَأْسَ بِأَنْ يَسْعَطَ الرَّجُلُ
بِلَبَنِ الْمَرْأَةِ دِيشَ بِهِ لِلدَّاءِ
(عالمگیری، ص ۳)

اور مخنی ابن قدامہ میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل مذکور ہے (مغنی کتاب البصید ص ۶۱۲) اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں، کیونکہ دودھ بھی خون کی بدلی ہوئی صورت ہے، اور جزیرہ انسان ہونے میں مشترک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دودھ پاک ہے اور خون ناپاک، تو حرمت کی پہلی وجہ یعنی جزیرہ انسانی ہونا تو یہاں وجہ ممانعت نہ رہی، صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا، علاج و دوا کے معاملہ میں بعض فقہاء نے خون کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔

اس لئے انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنے کا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں تو جائز نہیں، مگر علاج و دوا کے طور پر اس کا استعمال اضطراری حالت میں بلاشبہ جائز ہے، اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہ ہو، اور خون دینے سے اس کی جان بچے گا، غالب ہوا ان مشطوں کے ساتھ خون دینا تو اس نفسِ شترانی کی دوسے جائز ہے، جس میں مضطر

کے لئے مردار جانور کھا کر جان بچانے کی اجازت صراحتہ مذکور ہے، اور اگر اضطراری حالت نہ ہو یا دوسری دوا میں بھی کام کر سکتی ہوں تو ایسی حالت میں مسئلہ مختلف تھا ہے، بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ بحث تداوی بالمحرم میں مذکور ہے، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم، اس کا ایک مستقل رسالہ بھی اس موضوع پر شائع ہو گیا ہے، جس کا نام ہے "اعضائے انسانی کی پیوندکاری" اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

تحريم خنزير

تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لحم خنزیر ہے، آیت میں حرمت لحم یعنی گوشت کی تخصیص نہیں، بلکہ اس کے تمام اجزاء ہڈی، کھال، بال، پٹھے سب ہی باجماع امت حرام ہیں، لیکن لفظ لحم بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دوسرے حرام جانوروں کی طرح نہیں ہے، کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہو سکتے ہیں، اگرچہ کھانا حرام ہی ہے، کیونکہ خنزیر کا گوشت ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا، کہ وہ نجس العین بھی ہے حرام بھی، صرف جڑا سینے کے لئے اس کے بال کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا ہے (جصاص، قرطبی)

مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنَةُ اللَّهِ

جو نعتی چیز جس کو آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ جانور ہے جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں: اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے، اور بوقت ذبح اسی غیر اللہ کا نام لیا جائے، یہ صورت باتفاق و باجماع امت حرام ہے، اور یہ جانور میتہ ہے، اس کے کسی جُز سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ صورت آیت مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنَةُ اللَّهِ کا مدلول صریح ہے، جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، یعنی اس کا خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو، لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے جیسے بہت سے نادان فاسقان بزرگوں پیروں کے نام پر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں، لیکن ذبح کے وقت اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں، یہ صورت بھی باتفاق فقہاء حرام اور مذکورہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات مفسرین فقہاء نے اس کو بھی مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنَةُ اللَّهِ کا مدلول صریح قرار دیا ہے، جیسا کہ حاشی بیضاوی میں ہے:

فَكُلْ مَا تَدْرِي عَلَيْهِ يَلْعَنُ اللَّهُ
اللَّهُ فَهُوَ حَرَامٌ وَإِنْ دُبِحَ
بِإِسْمِ اللَّهِ فَهُوَ حَرَامٌ ۖ

بِاسْمِ اللَّهِ تَعَالَى حَيْثُ اجْتَمَعَ
الْعُلَمَاءُ لَوْ أَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ
ذَبِيحَةً وَفَصَدَّ يَدَ بَحِيهِ
النَّقَرُ إِلَى غَيْرِ اللَّهِ صَاسَةً
مُرَكَّنًا وَذَبِيحَتُهُ ذَبِيحَةُ مُرَكَّنٍ

نیز در مختار کتاب الذبائح میں ہے:

ذَبْحٌ لِعَدُوٍّ وَمِثْلُهُ لِحَبِيبٍ
كُلُّ أَحَدٍ مِنَ الْعُظَمَاءِ يَحْتَرِمُ
لِأَهْلِهِ أَهْلًا بِهِ لِيُغَيِّرَ اللَّهُ وَكُلُّ
ذِكْرٍ اسْمُ اللَّهِ وَآقَرُكَ الثَّالِثِي

نام لیا ہوا اس کو کہ علماء فقہاء کا اتفاق ہو
کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے قرب کے لئے
اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد
ہو جاوے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا
ذبیحہ کہلاتے گا۔

”کسی امیر یا بڑے کے آگے جانور ذبح کیا
تو وہ حرام ہوگا، کیونکہ وہ مائیل بہ بغیر
اللہ میں داخل ہے، اگرچہ بوقت ذبح
اللہ ہی کا نام لیا ہو۔ اور شامی نے

اور بعض حضرات نے اس صورت کو مائیل بہ بغیر اللہ کا مدلول صریح تو نہیں لایا
کیونکہ وہ بحیثیت عربیت تکلف سے خالی نہیں، مگر بوجہ اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی
نیت کے اس کو بھی مائیل بہ بغیر اللہ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے، احتسار کے
نزدیک یہی وجہ احوط اور اسلم ہے۔

نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذَبَحَ
عَلَى النُّصُبِ نُصْبٌ اِنْ تَمَّامٌ حَيْثُ ذَبَحَ لِقَابِ اللَّهِ، جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہے
یعنی یہ ہیں کہ وہ جانور جس کو مجوس باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے، اس سے پہلے وَمَا أَهْلٌ
بِهِ لِيُغَيِّرَ اللَّهُ کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مائیل بہ کا مدلول صریح تو وہی جانور ہے
جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور ذَبَحَ عَلَى النُّصُبِ (۳۱۵) کے بالمقابل آیا ہے جس میں
غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں، صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیت سے ذبح کرنا اور
اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے قرب کے لئے مگر بوقت ذبح

عہد، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر محض ذبح کے عمل سے کسی بڑے کی تعظیم مقصود ہو تو یہ حرام ہے، لیکن اگر مقصد یہاں کرنا
ہو اور اس جہان کیلئے جانور ذبح کیا جائے، یعنی اس کا گوشت یہاں کو کھلانا مقصود ہو، محض ذبح کے عمل سے تعظیم مقصود
نہ ہو تو یہ سنت ضیافت ہے اور جائز ہے اور دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں ہیزائی کیلئے گوشت کا حصول
ہوتا ہے اور پہلی صورت میں تعظیم کی علامت کے طور پر جانور کو ذبح کرنا مقصود ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا گوشت
کھا یا جائے گا یا نہیں؟ چنانچہ مختار میں آگے ہی وضاحت کی گئی ہے: وَلَوْ ذَبَحَ لِلضَّيْفِ لَا يَحِلُّ لَدَنِّهِ سَنَةِ الْفِيلِ
وَأَكْرَامِ الضَّيْفِ أَكْرَامُ اللَّهِ تَعَالَى. وَالْقَادِقُ أَنَّهُ إِنْ قَدَّ مَهْلًا كُلَّ مَهْلًا كَانَ الذَّبْحُ لِلَّهِ وَالْمَنْفَعَةُ لِلضَّيْفِ
أَوَّلُ لَوْلِيهِ أَوَّلُ لَوْلِيهِ وَإِنْ لَمْ يَقْدَمْ مَهْلًا كُلَّ مَهْلًا لَمْ يَكُنْ لَتَعْظِيمِ غَيْرِ اللَّهِ تَعَالَى
علامہ شامی نے اس کی شرح میں مزید تشریح فرمادی ہے (رد المحتار ص ۳۰۹ و ۳۱۰) بحوالہ شامی ۲۴ و ۲۵

اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ شعیب حکیم الامت)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو خستہ یا رکبا ہے، اُن کی عبارت یہ ہے:

وَجَرَتْ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالْقَبِيحِ
بِاسْمِ الْمُقْصُودِ بِالذَّبْحِ بِيَحْتِ
ذَلِكَ فِي إِسْنَعْنَالِهِمْ حَتَّى غَبَرَ
بِهِ عَنِ الشَّيْءِ الَّذِي هِيَ عَلَيْهِ
التَّخْرِيمِ (تفسیر قرطبی ص ۲۵۸)

امام قرطبی نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرام میں سے دو حضرات حضرت علی مرتضیٰ
رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں فرزدق شاعر کے باب فالتب نے ایک اونٹ ذبح
کیا تھا، جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کو بھی
مَائِلٌ بِغَيْرِ اللَّهِ کہہ کر اس میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، اور سب صحابہ کرام نے اس کو قبول
کیا، اسی طرح امام مسلم کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث
نقل کی جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہ سے سوال کیا کہ اُمّ المؤمنین
ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار بھی لوگوں میں سے ہیں، اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار
ہوتا رہتا ہے، یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں
یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہ نے فرمایا:

أَمَّا مَا ذَبَحَ لَكَ الْيَتِيمُ فَلَا
تَأْكُلُوهُ وَلَكِنْ كُلُوا مِنْ أَكْبَارِهِمْ
(تفسیر قرطبی ص ۲۵۸)

الغرض یہ صورت ثانیہ جس میں نیت تو تقرب الی غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ کا
نام لیا جائے، اول تو اشتراک علت یعنی نیت تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَائِلٌ بِغَيْرِ اللَّهِ
اللہ کے حکم میں ہو، دوسرے آیت وَمَا ذَبَحَ عَلَى النُّصُبِ کا بھی مدلول ہے اس لئے یہ بھی حرام ہے۔
تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو کان کاٹ کر یا کوئی دوسری علامت لگا کر تقرب الی
غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لئے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے
کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں، یہ جانور مَائِلٌ بِغَيْرِ اللَّهِ اور مَائِلٌ بِغَيْرِ اللَّهِ
عَلَى النُّصُبِ دونوں میں داخل نہیں، بلکہ اس قسم کے جانور کی بھیر یا سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہے،
اور حکم ان کا یہ ہے کہ یہ نفل تو نبض شتران حرام ہے، جیسا کہ آیت مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ تَحْتِهَا

وَلَا تَسْكَبْتُمْ بِهِ (۴۳:۵) میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتا بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے عقیدہ، باطلہ کی تائید و تقویت ہوتی ہے، اس لئے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے۔

مگر شرعی اصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوا، اسی کا ملوک ہے، اگرچہ وہ اپنے غلط عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میری ملک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہو گیا، مگر شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے، وہ جانور بدستور اس کی ملک میں ہے۔ اب اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا ہبہ کر دے تو اس کے لئے یہ جانور حلال ہے، جیسا بکثرت ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام پر کر گئے وغیرہ کو اپنے نزدیک وقف کر کے چھوٹے بڑے ہندوؤں کو ہار دیا، جو چاہیں کریں، یہ ہندوؤں کے بھاری اُن کو مسلمانوں کے ہاتھ بھی فروخت کر دیتے ہیں۔

یہ اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں، کہ بکرا، بامرغا چھوڑ دیتے ہیں، اور مزارات کے مجاورین کو خستیاں دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کر دیتے ہیں، تو جو لوگ ان جانوروں کو اُن لوگوں سے خرید لیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کے لئے ان خریدنا اور ذبح کر کے کھانا اور فروخت کرنا حلال ہے۔

نذر غیر اللہ کا مسئلہ یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً مٹھائی کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (منّت) کے طور سے، ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزار پر چڑھاتے ہیں، حضرات فقہار نے اس کو بھی اشتراکِ علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مآ اُھلَیہ یَغْبِرُ اللہ کے حکم میں مسترد کر دیا ہے، اور اس کے کھانے پینے، دوسروں کو کھلانے اور بیچنے خریدنے سب کو حرام کہا ہے، کتب فقہ بحر اترانق وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں، یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نص شرعی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

اضطرار و مجبوری کے احکام آیت مذکورہ میں چار چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد ایک حکم استثنائی مذکور ہے فَتَمِنَ اضْطُرَّ غَیْرُ بَاطِلٍ وَلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ اِنَّ اللہَ غَفُورٌ رَّحِیْمٌ اس حکم میں اتنی آسانی کر دی گئی ہے کہ جو شخص بھوک سے بہت ہی بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ تو کھانے میں طالب لذت ہو اور نہ قد بضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس حالت میں اُن حرام چیزوں کو کھالینے سے بھی

اس شخص کو کوئی گناہ نہیں ہوتا، بے شک اللہ تعالیٰ میں بڑے غفور و رحیم۔ اس میں مضطر کے لئے جان بچانے کے واسطے دو شرطوں کے ساتھ ان حرام چیزوں کے کھالینے سے بھی گناہ اٹھا دیا گیا ہے۔

مضطر، شرعی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی جان خطرہ میں ہو، معمولی تکلیف یا ضرورت سے مضطر نہیں کہا جاسکتا، تو جو شخص بھوک سے ایسی حالت پر پہنچ گیا کہ اگر کچھ نہ کھائے تو جان جاتی ہے گی، اس کے لئے دو شرطوں کے ساتھ یہ حرام چیزیں کھالینے کی گنجائش دی گئی ہے، ایک شرط یہ ہے کہ مقصود جان بچانا ہو کھانے کی لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھائے جو جان بچانے کے لئے کافی ہو، پیٹ بھر کر کھانا یا قدر ضرورت سے زائد کھانا اس وقت بھی حرام ہے۔

اہم فائدہ یہاں قرآن عزیز نے اضطرار کی حالت میں بھی حرام چیزوں کے کھالے کو حلال نہیں فرمایا، بلکہ لَا اِثْمَ عَلَیْہِ فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو اب بھی اپنی جگہ حرام ہی ہیں، مگر اس کھانے والے سے بوجہ اضطرار کے استعمال حرام کا گناہ معاف کر دیا گیا، حلال ہو جانے اور گناہ معاف کر دینے میں بڑا فرق ہے، اگر اضطراری حالت میں ان چیزوں کو حلال کر دینا مقصود ہوتا تو حرمت سے صرف استثناء کر دینا کافی ہوتا، مگر یہاں صرف استثناء پر اکتفاء کر دینے کے بجائے لَا اِثْمَ عَلَیْہِ کا اضافہ فرما کر اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ حرام تو اپنی جگہ حرام ہی ہے، اور اس کا استعمال گناہ ہی ہو، مگر مضطر سے یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔

حالت اضطرار میں دوا کے آیت مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جس شخص کی جان خطرہ میں ہو وہ حرام چیزوں کا استعمال جان بچانے کے لئے بطور دوا کے حرام چیز کو استعمال کر سکتا ہے، مگر آیت مذکورہ ہی کے اشارہ سے اس میں چند شرطیں معلوم ہوتی ہیں،

اول یہ کہ حالت اضطرار کی ہو، خطرہ جان جانے کا ہو، معمولی تکلیف و بیماری کا حکم نہیں ہے، دوسرے یہ کہ بجز حرام چیز کے اور کوئی چیز علاج و دوا کے لئے مؤثر نہ ہو یا موجود نہ ہو، جیسے شدید بھوک کی حالت میں استثناء اُسی وقت ہی جب کہ کوئی دوسری حلال غذا موجود و مقدور نہ ہو، تیسرے یہ کہ اس حرام کے استعمال کرنے سے جان بچ جانا یقینی ہو جیسے بھوک سے مضطر کے لئے ایک دو قلم حرام گوشت کا کھالینا عادتاً اس کی جان بچانے کا یقینی سامان ہے، اگر کوئی دوا ایسی ہے کہ اس کا استعمال مفید تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے شفاء یقینی نہیں تو اس دوا حرام کا استعمال آیت مذکورہ کے استثنائی حکم میں داخل نہ ہو کر جائز نہیں ہو گا، اس کے ساتھ مزید دو شرطیں آیت قرآنی میں منصوص ہیں، کہ اس کے

استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدر ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔
آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ
ہر حرام و ناپاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں بافتاق فقہاء امت
جائز ہے، ان شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطرار کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو
یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عارضہً یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت
حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدر ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

غیر اضطراری حالت میں عام علاج و اضطراری حالت کا مسئلہ تو شرائط مذکورہ کے ساتھ نص قرآن
دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال سے ثابت اور احتماعی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی
ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر
فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطرار اور ان تمام شرائط کے جو اوپر مذکور ہوئے حرام دوا کا استعمال جائز
نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان
کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)"

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا،
وہ واقعہ غزینہ کا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ادویہ کا دودھ اور پشیا استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے
ان کو شفاء ہو گئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہو،
اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائط اضطرار مذکورہ موجود نہ ہوں حرام
دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام و ناپاک دواؤں کی کثرت اور ابتلا
عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری
حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

کافی الدوا المختار قبیل فصل البیرو

اختلاف فی التداوی بالمحرم و
ظاہر المذہب المنع کافی

در مختار میں فصل بیر سے پہلے مذکور ہے
حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے
میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البیرو لکن نقل المصنف
ثم وھمنا عن العادی قیل
یرخص اذا علّم فیہ الشفاء
ولم یعلّم دوا اخر کما رخص
فی الخمر للعطشان وعلیہ
الفتویٰ و مثله فی العالم کثیر
ص ۳۵۵ ج ۵

یعنی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ
پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے ان تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو روپ
وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیا کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں
حرام و نجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط
بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَسْتُرُونَ

جے تک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لپتے ہیں اس پر

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أَوْ لِيكَ مَا يَكُونُ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارُ وَلَا

تھوڑا سا مال وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يَكْلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے لئے ہے

أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَلَاءِ

عذاب دردناک، یہی ہیں جنہوں نے خرید اگر اسی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۖ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَلَ

بدلے بخشش کے، مگر کس قدر صبر کریں گے ان پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمایا

استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدر ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔
آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ
ہر حرام و ناپاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں بافتاق فقہاء امت
جائز ہے، ان شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطرار کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو
یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عارضہً یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت
حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدر ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

غیر اضطراری حالت میں عام علاج و اضطراری حالت کا مسئلہ تو شرائط مذکورہ کے ساتھ نص قرآن
دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال سے ثابت اور احتماعی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی
ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر
فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطرار اور ان تمام شرائط کے جو اوپر مذکور ہوئے حرام دوا کا استعمال جائز
نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان
کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)"

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا،
وہ واقعہ غزینہ کا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ادویہ کا دودھ اور پشیا استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے
ان کو شفاء ہو گئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہو،
اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائط اضطرار مذکورہ موجود نہ ہوں حرام
دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام و ناپاک دواؤں کی کثرت اور ابتلا
عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری
حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

کافی الدوا المختار قبیل فصل البیہر

اختلاف فی التداوی بالمحرم و
ظاہر المذہب المنع کافی

در مختار میں فصل بیر سے پہلے مذکور ہے
حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے
میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البحر و لکن نقل المصنف
ثُمَّ وَهَمْنَا مِنَ الْعَادَى قَبِيل
بِرْخَصٍ إِذَا عَلِمَ فِيهِ الشِّفَاءُ
وَلَمْ يُعْلَمْ دَوَاؤُ الْخُرْكَ مَا رَخَصَ
فِي الْخَمْرِ لِلْعَطْشَانِ وَعَلَيْهِ
الْفَتْوَى، وَمِثْلُهُ فِي الْعَالَمِ الْكَبِيرَةِ
ص ۳۵۵ ج ۵

یعنی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ
پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے ان تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو روپ
وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیاء کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں
حرام و نجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط
بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَسْتُرُونَ

جے تک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لپتے ہیں اس پر

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أَوْ لِيكَ مَا يَکُونُ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارُ وَلَا

تھوڑا سا مال وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يُحْكِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے لئے ہے

أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَلَاءِ

عذاب دردناک، یہی ہیں جنہوں نے خرید اگر اسی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَلَ

بدلے بخشش کے، مگر کس قدر صبر کر رہے ہیں دوزخ پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمایا

الْكِتَابِ بِالْحَقِّ، وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ

کتاب سچی ، اور جنہوں نے اختلاف ڈالا کتاب میں وہ بے شک ضد میں

بَعِيدٌ

دور جا پڑے

خلاصہ تفسیر ربط آیات | اس سے پہلی آیات میں ان حرام چیزوں کا ذکر تھا جو محسوسات میں سے ہیں، اگلی آیات میں ایسے حرام کاموں کا ذکر جو محسوس نہیں بلکہ باطنی اور ظاہری اعمال شریک ہیں، مثلاً علمائے یہود میں یہ مرض تھا کہ عوام سے رشوت لیکر ان کے مطلب کے موافق غلط فتوے دیدیتے تھے، اور توراتیت کی آیات میں تحریف کر کے ان کے مطلب کے موافق بناتے تھے، اس میں امت محمدیہ کے علماء کو بھی تنبیہ ہو کہ وہ ایسے افعال سے اجتناب کریں، کسی نفسانی غرض سے احکام حق کے اظہار میں کوتاہی نہ کریں۔

دین فروشی کی سزا | اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مصلحت) کا اخفاء کرتے ہیں اور اس (خیانت) کے معاوضہ میں دنیا کی (منازع قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے پیٹ میں آگ (کے انگٹھے) بھر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ توقیت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (گناہ معاف کر کے) ان کی صفائی کریں گے، اور ان کو سزائے دردناک ہوگی، یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں تو ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور آخرت میں (مغفرت چھوڑ کر عذاب (سزا) میں) سو (شاباش) ان کی ہمت کو) دوزخ میں جانے کے لئے کیے باہمت ہیں (اور) یہ (ساری مذکورہ سزائیں) ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا، اور جو لوگ (ایسی ٹھیک ٹھیک بھیجی ہوئی کتاب میں بے راہی اختیار) کریں، وہ ظاہر ہے کہ بڑی دور (دوراز) کی خلاف (ورزی) میں (مبتلا) ہوں گے اور ایسی خلاف ورزی پر ضرور ایسی ہی سخت سزاؤں کا استحقاق ہوگا۔

معارف مسائل

مسئلہ: آیات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص مال کے لالچ سے حکیم شرعی کو بدل دے، وہ جو یہ مال حرام کھاتا ہے گویا اپنے پیٹ میں جہنم کے انگٹھے بھر رہا ہے، کیونکہ اس عمل کا انجام یہی ہے، اور بعض محقق علماء نے فرمایا کہ مالی حرام درحقیقت جہنم کی آگ کی ہر

اگرچہ اس کا آگ ہونا دنیا میں محسوس نہیں ہوتا، مگر مرنے کے بعد اس کا یہ عمل آگ کی شکل میں سامنے آجائے گا۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

نیکی کچھ یہی نہیں کہ تم کو رو اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کی

وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ

لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے کہ جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور

وَالنَّبِيِّنَ، وَآلَى الْمَالِ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَ

سب کتابوں پر اور یتیموں پر اور غنیمت کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو

الْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ، وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ

محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور قائم رکھے

الصَّلَاةَ وَآلَى الزَّكَاةَ، وَالْمُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا

نماز اور دیا کرے زکوٰۃ، اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں،

وَالصَّادِقِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ

اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت یہی لوگ

الَّذِينَ صَدَقُوا، وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

ہیں سچے اور یہی ہیں پرہیزگار

ربط از بیان ہستران | شروع سورت سے یہاں تک تقریباً نصف سورۃ بقرہ،

زیادہ روئے سخن منکرین کی طرف تھا، کیونکہ سب اول قرآن

کی حقانیت کا اثبات کیا، اس ضمن میں اس کے ماننے والے اور نہ ماننے والے فسوق کا ذکر

کیا، پھر توحید و رسالت کو ثابت کیا، پھر اولاد ابراہیم علیہ السلام پر انعامات و احسانات کو

ایضاً بیان کیا، پھر ایمان کی بات فرمائی، وہاں سے قبلہ کی بحث چلی، اور اس کو بیان کر کے صفحہ

دومہ کی بحث پر ختم کیا۔

پھر توحید کے اثبات کے بعد شرک کے اصول و فروع کا ابطال کیا، اور یہاں تک یہی

کے جوابات ضمنی، اسی لئے اس آیت کو احکام اسلامیہ کی ایک نہایت جامع آیت کہا گیا ہے۔ اس کے بعد بعترہ کے ختم تک تقریباً اسی آیت کی مزید تشریحات ہیں، اس آیت میں اصولی طور سے تمام احکام شرعیہ، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق کا اجمالی ذکر آ گیا ہے۔

پہلی چیز اعتقادات ہیں، اس کا ذکر مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ میں مفصل آ گیا، دوسری چیز اعمال یعنی عبادات اور معاملات ہیں، ان میں سے عبادات کا ذکر وَالَّذِيْ اَتَى الزَّكٰوةَ تک آ گیا، پھر معاملات کا ذکر وَالْمُؤْتُوْنَ بِعَهْدِهِمْ سے کیا گیا، پھر اخلاق کا ذکر وَالصّٰبِرِيْنَ سے کیا گیا، آخر میں بتلادیا کہ سچے مومن وہی لوگ ہیں جو ان تمام احکام کی پیروی مکمل کریں اور انہی کو تقویٰ شعار کہا جاسکتا ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے میں بہت سے بلیغ اشارات ہیں، مثلاً مال کو حشر چ کرنے میں غلّہ خجّہ کی قید لگا دی، جس میں تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ خجّہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ مال خرچ کرنے میں کوئی نفسانی غرض نام و نمود کی شامل نہ ہو، بلکہ اخلاص کامل کے ساتھ صرف اللہ جلّ شانہ کے ساتھ محبت اس حشر چ کرنے کا داعیہ ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر مال کی طرف راجع ہو تو مراد یہ ہوگی کہ اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرنا موجب ثواب ہے جو انسان کو محبوب ہو، بیکار چیزیں جو پھینکنے کی تھیں ان کو دے کر صدقہ کا نام کرنا کوئی صدقہ نہیں، اگرچہ پھینکنے کی نسبت سے بہتر یہی ہے کہ کسی کے کام آسے، تو اس کو دیدے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ آتٰی میں جو اس کا مصدر آیتا۔ مفہوم ہوتا ہے اس کی طرف ضمیر راجع ہو، اور معنی یہ ہوں کہ وہ اپنے خرچ کرنے پر دل سے راضی ہو، یہ نہ ہو کہ حشر چ تو کر رہا ہے مگر اندر سے دل دکھ رہا ہے۔

امام جصاصؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ تینوں ہی چیزیں مراد میں داخل ہوں، پھر اس جگہ مال کے خرچ کرنے کی دو صورتیں مقدم بیان کر دیں، جو زکوٰۃ کے علاوہ ہیں، زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا، شاید تقدیم کی وجہ یہ ہو کہ عام طور سے ان حقوق میں غفلت اور کوتاہی برتی جاتی ہے، صرف زکوٰۃ ادا کر دینے کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اسی سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ مالی فرض صرف زکوٰۃ سے پورا نہیں ہوتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت جگہ پر مال خرچ کرنا فرض و واجب ہوتا ہے (جصاص قرطبی)

جیسے رشتہ داروں پر خرچ کرنا کہ جب وہ کمانے سے معذور ہوں تو نفقہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے، کوئی مسکین غریب مر رہا ہے اور آپ اپنی زکوٰۃ ادا کر چکے ہیں، مگر اس وقت مال خرچ کر کے اس کی جان بچانا فرض ہے۔

اسی طرح ضرورت کی جگہ مسجد بنانا یا دینی تعلیم کے لئے مدارس و مکاتب بنانا یہ سب فرائض مالی میں داخل ہیں، فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ کا ایک خاص قانون ہے اس کے مطابق ہر مال میں زکوٰۃ کا ادا کرنا ضروری ہے، اور یہ دوسرے مصارف ضرورت و حاجت پر موقوف ہیں، جہاں ضرورت ہو خرچ کرنا فرض ہو جائے گا جہاں نہ ہو فرض نہیں ہوگا۔

جن لوگوں پر مال خرچ کرنا ہے، مثلاً ذوی القربی، مساکین، مسافر، سوال کرنے والے فقیران سب کو تو ایک انداز سے بیان فرمایا، پھر وَالَّذِيْ اَتَى الزَّكٰوةَ میں، حرف فی

بڑھاکر اشارہ کر دیا کہ ملوک غلاموں کو مال کا مالک بنانا مقصود نہیں، بلکہ ان کے مالک سے خرید کر ان کے آزاد کرنے پر خرچ کیا جائے، اس کے بعد اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتٰی الزَّكٰوةَ کا ذکر بھی

اسی طریق پر آیا، جیسے دوسری چیزوں کا ذکر ہے، آگے معاملات کا باب بیان کرنا تھا اس میں اسلوب (طریق) بدل کر بجائے صیغہ ماضی استعمال کرنے کے وَالْمُؤْتُوْنَ صِيْغَةً اِسْمِ فاعِلٍ استعمال کیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس میں ایفاء عہد کی عادت دائمی ہونا چاہیے، اتفاقی طور پر کوئی معاہدہ پورا کر دے تو یہ ہر کافر ناجبر بھی کہیں نہ کہیں کرتا ہے، اس کا اعتبار نہیں اسی طرح معاملات کے باب میں صرف ایفاء عہد کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اگر غور کیا جائے تو تمام معاملات بیع و شراء، اجارہ، شرکت سب ہی کی روح ایفاء معاہدہ ہے۔

اسی طرح آگے اخلاق یعنی اعمال باطنہ کا ذکر کرنا تھا، ان میں سے صرف صبر کو بیان کیا گیا، کیونکہ صبر کے معنی ہیں نفس کو قابو میں رکھنے اور ہزیموں سے بچانے کے، اگر غور کیا جائے تو تمام اعمال باطنہ کی اصل روح صبریہ ہے، اسی کے ذریعہ اخلاق فاضلہ حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ اخلاق رذیلہ سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایک اور تغیر اسلوب بیان میں یہاں یہ کیا گیا کہ پہلے وَالْمُؤْتُوْنَ ذکر کیا تھا یہاں وَالصّٰبِرِيْنَ نہیں بلکہ وَالصّٰبِرِيْنَ فرمایا، حضرات مفتخرین نے فرمایا کہ یہ نصب علی المدح ہے، جس کی مراد یہ ہے کہ اس جگہ لفظ مدح مقدر ہو اور صابرین اس کا مفعول ہو، یعنی ان سب نیکو کار لوگوں میں خصوصیت سے قابل مدح صابرین ہیں، کیونکہ صبر ہی ایک ایسا ملکہ اور ایسی قوت ہے جس سے تمام اعمال مذکورہ میں مدد ملی جاسکتی ہے، اس طرح آیت مذکورہ میں دین کے تمام شعبوں کے اہم اصول بھی آگئے ہیں، اور بلیغ اشارات سے ہر ایک کی اہمیت کا درجہ بھی معلوم ہو گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ ۖ الْحُرُّ

اے ایمان دار فرض ہوا تم پر قصاص، برابری کرنا مقتولوں میں، آزاد کے بدلے

بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ ۚ الْأَنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۖ فَمَنْ عَفَىٰ عَنْهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ

آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت پھر جسکو معاف کیا جکا اس کے بھائی کی طرف

فَاتَّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدْءُ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۚ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ

کچھ بھی توابعاری کرنی چاہئے موافق دستور کے اور ادا کرنا چاہئے اس کو غور کے ساتھ یہ آسانی ہوتی

مِّن تَرَبُّكُمُ وَرَحْمَةٌ مِّن رَّبِّكَ ۚ فَكُلُّهُ عَنَّا بِ

تمہارے رب کی طرف سے اور ہر بات پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس کے لئے ہر عذاب

الْيَمِّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ

درذناک، اور تمہارا واسطہ قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمندو! تاکہ تم

تَتَّقُونَ ﴿۱۷۱﴾

بچتے رہو۔

رابط آیات اور خلاصہ تفسیر

اس سے پہلے آیات کی تفسیر میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان آیات میں اجمالی طور پر نیک اور غوی کے اصول بتلا دیئے گئے ہیں، آگے اُن کی جزئی تفصیلات آئیں گی جن کو ابواب البر کہا جاسکتا ہے، آگے انہی ابواب البر کے کچھ احکام جزئیہ کا بیان ہوتا ہے، جو ضرورت اور حالات و واقعات کے تابع بیان ہوئے ہیں۔

اے ایمان والو تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین

حکم اول قصاص (بقتل عمد) کے بارے میں (یعنی ہر) آزاد آدمی کو قتل کیا جائے ہر

دوسرے، آزاد آدمی کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) غلام (دوسرے ہر) غلام کے عوض

میں اور (اسی طرح ہر) عورت (دوسری ہر) عورت کے عوض میں (گویہ قاتلین بڑے

درجہ کے اور مقتولین چھوٹے درجہ کے ہوں، جب بھی سب برابر قصاص لیا جاوے گا، یعنی قاتل کو

سزائیں قتل کیا جاوے گا، ہاں جس (قاتل) کو اس کے فریق (معتد) کی طرف سے کچھ معافی

ہو جاوے (مگر پوری معاف نہ ہو) تو اس سے سزائے قتل سے تو بری ہو گیا، لیکن دیت یعنی خونہا کے طور پر ایک معین مقدار سے مال بذمہ قاتل واجب ہو جاوے گا، تو اس وقت فریقین کے ذمہ ان دو امر کی رعایت ضروری ہے، مدعی یعنی وارث مقتول کے ذمہ (تو) معقول طور پر (اس مال کا) مطالبہ کرنا کہ اس کو زیادہ تنگ نہ کرے) اور (مدعا علیہ یعنی قاتل کے ذمہ) خوبی کے ساتھ (اس مال کا) اس (مدعی) کے پاس پہنچا دینا کہ مقدار میں کمی نہ کرے، اور خواہ مخواہ ٹالے نہیں) یہ (قانون دیت و عفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزائیں) تخفیف پر اور (شاہانہ) ترحم ہے (ورنہ بجز سزائے قتل کے کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی) پھر جو شخص اس (قانون) کے (مقرر ہوئے) بعد تعدی کا مرتکب ہو (مثلاً کسی پر جھوٹا یا اشتباہ میں دعویٰ قتل کا کر دے یا معاف کر کے پھر قتل کی پیروی کرے) تو اس شخص کو رآخیت میں (بڑا دردناک عذاب ہو گا، اور فہم لوگو! اس قانون) قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہو (کیونکہ اس قانون کے خوف سے ارتکاب قتل سے ڈریں گے، تو کسی جانیں بچیں گی)، ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے قانون امن کی خلاف ورزی سے) پرہیز رکھو گے۔

معارف مسائل

قصاص کے لغوی معنی ممانعت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کسی پر کیا اتنا ہی بدلہ لینا دوسرے کے لئے جائز ہے، اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں، قرآن مجید کی آیت میں عنقریب اسی سورت میں اس کی زیادہ وضاحت اس طرح آتی ہے، فَاَعْتَدْ لِّوَاَعْلِيَّهِ بِمِثْلِ مَا عَتَذَىٰ عَلَيْكَ، (۱۷۲:۱۷۳) اور سورۃ نحل کی آخری آیات میں وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ، (۱۷۶:۱۷۷) اسی مضمون کے لئے آیا ہے۔

اس لئے اصطلاح شرع میں قصاص کہا جاتا ہے قتل کرنے اور زخم لگانے کی اس سزا کو جس میں سادات اور ممانعت کی رعایت کی گئی ہو۔

مسئلہ: قتل عمدہ کہ ارادہ کر کے کسی کو آہنی ہتھیارے یا ایسی چیز سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہہ سکے قتل کیا جائے، قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینا، ایسے ہی قتل کے جرم کے ساتھ مخصوص ہے۔

مسئلہ: ایسے قتل میں جیسے آزاد آدمی آزاد کے عوض میں قتل کیا جاتا ہے ایسے ہی غلام کے عوض میں بھی غلام، اور جس طرح عورت کے عوض میں عورت ماری جاتی ہے، اسی طرح مرد کی عورت کے مقابلہ میں قتل کیا جاتا ہے۔

آیت میں آزاد کے مقابل آزاد اور عورت کے مقابل عورت کا جو ذکر آیا ہے یہ اس خاص واقعہ کی بناء پر ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ابن کثیرؒ نے باسناد ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ زمانہ اسلام سے کچھ پہلے دو عرب قبیلوں میں جنگ ہو گئی، طرفین کے بہت سے آدمی آزاد اور غلام مرد اور عورتیں قتل ہو گئے، ابھی ان کے معاملہ کا تصفیہ ہونے نہیں پایا تھا کہ زمانہ اسلام شروع ہو گیا، اور یہ دونوں قبیلے اسلام میں داخل ہو گئے، اسلام لانے کے بعد اپنے اپنے مقتولوں کا قصاص لینے کی گفتگو شروع ہوئی، تو ایک قبیلہ جو قوت و شوکت والا تھا، اس نے کہا کہ ہم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں تمہارا آزاد آدمی اور عورت کے بدلے میں مرد قتل نہ کیا جائے۔

قصاص کے متعلق اسلام کا عادلانہ قانون اور قصاص کے مسائل
ان کے جاہلانہ اور ظالمانہ مطالبہ کی تردید کرنے کیلئے آیت نازل ہوئی **الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَى بِالْأُنْثَى** جس کا حاصل ان کے مطالبہ کو رد کرنا تھا کہ

غلام کے بدلے آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے اگرچہ وہ قاتل نہ ہو، اسلام نے اپنا عادلانہ قانون یہ نافذ کر دیا کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے، اگر عورت قاتل ہے تو کسی بے گناہ مرد کو اس کے بدلے میں قتل کرنا اسی طرح قاتل اگر غلام ہے تو اس کے بدلے میں کسی بے گناہ آزاد کو قتل کرنا ظلم عظیم ہے، جو اسلام میں قطعاً برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے گا، عورت ہو یا غلام، قاتل عورت اور غلام کے بجائے بے گناہ مرد یا آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں۔

آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت کوئی مرد قتل کرے یا غلام کو کوئی آزاد قتل کرے تو اس سے قصص نہیں لیا جائے گا، مشرآن مجید کی اسی آیت کے شروع میں **الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ** اس عموم کی واضح دلیل ہے، اور دوسری آیات میں اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے، مثلاً **الْقَتْلُ بِالنَّفْسِ** وغیرہ۔

مسئلہ: اگر قاتل عہد میں قاتل کو پوری معافی دیدی جائے، مثلاً مقتول کے وارث صرف اس کے دوست تھے، اور ان دونوں نے اپنا حق معاف کر دیا، تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہیں رہا، اور اگر پوری معافی نہ ہو مثلاً صورت مذکورہ میں دو بیٹوں میں سے ایک نے معاف کیا دوسرے نے معاف نہیں کیا، تو مزائے قصاص سے تو قاتل بری ہو گیا، لیکن معاف

نہ کرنے والے کو نصف دیت (خونہا) دلایا جاوے گا، اور دیت یعنی خون بہا شریعت میں سوانٹ یا ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہوتے ہیں، اور درہم آجکل کے مردجہ وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے، تو پوری دیت دو ہزار نو سو سولہ تولے ۸ ماشہ چاندی ہوگی، یعنی ۳۶ سیر ۲۶ تولے ۸ ماشے۔

مسئلہ: جس طرح ناتمام معافی سے مال واجب ہو جاتا ہے اسی طرح اگر باہم کسی قدر مال پر مصالحت ہو جائے تب بھی قصاص ساقط ہو کر مال واجب ہو جاتا ہے، لیکن اس میں کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

مسئلہ: مقتول کے جتنے شرعی وارث ہیں وہی قصاص اور دیت کے مالک بقدر اپنے حصہ میراث کے ہوں گے، اگر دیت یعنی خون بہا لیا گیا تو مال ان وارثوں میں بھٹا وراثت تقسیم ہوگا، اور قصاص کا فیصلہ ہو تو قصاص کا حق بھی سب میں مشترک ہوگا، مگر چونکہ قصاص ناقابل تقسیم ہے، اس لئے کوئی اولیٰ درجہ کا حق رکھنے والا بھی اپنا حق قصاص معاف کر دیا تو دوسرے وارثوں کا حق قصاص بھی معاف ہو جائے گا، ہاں انکو دیت (خونہا) کی رقم حسب حصہ ملے گی۔

مسئلہ: قصاص لینے کا حق اگرچہ اولیاء مقتول کا ہے، مگر باجماع امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں، کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں بلکہ اس حق کے حاصل کرنے کے لئے حکیم سلطان مسلم یا اس کے کسی نائب کا ضروری ہے، کیونکہ قصاص کس صورت میں واجب ہوتا ہے کس میں نہیں اس کی جزئیات بھی دقیق ہیں جن کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ اولیاء مقتول اپنے غصہ میں مغلوب ہو کر کوئی زیادتی بھی کر سکتے ہیں، اس لئے باتفاق علماء امت حق قصاص حاصل کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے (قرطبی)

کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا

فرض کیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال

الْوَصِيَّةُ لِلْوَٰلِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى

دمیت کرنا ان باپ کے واسطے اور رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ یہ حکم لازم ہے

الْمُتَّقِينَ ۝ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى

پر ہیزگاروں پر، پھر جو کوئی بدل ڈالے دمیت کو بعد اس کے کہ جو سن چکا تو اس کا گناہ انہی پر

الَّذِينَ يَبْدِلُونَهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸۲﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مَثْوًى

ہے جنہوں نے اس کو بدلا بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۔ پھر جو کوئی خوف کرے وصیت کرنے

جَنَفًا أَوْ أَثِمًا فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِذَا تَوَلَّى اللَّهَ

والے سے طرفداری کا یا گناہ کا پھر ان میں باہم صلح کرانے تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ

غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۸۳﴾

بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے

رَبِطَ آيَاتٍ وَخُلَاصَةٌ تَفْسِير

حکم دوم از ابواب البر وصیت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے خواہ زندگی میں یا بعد الموت، لیکن عرف میں اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم بعد الموت ہو۔

خیر، لفظ خیر کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں، جیسے قرآن میں ہے، **وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْخَيْرَ** (نشدید ۸۱:۱۰) اس جگہ باتفاق مفسرین خیر سے مراد مال ہے۔ شروع اسلام میں جب تک میراث کے حقے شرع سے مقرر نہ ہوئے تھے، حکم تھا کہ ترکہ کے ایک ثلث میں مرنے والا اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے جتنا جتنا مناسب سمجھے وصیت کر دے، اتنا تو ان لوگوں کو حق تھا، باقی جو کچھ رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا، اس آیت میں یہ حکم مذکور ہے یعنی :-

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور دیگر اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ کچھ بتلا جائے (اس کا نام وصیت ہی) جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری (کیا جاتا ہے) پھر (جن لوگوں نے اس وصیت کو سنا ہو ان میں سے) جو شخص (یعنی) سن لینے کے بعد اس (کے مضمون) کو تبدیل کرے گا اور باہمی تقسیم و فیصلہ کے وقت غلط اظہار دے گا، اور اس کے موافق فیصلہ ہونے سے کسی کا حق تلف ہو جائیگا تو اس (حق تلفی) کا گناہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس (مضمون) کو تبدیل کریں گے (حاکم عدالت یا ثالث کو یا مرنے والے کو گناہ نہ ہوگا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو یقیناً سنستے جانتے ہیں (تو تبدیل کرنے والے کے اظہار بھی سنتے ہیں اور حاکم کا بے خبر اور حذر در ہونا بھی جانتے ہیں) ہاں (ایک طرح کی

تبدیل کی امانت بھی ہے وہ یہ کہ) جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے وصیت کے بارے میں (کسی غلطی کی یا (تصدیقاً قانون وصیت کے کسی دفعہ کی خلاف ورزی کے) کسی جرم کے ارتکاب کی تحقیق ہوئی ہو اور اس بے ضابطہ وصیت کی وجہ سے اس میت کے پسماندہ مستحقان ترکہ و مستحقان مال وصیت میں نزاع کا خطرہ یا وقوع معلوم ہو) پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کرالے (مگر وہ مصالحت اس مضمون وصیت کے خلاف ہو جو ظاہر تبدیلی وصیت ہی) تو اس شخص پر کوئی دباہ گناہ نہیں ہے (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) معاف فرمانے والے ہیں اور دہنگار پر رحم کرنے والے ہیں اور اس شخص نے تو کوئی گناہ نہیں کیا کیونکہ وصیت میں تبدیلی اصلاح کے لئے کی ہو، تو اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی)

مَعَارِفُ مَسَائِل

اس آیت میں جو وصیت کرنا اس مرنے والے پر فرض کیا ہو جو کچھ مال چھوڑ کر مر رہا ہو اس حکم کے تین جز ہیں، ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دوسرے وارث کے حقے مقرر نہیں ہیں، ان کے حصوں کا تعین مرنے والے کی وصیت کی بنیاد پر ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ایسے اقارب کے لئے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے۔ تیسرے یہ کہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔

ان تین احکام میں سے پہلا حکم تو اکثر صحابہ و تابعین کے نزدیک آیت میراث سے منسوخ ہو گیا، ابن کثیر نے تصحیح حاکم وغیرہ حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے کہ اس حکم کو آیت میراث نے منسوخ کر دیا، یعنی **وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْخَيْرَ** (نشدید ۸۱:۱۰) اور حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک دوسری روایت میں اس کی یہ تفصیل ہے کہ آیت میراث نے ان لوگوں کی وصیت کو منسوخ کر دیا جن کا میراث میں حصہ مقرر ہی، دوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ نہیں، ان کے لئے حکم وصیت اب بھی باقی ہے (جصاص، قرطبی) لیکن باجماع امت یہ ظاہر ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں، ان کے لئے میت پر وصیت کرنا کوئی فرض و لازم نہیں، اس لئے فرضیت وصیت ان کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی (جصاص، قرطبی) یعنی بشرط ضرورت صرف مستحب رہ جائے گی۔

دوسرا حکم وصیت کا فرض ہونا یہ بھی باجماع امت منسوخ ہے، اور نسخ اس کا وہ حد متواتر ہے جس کا اعلان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع

کے خطبہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کے سامنے فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ أَعْطَىٰ لِكُلِّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ
فَلَا وَصِيَّةَ لَوَإِيْشٍ، اُخْرَجَهُ
الْمُزْمَلِيُّ وَقَالَ هَذَا حَدِيثٌ
حَسَنٌ صَحِيحٌ

اسی حدیث میں بروایت ابن عباسؓ یہ الفاظ بھی منقول ہیں:
لَا وَصِيَّةَ لَوَإِيْشٍ إِلَّا أَنْ
تُحْيِيَنَّاهُ أَوْ تَمُوتَ (جصاص)
کس وارث کے لئے وصیت اس وقت
تک جائز نہیں جب تک باقی سب وارث
اجازت نہ دیدیں۔

اس لئے مصل اس حدیث کا یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود معسر
فرمادیئے ہیں، اس لئے اسے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وارث کے حق میں وصیت
کرنے کی اجازت بھی نہیں، ہاں اگر دوسرے ورثہ اس وصیت کی اجازت دیدیں تو جائز ہے
امام جصاص نے فرمایا کہ یہ حدیث ایک جماعت صحابہ سے منقول ہے، اور فقہاء
امت نے باتفاق اس کو قبول کیا ہے، اس لئے بحکم متواتر ہے، جس سے آیت شرآن کا
نسخ جائز ہے۔

اور امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ بات علماء امت میں متفق علیہ ہو کہ جب کوئی حکم
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یقیناً طور پر معلوم ہو جائے جیسے خبر متواتر مشہور وغیرہ
میں ہوتا ہے، تو وہ بالکل بحکم قرآن ہے، اور وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے،
اس لئے ایسی حدیث سے کسی آیت قرآن کا منسوخ ہو جانا کوئی محل شبہ نہیں، پھر مندرایا
کہ اگرچہ یہ حدیث ہم تک خبر واحد ہی کے طریق پر پہنچی ہو، مگر اس کے ساتھ حجۃ الوداع کے
سب سے بڑے اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہ کے سامنے اس کا اعلان فرمانا اور اس پر اجماع صحابہ
اور اجماع امت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حدیث ان حضرات کے نزدیک قطعی الثبوت ہے،
ورنہ شک و شبہ کی گنجائش ہوتے ہوئے اس کی وجہ سے آیت قرآن کے حکم کو چھوڑ کر اس پر
اجماع نہ کرتے۔

تیسرا حکم، وصیت ایک ہتھالی
مال سے زیادہ کی جائز نہیں
یہ باتفاق امت اب بھی باقی ہے، ہاں وارثوں کی اجازت
سے ایک ہتھالی سے زائد کی بلکہ پورے مال کی بھی وصیت
جائز اور قابل قبول ہے۔

تفصیل مذکور سے یہ واضح ہو چکا کہ اب جن رشتہ داروں کے حصے قرآن کریم نے
مسئلہ خود معسر کر دیئے ہیں ان کے لئے اب وصیت واجب نہیں، بلکہ بدوین
اجازت دوسرے وارثوں کے جائز بھی نہیں، البتہ جو رشتہ دار شرعی وارث نہیں ان کے لئے
وصیت کرنے کی اجازت ایک ہتھالی مال تک ہو۔

مسئلہ: اس آیت میں ذکر ایک خاص وصیت کا تھا، جو مرنے والا اپنے متروکہ
مال کے متعلق کرتا تھا، جو منسوخ ہو گیا، لیکن جس شخص کے ذمے دوسرے لوگوں کے حقوق واجب
ہوں یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو اس پر ان تمام چیزوں کی ادائیگی کے لئے وصیت
واجب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کچھ لوگوں
کے حقوق ہوں اس پر تین راتیں ایسی نہ گزرنی چاہئیں کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے
پاس موجود نہ ہو۔

مسئلہ: آدمی کو جو ایک ہتھالی مال میں وصیت کرنے کا حق دیا گیا ہے اپنی زندگی
میں اس کو یہ بھی حق رہتا ہے کہ اس وصیت میں کچھ تبدیلی کر دے یا بالکل ختم کر دے (جصاص)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى

اے ایمان والو فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ

اگلوں پر تاکہ تم پر ہیسزگار ہو جاؤ، چند روز ہیں گنتی کے

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو ان کی گنتی ہے اور دنوں سے

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ

اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا، پھر جو کوئی خوشی سے کرو

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ

نیکی تو چاہو اس کے واسطے اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمھارے لئے اگر تم

تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

سمجھ رکھتے ہو۔

خلاصہ تفسیر

حکمِ صومِ صوم

اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس موقع پر کہ تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی اور اسی عادت کی پشتگی بنیاد پر تقویٰ کی سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دنوں سے مراد رمضان ہی، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے) پھر اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ جو شخص تم میں (ایسا) بیمار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، اور بجائے رمضان کے (دوسرا ایام کالاتناہی) شمار کر کے ان میں روزہ رکھنا اس پر واجب ہے، اور دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہو گئی یہ ہے کہ جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو) ان کے ذمہ صرف روزے کا (فدیہ یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دیدینا) ہے، اور جو شخص خوشی سے (زیادہ) خیر خیرات کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بہتر ہے اور اگر وہ روزہ رکھنے کے لئے ان حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دیدی ہو، لیکن تمہارا روزہ رکھنا اس حالت میں بھی (زیادہ بہتر ہے اگر تم رکھ روزے کی فضیلت کی) خبر رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

صوم کے لفظی معنی امساک یعنی رکنے اور بچنے کے ہیں، اور اصطلاح شرع میں کھانے پینے اور عورت سے مباشرت کرنے سے رکنے اور باز رہنے کا نام صوم ہے، بشرطیکہ وہ طلوع صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک مسلسل رکھ کر رہے، اور نیت روزہ کی بھی ہو، اس لئے اگر غروب آفتاب سے ایک منٹ پہلے بھی کچھ کھاپی لیا تو روزہ نہیں ہوا، اسی طرح اگر ان تمام چیزوں سے پرہیز تو پورے دن پوری احتیاط سے کیا، مگر نیت روزہ کی نہیں کی تو بھی روزہ نہیں ہوا۔

صوم یعنی روزہ ان عبادات میں سے ہے جن کو اسلام کے عہد اور شعائر قرار دیا گیا ہو، اس کے فضائل بے شمار ہیں، جن کے تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں۔

روزے کی فرضیت کا حکم مسلمانوں کو ایک خاص مثال سے پھیل امتوں میں روزہ کا حکم دیا گیا ہے، حکم کے ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ یہ روزے کی

فرضیت کچھ تھا جسے ساتھ خاص نہیں، پھیل امتوں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے، اس سے روزے کی خاص اہمیت بھی معلوم ہوئی، اور مسلمانوں کی دلچسپی کا بھی انتظام کیا گیا کہ روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہے، مگر یہ مشقت تم سے پہلے بھی سب لوگ اٹھاتے آئے ہیں، طبعی بات یہ کہ مشقت میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو وہ ہلکی معلوم ہونے لگتی ہے (روح المعانی) قرآن کریم کے الفاظ **الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ** میں قلیل سے عام ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تمام شریعتوں اور امتوں کو شامل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نماز کی عبادت سے کوئی شریعت اور کوئی امت خالی نہیں رہی اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔

جن حضرات نے فرمایا ہے کہ **مَنْ قَبِلَ كُمْ** سے اس جگہ نصاوری مراد ہیں وہ بطور ایک مثال کے ہو، اس سے دوسری امتوں کی نفی نہیں ہوتی (روح)

آیت میں صرف اتنا بتلایا گیا ہے کہ روزے جس طرح مسلمانوں پر فرض کئے گئے پھیل امتوں میں بھی فرض کئے گئے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پھیل امتوں کے روزے تمام حالات و صفات میں مسلمانوں ہی کے روزوں کے برابر ہوں، مثلاً روزوں کی تعداد، روزوں کے اوقات کی تحدید، اور یہ کہ کن ایام میں رکھے جائیں، ان امور میں اختلاف ہو سکتا ہے، چنانچہ واقعہ بھی ایسا ہی ہوا، کہ تعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی، اور روزے کے ایام اور اوقات میں منسرق ہوتا رہا ہے (روح)

تَعْلَمُ كُمْ تَقْوَىٰ میں اشارہ ہے کہ تقویٰ کی قوت حاصل کرنے میں روزہ کو بڑا دخل ہے، کیونکہ روزہ سے اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا ایک ملکہ پیدا ہوتا ہے، وہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا مریض سے مراد وہ مریض ہے جس کو روزہ رکھنے سے ناقابل برداشت تکلیف پہنچے، یا مرض بڑھ جانے کا قری اندیشہ ہو، بعد کی آیت **وَلَا يَزِيدُ فِي كَمَرِ الْعَسْرِ** میں اس طرف اشارہ موجود ہے، مہجور فقہاء امت کا یہی مسلک ہے۔

مُسَافِرٌ روزہ | **أَوْ عَلَى سَفَرٍ** یہاں لفظ مسافر کے بجائے علی سفر کا لفظ اختیار فرما کر کئی اہم مسائل کی طرف اشارہ فرمادیا:

اول یہ کہ مطلقاً لغوی سفر یعنی اپنے گھر اور وطن سے باہر نکل جانا روزہ میں رخصت سفر کے لئے کافی نہیں، بلکہ سفر کچھ طویل ہونا چاہئے، کیونکہ لفظ **عَلَى سَفَرٍ** کا مفہوم یہ ہے کہ

وہ سفر پر سوار ہو جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر سے دس پانچ میل چلے جانا مراد نہیں، مگر یہ تحدید کہ سفر کتنا طویل ہو قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ کے تعامل سے امام اعظم ابو حنیفہ اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین منزل یعنی وہ مسافت جسکو پیادہ سفر کرنے والا آسانی تین روز میں طے کر سکے، قرار دی ہے، اور بعد کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے اڑتالیس میل لکھے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اسی لفظ علیٰ سقہ سے یہ نکلا کہ وطن سے نکل جانے والا مسافر اسی وقت تک رخصت سفر کا مستحق ہے جب تک اس کے سفر کا سلسلہ جاری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آرام کرنے یا کچھ کام کرنے کے لئے کسی جگہ ٹھہر جانا مطلقاً اس کے سلسلہ سفر کو ختم نہیں کر دیتا، جب تک کوئی معتد بہ مقدار قیام نہ ہو، اور اسی معتد بہ قیام کی مدت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئی کہ پندرہ دن ہیں، جو شخص کسی ایک مقام پر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو وہ علیٰ سقہ نہیں کہلاتا، اس لئے وہ رخصت سفر کا بھی مستحق نہیں۔ مسئلہ: اسی سے یہ بھی نکل آیا کہ کوئی شخص پندرہ دن کے قیام کی نیت ایک جگہ نہیں بلکہ متفرق مقامات شہروں اور بستیوں میں کرے تو وہ بدستور مسافر کے حکم میں رہ کر رخصت سفر کا مستحق رہے گا، کیونکہ وہ علیٰ سقہ کی حالت میں ہے۔

روزہ کی قضا **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** یعنی مریض و مسافر کو اپنے فوت شدہ روزوں کی گنتی کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھنا واجب ہے اس میں بتلانا تو یہ منظور تھا کہ مرض یا سفر کی مجبوری سے جو روزے چھوڑے گئے ہیں ان کی قضا سامان لوگوں پر واجب ہے جس کے لئے **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** کا مختصر جملہ بھی کافی تھا، مگر اس کے بجائے **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضا صرف اس صورت میں واجب ہوگی، جب کہ مریض صحت کے بعد اور مسافر معتمہ ہونے کے بعد اتنے دنوں کی ہمت پائے، جنہیں قضا کر سکے، تو اگر کوئی شخص اتنے دن پہلے ہی مر گیا تو اس پر قضا یا وصیت فدیہ لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** میں چونکہ اس کی کوئی قید نہیں کہ ترتیب وار رکھو یا غیر مسلسل رکھے، بلکہ عام اختیاری ہے، اس لئے اگر کوئی شخص جس کے رمضان کے ابتدائی دس روزے قضا ہو گئے ہوں وہ دسویں یا نویں روزے کی قضا پہلے کرے اور ابتدائی روزوں کی قضا بعد میں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، اسی طرح متفرق کر کے قضا روزے رکھے، تو یہ بھی جائز ہے، کیوں کہ **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** میں اس کی گنجائش ہے۔

روزہ کا فدیہ

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ اس آیت کے بے تکلف معنی دی ہیں جو خلاصہ تفسیر میں بتلائے گئے ہیں، کہ جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں بلکہ روزے کی طاقت تو رکھتے ہیں، مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا تو ان کے لئے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ روزے کے بجائے روزے کا فدیہ بصورت صدقہ ادا کر دیں، اسکے ساتھ اتنا فرما دیا **وَأَن تَصُومُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ**، یعنی تمھارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ ہی رکھو۔ یہ حکم شروع اسلام میں تھا جب لوگوں کو روزے کا خوگر کرنا مقصود تھا، اس کے بعد جو آیت آنے والی ہے یعنی **مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ**، اس سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ کر دیا گیا، صرف ایسے لوگوں کے حق میں اب بھی باجماع امت باقی رہ گیا جو بہت بوڑھے ہوں (جصاص) یا ایسے بیمار ہوں کہ اب صحت کی امید ہی نہیں رہی، جہوڑ صحابہ و تابعین کا یہی قول ہے (جصاص، منطری)۔

یحییٰ بخاری و مسلم و ابوداؤد، نسائی، ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمہ حدیث نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ** نازل ہوئی تو ہمیں خستیاں دیدیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزے رکھے جس کا جی چاہے ہر روزے کا فدیہ دیدے، پھر جب دوسری آیت **مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** نازل ہوئی تو یہ اختیار ختم ہو کر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہو گیا۔

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی ابتداء اسلام میں تین تغیرات ہوئے اور روزے کے معاملہ میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں، روزے کی تین تبدیلیاں یہ ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ہر مہینہ میں تین روزی اور ایک روزہ یوم عاشوراء یعنی دسویں محرم کا رکھتے تھے، پھر رمضان کی فرضیت نازل ہو گئی، **كَيْتَبَ عَلَيْكُمْ الْعِيَّامُ** تو حکم یہ تھا کہ ہر شخص کو خستیاں ہو کہ روزہ رکھے یا فدیہ دیدے، اور روزہ رکھنا بہتر اور افضل ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت **مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** نازل فرمادی، اس آیت نے تندرست قوی کے لئے یہ اختیار ختم کر کے صرف روزہ رکھنا لازم کر دیا، مگر بہت بوڑھے آدمی کے لئے یہ حکم باقی رہا کہ وہ چاہے تو فدیہ ادا کر دے۔

یہ تو دو تبدیلیاں ہوئیں، تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں افطار کے بعد کھانے پینے اور اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت صرف اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں، جب سو گیا تو دوسرا روزہ شروع ہو گیا، کھانا پینا وغیرہ ممنوع ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت

أَجْنَلْ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ الَّذِي نَازَلَ مِنْهُ مَا كَرِهَ آسَانِي عَطَا فَرَادَى كَرِ الْكَلِّ دَن كِي صَح
صَادِق تَم كَمَا نَا بِنَا وَغَيْرِهِ سَب جَائِزِ هِي، سَوَكْرَ أَتَخَنَ كَع بَعْدُ سَحَرَى كَحَانِ كُو سَنَت فَتَرَار
رِيدَا لِيَا، صَح بِخَارِي، سَلَم، اِبْدَوَادُ دَمِي هِي اِس مَضْمُون كِي اَحَادِيثِ آتِي هِي (ابن كثير)

ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہے، نصف
فدیہ کی مقدار اور متعلقہ مسائل

کو مال کا نہ طور پر دیدینا ایک روزہ کا فدیہ ہے، بشرطیکہ کسی مجذوم یا مسکین کی خدمت کے معاوضہ میں ہو۔

مسئلہ: ایک روزہ کے فدیہ کو دو آدمیوں میں تقسیم کرنا یا چند روزوں کے فدیہ کو
ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں، جیسا کہ شامی نے بحوالہ بجزاز قنیہ نقل کیا ہے
اور بیان العشرین میں اسی کو نقل کیا گیا ہے، مگر حضرت نے امداد الفتاویٰ میں فتویٰ اس پر نقل
کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، شامی نے بھی فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، البتہ امداد الفتاویٰ
میں ہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ کسی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک کو نہ دے، لیکن دیدینے
میں گنجائش بھی ہے، یہ فتویٰ مورخہ ۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ امداد الفتاویٰ جلد دوم صفحہ ۱۵۰ میں منقول ہے
مسئلہ: اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط استغفار کرے اور
دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کروں گا (بیان القرآن)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَ

ہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطہ لوگوں کے

بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ

اور دلیل روشن راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی سو جو کوئی پائے تم میں سے اس ہینہ کو

فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

تو ضرور فہمے رکھے اس کے اور جو کوئی ہو بیمار یا مسافر تو اس کی گنتی پوری کرنی چاہئے اور

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ

اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی

وَلِتُكْمِلُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۲۰﴾

اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی اور تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر اور ربط آیات

تعیین ایام صیام اور پرارشاد ہوا تھا کہ تھوڑے روزہ رکھ لیا کرو، آگے ان تھوڑے دنوں کا بیان ہے

روہ تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے (ماہ رمضان جس میں ایسی برکت ہے کہ اس کے ایک خاص حصہ یعنی شب قدر میں) قرآن مجید (لوح محفوظ سے آسان دنیا پر) بھیجا گیا ہے، جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے (ذریعہ) ہدایت ہے، اور (دوسرا) وصف یہ ہے کہ ہدایت کے طریقے بتلانے میں اس کا جزو جزو (واضح الدلالة) ہے، اور ان دونوں وصفوں میں

مجموعہ ان کتب (ساویہ) کے (ہے) جو کہ انہی دو وصفوں سے موصوف ہیں یعنی ذریعہ (ہدایت) (بھی) ہیں اور (وضوح دلالت کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں،

سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے (اور وہ فدیہ کی اجازت جو

اوپر مذکور تھی منسوخ و موقوف ہوئی) اور (مریض اور مسافر کے لئے جو اہل قانون تھا وہ البتہ اب بھی اسی طرح باقی ہے کہ) جو شخص (ایسا) بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا

(شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان کے) (دوسرے ایام کا) راتنا ہی (شمار کر کے ان میں روزہ رکھنا) اس پر واجب ہے (اللہ تعالیٰ

کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی (کی رعایت) کرنا منظور ہے (اس لئے ایسے احکام معتبر کئے جن کو تم آسانی سے بجالا سکو، چنانچہ سفر اور مرض میں کیسا آسان قانون مقرر کر دیا) اور تمہارے

ساتھ (احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں (کہ سخت احکام تجویز کر دیتے) اور یہ احکام مذکورہ ہم نے خاص خاص مصلحتوں سے مقرر کئے، چنانچہ اولاً روزہ ادا رکھنے کا اور

کسی شرعی عذر سے وہ جاریے تو دوسرے ایام میں قضا کرنے کا حکم تو اس لئے کیا، تاکہ تم لوگ (ایام ادا یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو، (تاکہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور (خود قضا رکھنے کا حکم اس لئے کیا، تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور ثناء) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک

ایسا) طریقہ بتلادیا (جس سے تم برکات و منکرات صیام سے محروم نہ رہو، ورنہ اگر قضا واجب نہ ہوتی تو کون اتنے روزے رکھ کر ثواب حاصل کرتا) اور (عذر سے خاص رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لئے دیدی) تاکہ تم لوگ (اس نعمت آسانی پر اللہ تعالیٰ کا) شکر

ادا کیا کرو (ورنہ اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو سخت مشقت ہو جاتی)

معارف و مسائل

اس آیت میں پھلی محل آیت کا بیان بھی ہے اور ماہ رمضان کی اعلیٰ فضیلت کا ذکر بھی بیان اس لئے کہ پھلی آیات میں آیاتاً مَعْفُودٌ کا لفظ محل ہو جس کی شرح اس آیت نے کر دی کہ وہ پورے ماہ رمضان کے ایام ہیں، اور فضیلت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کو اپنی وحی اور آسمانی کتابیں نازل کرنے کے لئے منتخب کر رکھا ہے، چنانچہ قرآن بھی اسی ماہ میں نازل ہوا، مسند احمد میں حضرت دائر بن قیس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی تاریخ میں نازل ہوئے، اور تورات چھ رمضان میں، انجیل تیرہ رمضان اور قرآن چوبیس رمضان میں نازل ہوا، اور حضرت جابرؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ زبور بارہ رمضان میں، انجیل اٹھارہ رمضان میں نازل ہوئی (ابن کثیر)

حدیث مذکور میں پھلی کتابوں کا نزول جس تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے اسی تاریخ میں وہ کتابیں پوری کی پوری انبیاء پر نازل کر دی گئی ہیں، قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ رمضان کی ایک رات میں پورا کا پورا لوح محفوظ سے سا بن دیا پر نازل کر دیا گیا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول تینیس سال میں رفتہ رفتہ ہوا۔

رمضان کی وہ رات جس میں قرآن نازل ہوا قرآن ہی کی تصریح کے مطابق شقیہ تھی اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ، مذکور الصدر حدیث میں اس کو ۲۳ رمضان کی شب بتلایا ہے، اور حضرت حسنؓ کے نزدیک چوبیسویں شب شب قدر ہوتی ہے، اس طرح یہ حدیث آیت قرآن کے مطابق ہو جاتی ہے، اور اگر یہ مطابقت نہ تسلیم کی جائے تو بہر حال قرآن کریم کی تصریح سب پر مقدم ہے جو رات بھی شب قدر ہو وہی اس کی مراد ہوگی۔

مَنْ شَهِدَ مِنْكُمْ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ اس ایک جملہ میں روزے کے متعلق بہت سے احکام و مسائل کی طرف اشارات ہیں، لفظ شَهِدَ شہود سے بنا ہے، جس کے معنی حضور یعنی حاضر و موجود ہونے کے ہیں، اور انشہی عربی لغت میں مہینہ کے معنی میں آتا ہے، مراد اس سے مہینہ رمضان کا ہے، جس کا ذکر اوپر آیا ہے، اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہو گئے کہ تم میں سے جو شخص ماہ رمضان میں حاضر یعنی موجود ہو اس پر لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے،

روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا عام اختیار جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے اس جملے نے ملحوظ کر کے روزہ ہی رکھنا لازم کر دیا ہے۔

ماہ رمضان میں حاضر و موجود ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ماہ رمضان کو ایسی حالت میں پائے کہ اس میں روزہ رکھنے کی صلاحیت موجود ہو، یعنی مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم، حیض و نفاس سے پاک ہو۔

اسی لئے جس شخص کا پورا رمضان ایسی حالت میں گزر گیا کہ اس میں روزہ رکھنے کی مطلق صلاحیت ہی نہیں جیسے کافر، نابالغ، مجنون، توہر لوگ اس حکم کے مخاطب ہی نہیں، اس لئے ان پر گزشتہ رمضان کے روزے فرض ہی نہیں ہوئے، اور جن میں صلاحیت ذاتی طور پر موجود ہو مگر کسی وقت عذر کی وجہ سے مجبور ہو گئے، جیسے حیض و نفاس والی عورت یا مریض اور مسافر تو انہوں نے ایک حیثیت سے ماہ رمضان بحالت صلاحیت پایا، اس لئے حکم آیت کا ان کے حق میں ثابت ہو گیا، مگر وقتی عذر کے سبب اس وقت روزہ معاف ہے، البتہ بعد میں قضاء لازم ہے، جیسا کہ اس کے بعد تفصیل آئے گی۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے لئے ماہ رمضان کا بحالت صلاحیت پالینا شرط ہے، اس لئے جس نے پورا رمضان پالیا اس پر پورے رمضان کے روزے فرض ہو گئے، جس نے کچھ کم پایا اس پر اتنے ہی دن کے روزے فرض ہوئے جتنے دن رمضان کے پائے، اس لئے وسط رمضان میں جو کافر مسلمان ہوا یا نابالغ بالغ ہوا اس پر صرف آئندہ کے روزے لازم ہوں گے، گزشتہ ایام رمضان کی قضاء لازم نہ ہوگی، البتہ مجنون مسلمان اور بالغ ہونے کے اعتبار سے ذاتی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اگر رمضان کے کسی حصہ میں ہوش میں آجائے تو گزشتہ ایام رمضان کی قضاء بھی اس پر لازم ہو جائے گی، اسی طرح حیض و نفاس والی عورت، وسط رمضان میں پاک ہو جائے یا مریض تندرست ہو جائے یا مسافر مقیم ہو جائے تو گزشتہ ایام کی قضاء لازم ہوگی۔

مسئلہ: ماہ رمضان کا پالینا شرعاً عین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے، ایک یہ کہ خود رمضان کا چاند دیکھ لے، دوسرے یہ کہ کسی معتبر شہادت سے چاند دیکھنا ثابت ہو جائے، اور جب یہ دونوں صورتیں نہ پائی جائیں تو شعبان کے تیس روز پورے کرنے کے بعد ماہ رمضان شروع ہو جائے گا۔

مسئلہ: شعبان کی انیسویں تاریخ کی شام کو اگر ابرو وغیرہ کے سبب چاند نظر نہ آئے اور کوئی شرعی شہادت بھی چاند دیکھنے کی نہ پہنچے تو اگلے روز یوم الشک کہلاتا ہے، کیونکہ

اُس میں یہ بھی احتمال ہے کہ حقیقت چاند ہو گیا ہو، مگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہو کہ آج چاند ہی مطلع پر نہ آیا ہو، اُس روز میں چونکہ شہر یعنی رمضان کا پالینا صادق نہیں آتا، اس لئے اُس دن کا روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، حدیث میں اس کی مانعت آئی ہے تاکہ فرض اور نفل میں اختلاط اور التباس نہ پیدا ہو جائے (رجصاص)

مسئلہ: جن ملکوں میں رات دن کئی کئی مہینوں کے طویل ہوتے ہیں وہاں شہر یعنی رمضان کا پالینا بظاہر صادق نہیں آتا، اس کا مقتضی یہ ہے کہ اُن پر روزے فرض نہ ہوں، فقہائے حنفیہ میں سے حلوانی اور قبائی وغیرہ نے نماز کے متعلق تو اسی پر فتویٰ دیا ہے کہ ان لوگوں پر اپنے ہی دن رات کے اعتبار سے نماز کا حکم عائد ہوگا، مثلاً جس ملک میں مغرب کے فوراً بعد صبح صادق ہوجاتی ہے وہاں نماز عشاء فرض ہی نہیں (شامی) اس کا مقتضی یہ ہو کہ جہاں چھ مہینے کا دن ہو وہاں چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہوں گی اور رمضان وہاں آئے گا ہی نہیں، اس لئے روزے بھی فرض نہ ہوں گے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں روزے کے متعلق اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ، اس میں مریض اور مسافر کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اُس وقت روزہ نہ رکھیں، تندرستی ہونے پر اور سفر سے ختم ہونے پر اتنے دنوں کی قضاء کر لیں، یہ حکم اگرچہ پچھلی آیت میں بھی آچکا تھا، مگر جب اس آیت میں روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا اختیار منسوخ کیا گیا ہے تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مریض اور مسافر کی رخصت بھی منسوخ ہوگئی ہو اس لئے دوبارہ اس کا اعادہ کر دیا گیا۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۚ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور جب تجھ سے بد چھیں میرے بندے مجھ کو میں تو قریب ہوں قبول کرتا ہوں مار مار گئے والے کی دعا کہ

إِذَا دَعَاَنِ فَلَيْسَ جَنُوبًا ۚ وَذَلِكُمْ مِنْ آيَاتِ لَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ ﴿۸۷﴾

جب مجھ سے دعا مانگے تو چاہئے کہ وہ حکم بائیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ نیک راہ پر آئیں۔

خلاصہ تفسیر مع ربط آیات

پچھل تین آیتوں میں روزہ اور رمضان کے احکام اور فضائل کا ذکر تھا، اور اس کے

بعد بھی ایک طویل آیت میں روزہ اور اعتکاف کے احکام کی تفصیل ہو، درمیان کی اس مختصر آیت میں بندوں کے حال پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت، ان کی دعائیں سننے اور قبول کرنے کا ذکر و سنہرا کر اطاعت احکام کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ روزہ کی عبادت میں رخصتوں اور سہولتوں کے باوجود کسی قدر مشقت ہے، اس کو سہل کرنے کے لئے اپنی مخصوص عنایت کا ذکر فرمایا، کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں جب بھی وہ دعا مانگتے ہیں میں اُن کی دعائیں قبول کرتا ہوں اور ان کی حاجات کو پورا کر دیتا ہوں۔

ان حالات میں بندوں کو بھی چاہئے کہ میرے احکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں، اور امام ابن کثیرؒ نے اس درمیان جملہ ترغیب دعا کی یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس آیت نے اشارہ کر دیا کہ روزہ کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، اس لئے دعا کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

إِذَا شِئْتُمْ فَطُورُكُمْ دَعْوَتُكُمْ

مُسْتَجَابَةٌ (ابوداؤد طحاوی)

یعنی روزہ افطار کرنے کے وقت روزہ کی دعا مقبول ہے۔

بروایت عبد اللہ بن عمروؓ اسی لئے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ افطار کے وقت سب گھر والوں کو جمع کر کے دعا کیا کرتے تھے تفسیر آیت کی یہ ہے:

اور ولے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں کہ میں ان سے قریب ہوں یا دور (تو میری طرف سے اُن سے فرما دیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں (اور یا استثناء نامناسب درخواست کے منظور کر لیتا ہوں) (ہر عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست ہے، سو جس طرح میں اُن کی عرض عرض کو منظور کر لیتا ہوں) ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو (بجا آوری کے ساتھ) قبول کیا کریں (اور چونکہ ان احکام میں کوئی حکم نامناسب نہیں اس لئے اس میں استثناء ممکن نہیں) اور مجھ پر یقین رکھیں (یعنی میری ہستی پر بھی میرے حاکم ہونے پر بھی میرے حکیم ہونے پر اور رحمت و معراج پر بھی اس طرح) امید ہو کہ وہ لوگ رشد و فلاح حاصل کر سکیں گے۔

مسئلہ: اس آیت میں (إِنِّي قَرِيبٌ) فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ دعا مانگنا آہستہ اور خفیہ کرنا چاہئے، دعا میں آواز بلند کرنا پسند نہیں، ابن کثیرؒ نے آیت کا شان نزول یہی ذکر کیا ہے کہ کبھی گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہمارا رب اگر ہم سے قریب ہو تو ہم دعا آہستہ آواز سے مانگا کریں، اور دور ہو تو بلند آواز سے پکارا کریں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

أَحِلَّ لَكُمْ كَيْلَ الصَّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ

حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے وہ پوشاک ہیں تمہاری

وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَهُنَّ أَنْفُسَكُمْ

اور تم پوشاک ہو ان کی اللہ کو معلوم ہو کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مِمَّا كَتَبَ

سو معاف کیا تم کو اور درگزر کی تم سے پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہے

اللَّهُ لَكُمْ مِمَّا كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ

اللہ نے تمہارے لئے اور کھاد اور زرد جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری صبح کی جدا دھاری

مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُمُوا الصَّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ

سیاہ سے ، پھر پورا کرو روزہ کو رات تک

وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ

اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں یہ حدیں باندھیں ہوئی ہیں اللہ کی

فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ

سو ان کے نزدیک نہ جاؤ اس طرح بیان فرماتا ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کو واسطے تاکہ وہ بچے رہیں

خلاصہ تفسیر

حکم چہارم، رمضان کی راتوں میں جماع | اس آیت میں روزہ کے بقیہ احکام کی کچھ تفسیر مذکور ہے

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں

سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا اور پہلے جو اس سے مانعت تھی وہ موقوف کی گئی (کیونکہ بوجہ قرب و اتصال

کے وہ تمہارے (بھائے) اور بھینے بھینے (کے) ہیں اور تم ان کے (بھائے) اور بھینے بھینے (کے) ہو، خدا تعالیٰ

کو اس کی خبر تھی کہ تم (اس علم انہی میں) خیانت (کر) کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر (جب

تم معذرت سے پیش آئے تو) اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت نسمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، سو

(جب اجازت ہو گئی تو) اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانون اجازت) تمہارے لئے تجویز کر دیا ہے

(بے تکلف) اس کا سامان کرو اور (جس طرح شب صیام میں بی بی سے ہمبستری کی اجازت ہو

اسی طرح یہ بھی اجازت ہو کہ تمام رات میں جب چاہو) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی) اس وقت تک

کہ تم کو سفید خط صبح (صادق کی روشنی) کا متمیز ہو جاوے سیاہ خط سے (یعنی رات کی تاریکی سے)

تو پھر (صبح صادق سے) رات (آئے) تک روزہ کو پورا کیا کرو۔

صبح کی سفیدی کا سفید خط رات کی تاریکی کے سیاہ خط سے متمیز ہو جانے سے مراد یہ ہے

کہ صبح صادق یقینی طور سے ثابت ہو جائے۔

حکم پنجم، اعتکاف | اور ان بیبیوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی (شہوت کے ساتھ) مت ملے

دو جس زمانے میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو، (جو کہ) مسجدوں میں

(ہوا کرتا ہے) یہ سب احکام مذکورہ) خداوندی ضابطے ہیں، سو ان (ضابطوں) سے (نکلنا تو کیسا)

نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا (اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام بیان کئے ہیں) اسی طرح

اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کی اصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں، اس

امید پر کہ وہ لوگ احکام پر مطلع ہو کر ان احکام کے خلاف کرنے سے) پرہیز رکھیں۔

معارف و مسائل

أَحِلَّ لَكُمْ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ جو چیز اس آیت کے ذریعہ حلال کی گئی ہے وہ

اس سے پہلے حرام تھی، صحیح بخاری وغیرہ میں بروایت براہ بن عازب مذکور ہے کہ ابتداء میں

جب رمضان کے روزے فرض کئے گئے تو افطار کے بعد کھانے پینے اور بیبیوں کے ساتھ

اختلاط کی صرف اُس وقت تک اجازت تھی جب تک سونہ جاتے، سو جانے کے بعد یہ سب

چیزیں حرام ہو جاتی تھیں، بعض صحابہ کرام کو اس میں مشکلات پیش آئیں، قیس بن صرمہ انصاری

دن بھر مزدوری کر کے افطار کے وقت گھر پہنچے تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا، بیوی نے

کہا کہ میں کہیں سے کچھ انتظام کر کے لاتی ہوں جب وہ واپس آئی تو دن بھر کے بھوکے بھوکے

ان کی آنکھ لگ گئی، اب بیدار ہوئے تو کھانا حرام ہو چکا تھا، اگلے دن اسی طرح روزہ رکھا،

دو پہر کو ضعف سے بیہوش ہو گئے، (ابن کثیر) اسی طرح بعض صحابہؓ سونے کے بعد اپنی بیبیوں

کے ساتھ اختلاط میں مبتلا ہو کر پریشان ہوئے، ان واقعات کے بعد یہ آیت نازل ہوئی،

جس میں پہلا حکم منسوخ کر کے غروب آفتاب کے بعد سے طلوع صبح صادق تک پوری رات

میں کھانے پینے اور مباشرت کی اجازت دیدی گئی، اگرچہ پورا کھانے کے بعد ہو، بلکہ سو کر اٹھنے

کے بعد آخر شب میں حسری کھانا سنت قرار دیا گیا، جس کا ذکر روایات حدیث میں واضح ہے، اس آیت میں اسی حکم کا بیان کیا گیا ہے۔

رَدِّی کے لفظی معنی اگرچہ عام ہیں، ایک مرد بی بی سے اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے جو کچھ کرتا یا کہتا ہے وہ سب اس میں شامل ہے لیکن باتفاق امت اس جگہ اس سے مراد جہاں شربت احکام شرعیہ کے لئے اس آیت نے جس حکم کو منسوخ کیا ہے، یعنی سو جانے کے بعد کھانے، پینے وغیرہ کی حرمت کو، یہ حکم تشرآن میں کہیں مذکور نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے صحابہ کرام اس حکم پر عمل کرتے تھے وگرنہ احادیث میں اس آیت کے حکم الہی قرار دیکر منسوخ کیا اس آیت میں پہلے حکم کو حکم الہی تشرار دیا گیا، اور پھر آسانی کے لئے اس کو منسوخ کیا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سنت سے ثابت شدہ بعض احکام کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ (جصاص وغیرہ)

سحری کھانے کا آخری وقت

حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ رات کی تاریکی کو سیاہ خط اور صبح کی روشنی کو سفید خط کی مثال سے بتلا کر روزہ شروع ہونے اور کھانا پینا حرام ہو جانے کا صبح وقت متعین فرما دیا، اور اس میں افراط و تفریط کے احتمالات کو ختم کرنے کے لئے حَتَّى يَتَبَيَّنَ کا لفظ بڑھا دیا جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ نہ تو وہی مزاج لوگوں کی طرح صبح صادق سے کچھ پہلے ہی کھانے پینے وغیرہ کو حرام سمجھو، اور نہ ایسی بے فکری اختیار کر دو کہ صبح کی روشنی کا یقین ہو جانے کے بعد جو کھانے پیتے رہو، بلکہ کھانے پینے اور روزہ کے درمیان حد فاصل صبح صادق کا یقین ہے، اس یقین سے پہلے کھانے پینے کو حرام سمجھنا درست نہیں، اور یقین کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہنا بھی حرام اور روزے کے لئے مفسد ہے، اگرچہ ایک ہی منٹ کے لئے ہو، حسری کھانے میں وسعت اور گنجائش صرف اسی وقت تک ہو جب تک صبح صادق کا یقین نہ ہو، بعض صحابہ کرام کے ایسے واقعات کو بعض کہنے والوں نے اس طرح بیان کیا کہ سحری کھاتے ہوئے صبح ہو گئی اور وہ بے پردائی سے کھاتے رہے، یہ اسی پر مبنی تھا کہ صبح کا یقین نہیں ہوا تھا اس لئے کہنے والوں کی جلد بازی سے متاثر نہیں ہوئے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت بلالؓ کی اذان تمہیں سحری کھانے سے مانع نہ ہونی چاہئے، کیونکہ وہ رات سے اذان دیدیتے ہیں، اس لئے تم بلال کی اذان سنکر بھی اُس وقت تک کھاتے پیتے رہو جب تک ابراہیمؑ کی اذان نہ سنو، کیونکہ وہ ٹھیک طلوع صبح صادق پر اذان دیتے ہیں (بخاری و مسلم)

اس حدیث کے اتمام نقل کرنے سے بعض معاصرین کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اذان فجر کے بعد بھی کچھ دیر کھایا پیا جائے تو مضائقہ نہیں، اور جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی کہ صبح کی اذان ہو رہی تھی اس کے لئے جائز کر دیا کہ وہ جلدی جلدی کچھ کھالے، حالانکہ اسی حدیث میں واضح طور پر بتلادیا گیا ہے کہ اذان ابن ام مکتومؓ بن جو ٹھیک طلوع فجر کے ساتھ ہوتی تھی اس پر کھانے سے رک جانا ضروری ہے، اس کے علاوہ تشرآن کریم نے خود جو حد بندی فرمادی ہے وہ طلوع صبح کا یقین پر اس کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی کھانے پینے کی اجازت دینا نص تشرآن کی خلاف ورزی ہے، صحابہ کرامؓ اور اسلاف امت سے جو افطار و سحر میں مسابقت کی روایات منقول ہیں ان سب کا عمل نص تشرآن کے مطابق ہی ہو سکتا ہے کہ یقین صبح صادق سے پہلے زیادہ احتیاطی تنگی اختیار نہ کی جائے، امام ابن کثیرؒ نے بھی ان روایات کو اسی بات پر معمول فرمایا ہے، ورنہ نص تشرآنی کی صریح مخالفت کو کون مسلمان برداشت کر سکتا ہے، اور صحابہ کرامؓ سے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا خصوصاً جبکہ قرآن کریم نے اسی آیت کے اخیر میں تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ کے ساتھ فَلَا تَقْرَبُوهَا فرما کر خاص احتیاط کی تاکید بھی فرمادی ہے۔

مسئلہ: یہ سب کلام ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسے مقام پر ہیں جہاں سے صبح صادق کو چشم خود دیکھ کر یقین حاصل کر سکتے ہیں، اور مطلع بھی صاف ہے، اور وہ صبح صادق کی ابتدائی روشنی کی پہچان بھی رکھتے ہیں، تو ان کو لازم ہے کہ براہ راست افق کو دیکھ کر عمل کریں، اور جہاں یہ صورت نہ ہو مثلاً کھلا ہوا افق سامنے نہیں یا مطلع صاف نہیں، یا اس کو صبح صادق کی پہچان نہیں، اس لئے وہ دوسرے آثار و علامات یا ریاضی حسابات کے ذریعہ وقت کا تعین کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے لئے کچھ وقت ایسا آئے گا کہ صبح صادق کا ہو جانا مشکوک ہو یقین نہ ہو، ایسے لوگوں کو مشکوک حالت میں کیا کرنا چاہئے، اس کے متعلق امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس حالت میں اصل تو یہی ہے کہ کھانے پینے پر اقام نہ کرے، لیکن مشکوک حالت میں صبح صادق کا یقین ہونے سے پہلے پہلے کسی نے کچھ کھالی لیا تو گناہگار نہیں ہوگا لیکن اگر بعد میں تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا کہ اُس وقت صبح ہو چکی تھی تو قضا اس کے ذمہ لازم ہے، جیسے شروع رمضان میں چاند نظر نہ آیا اور لوگوں نے روزہ نہیں رکھا، مگر بعد میں شہادت سے ۲۹ کا چاند ثابت ہو گیا، تو جن لوگوں نے اس دن کو شعبان کی تیسویں تاریخ سمجھ کر روزہ نہیں رکھا تھا، وہ گناہگار تو نہیں ہوتے، مگر اس روزے کی قضا اُن پر باتفاق لازم ہے، اسی طرح بادل کے دن میں غروب کے گمان پر روزہ افطار کر لیا، بعد میں آفتاب نکل آیا، تو یہ شخص گناہگار تو نہیں مگر قضا اس پر واجب ہے۔

امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائے گا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضاء بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قضاء ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

اعتکاف اور اس کے مسائل | اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے، لفظی التماسیج کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو شرط بیان کی ہر کہ اعتکاف صرف اس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آبا مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

مسئلہ: روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اور پر بیان ہوا ہے، حالت اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہو جو سبکے لئے ہے، مگر مباشرت نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ: اعتکاف کے دو سکر مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد رکھنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

روزے کے معاملے میں حسیاط کا حکم | آخر آیت میں تِلْقَ حُدُودِ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جو ممانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس کتنا مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں حسیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا، بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور ہسل انگاری اس ارشاد خداوندی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ ان حکاموں تک کہ

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۸﴾

کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق)، اور تم کو معلوم ہے۔

ربط آیات خلاصہ تفسیر

پہلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مال حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبادت صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہے کہ جب روزہ ختم ہوا فطار کے لئے مالی حلال ہتیا کرنا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مال حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکم ششم، مال حرام سے بچنا | اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف و مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:

”میں نے لوگوں کو زمین کی چیزوں میں سے جو چیزیں حلال اور ستھری ہیں اور شیطان کے قدم پر نہ چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے“

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھینگا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضاء بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قضاء ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

اعتکاف اور اس کے مسائل | اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے، لفظی التماسی کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو شرط بیان کی ہر کہ اعتکاف صرف اس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آبا مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہو، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

مسئلہ: روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اور پر بیان ہوا ہے، حالت اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہو جو سبکے لئے ہے، مگر مباشرت نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ: اعتکاف کے دو سکر مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد پر ٹھکانا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

روزے کے معاملے میں حسیاط کا حکم | آخر آیت میں یَلْقَیْ حُرُّ الذَّیْفَانِ فَلَا تَغْرِیْبُوْهَا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جو مانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس کتنا مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں حسیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا، بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور سہل انگاری اس ارشاد خداوندی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ ان حکاموں تک کہ

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۸﴾

کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق)، اور تم کو معلوم ہے۔

ربط آیات خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مال حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی مانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبادت صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہے کہ جب روزہ ختم ہوا فطار کے لئے مالی حلال ہتیا کرنا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مال حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکم ششم، مال حرام سے بچنا | اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف و مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی مانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:

”میں نے لوگوں کو زمین کی چیزوں میں سے جو چیزیں حلال اور ستھری ہیں اور شیطان کے قدم پر نہ چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے“

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

اور سورۃ نمل آیت ۱۱۴ میں ارشاد فرمایا:-

تَكُونُوا مِمَّنْ يَمْنُونَ فَلَاحًا
كَلِمَاتٍ وَأَشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِنَّ
كُنْتُمْ أَتَايَا تُعْبُونَ ۝

یعنی کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ تعالیٰ نے
ملاں اور پاک اور شکر کر اللہ کے احسان
کا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو

کسب مال کے اچھے برے ذرائع
اور اچھائی بُرائی کا معیار

جس طرح مال کی ضرورت اور مدارِ زندگی ہونے پر
ساری دنیا اور اس کی ہر قوم و ملت کا اتفاق ہے،
اسی طرح اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس کی تحصیل کے

کچھ ذرائع پسندیدہ اور جائز ہیں، کچھ ناپسند اور منوع ہیں، چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب کو ساری ہی
دنیا بُرا سمجھتی ہے، لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی صحیح معیار عام طور پر لوگوں کے ہاتھ میں
نہیں، اور ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعلق پوری دنیا کے انسانوں کی صلاح و فلاح سے ہے اور
پورا عالم انسانی اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہو سکتا ہے جو
رب العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، ورنہ اگر خود انسان اس کا معیار بنانے کا اختیار ہو
تو جو لوگ اس کا قانون بناتیں گے وہ اپنی قوم یا اپنے وطن یا اپنی ملت کے بارے میں جو کچھ سوچیں
وہ عام عادت کے مطابق اس سے مختلف ہوگا جو دوسری قومیں اور وطنوں کے متعلق سوچا جائے گا۔
اور بین الاقوامی کانفرنسوں کی صورت میں پوری دنیا کی نمائندگی کی جائے تو تجربہ شاید ہو کہ وہ بھی
ساری مخلوق کو مطمئن کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ قانونی ناانصافی انجام کار
جنگ و جدل اور فساد کی صورت اختیار کرے گی۔

اسلامی نظامِ معاش ہی شریعتِ اسلام نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا جو قانون بنایا، وہ حرا و وحی الہی
دنیا میں قائم کر سکتا ہے۔ یہی اس کے مستفاد اور وہی ایک ایسا معقول فطری و جمیع قانون جو ہر قوم و ملت
اور ہر ملک و وطن میں چل سکتا ہے، اور امن و مامہ کا ضامن ہو سکتا ہے، کیونکہ اس قانون الہی میں قابل
اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقف عام رکھا گیا ہے، جس میں تمام انسان مساوی حق رکھتے ہیں جیسے
ہوا پانی، خورد و گھاس، آگ کی حرارت اور غیر ملوک جنگلات اور غیر آباد زمینیں جی جنگلات کی پیداوار
وغیرہ کہ ان میں سب انسانوں کا مشترک حق ہے، کسی کو ان پر مالکانہ قبضہ جائز نہیں اور جن چیزوں
کے اشتراک میں انسانی معاشرت میں خلل پیدا ہوتا ہے، یا نزاع و جدل کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں
ان میں انفرادی ملکیت کا قانون جاری فرمایا گیا، کسی زمین یا اس کی پیداوار پر ابتدائی ملکیت
کا قانون جہاں ہے، اور پھر انتقالِ ملکیت کا جہاں اس قانون کی ہر دفعہ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہو کہ کوئی
انسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، بشرطیکہ وہ اپنی جدوجہد ان کی تحصیل میں خرچ کرے،

اور کوئی انسان دوسروں کے حقوقِ غصب کر کے یا دوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو محدود افراد میں
مقبول کر دے، انتقالِ ملکیت خواہ بعد الموت وراثت کے قانون الہی کے مطابق ہو، یا پھر بیع و شرا
وغیرہ کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے ہو، مزدوری ہو یا کسی مال کا معاوضہ دونوں میں اس کو
ضروری قرار دیا گیا کہ معاملہ میں کوئی دھوکہ، فریب، یا تلبیس نہ ہو، اور کوئی ایسا ابہام اور اجمال
نہ رہے جس کی وجہ سے باہمی منازعت کی نوبت آئے۔

یہ اس کی بھی رعایت رکھی گئی ہے کہ فریقین جو رضامندی دے رہے ہیں وہ حقیقی رضامندی
ہو، کسی انسان پر دباؤ ڈال کر کوئی رضامندی نہ لی گئی ہو، شریعتِ اسلام میں جتنے معاملات باطل یا
فاسد اور گناہ کہلاتے ہیں ان سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان میں وجوہ مذکور ہیں کسی وجہ سے
خلل ہوتا ہے، کہیں دھوکہ فریب ہوتا ہے، کہیں نامعلوم چیز یا نامعلوم عمل کا معاوضہ ہوتا ہے،
کہیں کسی کا حق غصب ہوتا ہے، کہیں کسی کو نقصان پہنچا کر اپنا نفع کیا جاتا ہے، کہیں حقوقِ عامہ
میں ناجائز تصرف ہوتا ہے، سود، قمار وغیرہ کو حرام قرار دینے کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوقِ عامہ
کے لئے مضری ہیں، ان کے نتیجے میں چند افراد پلتے بڑھتے ہیں، اور پوری ملت مفلس ہوتی ہے،
ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لئے حلال نہیں کہ وہ پوری ملت کے خلاف
ایک جرم ہے، آیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں پر حاوی ہے، ارشاد ہے، وَلَا تَكُونُوا مِمَّنْ أَمَّا لَكُمْ
بَيْنَكُمْ وَمَا يُبَايِعُكُمْ بِغُلَامٍ، یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر، اس میں ایک بات تو یہ قابل
غور ہو کہ قرآن کریم کے الفاظ میں آمَّا لَكُمْ كُنْتُمْ آيَا ہے جس کے اصلی معنی ہیں اپنے اموال جن
میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ تم جو کسی دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور
کر دو کہ دوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت اور تعلق ہوگا جیسا تمہیں اپنے مال
سے ہے، اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دکھ پہنچا اُس کا اس وقت بھی
ایسا ہی احساس کرو، کہ گویا وہ تمہارا مال ہو۔

اس کے علاوہ اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے مال میں
کوئی ناجائز تصرف کرتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہ رسم چل پڑی تو دوسرے اس کے
مال میں ایسا ہی تصرف کریں گے، اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف حقیقت
اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے، غور کیجئے اشیاء ضرورت میں ملاوٹ
کی رسم چل جائے، کوئی گھی میں تیل یا چربی ملا کر زائد پیسے حاصل کرے، تو اس کو جب دودھ خریدنے
کی ضرورت پڑے گی دودھ والا اس میں پانی ملا کر دے گا، مسالہ کی ضرورت ہوگی اس میں ملاوٹ
ہوگی، دوا کی ضرورت ہوگی اس میں بھی یہی منظر سامنے آئے گا، تو جتنے پیسے ایک شخص نے ملاوٹ

کر کے زائد حاصل کرنے، دوسرا آدمی وہ پیسے اس کی جیب نکال لیتا ہے، اسی طرح دوسرے کے پیسے تیسرا نکال لیتا ہے، یہ بیوقوف اپنی جگہ پیسوں کی زیادتی شمار کر کے خوش ہوتا ہے، مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا رہا، تو جو کوئی دوسرے کے مال کو غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے درحقیقت وہ اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ اس ارشاد خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریق سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کر لینا بھی داخل ہے، چوری اور ڈاکہ بھی، جن میں دوسرے پر ظلم کر کے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رشوت اور تمام بیوع فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جو از روئے شرع جائز نہیں، اگرچہ منکرین کی رضا مندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کر لینا یا ایسی کمائی جس کو شریعت اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے، اگرچہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو وہ سب حرام اور باطل ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں اگرچہ صراحت کھانے کی مانعت مذکور ہے، لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ مطلقاً استعمال کرنا ہے، خواہ کھالی کرا یا پین کر یا دوسرے طریقے کے استعمال سے، مگر محاورات میں ان سبب سے ہستیاؤں کو کھالینا ہی بولا جاتا ہے، کہ فلاں آدمی فلاں کا مال کھا گیا، اگرچہ وہ مال کھانے پر لائق نہ ہو۔

شان نزول آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت صحابہ کرام میں سے دو صاحبزادے آئیں، ایک زمین پر جھگڑا ہوا، امت محمدیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، مدعی کے پاس گولہ نہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی ضابطہ کے مطابق مدعا علیہ کو حاکم کر کے حکم دیا، وہ حلف پر آمادہ ہو گیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور نصیحت ان کو یہ آیت سنائی: **إِنَّ أَوْلَىٰ بَيْنَ بَنِي إِسْرَءِيلَ يَحْكُمُونَ بِآيَاتِنَا**، جس میں قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرنے پر وعید مذکور ہے، صحابی نے جب یہ آیت سنی تو قسم کھانے کو ترک کر دیا اور زمین مدعی کے حوالہ کر دی۔ (روح المعانی)

اس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ناجائز طریق پر کسی کا مال کھانے یا حاصل کرنے کو حرام قرار دیا ہے، اور اس کے آخر میں خاص طور پر جھوٹا مقدمہ بنانے اور جھوٹی قسم کھانے اور جھوٹی شہادت دینے اور دلوں کی سخت مانعت اور اس پر وعید آئی ہے، ارشاد ہے: **وَتَذَكَّرُوا بِهَا إِلَىٰ الْحُكَامِ لِيَأْتِيَنَّكُمْ قَاتِلِينَ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ**، یعنی نہ لے جاؤ اموال کے مقدمات حکام تک، تاکہ ان کے ذریعہ تم لوگوں کے اموال کا کوئی حصہ کھا جاؤ بطریق گناہ جب کہ تم جانتے بھی ہو کہ اس میں تمہارا کوئی حق نہیں، تم جھوٹا مقدمہ بنا رہے ہو، **وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ** سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی معاملہ کی بنا پر اس چیز کو اپنا حق سمجھتا ہے، وہ اگر عدالت میں

دعویٰ دائر کر کے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں، اسی جیسے ایک واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ
إِلَىٰ وَتَعْلَمُونَ بَعْضُكُمْ أَنْ يَكُونَتْ
الْعَيْنُ بِحُجَّتِهِ مِنْ تَعْنِيهِ نَاقِصٌ
لَهُ عَلَىٰ تَحْوِيٍّ أَسْمُ مِنْهُ فَمَنْ
قَضَيْتَ لَهُ بِئْسَىٰ مِنْ حَقِّ أَخِيهِ
فَلَا يَأْخُذْهُ فَإِنَّمَا أَفْطَمَ لَهُ
يَقْطَعُ مِنَ النَّارِ (رواه البخاری
ومسلم عن ام سلمة)

”یعنی میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو، اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے معاملہ کو زیادہ رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرے، اور میں اسی سے مطمئن ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو زیادہ کھو کر حقیقت حال تو عموماً معاملہ کو خود معلوم ہوتی ہے، اگر فی الواقع وہ اس کا حق نہیں ہے تو اس کو لینا نہیں

چاہئے، کیونکہ اس صورت میں جو کچھ میں اس کو دوں گا وہ جہنم کا ایک قطعہ ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں واضح فرمادیا کہ اگر امام یا قاضی یا امام المسلمین کسی مخالط کی وجہ سے کوئی فیصلہ کرے جس میں ایک کا حق دوسرے کو ناجائز طور پر مل رہا ہو، تو اس عدالتی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو جاتا، اور جس کے لئے حلال ہے اس کے لئے حرام نہیں ہو جاتا، الغرض عدالت کا فیصلہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہیں بناتا، اگر کوئی شخص جھوٹ فریب یا جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا مال بذریعہ عدالت لے لے، تو اس کا وبال اس کی گردن پر رہے گا اس کو چاہئے کہ آخرت کے حساب کتاب اور عظیم ذخیر کی عدالت میں پیشی کا خیال کر کے اس کو چھوڑ دے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جن معاملات میں کوئی عقد یا فیخ ہوتا ہو اور جن میں قاضی یا جج کو بھی شرعاً اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ایسے معاملات میں اگر جھوٹی قسم یا جھوٹی شہادت کی بنا پر بھی کوئی فیصلہ قاضی نے صادر کر دیا تو شرعاً وہ عقد یا فیخ صحیح ہو جائے گا، اور حلال و حرام کے احکام اس پر مامد ہو جائیں گے، اگرچہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی شہادت دلوںے کا وبال اس کی گردن پر رہے گا۔

مال حلال کی برکات
مقامات میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں فرمائی ہیں، ایک آیت اور حرام کی نحوست میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق یا بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اخلاق حمیدہ اور

اعمال صالحہ کا صدور شکل ہوا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ مَنُكِّلُوا مِنِ الْخَبِيثَاتِ
وَاعْتَمِلُوا صَالِحًا لِّإِيَّايَ يَتَأْتِكُنَّ
عَلَيْتُهُ (۵۱:۲۳)

یعنی اے گردہ انبیاءِ حلال اور پاک چیزیں
کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال
کی حقیقت سے واقف ہوں ۵

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عمل صالح کا حکم شرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ اعمالِ صالحہ کا صدور جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب انبیاء علیہم السلام کو ہے، مگر یہ حکم کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان اس کے مامور ہیں، اس حدیث کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی، بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دعا کے لئے پھیلاتے ہیں، اور یارب یارب پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام ہے تو ان کی یہ دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا حصہ اسی کام کے لئے وقف رہا ہے کہ امت کو حرام سے بچانے اور حلال کے استعمال کرنے کی ہدایتیں دیں۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کی ایذاؤں سے محفوظ رہے وہ جنت میں جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آجکل تو یہ حالات آپ کی امت میں عام ہیں، بیشتر مسلمان ان کے پابند ہیں، آپ نے فرمایا ہاں! آئندہ بھی ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہیں گے جو ان احکام کے پابند ہوں گے (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے، اور اس کو صحیح فرمایا ہے)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ چار خصلتیں ایسی ہیں جب وہ تمہارے اندر موجود ہوں تو پھر دنیا میں کچھ بھی حاصل نہ ہو تو تمہارے لئے کافی ہیں، وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ایک امانت کی حفاظت، دوسرے سچ بولنا، تیسرے حسن خلق، چوتھے کھانے میں حلال کا اہتمام۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے یہ دعا فرمادیجئے کہ میں معتبول الدعاء ہو جاؤں، جو دعا کیا کروں قبول ہو کرے، آپ نے فرمایا اے سعد اپنا کھانا حلال اور پاک بنا، لو، تجاب الدعوات ہو جاؤ گے، اور قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو

چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لئے تو جہنم کی آگ ہی لائق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب اور زبانِ مسلم نہ ہو جائے، اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں، اور جب کوئی بندہ مالِ حرام کما تکے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا، اور اگر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی، اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لئے اس کا توشہ ہوتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ بڑی چیز سے بُرے عمل کو نہیں پسند دھوئے، ہاں اچھے عمل سے بُرے عمل کو دھو دیتے ہیں۔

مشرین ہر انسان کا پانچ ہم ساوا اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَا تَزَالُ قَدَّ مَاتَ بَيْنَ يَوْمٍ لِّعِيَا مَسْجِدٍ
حَتَّى يَسْأَلَ عَنْ أَمْرٍ عَنِ عَمَلِهِ فِيهِمَا
مَا ذُنُوبُهُ وَعَنْ شَيْءٍ فِيهِمَا أَبْلَاكَ
وَعَنْ مَالِهِ بَيْنَ أَيْمَنِ اكْتَسَبَهُ وَفِيهِمَا
الْغَنَقَةُ وَعَنْ عَمَلِهِ مَا ذَا عَمِلَ
فِيهِ (البیہقی، مرغیب)

قیامت کے روز عشر میں کوئی بندہ اپنی
جگہ سے سرک نہ سکے گا، جب تک اس سے چار
سوالوں کا جواب نہ لیا جائے، ایک یہ کہ اس نے
اپنی عمر کس کام میں فنا کی دوسرے یہ کہ اپنی
جوانی کس شغل میں برباد کی تیسرے یہ کہ اپنا
مال کہاں سے کمایا، اور کہاں خرچ کیا، اور چوتھے
یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا ۵

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ اے جماعتِ مہاجرین، پانچ خصلتیں ہیں جن کے متعلق میں اللہ تعالیٰ ہے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں، ایک یہ کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلتی ہے تو ان پر طاعون اور وبایں اور ایسے نئے نئے امراض مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو ان کے آباء و اجداد نے کئے بھی نہ تھے، اور دوسرے یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہو جا تو ان پر قحط اور گرانی اور مشقت و محنت اور حکام کے مظالم مسلط کر دیئے جاتے ہیں، اور تیسرے یہ کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے تو بارش بند کر دی جاتی ہے، اور چوتھے یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالیٰ ان پر اجنبی دشمن مسلط فرما دیتے ہیں، جو ان کے مال بغیر کسی حق کے چھین لیتا ہے، اور پانچویں یہ کہ جب کسی قوم کے اربابِ اقتدار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام ان کے دل کو نہ لگیں تو

عہ بعض روایات میں پانچ کلمے ہیں اس میں مال کے دو سوالوں کو الگ الگ شمار کیا ۵

اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دینے میں مدد دیتا ہے اور حکم نے اس کو صحیح علی شرط مسلم فرمایا ہے۔
اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

يَسْعَوْنَكَ عَنِ الْاَهْلِ كُلِّ هِي مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَبِجِّ مَوَاقِيْتُ

تجھ سے بڑھتے ہیں حال نئے چاند کا بھر دے کہ میادقات مقررہ ہیں لوگوں کی واسطے اور حج کے واسطے اور

الْبِرِّ بَانَ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مِنَ الْقِيَّةِ وَ

یکسی نہیں کہ گھروں میں آؤ ان کی پشت کی طرف سے اور یکسی نیکی یہ کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے اور

أَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۳﴾

گھروں میں آؤ دروازوں سے اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُوكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا اِنَّا

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کرو بیشک

اللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۱۴﴾ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَ

اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو، اور مار ڈالو ان کو جس جگہ پاؤ اور

اَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ اَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچنا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے

وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَاِنْ

اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر اگر وہ

فَاتْلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿۱۵﴾

خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مار دو یہی ہے سزا کا فسروں کی۔

رَبُّ آيَاتٍ اَيُّ لَيْسَ الْبِرِّ كَيْفَ تَعْتَمِدُ بَيَانِ هُوَ چکا ہے کہ اس کے بعد آخر سورہ بقرہ تک

ابواب البر کا بیان ہو گا، جو اہم احکام شرعیہ پر مشتمل ہیں، ان میں پہلا حکم قصاص کا دوسرا وصیت کا، تیسرا اور چوتھا صوم اور اس کے متعلقہ مسائل کا، پانچواں اعتکاف کا، چھٹا مال حرام سے بچنے کا تھا، مذکورہ صدر دو آیتوں میں حج اور جہاد کے احکام و مسائل کا بیان ہے، اور حج کے حکم سے پہلے یہ بتلایا گیا کہ روزہ اور حج وغیرہ میں قمری مہینوں اور دنوں کا اعتبار ہو گا۔

لغاست: اہلہ، ہلال کی جمع ہے، قمری مہینہ کی ابتدائی چند راتوں کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے، مَوَاقِيْتُ، میقات کی جمع ہے، جس کے معنی مطلق وقت یا مہینہ کا وقت کے آتے ہیں (ذہبی)

خلاصہ تفسیر

حکم ہفتم، اعتبار حساب (یعنی آدمی آپ سے ان) چاندوں کے (ہر مہینہ گھٹنے بڑھنے کی)

حالت را اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ کی تحقیقات کرتے ہیں

قمری درجہ وغیرہ آپ فرمادیجئے کہ فائدہ اس کا یہ ہو کہ وہ چاند اپنے اس گھٹنے اور

بڑھنے کے اعتبار سے (زود مایا سہولت) آئے سشناخت اوقات ہیں لوگوں کے (اختیاری معاملات

مثل عدت و مطالبہ حقوق کے لئے اور (غیر اختیاری عبادات مثل) حج (و زکوٰۃ و روزہ وغیرہ)

کے لئے۔

حکم ہشتم، اصلاح رسم جاہلیت (بعض لوگ قبل اسلام کے اگر حج کا احرام باندھنے کے بعد کسی

ضرورت سے گھر جانا چاہتے تھے، تو دروازہ سے جانا ممنوع

جانتے تھے، اس لئے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے، اور اس عمل

کو فضیلت سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس کے متعلق بعد ذکر حج کے ارشاد فرماتے ہیں) اور اس میں

کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو، ہاں لیکن فضیلت یہ ہو کہ کوئی

شخص حرام (چیسروں) سے بچے اور (چونکہ گھروں میں دروازہ کی طرف سے آنا حرام نہیں ہے

اس لئے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں، سو اگر آنا چاہو تو) گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ،

اور (اصل الاصول تو یہ ہو کہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے البتہ امید ہے کہ تم راہین

میں کامیاب ہو۔

حکم نہم، قتال کفار (رذی قعدہ سلسلہ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اولے عمرہ کے

قصد سے مکہ معظمہ تشریف لے چلے آئے وقت تک مکہ معظمہ میں

کے قبضہ اور حکومت میں تھا، ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہیوں کو مکہ

کے اندر نہ جانے دیا اور عمرہ رہ گیا، آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ معاہدہ قرار پایا کہ سال آئندہ

تشریف لا کر عمرو اور افراد میں، چنانچہ ذی قعدہ عشرہ میں پھر آپ اسی قصد سے تشریف لے چلے، لیکن آپ کے ساتھی مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید مشرکین اپنا معاہدہ پورا نہ کریں اور آمادۂ مقابلہ و معاکرہ ہو جاویں، تو ایسی حالت میں نہ سکوت مصلحت ہے، اور اگر مقابلہ کیا جاوے تو ذی قعدہ میں قتال لازم آتا ہے، اور یہ مہینہ منجملہ اُن چار مہینوں کے ہے جن کو اُشہر حُرّم کہا جاتا ہے، ان چاروں مہینوں میں اُس وقت تک قتل و قتال حرام و ممنوع تھا، یہ چار مہینے ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب تھے، غرض مسلمان اس تردد سے پریشان تھے، حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائی کہ ان خاص معاہدہ کرنے والوں کے ساتھ بوجہ باہمی معاہدہ کے تم کو اپنی جانب سے ابتداء قتال کرنے کی اجازت نہیں، لیکن اگر وہ لوگ خود عہد شکنی کریں اور تم سے لڑنے کو آمادہ ہو جاویں تو اُس وقت تم کسی طرح کا اندیشہ دل میں مت لاؤ، اور (بے تکلف) تم (بھی) لڑو اور اللہ کی راہ میں (یعنی اس نیت سے کہ یہ لوگ دین کی مخالفت کرتے ہیں) ان لوگوں کے ساتھ نقص عہد کر کے (تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (از خود) حد معاہدہ سے مت نکلو، کہ عہد شکنی کر کے (لڑنے لگو)، واقعی اللہ تعالیٰ حد (قانون شرعی) سے بھٹکنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور (جس حالت میں وہ خود عہد شکنی کریں تو اس وقت دل کھول کر خواہ) ان کو قتل کرو چاہ ان کو پاؤ اور (خواہ) ان کو (دیکھ نکال باہر کرو چاہ ان سے انھوں نے تم کو (منگ کر کے اور ایذا میں پہنچا کر) بھٹکنے (اور ہجرت کرنے) پر مجبور کیا ہے، اور (تمہارے اس قتل و اخراج کے بعد بھی عقلاً الزام انھیں پر رہے گا، کیونکہ عہد شکنی جو ان سے واقع ہوگی، بڑی شرارت کی بات ہے اور ایسی) شرارت (ضرر میں) قتل (و اخراج) سے بھی سخت تر ہے (کیونکہ اس قتل و اخراج کی نسبت اس شرارت ہی کی بدولت پہنچی ہے) اور (علاوہ معاہدہ کے ان کے ساتھ ابتداء قتال کرنے سے ایک اور امر بھی منع ہوا ہے کہ حرم تشریف یعنی مکہ اور اس کا گرد اگر دایک واجب الاحترام جگہ ہے، اور اس میں قتال کرنا اس کے احترام کے خلاف ہے، اس لئے بھی حکم دیا جاتا ہے کہ) ان کے ساتھ مسجد حرام کے قرب (و فواح) میں (جو حرم کہلاتا ہے) قتال مت کرو جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں، ہاں اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کرنے لگیں تو اس وقت پھر تم کو بھی اجازت ہے کہ تم (بھی) ان کو مارو (و عاڈو) ایسے کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سزا ہے۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں صحابہ کرام کا ایک سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب نقل کیا گیا ہے۔ امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ

کی ایک خاص شان ہو، کہ انہوں نے بوجہ عظمت و مہبت کے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات بہت کم کئے ہیں، بخلاف پچھلی امتوں کے کہ جنہوں نے بکثرت سوالات کئے اور اس ادب کو ملحوظ نہیں رکھا، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کے سوالات جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے مکمل چودہ ہیں، جن میں سے ایک سوال ابھی اور مقرر ہے، **وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ**، دوسرا سوال یہ ہے، اور ان کے بعد سورہ بقرہ ہی میں چھ سوال اور مذکور ہیں، اور باقی چھ سوالات مختلف سورتوں میں آئے ہیں۔

آیت مذکورہ میں ذکر یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اھلۃ
یعنی شروع پہننے کے چاند کے متعلق سوال کیا کہ اس کی صورت آفتاب سے مختلف ہے، کہ وہ کبھی
باریک ہلالی شکل میں ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہی، پھر پورا دائرہ ہو جاتا ہے، پھر اس میں
تدریجی کی اسی طرح آتی ہے، اس کی حقیقت دریافت کی یا حکمت و مصلحت کا سوال کیا، دونوں
احتمال ہیں، مگر جو جواب دیا گیا اس میں حکمت و مصلحت کا بیان ہے، اگر سوال ہی یہ تھا کہ چاند
کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت و مصلحت کیا ہی، تب تو جواب اس کے مطابق ہو ہی گیا، اور اگر سوال
سے اس گھٹنے بڑھنے کی حقیقت دریافت کرنا مقصود تھا جو صحابہ کرامؓ کی شان سے بعید ہے تو
پھر جواب بجا حقیقت کے حکمت و مصلحت بیان کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اجرام ساریہ کے
حقائق دریافت کرنا انسان کے بس میں بھی نہیں، اور ان کا کوئی دینی یا دنیوی کام اس حقیقت
کے علم پر موقوف بھی نہیں، اس لئے حقیقت کا سوال فضول ہے، پوچھنے اور بتلانے کی بات یہ
ہے کہ چاند کے اس طرح گھٹنے بڑھنے چھپنے اور طلوع ہونے سے ہمارے کون سے مصالح و مصلحت
ہیں، اس لئے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ
تمہاری مصالح جو چاند سے وابستہ ہیں یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ تمہیں اپنے معاملات اور معاہدوں
کی میعاد مقرر کرنا اور حج کے ایام معلوم کرنا آسان ہو جاتے گا۔

قری اور ٹیسی حساب | اس آیت سے تو اتنا معلوم ہوا کہ چاند کے ذریعہ تھیں تاریخوں اور مہینوں کا
کی شرعی حیثیت | حساب معلوم ہو جائے گا، جس پر تمہارے معاملات اور عبادات حج وغیرہ
کی بنیاد ہے، اسی مضمون کو سورۃ یونس کی آیت ۵ میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے، وَقَدْ سَدَّ تَتَابِلَ
لِتَعْلَمُوا عَدَّةَ الْيَمِينِ وَالْحِجَابِ رُونَ، جس سے معلوم ہوا کہ چاند کو مختلف منزلوں اور
مختلف حالات سے گزارنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سال اور مہینوں اور تاریخوں کا
حساب معلوم ہو سکے، مگر سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۵۴ میں اس حساب کا تعلق آفتاب سے بھی
بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے:

فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ | پھر مٹا یا رات کا نمونہ اور بنادیا دن کا

مُبْجِسَةً لِّتَبْتَغُوا أَفْضَلًا مِّنْ
تَّرْتِكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ
وَالْحِسَابِ ۝ (۱۲: ۱۹۱)

اسی میری آیت سے اگرچہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے رکما ذکرہ فی روح المعانی

لیکن چاند کے معاملہ میں جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کئے ان سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعت اسلام میں حساب چاند ہی کا متعلق ہے، خصوصاً ان عبادات میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے، جیسے روزہ رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرم، شہر برأت وغیرہ جو احکام متعلق ہیں وہ سب رویت ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں کیونکہ اس آیت میں جی مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ قَالِیْهِجَ فَرَاکَرْتَلَا دِیَا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے، اگرچہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

شریعت اسلام نے چاند کے حساب کو اس لئے اختیار فرمایا کہ اس کو ہر آنکھوں والا فنی پر دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے، عالم جاہل، دیہاتی، جزیروں، پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی سب کو اس کا علم آسان ہے، بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلات رصدیہ اور قواعد ریاضیہ پر موقوف ہے جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کر سکتا، پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطور فرض متعین کر دیا، اور عام معاملات تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا، جو عبادت اسلامی کا ذریعہ اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہو، اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، شرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہو جائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلا دیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات روزہ و حج وغیرہ میں غلط لازم آتا ہے، جیسا اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پوچھے یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرت قومی و ملی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے ان میں صرف شمسی حساب رکھیں، باقی نجی خط و کتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا، اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔

مسئلہ: لَکِنَ الْاِیْرَکَانَ تَاکُوْا الْکِبٰیوْتِیْنَ مِّنْ ظُلُمٍ ۙ ہَا، اس آیت سے یہ مسئلہ بھی محل آیا کہ جس چیز کو شریعت اسلام نے ضروری یا عبادت نہ سمجھا ہو اس کو اپنی طرف سے ضروری اور عبادت سمجھ لینا جائز نہیں، اسی طرح جو چیز شرعاً جائز ہو اس کو گناہ سمجھنا بھی گناہ ہے، ان

لوگوں نے ایسا ہی کر رکھا تھا کہ گھر کے دروازوں سے داخل ہونا جو شرعاً جائز تھا اس کو گناہ قرار دیا، اور مکان کی پشت سے دیوار توڑ کر آنا جو شرعاً ضروری نہیں تھا اس کو ضروری سمجھا، اسی پر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی، بدعات کے ناجائز ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ غیر ضروری چیزوں کو فرض و واجب کی طرح ضروری سمجھ لیا جاتا ہے، یا بعض جائز چیزوں کو حرام و ناجائز قرار دیدیا جاتا ہے، اس آیت سے ایسا کرنے کی ممانعت واضح طور پر ثابت ہو گئی جس سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہو گیا۔

حکم نہم جہاد و قتال

اس پر ساری امت کا اتفاق ہے کہ ہجرت مدینہ سے پہلے کفار کے ساتھ جہاد و قتال ممنوع تھا، اس وقت کی تمام آیات قرآنی میں مسلمانوں کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور عفو و درگزر کا ہی تلقین تھی، ہجرت مدینہ کے بعد سب سے پہلے اس آیت میں قتال کفار کا حکم آیا، قَالَ الرِّیْحُ بَنَیْشَ وَغَیْرَہُ اور صدیق اکبرؓ سے ایک روایت یہ بھی ہو کہ قتال کفار کے متعلق پہلی آیت یہ ہے، اِذْ ذٰلَکَ یُلٰذِیْنِ یُقَاتِلُوْنَ بِاَنۡفُسِہُمۡ ظِلَمُوْا (۲۹: ۱۲۲) مگر اکثر حضرات صحابہؓ و تابعینؓ کے نزدیک پہلی آیت سورۃ بقرہ کی آیت مذکورہ ہی ہو اور صدیق اکبرؓ نے جس کو پہلی فرمایا ہے وہ بھی ابتدائی آیتوں میں ہونے کے سبب پہلی ہی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں حکم یہ ہو کہ مسلمان صرف ان کافروں سے قتال کریں جو ان کے مقابلہ پر قتال کے لئے آویں، اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں، بچے، بہت بوڑھے اور اپنے مذہبی شغل میں دنیا سے یکسو ہو کر گئے ہوئے عبادت گزار راہب، پادری وغیرہ اور ایسے ہی اپاہج و معذور لوگ یا وہ لوگ جو کافروں کے یہاں محنت مزدوری کا کام کرتے ہیں ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوتے ایسے لوگوں کو جہاد میں قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ حکم آیت کا صرف ان لوگوں سے قتال کرنے کا ہے، جو مسلمانوں کے مقابلہ میں قتال کریں، اور مذکورہ قسم کے سب افراد قتال کرنے والے نہیں، اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی عورت یا بولہ یا مذہبی آدمی وغیرہ کفار کی طرف سے قتال میں شریک ہوں یا مسلمانوں کے بالمقابل جنگ میں ان کی مدد کسی طرح سے کر رہے ہوں ان کا قتل جائز ہے، کیونکہ وہ اَلَّذِیۡنَ یَقَاتِلُوْکُمْ فَاَکْثَرُ مِنْ دَاخِلِہِیۡں (منظہری، قرطبی، جصاص)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات جو مجاہدین اسلام کو بوقت جہاد دی جاتی تھیں، ان میں اس حکم کی واضح تشریحات مذکور ہیں، صحیح بخاری و مسلم میں ہر روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک حدیث میں ہے:

تَعْلٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم
وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ الْیَسَاءِ وَالْقَبَائِلِ

تین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں
اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔

اور ابو داؤد میں بروایت ابن شہابہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ
ہدایات منقول ہیں، تم اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کی ملت پر جہاد کے لئے جاؤ، کسی بوڑھے ضعیف
کو اور چھوٹے بچے کو یا کسی عورت کو قتل نہ کرو (منظہری)

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یزید بن ابی سفیان کو ملک شام بھیجا تو ان کو یہی ہدایت دی،
اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عبادت گزار اور راہبوں کو اور کافروں کی مزدوری کرنے والوں کو
بھی قتل نہ کریں، جبکہ وہ قتال میں حصہ نہ لیں (قرطبی)

آیت کے آخر میں قَدْ تَعَسَّدُوا کا بھی جہور مفسرین کے نزدیک یہی مطلب ہے کہ
قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو، کہ عورتوں بچوں وغیرہ کو قتل کرنے لگو۔

وَأَقْتُلُوا الْمُشْکِیْکَ لَقِیْتُمْ مَّوْہِمًا وَآخَرُجُوْہُمْ مِّنْ حَیْثُ أَخْرَجُوْکُمْ۔ خلاصہ تفسیر

میں بیان ہو چکا کہ یہ آیت واقعہ حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی ہے، جب صلح حدیبیہ
کی شرط کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس عمرہ کی قضاء کے
لئے سفر کا ارادہ کیا، جس سے اس سے پہلے سال میں کفار مکہ نے روک دیا تھا، صحابہ کرامؓ کو اس
سفر کے وقت یہ خیال ہو رہا تھا کہ کفار کی صلح اور معاہدہ کا کچھ بھروسہ نہیں، اگر وہ لوگ اس سال
بھی آمادہ پیکار ہو گئے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے، اس پر آیت مذکورہ کے الفاظ نے ان کو اجازت
دیدہ کہ اگر وہ قتال کرنے لگیں تو تمہیں بھی اجازت ہے، کہ جہاں پاؤ ان کو قتل کرو، اور اگر قدرت
میں ہو تو جس طرح انھوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا تم بھی ان کو مکہ سے نکال دو۔

اور پوری مکی زندگی میں جو مسلمانوں کو کفار کے ساتھ مقابلہ سے روکا ہوا تھا، اور ہمیشہ
عفو و درگزر کی تلقین ہوتی رہی تھی، اس لئے صحابہ کرامؓ کو اس آیت کے نازل ہونے سے یہی
خیال تھا کہ کسی کافر کو قتل کرنا برا اور ممنوع ہے، اس خیال کے ازالہ کے لئے فرمایا وَالْفِتْنَةُ
اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ، یعنی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ کسی کو قتل کرنا سخت بڑا کام ہے، مگر کفار مکہ کا
اپنے کفر و شرک پر چار ہٹنا اور مسلمانوں کو ادائے عبادت حج و عمرہ سے روکنا اس سے زیادہ سخت
و شدید ہے، اس سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، آیت میں لفظ فتنہ
سے کفر و شرک اور مسلمانوں کو ادائے عبادت سے روکنا ہی مراد ہے (جصاص قرطبی وغیرہ)

البتہ اس آیت کے عموم سے جو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ کفار جہاں کہیں ہوں ان کا قتل کرنا جائز
ہے، اس عموم کی ایک تخصیص آیت کے اگلے جملے میں اس طرح کر دی گئی وَلَا تَقْتُلُوا مَنۢ مِّنۡہُمْ عِنۡدَ

الْمُتَّحِدِ الْاَحْرَامِ حَتّٰی یُقْتَلُوْا کُفْرًا فِیْہِ، یعنی مسجد حرام کے آس پاس جس سے مراد پورا حرم مکہ ہے
اس میں تم ان لوگوں سے اس وقت تک قتال نہ کرو جب تک وہ خود قتال کی ابتداء نہ کریں۔

مسئلہ: حرم مکہ میں انسان کیا کسی شکاری جانور کو بھی قتل کرنا جائز نہیں، لیکن اس
آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرم محترم میں کوئی آدمی دوسرے کو قتل کرنے لگے تو اس کو بھی ممانعت
میں قتال کرنا جائز ہے، اس پر جہور فقہاء کا اتفاق ہے۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتداء جہاد و قتال کی ممانعت صرف مسجد
حرام کے آس پاس حرم مکہ کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے مقامات میں جیسے دفاعی جہاد و ضروری
ہر اسی طرح ابتدائی جہاد و قتال بھی درست ہے۔

فَاِنْ اَنْتَہُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۱

پھر اگر وہ باز آئیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہو، اور لاؤ ان سے یہاں تک کہ

فِتْنَتُہٗ وَیَكُوْنُ الدِّیْنُ لِلّٰہِ فَاِنْ اَنْتَہُوْا فَلَا عُدُوْا اِلَّا عَلٰی

نہ باقی رہے فساد اور حکم ربہ خدا تعالیٰ کا پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر

الظَّالِمِیْنَ ۝۱۲

ظالموں پر، حرمت والا ہمیشہ بدلہ (مقابلہ) حرمت الیٰہیہ کے اور مادہ کفر میں بدلہ ہے،

فَمَنْ اَعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاَعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اَعْتَدٰی عَلَیْکُمْ

پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی کی تم پر

وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ السَّاقِیْنَ ۝۱۳

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے پرہیزگاروں کے، اور خرچ کرو اللہ

سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّہْکِیْمَةِ ۝۱۴

کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں، اور نیکی کرو

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۱۵

بیشک اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر | پھر اگر (بعد شروع قتال کے بھی) وہ لوگ (یعنی مشرکین مکہ اپنے کفر سے) باز نہ آجائیں

اور اسلام قبول کر لیں، تو ان کا اسلام بے قدر نہ سمجھا جاوے گا بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے گزشتہ کفر کو بخش دے گا اور مغفرت کے علاوہ بے شمار نعمتیں دے کر ان پر ہر باری رحیمی فرادے گا اور اگر وہ لوگ اسلام نہ لائیں تو اگرچہ دوسرے کفار کے لئے اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی اگر اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینے کا اقرار کر لیں تو ان کا قتل جائز نہیں رہتا، بلکہ ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت پر لازم ہو جاتی ہے، مگر یہ خاص کفار چونکہ اہل عرب ہیں، ان کے لئے قانون جزیہ نہیں، بلکہ ان کے لئے صرف دو راستے ہیں، اسلام یا قتل اس واسطے ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور ان کا (دین و خالص) الشہی کا ہو جائے اور کسی کا دین و مذہب کا خالص اللہ کے لئے ہو جانا معروف ہے، قبول اسلام پر، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کر لیں، اور اگر وہ لوگ (کفر سے باز آجائیں جس کا ذکر ابھی ہوا بھی ہے) تو آخرت میں مغفرت و رحمت کے مستحق ہونے کے ساتھ دنیا میں ان کے لئے ستم کو یہ قانون بتلایا جاتا ہے کہ سزا کی سختی کسی پر نہیں ہو کر لی، بجز بے انصافی کرنے والوں کے (جو براہ بے انصافی خدائی احسانات کو قبول کر کفر و شرک کرنے لگیں اور جب یہ لوگ اسلام لے آئے تو بے انصاف نہ ہے، لہذا ان پر سزائے قتل کی سختی نہ رہی اور مسلمانوں کو جو یہ خیال ہے کہ کفار مکہ اگر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تو شہر حرام یعنی ذی قعدہ میں ان سے لڑنا پڑے گا، سو اس سے بھی بے فکر رہو، کیونکہ حرمت والاہینہ (تم کو قتال کفار سے مانع ہو سکتا ہے بعض اس کے کہ اس حرمت والے مہینہ کے سبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں) اور (جو یہ ہے کہ یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں (سو جو تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کرے تو تم بھی رعایت رکھو اور جو تم پر ایسی حرمتوں کی رعایت نہ کرے) زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور ان سب احکام مذکورہ کے برتاؤ میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ کسی امر میں حد قانونی سے تجاوز نہ ہونے پاوے) اور یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ (اپنی عنایت و رحمت سے) ان ڈرے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

حکم دہم انفاق فی الجہاد اور ستم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں جہاد میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو کہ ایسے مواقع میں جان و مال خرچ کرنے سے جبن یا بخل کرنے لگو، جس کا نتیجہ تمہارا ضعیف اور مخالف کا قوی ہو جانا ہے، جو کہ عین تباہی ہے (اور جو) کام (کرد) اچھی طرح کیا کرو (مثلاً اس فتح پر خرچ کرنا بادل کھول کر خوشی سے اچھی نیت کی گشتا خرچ کرو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح

کام کر لے والوں کو۔

معارف مسائل

مسئلہ: جری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے قانون کے مطابق فوت شدہ عمرہ ادا کرنے کے لئے بمعیت صحابہ مکہ کے سفر کا ارادہ کیا تو صحابہ کرام جانتے تھے کہ ان کفار کے معاہدوں اور صلح کا کچھ اعتبار نہیں ممکن ہو کہ وہ جنگ کرنے لگیں، تو اس جنگ میں صحابہ کے لئے ایک اشکال تو یہ تھا کہ حرم مکہ میں جنگ کی نوبت آئے گی، جو اسلام میں ناجائز ہو، اس کا جواب پچھل آیت میں دیدیا گیا کہ حرم مکہ کی حرمت مسلمانوں پر ضرور لازم ہے، لیکن اگر کفار حد و حرم میں ہی مسلمانوں سے جنگ کرنے لگیں تو ان کو بھی مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہو دوسرا اشکال یہ تھا کہ یہ مہینہ ذیقعدہ کا ہے جو ان چار مہینوں میں سے ہے، جن کو اشہر حرم کہا جاتا ہے، اور ان میں کسی سے کسی جگہ جنگ کرنا جائز نہیں، تو اگر مشرکین مکہ نے ہمارے خلاف جنگ شروع کر دی تو ہم اس مہینے میں دفاعی جنگ کیسے کر سکتے ہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جیسے حرم مکہ کی حرمت سے حالت دفاع مستثنیٰ ہے، اسی طرح اگر اشہر حرم میں کافر ہم سے قتال کرنے لگیں تو ہم کو بھی ان سے دفاعی جنگ لڑنا جائز ہے۔

مسئلہ: اشہر حرم چار مہینے ہیں، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ تین ماہ تو مسلسل ہیں، چوتھا مہینہ رجب کا ہے، اسلام سے پہلے بھی ان چار مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھا جاتا تھا، اور مشرکین مکہ بھی اس کے پابند تھے، ابتداء اسلام میں بھی سب جری تک یہی قانون نافذ تھا، اسی لئے صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا، اس کے بعد یہ حرمت قتال منسوخ کر کے عام قتال کی اجازت باجماع امت دیدی گئی مگر افضل اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں ابتداء بالقتال نہ کی جائے، صرف مدافعت کی ضرورت سے قتال کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہنا بھی فی الجملہ درست ہو کہ اشہر حرم کی حرمت منسوخ نہیں باقی ہے، جیسے حرم مکہ میں قتال کی اجازت بغیر مدافعت دینے سے حرم مکہ کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ صرف ایک استثنائی صورت پر عمل ہوا۔

دسواں حکم جہاد کے لئے مال خرچ کرنا

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ، اس میں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ جہاد کے لئے بقدر ضرورت اپنے اموال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، اس سے فقہاء نے یہ حکم بھی نکالا ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کے علاوہ بھی دوسرے حقوق فرض ہیں، مگر وہ نہ واجب ہیں اور نہ ان کے لئے کوئی نصاب اور مقدار

مقین ہوا بلکہ جب اور معنی ضرورت ہو اس کا انتظام کرنا سب مسلمانوں پر فرض ہے، اور ضرورت نہ ہو تو کچھ فرض نہیں، چاہا کہ خرچ بھی اسی میں داخل ہے۔

وَلَا تُلْغُوا بِاَيِّدِيْكُمْ لِيَّ الْاَهْلَآءَ كَيْفَ كُنْتُمْ تَكُوْنُوْنَ
ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت بیان فرمائی ہے، اب یہ بات کہ ہلاکت میں ڈالنے سے اس جگہ کیا مراد ہے؟ اس میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، اور اتمام جصاص رازی نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی تضاد نہیں سب ہی مراد ہو سکتے ہیں، حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہلے ہی ہلے میں نازل ہوئی ہے ہم اس کی تفسیر بخوبی جانتے ہیں، بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ اور قوت عطا فرمادیا تو ہم میں یہ گفتگو ہوئی کہ اب جہاد کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اپنے وطن میں پھر کر اپنے مال و جائیداد کی خبر گیری کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے یہ بتلادیا کہ ہلاکت سے مراد اس جگہ ترک جہاد ہے، اور اس سے ثابت ہوا کہ ترک جہاد مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کا سبب ہے، اسی لئے حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے عمر بھر جہاد میں صرف کر دی، یہاں تک کہ آخر میں قسطنطنیہ میں وفات پا کر وہیں مدفون ہوئے۔

حضرت عباسؓ، حذیفہؓ، قتادہؓ، مجاہدؓ، ضحاكؓ ائمہ تفسیر سے بھی یہی مضمون منقول ہے۔ حضرت براہ بن عازبؓ نے فرمایا کہ گناہوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت اور مغفرت سے مایوس ہو جانا اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا ہے، اس لئے مغفرت سے مایوس ہونا حرام ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا کہ بیوی بچوں کے حقوق ضائع ہو جائیں، یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، ایسا اسراف جائز نہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ ایسی صورت میں قتال کے لئے اقدام کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، جبکہ یہ اندازہ ظاہر ہے کہ دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، خود ہلاک ہو جائیں گے، ایسی صورت میں اقدام قتال اس آیت کی بناء پر ناجائز ہے۔

اور جصاصؒ کے فرمانے کے مطابق یہ سب ہی احکام اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں
وَ اٰخِذُوا بِالنَّفَقَةِ يَجِبُ الْمُتَحَنِّنِينَ۔ اس جملے میں ہر کام کو اچھی طرح کرنے کی ترغیب ہے، اور کام کو اچھی طرح کرنا جس کو قرآن میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، و در طرح کا ہے، ایک عبادت میں دوسرے آپس کے معاملات و معاشرت میں، عبارت میں احسان کی تفسیر حدیث جبریلؑ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ ایسی طرح عبادت کر دیجیے تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ تو اعتقاد لازم ہے

ہو کہ خدا تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔

اور معاملات و معاشرت میں احسان کی تفسیر مسند احمد میں بروایت حضرت معاذؓ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ تم سب لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور جس چیز کو تم اپنے لئے برا سمجھتے ہو وہ دوسروں کے لئے بھی برا سمجھو۔ (منظہری)

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے پھر اگر تم روک دیے جاؤ تو تم پر ہے جو کچھ کہ میسر ہو

الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِفُوْا ۚ وَ سَكُمُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحَلَّهُ ۚ فَمَنْ

سربانی سے اور حج تمت نہ کرو اپنے سروں کی جب تک نہ پہنچ سکے قربانی ابو تمھارے پر پھر ہو

كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا اَوْ بِهٖ اَذًى مِّنْ رَّاسِهِ ۚ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ

کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کو تکلیف ہو سر کی تو بدلہ دیوے روزے یا خیرات

اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَا اُمِيتُمْ فَفَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلٰى

یا سربانی، پھر جب تمہاری خاطر جمع ہو تو جو کوئی فائدہ اٹھاوے عمرہ ملا کر

الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامٌ ثَلَاثَةَ

حج کے ساتھ تو اس پر ہے جو کچھ میسر ہو سربانی سے پھر جس کو قربانی نہ ملے تو روزے رکھے تین

اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةً اِذَا رَجَعْتُمْ ۚ يَلَيْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ ۚ لِّذٰلِكَ

حج کے دنوں میں اور سات روزے جب لوگوں یہ دس روزے ہوئے پورے، یہ حکم

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلًا حَاضِرًا لِّلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ

اس کے لئے ہے جس کے گھر والے نہ رہتے ہوں مسجد الحرام کے پاس اور ڈرتے رہو اللہ سے اور

اعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ الْحَجَّ اَشْهُرٌ مُّعْلُوْمَةٌ ۝

جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے، حج کے چند مہینے ہیں معلوم،

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْكَ وَلَا جِدَالَ فِي

پھر جس شخص نے لازم کر لیا ان میں حج تو بے عجب ہو جائز نہیں عورت اور دگناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا

الْحَجَّ وَمَا تَفَعَّلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ وَتَزَوَّدُوا فَإِنْ خَيْرٌ

حج کے زمانے میں اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے اور زاد راہ لے لیا کرو کہ بیشک بہتر

الزَّادِ الْقَوِيُّ يَا دُولِي الْأَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

فانہ زاد راہ کا پھنا ہر سوال سے اور حج سے ڈرتے رہو اے عقلمند! کچھ گناہ نہیں تم پر کہ

أَنْ تَبْتَغُوا أَفْضَلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا

تلاش کرو فضل اپنے رب کا پھر جب طواف کے لئے لوتو عرفات سے تو یاد کرو

اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۝ وَادْكُرُوا هَذَا نِعْمَةً مِنْكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ

اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھایا اور بیشک تم تھے

مِنْ قَبْلِهِ لَيْسَ الضَّالِّينَ ۝ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ

اس سے پہلے ضالین ، پھر طواف کے لئے پھر جہاں سے سب لوگ پھریں ،

وَاسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ فَإِذَا أَقْضَيْتُمْ

اور مغفرت چاہو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے ہر بان ، پھر جب پوئے کر چکو

مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ وَأَشْذِذُوا لَكُمْ

اپنے حج کے کام کو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ

پھر کوئی آدمی تو کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لئے آخرت میں کچھ

مِنْ خَلْقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

حصہ نہیں ، اور کوئی ان میں کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خیر اور

وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ

آخرت میں خیر اور بچاؤ ہم کو دوزخ کے عذاب سے ، انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے

مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ وَادْكُرُوا اللَّهَ فِي آيَاتِهِ

اپنی کتاب سے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے ، اور یاد کرو اللہ کو گفتی کے چند

مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ

دنوں میں پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دوسری دن میں تو اس پر گناہ نہیں اور جو کوئی رو گیا

فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ

تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہ ڈرتا ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جانی لو بیشک تم سب

تُحْشَرُونَ ۝

اسی کے پاس جمع ہو گے۔

خلاصہ تفسیر

گیارہواں حکم متعلق حج و عمرہ

اور رجب حج یا عمرہ کرنا ہو تو اس رجب اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے راضی کرنے کے واسطے

پورا پورا اور کیا کر دو کہ اعمال و آداب بھی سب بجا لاؤ اور نیت بھی خالص ثواب ہی کی ہو پھر

اگر کسی دشمن کی جانب سے یا کسی مرض کے سبب سے حج و عمرہ کے پورا کرنے سے روک دیا جائے

تو اس حالت میں یہ حکم ہے کہ قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو ذبح کرے اور حج و عمرہ کی جو وضع

اختیار کر رکھی تھی موقوف کرے اس کو احرام کھولنا کہتے ہیں جس کا طریقہ شرع میں سر منڈانی

ہو ، اور بال کشا دینے کا بھی یہی اثر ہے اور یہ نہیں کہ فوراً رک ٹوک کے ساتھ ہی تم کو احرام

کھولنا درست ہو جائے ، بلکہ اپنے سروں کو احرام کھولنے کی غرض سے ، اس وقت تک مت

منڈاؤ جب تک کہ (وہ) قربانی کا جانور جس کے ذبح کا اس حالت میں حکم تھا ، اپنے موقع

پر نہ پہنچ جائے اور وہ موقع حرم ہے کہ اس قربانی کا جانور عدد و حرم ہی میں ذبح کیا جاسکتا ہے

وہاں اگر خود نہ جاسکے ، تو کسی کے ہاتھ بھیج کر ذبح کرایا جائے جب جانور ذبح ہو جائے اس وقت

احرام کھولنا جائز ہوگا البتہ اگر کوئی تم میں سے رکھے ، بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ زخم یا درد

یا جو درد وغیرہ کی تکلیف ہو اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت

پڑے (تو اس کو اجازت ہے کہ وہ سر منڈا کر) فدیہ (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے (یعنی خواہ مخواہ)

دو تھے سے یا رچھ مسکینوں کو فی مسکین صدقہ فطر کے برابر یعنی نصف صاع گیہوں (غیر است

ر کے طور پر) دیدینے سے یا (ایک بکری) ذبح کر دینے سے پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (خواہ

نہ پہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش نہیں آیا ، یا ہو کر جاندار) تو اس صورت میں حج و عمرہ

کے متعلق قربانی کرنا ہر ایک کے ذمہ نہیں ہو بلکہ خاص (جو شخص عمروے اس کو حج کے ساتھ ملا کر مفتوح ہوا) یعنی ایام حج میں عمرو بھی کیا ہو) تو فقط اس پر واجب ہے کہ جو کچھ قربانی میسر ہو (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرو کیا ہو یا صرف حج کیا ہو اس پر حج یا عمرو کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر (ایام حج میں حج و عمرو کو جمع کرنے والوں میں سے) جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو اس کے ذمہ بجائے قربانی کے (تین دن کے روزے ہیں (ایام) حج میں رکنا آخر ان ایام کا نویں تاریخ ذی الحجہ ہے) اور سات (دن کے روزے) ہیں جبکہ حج سے تمھارے لوٹنے کا وقت آجائے (یعنی حج کر چکے خواہ لوٹنا ہو یا کہ وہیں رہنا ہو) یہ پورے دس (دن کے روزے) ہو گئے (اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابھی حج و عمرو کے ملانے کا حکم ہوا ہے) یہ (ملانا ہر ایک کو درست نہیں) بلکہ خاص (اس شخص کے لئے (درست) ہے جس کے اہل (و عیال) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے قرب (نواح) میں نہ رہتے ہوں یعنی حدود حرم مکہ میں ان کا وطن نہ ہو) اور ان سب احکام کی بجا آوری میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ کسی امر میں خلافت نہ ہو جائے) اور (خوب) جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ریبا کی اور مخالفت کرنے والوں کو سزائے سخت دیتے ہیں۔

(زمانہ افعال) حج و کما (چند مہینے ہیں جو مشہور) معلوم ہیں (ایک مثال) و سر ازی تعدہ (تیسرا دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان (ایام) میں (اپنے ذمہ) حج مقرر کر لے (کہ حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی غش بات (جائز ہے اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے) اور نہ کسی قسم کا نزاع (و تکرار) زیبا ہے، بلکہ اس کو چاہئے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگائے) اور جو نیک کام کرو گے خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے (سو اس کا ثمرہ تم کو عنایت ہوگا) اور جب حج کو جانے لگو تو (خرج ضرور (ساتھ) لے لیا کرو، سب سے بڑی بات (اور خوبی) خرج میں رگداری (سے) بچا رہنا ہے اور اے ذی عقل لوگو! ان احکام کی تعمیل میں) مجھ سے ڈرتے رہو (اور کسی حکم کے خلاف مت کرو)۔

(اور اگر حج میں کچھ اسباب تجارت ہر اہل بجانا مصلحت بھوتو) تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو (تمھاری قسمت میں) تمھارے پروردگار کی طرف سے (دھی) ہے، پھر جب تم لوگ عرفات میں ٹھہر کر وہاں سے واپس گئے لگو تو مشعر حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں) اگر شب کو وہاں قیام کر کے (خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور یاد کرنے کے طریقہ میں اپنی رائے کو دخل مت دو، بلکہ اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو (اللہ تعالیٰ نے) بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں قبل اس (بتلانے) کے تم محض ہی نادانقت تھے، پھر اس میں اور بھی بات یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور نکال رکھا تھا کہ تمام حجاج تو عرفات میں ہو کر پھر وہاں سے مزدلفہ کو آتے تھے اور یہ مزدلفہ ہی

میں رہ جاتے تھے، عرفات نہ جاتے تھے، یہ جائز نہیں، بلکہ) تم سب کو (خواہ قریش ہوں یا غیر قریش) ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ، جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں اور (احکام) حج میں قربانی رسوں پر عمل کرنے سے (خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، لیسنا اللہ تعالیٰ معاف کر دے) اور ہر بانی فرمادیں گے۔

(جاہلیت میں بعضوں کی توبہ عادت تھی کہ حج سے فایض ہو کر منیٰ میں جمع ہو کر اپنے آباء و اجداد کے مفارقت و فضاہل بیان کیا کرتے، حق تعالیٰ بجائے اس بیہودہ شغل کے اپنے ذکر کی تعلیم کے لئے فرماتے ہیں کہ) پھر جب تم اپنے اعمال حج پر سے کر چکا کرو تو حق تعالیٰ کا (شکر و عظمت کے ساتھ) ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباء (و اجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو بلکہ یہ ذکر اس سے (بہتر) ہے، بڑھ کر ہو (نا چاہئے اور بعضوں کی عادت تھی کہ حج میں ذکر تو اللہ تعالیٰ ہی کا کرتے تھے لیکن چونکہ آخرت کے قائل نہ تھے، لہذا تا ستر ذکر ان کا صرف دنیا کے لئے دماء مانگنا ہوتا تھا، حق تعالیٰ صرف دنیا طلبی کی مذمت بیان فرما کر بجائے اس کے خیر دارین طلب کرنے کی ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں) سو بعض آدمی (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو (دعاء میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا میں دیدیجئے (و بس) سو ان کو جو کچھ ملنا ہو گا دنیا ہی میں مل رہے گا، اور ایسی شخص کو آخرت میں (بوجہ انکار آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا، اور بعض آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو (دعاء میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے، اور آخرت میں بھی بہتری دیدیجئے، اور ہم کو عذاب و دوزخ سے بچائیے (سو یہ لوگ ادھر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں بلکہ) ایسے لوگوں کو (دو دنوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے اس عمل (یعنی طلب خیر دارین) کے اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں دیکھو کہ قیامت میں حساب ہوگا، اور قیامت نزدیک آتی جاتی ہے، جب حساب جلدی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مت بھولو، اور (منیٰ میں خاص طریقہ سے بھی) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کئی روز تک (وہ خاص طریقہ کنکریوں کا خاص بین پتھروں پر مارنا ہے، اور وہ کئی روز و سوس گیارہویں تاریخ ذی الحجہ کی ہیں، یا تیرہویں بھی کہ ان میں کنکریاں ماری جاتی ہیں) پھر جو شخص کنکریاں مار کر سوس یا پانچ کے بعد (دو دن میں) مکہ واپس آنے میں (تجیل کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص (ان) (دو دن میں) واپس مکہ میں) تاخیر کرے (یعنی بارہویں کو نہ آئے، بلکہ تیرہویں کو آؤ) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں (اور یہ سب باتیں) اس شخص کے واسطے (ہیں) جو (خدا سے) ڈرے (اور نہ ڈرنے والے کو گناہ ثواب ہی سے غرض نہیں) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

نہیں ہی مگر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہ صحابی کی ایسی ہی حالت میں یہ فرمایا کہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع گندم کا بطور صدقہ دیدیں (صحیح بخاری) آدھا صاع ہمارے انٹی تولہ کے سیر کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر گندم ہوتے ہیں، اُن کی قیمت صدقہ کر دینا بھی کافی ہے۔

حج کے مہینوں میں حج و عمرہ کو اسلام سے پہلے عربی جاہلیت کا خیال تھا کہ جب حج کے مہینے شروع ہو جائیں یعنی ماہ شوال شروع ہو جائے تو ان ایام میں حج و عمرہ کا جمع کرنا سخت گناہ ہے، اس آیت کے آخری حصے میں ان کے اس خیال کی اصلاح اس طرح کر دی گئی کہ حد میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے تو حج و عمرہ دونوں کو اشہر حج میں جمع کرنا ممنوع رکھا گیا، کیونکہ ان کو اشہر حج کے دوبارہ عمرہ کے لئے سفر کرنا مشکل نہیں، لیکن حد میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے جمع کرنے کو جائز قرار دیا، کہ دور دراز سے عمرہ کے لئے مستقل سفر کرنا ان کے لئے آسان نہیں میقات وہ مہین مقامات ہیں جو اطراف عالم سے مکہ میں آنے والوں کے ہر راستہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں کہ جب بقصد مکہ آنے والا مسافر یہاں پہنچے تو یہاں سے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھنا لازم ہے بغیر احرام کے یہاں سے لگے بڑھنا جرم و گناہ ہے، وَلَمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلَهُ حَاضِرًا الْقُدُورِ لِحَرَامٍ کا یہی مفہوم ہے، کہ جس شخص کے اہل و عیال مسجد حرام کے قرب و جوار یعنی حدود میقات کے اندر نہیں رہتے، مقصد یہ ہے کہ اس کا وطن حد و میقات کے اندر نہیں ہے اس کیلئے حج و عمرہ کو اشہر حج میں جمع کرنا جائز ہے۔

البتہ جو لوگ حج و عمرہ کو اشہر حج میں جمع کریں اُن پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکرانہ ادا کریں وہ یہ کہ جس کو قربانی دینے کی قدرت ہو وہ ایک قربانی دے، بکری، گائے، اونٹ جو اس کے لئے آسان ہو، لیکن جس شخص کی مالی حیثیت قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں اس پر دس روزے اس طرح واجب ہیں کہ تین روزے تو ایام حج کے اندر ہی رکھے یعنی نویں ذی الحجہ تک پورے کر دے، باقی سات روزے حج سے فارغ ہو کر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے، وہیں مکہ مکرمہ میں رہ کر پورے کرے یا گھر واپس آ کر، اختیار ہے، اگر کوئی شخص تین روزے ایام حج میں نہ رکھ سکا تو پھر ایام ابو حنیفہ اور اکابر صحابہ کے نزدیک اس کے لئے قربانی کرنا ہی متعین ہے، جب قدرت ہو کسی کے ذریعہ حرم میں قربانی کرائے (جصاص)

تمتع و ستران اشہر حج میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ میقات سے ہی حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ لے اس کو اصطلاح حدیث میں قرآن کہا گیا ہے اس کا احرام حج کے احرام کے ساتھ کھلتا ہے، آخر ایام

حج تک اس کو احرام ہی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھ اور مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے، پھر آٹھویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ جانے کے وقت حج کا احرام حرم شریف کے اندر ہی باندھ لے، اس کو اصطلاح میں تمتع کہا جاتا ہے، اور لغتی معنی کے اعتبار سے لفظ تمتع دونوں صورتوں پر حاوی ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں حج و عمرہ کو جمع کر کے نفع اٹھانا اور وہ دونوں صورتوں میں برابر ہے، قرآن کی آیت مذکورہ میں قَمَنْ تَمَتَّعَ اسی عام معنی میں ہے۔

احکام حج و عمرہ میں خلاف ورزی آخر آیت میں اذل تقویٰ اختیار کر لے کا حکم دیا جس کے معنی ہیں اور کوتاہی موجب عذاب ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرنے اور بچنے کے، اس کے بعد فرمایا: وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَدْعُونَ لِيُغْفِرَ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ، یعنی جو شخص جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے، آجکل حج و عمرہ کو جانے والے بکثرت اس سے غافل ہیں، اذل تو حج و عمرہ کے احکام معلوم کرنے ہی کی پوری کوشش نہیں کرتے، پھر معلوم بھی ہو تو بکثرت ان کے مطابق عمل نہیں کرتے، غلط کار معلوم اور ساختہ کی بے پروائی سے بہت سے واجبات تک چھوٹ جاتے ہیں، اور آداب دین کا تو کہنا کب، اللہ تعالیٰ سب کو اصلاح عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔

احکام حج کی آیتوں میں سے اَلْحَجُّ مَشْكُورٌ، اشہر اشہر کی حج ہے جس کے معنی ہیں دوسری آیت اور اس کے مسائل مہینہ، پچھلی آیت میں بتلایا گیا تھا کہ جو کوئی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے، تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کے احکام پورے ادا کرے، ان دونوں میں عمرہ کے لئے تو کوئی تاریخ اور مہینہ معسر نہیں، سال بھر میں جب چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن حج کے لئے مہینہ اور اس کے افعال و اعمال کے لئے خاص تاریخیں اور اوقات مقرر ہیں، اس لئے اس آیت کے شروع میں یہ بتلادیا کہ حج کا معاملہ عمرہ کی طرح نہیں ہے، اس کے لئے کچھ مہینے مقرر ہیں، جو معروف و مشہور ہیں، جاہلیت عرب کے لیکر زمانہ اسلام تک یہی مہینے حج کے مقرر رہے ہیں، وہ مہینے شوال ذیقعدہ اور دس روز ذی الحجہ کے ہیں، جیسا کہ حدیث میں بروایت ابوامامہ و ابن عمر منقول ہے (منظری) شوال سے حج کے مہینے شروع ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے پہلے حج کا احرام باندھنا جائز نہیں، بعض ائمہ کے نزدیک تو قبل شوال کے احرام سے حج کی ادائیگی ہی نہیں ہو سکتی، امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اس احرام سے حج تو ادا ہو جائے گا مگر مکروہ ہوگا (منظری) قَمَنْ تَمَتَّعَ فِيهِ الْحَجَّ فَلَا تَرْتَدَّتْ وَلَا تُسَوَّىٰ وَلَا تَجِدُ اِلَّا فِي الْحَجِّ، اس میں حج کا احرام باندھنے والے کے لئے کچھ منفی آداب و احکام کا بیان ہے، جن سے حالت احرام میں

پرہیز کرنا لازم و واجب ہو، وہ تین چیزیں ہیں: رفت، فسق، جدال۔

رفت ایک لفظ جامع ہے جس میں عورت سے مباشرت اور اس کے مقدمات یہاں تک کہ زبان سے عورت کے ساتھ اس کی کھلی گفتگو بھی داخل ہے، محرم کو حالت احرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں، تعریض و کنایہ کا مضائقہ نہیں۔

فسق کے لفظی معنی خروج کے ہیں، اصطلاح قرآن میں عدول بھی اور ناسرمانی کو فسق کہا جاتا ہے، جو اپنے عام معنی کے اعتبار سے سب گناہوں کو شامل ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس جگہ عام معنی ہی مراد لئے ہیں، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس جگہ فسق کی تفسیر مخطورات احرام سے فرمائی ہے، یعنی وہ کام جو حالت احرام میں ممنوع و ناجائز ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس مقام کے مناسب یہی تفسیر ہے، کیونکہ عام گناہوں کی مانعت احرام کے لئے خاص نہیں ہر حال میں حرام ہیں۔

وہ چیزیں جو اصل سے گناہ نہیں مگر احرام کی وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہیں چھ چیزیں ہیں: اول عورت کے ساتھ مباشرت اور اس کے تمام متعلقات یہاں تک کہ کھلی گفتگو بھی، دوسرے بڑی جانوروں کا شکار، خود کرنا یا شکاری کو بتلانا، تیسرے بال یا ناخن کٹوانا، چوتھے خوشبو کا استعمال یہ چار چیزیں تو مرد و عورت دونوں کے لئے حالت احرام میں ناجائز ہیں، باقی دو چیزیں مردوں کے ساتھ خاص ہیں، یعنی بے ہوش پڑے پہننا، اور سر اور چہرے کو ڈھانپنا، امام اعظم ابوحنیفہؒ و مالکؒ کے نزدیک چہرہ کو ڈھانپنا حالت احرام میں عورت کے لئے بھی ناجائز ہے، اس لئے یہ بھی مشترک مخطورات احرام میں شامل ہے۔

ان چھ چیزوں میں پہلی یعنی عورت سے مباشرت وغیرہ، اگرچہ فسق میں داخل ہے لیکن اس کو فسق سے پہلے الگ کر کے لفظ رفت سے اس لئے بتلادیا کہ احرام میں اس سے اجتناب سب سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ دوسرے مخطورات احرام کا تو کوئی بدل اور کفارہ بھی ہو جاتا ہے، اور مباشرت کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ اگر ان میں کوئی مسبب ہو جائے تو حج ہی فاسد ہو جاتا ہے اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں ہو سکتا، مثلاً وقوف عرفات سے پہلے بی بی سے صحبت کر لی، تو حج فاسد ہو گیا، اور اس کا جبرانہ بھی محاکمے یا اونٹ کی قربانی سے دینا پڑے گا، اور اگلے سال پھر حج کرنا پڑے گا، اس مزید اہمیت کی بنا پر اس کو خلافتِ ذوق کے لفظ سے مستقلاً بیان فرمادیا۔

جدال کے معنی ایک دوسرے کو پھانسنے کی کوشش کے ہیں، اس لئے سخت قسم کے جھگڑے کو جدال کہا جاتا ہے، یہ لفظ بھی بہت عام ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے عام ہی معنی مراد لئے ہیں، اور بعض حضرات نے مقام حج و احرام کی مناسبت سے اس جگہ جدال کے معنی یہ

لئے ہیں، کہ جاہلیت عرب کے لوگ مقام وقوف میں اختلاف رکھتے تھے، کچھ لوگ عرفات میں وقوف کرنا ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ حقیقت ہے، اور کچھ مزدلفہ میں وقوف ضروری کہتے تھے، عرفات میں جانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، اور اسی کو موقع ابراہیم علیہ السلام قرار دیتے تھے، اسی طرح اوقات حج کے معاملہ میں بھی اختلاف تھا، کچھ لوگ ذی الحجہ میں حج کرتے تھے، اور کچھ ذیقعدہ ہی میں کر لیتے تھے، اور پھر ان معاملات میں باہمی نزاعات اور جھگڑے ہوتے تھے، ایک دوسرے کو گمراہ کہتا تھا، قرآن کریم نے لآجذی الیٰ فرما کر ان جھگڑوں کا خاتمہ فرمایا، اور جو بات حق تھی کہ وقوف فرض عرفات میں اور پھر وقوف واجب مزدلفہ میں کیا جائے، اور حج صرف ذی الحجہ کے ایام میں کیا جائے، اس کا اعلان کر کے اس کے خلاف جھگڑا کرنے کو ممنوع کر دیا۔

اس تفسیر و تقریر کے لحاظ سے اس آیت میں صرف مخطورات احرام کا بیان ہوا جو اگرچہ فی نفسہ جائز ہیں، مگر احرام کی وجہ سے ممنوع کر دی گئی ہیں، جیسے نماز روزہ کی حالت میں کھانا پینا، کلام کرنا وغیرہ جائز چیزیں کہ منع کر دی گئیں۔

اور بعض حضرات نے اس جگہ فسق و جدال کو عام معنی میں لیکر مقصد یہ بتلادیا کہ اگرچہ فسق و گناہ اسی طرح باہم جدال و غلات ہر جگہ ہر حال میں مذموم و گناہ ہے، لیکن حالت احرام میں اس کا گناہ اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے، مبارک ایام اور مقدس سرزمین میں جہاں صرف اللہ کے لئے عبادت کے واسطے آتے ہیں، اور لبتیک لبیک پکار رہے ہیں، احرام کا لباس ان کو ہر وقت اس کی یاد دہانی کر رہا ہے کہ تم اس وقت عبادت میں ہو، ایسی حالت میں فسق و فجور اور نزاع و جدال انتہائی پیاکی اور اسشد ترین گناہ ہو جاتا ہے۔

اس عام معنی کے اعتبار سے اس جگہ رفت، فسق، جدال سے روکنے اور ان کی حرمت کو بیان کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مقام حج اور زمانہ حج کے حالات ایسے ہیں کہ ان میں انسان کو ان تینوں چیزوں میں ابتلا کے مواقع بہت پیش آتے ہیں، حالت احرام میں اکثر اپنے اہل و عیال سے ایک طویل مدت تک علیحدہ رہنا پڑتا ہے، اور پھر مطاف و منیٰ، عرفات، مزدلفہ منیٰ کے اجتماعات میں کتنی بھی احتیاط برتی جائے عورتوں مردوں کا اختلاط ہو ہی جاتا ہے، ایسی حالت میں نفس پر قابو پانا آسان نہیں، اس لئے سب سے پہلے رفت کی حرمت کا بیان فرمادیا، اسی طرح اس عظیم الشان اجتماع میں چوری وغیرہ دوسرے گناہوں کے مواقع بھی بے شمار پیش آتے ہیں، اس لئے لآفسوق کی ہدایت فرمادی، اسی طرح سفر حج میں اول سے آخر تک بے شمار مواقع اس کے بھی پیش آتے ہیں کہ رفقاء سفر اور دوسرے لوگوں سے جگہ کی تنگی اور دوسرے اسباب کی بنا پر جھگڑا والی ہو جائے، اس لئے لآجذی الیٰ کا حکم دیا گیا۔

بلاغت قرآن

اس آیت کَلَّا تَقُولُ لَكَ قُصُوۡتٰی وَلَا جِدَّ اِلٰی سِیِّئِیۡكَ لَیۡسَ بِاِلَہٍ غَیۡرُہٗ لَیۡسَ بِاِلَہٍ غَیۡرُہٗ کے الفاظ نفی کے الفاظ ہیں کہ یہ سب چیزیں حج میں نہیں ہیں، حالانکہ مقصود ان چیزوں سے ہنسی اور مانعت کرنا ہے، جس کا مقتضی یہ تھا کہ لَا تَرْفُخُوۡا وَّلَا تَنۡفُسُوۡا وَلَا تَجَادِلُوۡا کہا جاتا، مگر یہاں نفی کی جگہ نفی کے الفاظ رکھ کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ان افعال کی حج میں کوئی گنہاش اور ٹھوس نہیں۔

وَمَا تَقۡلَعُوۡا مِنْ خَیۡرٍ یَّعۡلَمُہُ اللّٰہُ۔ محظورات و ممنوعات احرام بیان فرمانے کے بعد آخر میں اس جملے میں یہ ہدایت دی گئی کہ حج کے مبارک ایام اور مقدس مقامات میں تو صرف یہی نہیں کہ محظورات اور گناہوں سے بچو، بلکہ غیبت جان کر عبادت و ذکر اللہ اور نیک کاموں میں لگے رہو، اتم جو بھی نیک کام کر دے وہ اللہ کے علم میں ہو اور تمہیں اس پر بڑے انعامات ملیں گے۔

وَتَزَوَّدُ فِیۡہِ اِنْ خَیۡرَ الْمَآۡدِ الثَّقَوٰی۔ اس میں ان لوگوں کی اصلاح ہے جو حج و عمرہ کے لئے بے سروسامانی کے ساتھ کھل کھڑے ہوتے ہیں، اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں، پھر راستہ میں بھیک مانگنا پڑتی ہے، یا خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں، ان کی ہدایت کے لئے حکم ہوا کہ سفر حج کے لئے ضروریات سفر ساتھ لینا چاہئے، یہ توکل کے منافی نہیں، بلکہ توکل کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب و وسائل کو اپنے معتد و رکنے مطابق حاصل اور جمع کرے، پھر اللہ پر توکل کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توکل کی یہی تفسیر منقول ہے بالکل ترک اسباب کا نام توکل رکھنا جاتا ہے۔

سفر حج میں تجارت یا گناہ نہیں کہ تم سفر حج میں تجارت یا مزدوری کے ذریعے کچھ روزی کماؤ اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق حاصل کرو۔ واقعہ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب جس طرح تمام عبادات و معاملات کو حج کے طرح طرح کی بیہودہ رسمیں ان میں شامل کر دی تھیں، اور عبادات کو بھی کھیل تماشہ بنادیا تھا، اسی طرح افعال حج میں بھی طرح طرح کی بیہودگیاں کرتے تھے، مٹی کے عظیم جہتار میں ان کے خاص خاص بازار لگتے تھے، نمائش ہوتی تھی، تجارتوں کے فروغ کے ذرائع لگائے جاتے تھے، اسلام آیا، اور حج مسلمانوں پر فرض کیا گیا تو ان تمام بیہودہ رسموں کا قلع قمع کیا گیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مست جانے والے تھے، اب ان کو یہ خیال ہوا کہ ایام حج میں تجارت کرنا یا مزدوری کر کے کچھ کما لینا یہ بھی جاہلیت کی پیداوار ہے، شاید اسلام میں اس کی مطلقاً حرمت و مانعت ہو جائے، یہاں تک کہ ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے

پاس آئے، اور یہ سوال کیا کہ ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اونٹ کرایہ پر چلاتے ہیں، کچھ لوگ ہمارے اونٹ حج کے لئے کرایہ پر لیجاتے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ جاتے ہیں اور حج کرتے ہیں، کیا ہمارا حج نہیں ہوگا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور آپؐ وہی سوال کیا تھا، جو تم مجھ سے کر رہو ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس وقت کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوا فَضۡلًا مِّنۡ بَیۡنِہُمَا۔ اُس وقت آپؐ نے اس شخص کو بلوایا اور فرمایا کہ ہاں تمہارا حج صحیح ہے۔

الغرض اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ اگر کوئی شخص دوران حج میں کوئی بیع و شہار یا مزدوری کرے جس سے کچھ نفع ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، ہاں کفار عرب نے جو حج کو تجارت کی منڈی اور نمائش گاہ بنالیا تھا اس کی اصلاح قرآن کے دو لفظوں سے کر دی گئی، ایک تو یہ کہ جو کچھ کمائیں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور عطا سمجھ کر حاصل کریں، شکر گزار ہوں، محض سرمایہ سیٹھا مقصد نہ ہو، فَضۡلًا مِّنۡ بَیۡنِہُمَا کے لفظ نے یہ بتلادیا کہ اس کمائی میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جس میں ایک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اس سے بھی اجتناب کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ اخلاص کامل میں فرق آتا ہے، اور حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ اس کا مدار اصل نیت پر ہے، اگر کسی شخص کی نیت اصل میں دنیوی نفع تجارت یا مزدوری ہے اور ضمنی طور پر حج کا بھی قصد کر لیا، یا نفع تجارت اور قصد حج دونوں مساوی صورت میں ہیں تب تو یہ اخلاص کے خلاف ہے، حج کا ثواب اس سے کم ہو جائیگا اور ہرکات حج جیسی عمل ہونی چاہئے وہ حاصل نہ ہوں گی، اور اگر اصل نیت حج کی ہے اسی کے ثواب میں نکلا ہے، لیکن مصارف حج میں یا گھر کی ضروریات میں تنگی ہو، اس کو پورا کرنے کے لئے کوئی معمولی تجارت یا مزدوری کر لی، یہ اخلاص کے بالکل منافی نہیں، ہاں اس میں بھی بہتر یہ ہے، کہ خاص ان پانچ ایام میں جن میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں، ان میں کوئی مشغلہ تجارت و مزدوری کا نہ رکھے، بلکہ ان ایام کو خالص عبادت و ذکر میں گزارے، اسی وجہ سے بعض علماء نے خاص ان ایام میں تجارت و مزدوری کو منوع بھی فرمایا ہے۔

وفات میں وقت اور اس کے بعد اسی آیت میں ارشاد ہے، یَاۡذَا اَفۡضَیۡتُمْ مِّنۡ عَرۡفَیۡہٗ کے بعد مزد و نفع کا وقت فَآذِکُمۡ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ السَّعَیۡہِ الْحَرَامِ وَاذِکُمۡ لَا تَمَہۡدُنَ لَکُمۡ وَرَآءَ کُمۡ مِّنۡ قَبۡلِہٖ لَیۡسَ بِالصَّٰلِحِیۡنَ۔ یعنی پھر جب تم وفات سے واپس آنے لگو تو شعر حرام کے پاس خدا تعالیٰ کی یاد کرو، اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے تم محض ہی ناواقف تھے، اس میں بتلایا گیا ہے کہ وفات

سے واپس میں رات کو مزدلفہ میں قیام اور اس کا خاص ذکر واجب ہیں۔

عرفات، لفظ تاجح ہے، اور ایک خاص میدان کا نام ہے جس کے حدود و اربعہ معروف و مشہور ہیں، یہ میدان حرم سے خارج واقع ہوا ہے، حجاج کو اس میں پہنچنا اور زوال آفتاب مغرب تک یہاں قیام کرنا حج کا اہم ترین فرض ہے، جس کے فوت ہونے کا کوئی کفارہ اور فدیہ نہیں ہو سکتا۔

عرفات کو عرفات کہنے کی بہت سی وجہ بتلائی جاتی ہیں، ان میں واضح یہ ہے کہ اس میدان میں انسان اپنے رب کی معرفت اور بذریعہ عبادت و ذکر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، نیز مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو آپس میں تعارف کا ایک موقع ملتا ہے، ارشاد قرآنی میں اس کی تاکید فرمائی ہے کہ عرفہ کے دن بعد مغرب عرفات سے واپس آتے ہوئے مشعر حرام کے پاس ٹھہرنا چاہئے، مشعر حرام ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، مشعر کے معنی شعار اور علامت کے ہیں اور حرام بمعنی محترم و مقدس کے ہے، معنی یہ ہیں کہ پہاڑ شعار اسلام کے اظہار کے لئے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو مزدلفہ کہتے ہیں، اس میدان میں رات گزارنا اور مغرب و عشاء دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مزدلفہ میں پڑھنا واجب ہے، مشعر حرام کے پاس اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اگرچہ ہر طرح کے ذکر اللہ کو شامل ہے، مگر خصوصیت دونوں نمازوں کو ایک وقت یعنی مغرب کو عشاء کے ساتھ ادا کرنا اس جگہ کی مخصوص عبادت ہے، آیت کے جملہ وَاَذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ میں شاید اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد اور ذکر کے لئے جو طریقہ بتلایا ہے اسی طرح اس کو یاد کرنا اپنی راستے اور قیاس کو اس میں دخل نہ دے کیونکہ راستے اور قیاس کا مقتضی تو یہ تھا کہ مغرب کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھی جاتی، عشاء کی عشاء کے وقت میں، لیکن اُس روز اُس مقام پر حق تعالیٰ کو یہی پسند ہوا کہ مغرب کی نماز مؤخر کی جائے، اس کو عشاء کے ساتھ پڑھا جائے، ارشاد قرآنی قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهُ سُبْحًا وَ مَشْرُوعًا سَآءَ مَا يَكْسِبُ الْغَافِلُونَ، ایک اور بھی اصولی مسئلہ نکل آیا، کہ ذکر اللہ اور عبادت میں آدمی خود مختار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح چاہے یاد کرے، اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے، بلکہ ذکر اللہ اور ہر عبادت کے خاص آداب ہیں، ان کے موافق ادا کرنا ہی عبادت ہے، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں، اور اس میں کمی بیشی یا مقدم مؤخر کرنا خواہ اس میں ذکر اللہ کی کچھ زیادتی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، لہذا عبادت اور صدقہ و خیرات وغیرہ میں جو لوگ بلا دلیل شرعی اپنی طرف کچھ خصوصیت اور اضافے کر لیتے ہیں، اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضروری قرار نہیں دیا، اور ان افعال کے نہ کرنے والوں کو خطا وار سمجھتے ہیں

اس آیت نے ان کی غلطی کو واضح کر دیا کہ وہ اہل جاہلیت کی سی عبادت ہے، کہ اپنی راستے و قیاس سے عبادت کی صورتیں گھڑ رکھی نہیں، اور چند رسوم کا نام عبادت رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد ہے، ثُمَّ أَفْضَوْا مِنْ حَيْثُ أَفَاقَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا لِلّٰهِ إِنَّهُ عَفُوٌّ ذَّهِيبٌ، یعنی پھر تم سب کو ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر واپس آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرما دیں گے۔

اس جگہ کا شان نزول یہ ہو کہ قریش عرب جو بیت اللہ کے محافظ و مجاور تھے اور سائے عرب میں ان کا اقتدار مسلم تھا، اور ان کی ایک ممتاز حیثیت تھی، زمانہ جاہلیت میں وہ اپنی امتیازی شان بنانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے، اور سب لوگ تو عرفات کو جاتے اور وہاں وقوف کر کے واپس آتے تھے، یہ لوگ راستہ میں مزدلفہ کے اندر ہی ٹھہر جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم چونکہ بیت اللہ اور حرم کے مجاور ہیں، اس لئے حدود حرم سے باہر جانا ہمارے لئے مناسب نہیں، مزدلفہ حدود حرم کے اندر ہے، اور عرفات سے خارج ہے، یہ پہاڑ کے مزدلفہ ہی میں قیام کر لیتے، اور وہیں سے واپس آ جاتا کرتے تھے، اور درحقیقت وجہ اس جیلہ پہاڑ کی اپنا فخر و غرور اور عام لوگوں سے ممتاز ہو کر رہنا تھا، حق تعالیٰ نے ان کی غلط کاری واضح فرمادی، اور ان کو حکم دیا کہ تم بھی وہیں جاؤ جہاں سب لوگ جاتے ہیں، یعنی عرفات میں اور پھر وہیں سے سب کے ساتھ واپس آؤ۔ ازل تو عام انسانوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر کے رکھنا خود ایک منکبرانہ فعل ہے، جس سے ہمیشہ ہی پرہیز لازم ہے، خصوصاً حج کے ایام میں جہاں لباس حرام اور پھر قیام و مقام کی نسبت کے ذریعہ اسی کا سبق دینا ہے کہ انسان سب برابر ہیں، امیر و غریب یا عالم و جاہل یا بڑے چھوٹے کا یہاں کوئی امتیاز نہیں، حالت احرام میں یہ امتیازی شان بنانا اور بھی زیادہ جرم ہے۔

انسانی مساوات کا زریں سبق اس ارشاد قرآنی سے اصول معاشرت کی ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسانوں کی بہترین علی صورت قیام و مقام میں بڑوں کو چاہئے کہ چھوٹوں سے الگ ممتاز ہو کر نہ رہیں بلکہ مل جل کر رہیں، کہ اس میں باہمی اخوت و ہمدردی اور محبت و تعلق پیدا ہوتا ہے، اور امیر و غریب کی تعزین ملتی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ ختم ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اس کو خوب واضح کر کے ارشاد فرمایا، کہ کسی عربی کو عجمی پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا مسدود تقویٰ اور اطاعت خداوندی پر ہے، اسی لئے جو لوگ ان کے خلاف مزدلفہ میں قیام کر کے اپنی ممتاز حیثیت بنانا چاہتے تھے، ان کے اس فعل کو گناہ مسترار دے کر ان پر لازم کیا کہ اپنے اس گناہ سے توبہ استغفار کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں

معاف فرادیں اور اپنی رحمت فرادیں۔

رسوم جاہلیت کی اصلاح بتی میں | چوتھی پانچویں اور چھٹی آیات میں چند رسوم جاہلیت کی اصلاح کی گئی
فصول اجتماعات کی ممانعت | ہی ایک تویہ کہ عرب زمانہ جاہلیت میں عرفات و مزدلفہ اور طواف
وقربانی سے فارغ ہو کر جب منیٰ میں قیام کرتے تھے قرآن کی مجلسیں صرف اس کام کے لئے ہوتی
تھیں کہ مشاعرے منعقد کریں، اور ان میں اپنے مفاخر اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر اور کارناموں
کا بیان کریں، ان کی مجلسیں ذکر اللہ سے یکسر خالی ہوتی تھیں، ان مبارک ایام کو ایسی لغو اور فضول
چیزوں میں ضائع کرتے تھے، اس لئے ارشاد ہوا کہ جب تم اپنے افعال احرام کو پورا کر چکو اور
منیٰ میں قیام کرو، تو وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اپنے آباء و اجداد کو یاد کرنا اور مخصوص
ان کے جھوٹے سچے مفاخر اور کارناموں کو بیان کرنا چھوڑ دو، جتنا تم ان کو یاد کرتے ہو اس کی جگہ
بلکہ اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو یاد کرو، اور ذکر اللہ میں مشغول رہو، قرآن کی اس آیت نے عرب کی
ایک جاہلانہ رسم کو مٹا کر مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ یہ ایام اور یہ مقام عبادت اور ذکر اللہ
کے لئے مخصوص ہیں، ان میں ذکر اللہ و عبادت کے جو فضائل و برکات ہیں وہ پھر ہاتھ نہ آئیں گے
ان کو غلیبت جانا چاہئے۔

علامہ ازہر ج ایک ایسی عبادت ہے جو عموماً سفر طویل کی مشقت، اہل و عیال کی مفارقت
کاروبار کو ترک کرنے اور ہزاروں روپے اور بہت سا وقت خرچ کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہو،
اس میں حوادث کا پیش آجانا کچھ بعید نہیں کہ آدمی باوجود کوشش کے اپنے مقصد ج
میں کامیاب نہ ہو سکے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام موانع ہٹا کر آپ کے مقصد میں
کامیاب فرمایا اور فرائض ج پورے ہو گئے، تو یہ مقام شکر ہے، جس کا اقتضاء یہ ہے کہ اور
زیادہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہو، ان اوقات کو فضول اجتماعات اور فضول کام یا کلام میں
ضائع نہ کرو، اہل جاہلیت ان اوقات میں اپنے آباء و اجداد کے تذکرے کرتے تھے، جن کا کوئی نفع
دین و دنیا میں نہ تھا، تم اس کی جگہ اللہ کا ذکر کرو جو نور ہی نور اور نفع ہی نفع ہے، دنیا کے لئے
بھی آخرت کے لئے بھی، آجکل اگرچہ مسلمانوں میں وہ رسم جاہلیت تو نہیں رہی، کہ مشاعرے
قائم کریں اور آباء و اجداد کے تذکرے کریں، لیکن آج بھی ہزاروں مسلمان ہیں جو ان ایام کو فضول
اجتماعات میں فضول دعوتوں اور تفریحات میں صرف کرتے ہیں، یہ آیت ان کی تنبیہ کے لئے
کافی ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو جیسے
بچپن میں اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں کہ ان کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کلام یا آیت یا آیت ہوتا ہو

تم اب بالغ ہو، جوان ہو، مائل ہو، یا آیت یا آیت کی جگہ یا آیت یا آیت کو اختیار کرو، اور اس پر نظر ڈالو
کہ بچپن میں اپنے باپ کو اس لئے پکارتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اپنے آپ کو باپ کا محتاج سمجھتا ہے،
انسان اگر ذرا غور کرے تو وہ ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج اس سے زیادہ ہے، جیسا بچہ اپنے
باپ کا محتاج ہے، نیز بعض اوقات کچھ لوگ اپنے باپ کا ذکر نغزاً بھی کیا کرتے ہیں، جیسے اہل جاہلیت
کرتے تھے تو اس آیت نے یہ بھی ہدایت کر دی کہ خود عزت کے لئے بھی ذکر اللہ سے زیادہ کوئی چیز
مؤثر نہیں (روح البیان)

ایک اور رسم جاہلیت کی اصلاح دین و | جس طرح جاہلیت کی یہ رسم یہودہ تھی کہ ان مبارک ایام کو اپنے باپ
دنیا کی طلب میں اسلامی اعتدال | دادوں کے تذکروں اور مشاعروں میں گذاریں، اسی طرح کچھ
لوگوں کی یہ عادت تھی کہ اگرچہ ایام حج میں مشغول تو ذکر اللہ اور دعاؤں ہی کا رکھتے تھے، مگر ان کی
تمام تر دعائیں صرف دنیوی حاجات اور دنیا کی راحت و عزت یا دولت کے لئے ہوتی تھیں آخرت
کی طرف کوئی دھیان نہ ہوتا تھا، ان کی اصلاح کے لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ بعض لوگ
وہ ہیں جو حج میں دعاء بھی مانگتے ہیں تو صرف دنیا کی بھلائی مانگتے ہیں، آخرت کی فکر نہیں کرتے،
ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کیونکہ ان کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ سر لیفہ حج بھی
انہوں نے محض رہنمائی اور دنیا میں فخر و جاہت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے، اللہ تعالیٰ
کو راضی کرنا اور آخرت میں نجات حاصل کرنا ان کے پیش نظر ہے ہی نہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ صرف دنیاوی دعاء مانگنے والوں کا ذکر اس آیت میں
اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کہتے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا اس کے ساتھ حَسَنَةً کا لفظ مذکور نہیں
جس میں اشارہ اس کی طرف ہو کہ وہ دنیا کے لئے بھی حسنہ کے طلبگار نہیں، بلکہ اغراض دنیویہ میں
ایسے مست و سرشار ہیں کہ ان کی طلب یہ رہ گئی ہے کہ اپنی خواہش کسی طرح پوری ہو، خواہ وہ
اچھی ہو یا بُری اور اچھے طریقہ سے حاصل ہو یا بُرے راستہ سے، لوگ اُن کو اچھا کہیں یا بُرا۔

اس آیت میں اُن مسلمانوں کے لئے بھی بڑی تنبیہ ہے جو موسم حج اور مقامات مقدسہ
میں بھی دعاؤں میں اپنی اغراض دنیویہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں، اور بیشتر اوقات انہیں کے لئے
صرف کرتے ہیں، اور اگر ہلکے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دولت مند لوگ
یہاں بھی جو وظائف اور دعائیں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں ان میں بکثرت لوگ ایسے
ہیں کہ ان کی غرض ان تمام وظائف و دعاؤں سے بھی صرف دولت کی ترقی، تجارت میں برکت
اغراض دنیویہ میں کامیابی ہوتی ہے وہ بہت سے وظائف اور فوائد پر کڑی بھی سمجھتے ہیں
کہ ہم بہت عبادت گزار ہیں، لیکن وہ حقیقت میں ایک طرح کی دنیا پرستی ہوتی ہے، بہت حضرات

زندہ بزرگوں سے اور وفات یافتہ اولیاء اللہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس تعلق کا بھی بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی دعا یا تعویذ سے ہمارے کام نکلیں گے، دنیا کی آفات دور ہوں گی، مال میں برکت ہوگی، ایسے لوگوں کے لئے بھی اس آیت میں خاص ہدایت ہو، معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جو علیم وخبیر ہے، ہر شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے، کہ وظائف و نوافل اور دعا و درود سے اوج و زیارت سے اس کی نیت کیا ہے۔ اس آیت کے آخری حصہ میں کم نصیب محروم القسمہ لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے نیک اور مقبول بندوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ یعنی ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بھلائی اور بہتری بھی مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذاب جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔

اس میں لفظ حسنہ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے، مثلاً دنیا کی حسنہ میں بدن کی صحت، اہل و عیال کی صحت، رزق حلال میں وسعت و برکت و نبوی سب ضروریات کا پورا ہونا اعمال صالحہ، احسان و محمودہ علم نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی درستی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاص کامل سب داخل ہیں، اور آخرت کی حسنہ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دعا ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں، دنیا و آخرت دونوں جہان میں راحت و سکون بدست آتا ہے، آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعا مانگا کرتے تھے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، اور حالت طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دعا مننون ہے، اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعا مانگتے کہ عبادت جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دعویٰ غلط اور خیال خام ہو، انسان اپنے وجود اور بقا اور عبادت و طاعت سب میں ضروریات دنیوی کا محتاج ہے، وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں، جو شخص دنیوی حاجات کے لئے دعا مانگے کہ زہد و بزرگی کے خلاف سمجھے وہ مقام انبیاء سے بے خبر اور جاہل ہے، ہاں صرف دنیوی حاجات ہی کو مقصد زندگی نہ بنائے،

اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لئے دعا مانگے۔

آیت کے آخر میں اسی دوسرے طبقہ کا جو کہ اپنی دعاؤں میں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مانگتا ہو، انجام ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے اس صحیح اور نیک عمل اور دعاؤں کا نتیجہ ان کو دنیا و آخرت میں ملے گا، اس کے بعد ارشاد ہے وَاللَّهُ سَيَرِيعُ الْحِسَابِ، یعنی اللہ جلد حساب لینے والا ہے، کیونکہ اس کا علم محیط اور قدرت کاملہ کے لئے ساری مخلوقات کے ایک ایک فرد اور پھر اس کی عمر بھر کے اعمال کا حساب لینے میں اُن آلات و ذرائع کی ضرورت نہیں جن کا انسان محتاج ہے، اس لئے وہ بہت جلد ساری مخلوقات کا حساب لے لیں گے، اور اُن پر جزاء و سزا مرتب فرمائیں گے۔

مٹی میں دو باہن دن کا قیام آٹھویں آیت جو اس جگہ احکام حج کی آخری آیت ہو اس میں حجاج کو ذکر اللہ اور ذکر اللہ کی تاکید کی طرف متوجہ کر کے ان کے مقصد حج کی تکمیل اور آئندہ زندگی کو درست رکھنے

کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی ہے، وَادْكُمُ اللَّهُ فِي آيَاتِهِ مَتَعًا وَذُكِّرَ، یعنی اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دنوں میں ان چند دنوں سے مراد ایام تشریق ہیں، جن میں ہر نماز کے بعد تکبیر کہنا واجب ہے۔ آگے ایک مسئلہ کی وضاحت کی گئی کہ مٹی میں قیام اور حجرات پر کنکریاں مارنا کب تک ضروری ہے، اس میں اہل جاہلیت کا اختلاف رہا کرتا تھا، بعض لوگ تیس ہویں تاریخ ذی الحجہ تک مٹی میں قیام اور حجرات پر مٹی کرنے کو ضروری سمجھتے تھے، اس سے پہلے بارہویں کو واپس آجانے کو ناجائز اور ایسا کرنے والوں کو گنہگار کہا کرتے تھے، اس طرح دوسرے لوگ بارہویں تاریخ کو چلے آنا ضروری سمجھتے، اور تیسرے تک ٹھہرنے کو گناہ جانتے تھے، اس آیت میں ان دونوں کی اصلاح اس طرح کی گئی، اَلَمْ تَرَ كَيْفَ جَعَلَ لَكُمُ الْيَوْمَ الْآيَةَ فَلَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَعْبُدُوْهُ، یعنی جو شخص عید کے بعد صرف دو دن مٹی میں قیام کر کے واپس آجائے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو تیسرے دن تک مؤخر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، یہ دونوں فریق جو ایک دوسرے کو گنہگار کہتے ہیں غلو اور غلطی میں مبتلا ہیں۔

حج یہ ہے کہ حجاج کو دونوں صورتوں میں اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں، ہاں افضل اولیٰ یہی ہے کہ تیسرے دن تک ٹھہریں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص دوسرے دن غروب آفتاب سے پہلے مٹی سے چلا آیا اس پر تیسرے دن کی ری واجب نہیں، لیکن اگر آفتاب مٹی میں غروب ہو گیا پھر تیسرے دن کی ری کرنے سے پہلے وہاں سے واپس آجانا جائز نہیں رہتا، البتہ تیسرے دن کی ری میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ زوال آفتاب سے پہلے صبح کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔

مٹی سے واپس آکر اس میں حجاج کو اختیار دینے کا ذکر فرمانے کے بعد جو کچھ کہا گیا کہ دوسرے دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، اور تیسرے دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، یہ سب اس شخص

کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ درحقیقت حج اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے، **إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (۲: ۱۷۵)** "یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعائر بندے ہیں" اور جو شخص حج سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا، اور حج کے اندر بھی بے پروائی سے کام لیتا رہا، حج کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا حج کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا حج فرض ادا ہو گیا، ترک حج کا جرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ تُحْشَرُونَ** - "یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کر دو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو، وہ تمہارے کھیلے ہوئے اور چپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزا و سزا دیں گے، احکام حج جو اوپر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت ان سب کی روح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ایام حج میں جب کہ اعمال حج میں مشغول ہوں اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکام حج میں کوئی کوتاہی نہ کرو، اور بعد میں بھی اپنے حج پر معسرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ وزن اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھٹا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور وزن ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادت حج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان حج سے فارغ ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہے، ورنہ جو شخص حج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علمائے فرمایا ہے کہ حج مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی طرف راغب ہو، ایسے شخص کا حج مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعا اس کی مقبول ہے، ورنہ حج میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت و فرمانبرداری کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگر حج کر لے والے اس کا دھیان رکھیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آسکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا دوسرا پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔
ایک ترک بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مريد تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا مشاہدہ کیا کرتے تھے، وہ حج کر گئے اور فارغ ہو کر واپس آئے تو یہ کیفیت بھلے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی، اپنے مرشد مولانا جامی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمہارے اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گھنگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاح و زاری کرتے تھے، حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ حج ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔

احکام حج کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہے، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح حج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈر لے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہو جائے۔ **وَقِنَا غَمًّا عَنَّا وَتَرْضَى مِنَ الْقَوْلِ وَالْفَعْلِ وَالنِّيَّةِ**

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ

اور بیضا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہو تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگی میں کاموں میں اور گولہ کرتا ہو

عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۖ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑا رہے، اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۖ

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو،

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۖ

اور جب اُس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو آمادہ کرے اس کو غرور گناہ پر سوکانی ہے اس کو دوزخ

وَلَيْسَ الْبِرَّ بِمَا كَسَبَ ۖ وَالنَّاسُ مِن شَرِّ نَفْسٍ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ

اور وہ نہ نیک بھلائی، اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے کہ بچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ ۖ

میں، اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر

کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ درحقیقت حج اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے، **إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ** (۲: ۱۷۷) یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعائر بندے ہیں، اور جو شخص حج سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا، اور حج کے اندر بھی بے پروائی سے کام لیتا رہا، حج کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا حج کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا حج فرض ادا ہو گیا، ترک حج کا جرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ تُحْشَرُونَ** - یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کر دو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو، وہ تمہارے کھیلے ہوئے اور چپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزا و سزا دیں گے، احکام حج جو اوپر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت ان سب کی روح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ایام حج میں جب کہ اعمال حج میں مشغول ہوں اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکام حج میں کوئی کوتاہی نہ کرو، اور بعد میں بھی اپنے حج پر معسرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ وزن اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھٹا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور وزن ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادت حج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان حج سے فایز ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہے، ورنہ جو شخص حج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علمائے فرمایا ہے کہ حج مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محبت سے فایز اور آخرت کی طرف راغب ہو، ایسے شخص کا حج مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعا اس کی مقبول ہے، ورنہ حج میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت و فرمانبرداری کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگر حج کر لے دے اس کا دھیان کہیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آسکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا دوسرا پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔
ایک ترک بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مريد تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا مشاہدہ کیا کرتے تھے، وہ حج کر گئے اور فایز ہو کر واپس آئے تو یہ کیفیت بھلے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی، اپنے مرشد مولانا جامی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمہارے اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گھنگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاح و زاری کرتے تھے، حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ حج ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔

احکام حج کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہے، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح حج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈر لے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرانی عبادت ضائع نہ ہو جائے۔ **وَقِنَا غَمًّا عَنَّا وَتَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ وَالنِّيَّةِ**۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ

اور بیضا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہو تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگی کے کاموں میں اور گولہ کرتا ہو

عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۖ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑا رہے، اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۖ

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیایاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو،

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۖ

اور جب اُس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آمادہ کرے اس کو غرور گناہ پر سوکانی ہے اس کو دوزخ

وَلَيْسَ الْبِرَّ بِمَا كَسَبَ ۖ وَالنَّاسُ مِن شَرِّ نَفْسٍ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ

اور وہ نہ نیک بھلائی کے لئے اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے کہ بچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ ۖ

میں، اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر

ربط آیات اوپر کی آیتوں میں دمار مانگنے والے آدمیوں کی دو قسمیں ٹھہرائی گئیں، ایک کافر کہ منکر آخرت ہو، اس نے صرف دنیا مانگتا ہے، دوسرا مؤمن کہ معتقد آخرت ہو، دنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگتا ہے، اب اگلی آیت میں اسی طرح کی تقسیم نفاق و اخلاص کے اعتبار سے فرماتے ہیں کہ بعض منافق ہوتے ہیں اور بعض مخلصین۔

خلاصہ تفسیر کوئی شخص تھا اَنْس بن شَرَبْن، بڑا فصیح و بلیغ، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر قسمیں کھا کھا کر دعویٰ اسلام کیا کرتا اور مجلس سے اٹھ کر جاتا تو فساد و شرارت و ایذا رسائی خلق میں لگ جاتا، اس منافق کے باب میں فرماتے ہیں (اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو شخص دنیوی غرض سے ہوتی ہے، دیکھ کر انہیں اسلام سے مسلمانوں کی طرح قربے خصوصیت کے ساتھ رہوں گا، اس کی نصاحت و بلاغت کی وجہ سے) مزہ دار معلوم ہوتی ہے، اور وہ اپنا اعتبار بڑھانے کو، اللہ تعالیٰ کو گھوڑا بناتا ہے اپنے دل کی سچائی پر حالانکہ بالکل جھوٹا ہے، کیونکہ واقع میں، وہ (آپ کی) مخالفت میں رہنایت ہدیہ ہے، اور جس طرح آپ کا مخالفت ہو اس طرح اور مسلمانوں کو بھی ایذا پہنچاتا ہو چنانچہ جب (آپ کی مجلس) پیٹھ پھیرتا ہے تو اس کو ڈر و صوب میں پھرتا رہتا ہو کہ شہر میں (کوئی) فساد کرے اور (کسی کی) کھیت اور مویشی کو تلف کرے، چنانچہ ایک مسلمان کا اس طرح نقصان کر دیا، اور اللہ تعالیٰ فساد کی باتوں کو پسند نہیں فرماتے، اور اس مخالفت و ایذا کے ساتھ مغرور اس درجہ ہو کہ جب اس سے کوئی کہتا ہے خدا سے ڈر تو (اور زیادہ) آمادہ کر دیتا ہے اس کو غرور گناہ پر، سو ایسے شخص کی کافی سزا ہے جہنم، اور وہ بڑا ٹھکانا ہے، اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بدلہ میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

معارف و مسائل

آیت کا آخری حصہ جس میں مؤمن و مخلص کا یہ حال بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتا ہے، یہ ان مخلص صحابہ کرام کی شان میں نازل ہوئی ہو جنہوں نے بے مثال شہرانیوں اللہ کی راہ میں پیش کی ہیں، مستدرک حاکم، ابن جریر، مسند ابن ابی حاتم وغیرہ میں بسند صحیح منقول ہے کہ یہ آیت حضرت حبیب رومی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں نازل ہوئی ہو کہ جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں کفار قریش کی ایک جماعت

نے راستہ روک لیا یہ دیکھ کر حضرت حبیب رومی اپنی سواری سے اتر کر کھڑے ہو گئے، اور ان کے ترکش میں جتنے تیر خے سب نکال لئے، اور قریش کی اس جماعت سے خطاب کیا کہ اے قبیلہ قریش تم سب بچے ہو کہ میں تیر اندازی میں تم سے زیادہ ماہر ہوں، میرا تیر کبھی خطا نہیں کرتا، اور اب میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تم میرے پاس اس وقت تک نہ پہنچ سکو گے جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے، اور تیروں کے بعد میں تلوار سے کام لوں گا جب تک مجھ میں دم رہے گا، پھر جو تم چاہو کر لینا، اور اگر تم نفع کا سودا چاہتے ہو تو میں تمہیں اپنے مال کا ہتہ دیتا ہوں جو مکہ مکرمہ میں رکھا ہے، تم وہ مال لے لو، اور میرا سستہ چھوڑ دو، اس پر قریش کی جماعت راضی ہو گئی، اور حضرت حبیب رومی نے مع صلح سلم انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر واقعہ سنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے فرمایا

رَبِّیُّہُ النَّبِیُّ اَبَا یَحْیٰی رَبِّیُّہُ النَّبِیُّ

تمہارا یہ بابر نفع بخش رہا، تمہاری بی بی نفع بخش

اَبَا یَحْیٰی

ہی

اسی واقعہ میں آیت مذکورہ کے نزول نے اس کلام کی تصدیق کر دی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا تھا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے کچھ دوسرے صحابہ کرام کے ایسے ہی واقعات کو آیت کا نشانہ نزول بتلایا ہے (منطری)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

لے ایمان والو داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے اور مت چلو قدموں پر

الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۚ فَإِنْ تَرَكْتُمُ مِنْ بَعْدِ مَا

شیطان کے بیشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے، پھر اگر تم بچنے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے

جَاءَ تَكْمُلُ الْبَيِّنَاتِ فَاَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ ۲۱۰ ۚ هَلْ

تم کو صاف حکم تو جان رکھو کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا، کیا وہ

يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ

اسی کی راہ دیکھتے ہیں کہ آدے ان پر اللہ ابر کے ساتباؤں میں اور فرشتے

وَقَضَىٰ الْأَمْرَ إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝ ۲۱۱ ۚ

اور طے ہو جائے قعدہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام

رابط آیات

اور پھر غلصہ کی مدح تھی، بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے ظن اور افراط ہو جاتا ہے یعنی قصد تو ہوتا ہے زیادہ اطاعت کا مگر وہ اطاعت بنظر فائز حد شریعت و ملت سے متجاوز ہوتی ہے، اس کو بدعت کہتے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ جو پہلے علماء یہودی تھے، اور اس مذہب میں ہفتہ کار روز معظم تھا، اور اونٹ کا گوشت حرام تھا، ان صاحبوں کو بعد اسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعت محمدیہ میں اس کی تعظیم واجب نہیں، اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کر دیں تو شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خیال کی اصلاح آیت آئندہ میں بھی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جائے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے، اور یہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کا عذاب زیادہ سخت ہونے کا خطرہ ہے۔

خلاصہ تفسیر

لے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو رہے نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رسم و رواج اور ایسے خیالات میں پڑ کر شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے کہ ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں تو مسلمانوں میں معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف ہے، پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلائل (احکام و شرائع اسلام کی) پہنچ چکی ہیں، پھر بھی مراکتعیم سے لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ ربڑے زبردست ہیں سخت سزا دینگے اور کچھ دنوں تک سزا دیں تو اس سے دھوکہ مت کھانا کیونکہ وہ حکمت والے (بھی) ہیں کسی حکمت و مصلحت سے کبھی سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے، یہ لوگ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اختیار کرتے ہیں، صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سانپانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے یعنی کیا اس وقت امر حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا، اور یہ سارے رجز و سزا کے مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جا دیں گے رکوئی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا، سو ایسے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے۔

معارف و مسائل

اَدْخُلُوا فِي الْيَسْمِ كَاذِبَةً، سلم بالکسر بافتح دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک صلح دوسری اسلام، اس جگہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اسلام مراد ہے (ابن کثیر) لفظ کاذبہ جمیعاً اور عامۃ کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ اس جگہ ترکیب میں قائل واقع ہوا ہے جس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر اَدْخُلُوا کا قائل تشرار دیا جائے، دوسرے یہ کہ سلم بمعنی اسلام کا قائل ہو، پہل صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی تمہارے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، دل اور دماغ سب کا سب دائرۃ اسلام و اطاعت اہلبیت کے اندر داخل ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکام اسلام بجا لارہے ہو مگر دل و دماغ اس پر مطمئن نہیں یا دل و دماغ سے تو اس پر مطمئن ہو مگر ہاتھ پاؤں اور اعضاء و ارجاء کا عمل اس سے باہر ہے۔

اور دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں، یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام کو تو قبول کرو لیکن میں پس و پیش ہے، اور چونکہ اسلام نام ہے اس مکمل نظام حیات کا جو قرآن و سنت میں بیان ہوا ہے خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو یا معاملات و معاشرت سے، حکومت و سیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت و صنعت وغیرہ اسے اسلام کا جو مکمل نظام حیات ہے تم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

خلاصہ دونوں صورتوں کا قریب قریب یہی ہے کہ احکام اسلام خواہ وہ کسی شعبہ زندگی سے متعلق ہوں اور اعضاء ظاہری سے متعلق ہوں یا قلب اور باطن سے ان کا تعلق ہو، جب تک ان تمام احکام کو سچے دل سے قبول نہ کر دو گے مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہو گے۔

اس آیت کا شان نزول جو اوپر بیان ہوا ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ صرف اسلام ہی کی تعلیمات تمہارا مطالعہ نظر ہونا چاہئے، اس کو پورا پورا اختیار کر لو تو وہ تمہیں ساری غائب و معلول سے بے نیاز کر دے گا۔

تنبیہ:۔ اس میں آن لوگوں کے لئے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادت کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، معاملات اور معاشرت کے احکام کو گو یا دین کا جزو ہی نہیں سمجھتے، اصطلاحی دینداروں میں یہ غفلت عام ہے، حقوق و معاملات اور خصوصاً حقوق معاشرت سے بالکل بیگانہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی نہیں سمجھتے، نہ ان کے معلوم کرنے یا سمجھنے کا اہتمام کرتے ہیں نہ ان پر عمل کرنے کا، نعوذ باللہ ہم ازکم محقر رسالہ آداب معاشرت حضرت سیدی حکیم الامت کا مسلمان مرد و عورت کو ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

اور یہ واقعہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادل کے ساتھ ان میں اُن کے پاس آجائیں قیامت میں پہلے آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح آنا مشابہات میں سے ہے جس کے متعلق جہور صحابہؓ و تابعینؓ اور اسلاف امت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے معنوں کے حق و صحیح ہونے کا اعتقاد یقین رکھے، اور کیفیت کہ کس طرح یہ کام ہوگا اس کی دریافت کی فکر میں نہ پڑے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور تمام صفات کی حقیقت اور کیفیت کا معلوم کرنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے یہ بھی اسی میں داخل ہے۔

سَلِّ بَنِي إِسْرَءِيلَ كَمَا آتَيْنَاهُمْ مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ وَمَنْ يُبَدِّلْ

یوحنا بنی اسرائیل سے کس قدر عنایت کہ ہم نے انکو نشانیاں کھلی ہوئی، اور جو کوئی بدل ڈالے

نِعْمَةً اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ پہنچ چکی ہو وہ نعمت اس کو تو اللہ کا عذاب سخت ہے،

زَيْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَتَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ

فریفتہ کیا کہ کافروں کو دنیا کی زندگی پر اور ہنسے ہیں ایمان والوں

اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اٰتَقَوْا فَرَقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ

سے اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں سے بالاتر ہوں گے قیامت کے دن اور اللہ روزی

مَنْ يَّشَاءُ مِنْ غَيْرِ حِسَابٍ ۝

دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار

رَبِّ اٰيَاتٍ | اوپر فرمایا تھا کہ بعد دلائل واضعہ آجانے کے حق کی مخالفت کرنا موجب سزا ہے،

پہلی آیت میں اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ جیسے بعض بنی اسرائیل کو ایسی ہی مخالفت

پر سزا دی گئی: خلاصہ تفسیر | آپ (علماء) بنی اسرائیل سے (دُعا) پوچھتے (تو یہی) ہم نے ان کو دینی اُن کے

بزرگوں کو کتنی واضح دلیلیں دی تھیں مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ

اس سے ہدایت حاصل کرتے اور الٹی گرا ہی پر کمر باندھی پھر دیکھو سزائیں بھی جگتیں ہشتا تو راہ ملی،

چاہتے تو یہ تھا کہ اس کو قبول کرتے، مگر انکار کیا، آخر کو وہ طور گرانے کی ان کو دھکی دی گئی، اور مثلاً

حق تعالیٰ کا کلام سنا، چاہو تو سراسر آنکھوں پر رکھتے مگر شہادت نکالے آخر پہلی سے ہلاک ہوئے اور مثلاً

دریائیں شگاف کر کے فرعون سے نجات دی گئی، احسان مانتے مگر گوسالہ پرستی شروع کی، جس پر

سزائے قتل دی گئی، اور مثلاً حق و سلوی نازل ہوا شکر کرنا چاہئے تھا، نافرمانی کی وہ سڑنے لگا، اور اس سے نفرت ظاہر کی تو وہ موقوف ہو گیا، اور کھیتی کی معیبت سر پر پڑی، اور مثلاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ان میں جاری رہا، غنیمت سمجھتے ان کو قتل کرنا شروع کر دیا، جس پر یہ سزا دی گئی کہ ان سے حکومت و سلطنت چھین لی گئی، دلیٰ ہتھکڑی سے معاملات اسی سورۃ بقرہ کے شروع میں بھی مذکور ہو چکے ہیں، اور (ہمارا قانون ہی یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہی بڑی، نعمت (دلائل واضحہ) کو بدلتا ہے، اس کے پاس پہنچنے کے بعد (یعنی بھاتے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرے اور اٹا گراہ بتا ہی) تو یقیناً حق تعالیٰ (ایسے شخص کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

دوسری آیت میں مخالفت حق کی اصل علت اکثر یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کی محبت ہو جس کے آثار میں سے اہل دین کو حقیر سمجھنا بھی ہے، کیونکہ جب دنیا کا غلبہ ہوتا ہے دین کی طلب نہیں رہتی، بلکہ دین کو اپنی دنیوی اغراض کے خلاف دیکھ کر ترک کر بیٹھتا ہے، اور دوسرے طالبان دین پر ہنسنا ہی، چنانچہ بعض رؤسائے بنی اسرائیل اور چھلے مشرکین غریب مسلمانوں کے ساتھ ہاتھ بڑھائے پیش آیا کرتے تھے، ان لوگوں کا بیان فرماتے ہیں کہ دنیوی معاش کفار کو آراستہ پہرہ مستحکم معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمیز کرتے ہیں، حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر و شرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ رک حالت میں ہوں گے قیامت کے روز کیونکہ کفار جہنم میں ہوں گے اور مسلمان جنت میں) اور (آدمی کو محض معاشی وسعت پر مغرور نہ ہونا چاہئے، کیونکہ روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے انداز (یعنی بکثرت) دیدیتے ہیں پس اس کا مدار قسمت پر ہے نہ کمال اور مقبولیت پر، سو یہ ضرور نہیں کہ جو روزی میں بڑا ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی معزز ہو اور بڑی عزت ہی جو اللہ کے نزدیک معتبر ہو پھر محض اس کے اوپر اپنے کو معزز اور دوسرے کو ذلیل سمجھنا بیوقوفی ہے۔

معارف و مسائل

دنیا کے مال و دولت اور عزت و جاہ پر مغرور ہونے اور غریب لوگوں کا استہزاء کرنے کی حقیقت قیامت کے روز آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی مومن مرد یا عورت کو اس کے فقر و فاقہ کی وجہ سے ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو اولین و آخرین کے مجمع میں رسوا اور ذلیل کریں گے، اور جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت پر بہتان باندھتا ہے اور کوئی ایسا عیب اس کی طرف منسوب کرتا ہے جو اس میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو آگ

کے ایک اونچے ٹیلہ پر کھڑا کریں گے جب تک کہ وہ خود اپنی تکذیب نہ کرے۔

(ذکر الحدیث القریبی)

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِينَ مُبَشِّرِينَ وَ

تھے سب لوگ ایک دین پر پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوش خبری سنانے والے اور

مُنذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

ڈرانے والے اور اناری اُن کے ساتھ کتاب بھی کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس بات

فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ

میں وہ جھگڑا کریں، اور نہیں جھگڑاؤ الا کتاب میں مگر انہی لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی اس

مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا

کے بعد کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم آپس کی ضد سے پھر اب ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو

لَمَّا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِآذِنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى

اسی ہی بات کی جس میں وہ جھگڑا کر رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ بتلاتا ہے جسکو چاہے

صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۲۱۳﴾

سیدھا راستہ۔

ربط آیات

اور پھر دین حق سے اختلاف کرنے کی ملتِ حُتّ دنیا کو بتایا ہے، آگے اسی مضمون کی تائید فرماتے ہیں کہ مذمت سے ہیں قصہ چلا آ رہا ہے کہ ہم دلائل واضعہ دین حق پر قائم کرتے ہیں، اور طالبانِ دنیا اپنی دنیوی اغراض کے سبب اس سے غلات کرتے رہے۔

خلاصہ تفسیر

(ایک زمانہ میں) سب آدمی ایک ہی طریق پر تھے کیونکہ اول دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام مع اپنی بی بی کے تشریف لاتے اور جو اولاد ہوتی گئی ان کو

دین حق کی تعلیم فرماتے رہے اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے، ایک مدت اسی حالت میں گزر گئی، پھر اختلافِ طبائع سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا حتیٰ کہ ایک عرصہ کے بعد

اعمال و عقائد میں اختلاف کی نوبت آگئی، پھر اس اختلاف کے رفع کرنے کو اللہ تعالیٰ نے

(مختلف) پیغمبروں کو بھیجا جو کہ (حق ماننے والوں کو) خوشی دے دے، سناتے تھے اور (نہ ماننے والوں کو) مذہاب سے ڈراتے تھے، اور ان پیغمبروں کی مجموعی جماعت کے ساتھ (آسانی) کتابیں بھی

ٹھیک طور پر نازل فرمائیں اور ان پیغمبروں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل فرمانا، اس غرض سے رہتا تھا کہ

اللہ تعالیٰ راہِ رسل و کتب کے ذریعہ سے اختلاف کرنے والے لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ

(مذہبی) میں فیصلہ فرمادیں کیونکہ رسل و کتب امر واقعی کا اظہار کر دیتے ہیں اور امر واقعی کے متعین

ہونے سے ظاہر ہے کہ غیر واقعی کا غلط ہو جانا معلوم ہو جاتا ہے، اور یہی فیصلہ ہی، اور ان پیغمبروں کے

ساتھ کتاب اللہ آنے سے چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے، اور اس پر مدار رکھ کر اپنے سب

اختلافات مٹا دیتے، مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا، اور خود اسی میں اختلاف کرنا شروع

کر دیا، اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو (اولاً)

وہ کتاب ملی تھی (یعنی اہل علم و اہل فہم نے) کہ اول مخاطب وہی لوگ ہوتے ہیں، دوسرے عوام اُن کے

ساتھ لگ لیا کرتے ہیں، اور اختلافات بھی کیسے وقت کیا، بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضح

پہنچ چکے تھے (یعنی ان کے ذہن نشین ہو چکے تھے، اور اختلاف کیا کس وجہ سے صرف، باہمی

ضد امتی کی وجہ سے) اور اصل وجہ ضد امتی کی حُتّ دنیا ہوتی ہے، حُتّ مال ہو یا حُتّ جاہ، پس

مدار علت مخالفت حق کا وہی حُتّ دنیا ٹھہری اور یہی مضمون تھا سابق میں، پھر یہ اختلاف کفار کا

کبھی اہل ایمان کو مضر نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں اختلاف

اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ (رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے کی بدولت) بتلادیا اور اللہ

تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو راہِ راست بتلا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان ایک ہی مذہب و ملت اور

عقیدہ و خیال پر تھے جو ملت حق اور دین فطرت تھی، پھر انہیں مزاج و مذاق اور رائے فکر کے اختلاف پہنچے مختلف خیالات

و عقائد پیدا ہو گئے، جن میں یہ ہمتیاز کرنا دشوار تھا کہ ان میں حق کونسا ہے اور باطل کونسا، حق کو

واضح کرنے اور صحیح راہ حق بتلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام بھیجے، اور ان پر کتابیں

اور وحی نازل فرمائی، انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد اور تبلیغ و اصلاح کے بعد انسان دو گروہوں

میں منقسم ہو گئے، ایک وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کو قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام

کے مشیق ہو گئے، جن کو مؤمن کہا جاتا ہے، دوسرے وہ جنہوں نے آسانی ہدایات اور انبیاء علیہم السلام

کو جھٹلایا، ان کی بات نہ مانی، یہ لوگ کافر کہلاتے ہیں، اس آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے: كَانَتِ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً، امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں فرمایا ہے کہ لفظ "امۃ"

عرب لغت کے اعتبار سے ہر ایسی جماعت کو کہا جاتا ہے جس میں کسی وجہ سے رابطہ و اتحاد اور وحدت

قائم ہو، خواہ یہ وحدت نظریات و عقائد کی ہو یا ایک زمانہ میں یا کسی ایک خطہ ملک میں جمع ہونے کی، یا کسی دوسرے علاقہ یعنی نسب، زبان، رنگ وغیرہ کی، مفہوم اس جملہ کا یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان باہم متفق و متحد ایک جماعت تھے، اس میں دو باتیں قابل غور ہیں،

اول یہ کہ اس جگہ وحدت سے کس قسم کی وحدت مراد ہے، دوسرے یہ کہ وحدت کس زمانہ میں تھی، امر اول کا فیصلہ تو اسی آیت کے آخری جملہ نے کر دیا، جس میں اس وحدت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا اور مختلف راہوں میں حق متعین کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کے بھیجے کا ذکر ہے، کیونکہ یہ اختلاف جس میں فیصلہ کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ نسب یا زبان یا رنگ یا وطن اور زمانہ کا اختلاف نہ تھا، بلکہ نظریات اور عقائد و خیالات کا اختلاف تھا، اسی کے مقابلے میں معلوم ہوا کہ اس آیت میں وحدت سے بھی وحدت فکر و خیال اور وحدت عقیدہ و مسلک مراد ہے۔

تو اب مفہوم آیت کا یہ ہو گیا کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب کہ تمام افراد انسانی صرف ایک ہی عقیدہ و خیال اور ایک ہی مذہب و مسلک رکھتے تھے، وہ عقیدہ و مسلک کیا تھا، اس میں دراحتمال ہیں، ایک یہ کہ سب عقیدہ توحید و ایمان پر متفق تھے، دوسرے یہ کہ سب کفر و ضلال پر متحد تھے۔ مگر جمہور مفسرین کے نزدیک رائج یہ ہے کہ مراد عقائد صحیحہ توحید و ایمان پر سب کا متحد ہونا ہے، سورہ یونس میں بھی اسی مضمون کی ایک آیت آئی ہے،

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً
فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ
مِّن رَّبِّكَ لَفُتِحَتْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ
فَيُنْزِلُ فِيهَا مَن يَخْتَلِفُونَ ۚ (۱۹:۱۰)

جملہ لوگوں کا ایسا فیصلہ کر دینا کہ جن سے اختلاف کرنے والوں کا نام ہی نہ رہتا۔

اور سورہ انبیاء میں فرمایا:

إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً
وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ (۱۲:۱۱)

اسی طرح سورہ مومنوں میں فرمایا:

وَأَنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً
وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ (۵۲:۲۳)

یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہو اور میں تمہارا رب ہوں، اس لئے سب میری ہی عبادت کرتے ہو۔

یعنی یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہو اور میں تمہارا رب ہوں، اس لئے مجھ سے ہی ڈرتے رہو۔

ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وحدت سے عقیدہ و مسلک کی وحدت اور دین حق توحید و ایمان میں سب کا متحد ہونا مراد ہے۔

اب یہ دیکھنا کہ یہ دین حق اسلام و ایمان پر تمام انسانوں کا اتفاق و اتحاد کس زمانہ کا واقعہ ہے، یہ وحدت کہاں تک قائم رہی؟ مفسرین صحابہؓ میں سے حضرت ابی بن کعبؓ اور ابن زیدؓ نے فرمایا کہ یہ واقعہ عالم ازل کا ہے، جب تمام انسانوں کی ارجح کو پیدا کر کے ان سے سوال کیا گیا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔ یعنی کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، اور سب نے بلا استثناء یہ جواب دیا تھا کہ بیشک آپ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اس وقت تمام افراد انسانی ایک ہی عقیدہ حق پر قائم تھے، جس کا نام ایمان و اسلام ہے (قرطبی)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ وحدت عقیدہ کا واقعہ اس وقت کا ہو جبکہ آدم علیہ السلام مع اپنی زوجہ محترمہ کے دنیا میں تشریف لائے، اور آپ کی اولاد ہوئی اور پہلی گئی، وہ سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کے دین اور انہی کی تعلیم و تلقین کے تابع توحید کے قائل تھے، اور سب کے سب باستثناء قابیل وغیرہ متبع شریعت و فرمانبردار تھے۔

مسند بزار میں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وحدت عقیدہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک قائم رہی، اس وقت تک سب کے سب علم اور توحید کے معتقد تھے، اور آدم علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے درمیان زمانہ دس قرن ہے، بظاہر قرن سے ایک صدی مراد ہو تو کل زمانہ ایک ہزار سال کا ہو گیا۔

اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا کہ یہ وحدت عقیدہ کا زمانہ وہ ہے جب کہ نوح علیہ السلام کی بددعا سے دنیا میں طوفان آیا، اور جب سب لوگوں کے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے، باقی ساری دنیا غرق ہو گئی تھی، طوفان ختم ہونے کے بعد جتنے آدمی اُس دنیا میں رہے وہ سب سلمان مومن اور دین حق کے پیرو تھے۔

اور درحقیقت ان تینوں اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ تینوں زمانے لیے ہی تھے جن میں سارے انسان ملت واحدہ اور امت واحدہ بنے ہوئے دین حق پر قائم تھے۔

آیت کے دوسرے جملہ میں ارشاد ہے، فَبَعَثْنَا إِلَيْكَ الرُّسُلَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ ۚ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَلَقَدْ لَعَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ عِندَ ذِي الْحَرَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۚ (۲:۲۱)

پ

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اوپر کے جملہ میں تمام انسانوں کا امتب واحد اور ملت واحد ہونا بیان کیا تھا، اور اس جملہ میں اسی پر تفسیر راجح کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ہم نے انبیاء اور کتابیں بھیجی تاکہ اختلاف کا فیصلہ کیا جائے، ان دونوں جملوں میں بظاہر جوڑ نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ انبیاء اور کتابوں کے بھیجنے کی ملت لوگوں کا اختلاف ہے، اور اختلاف اس وقت تھا نہیں مگر جواب بالکل واضح ہے کہ مراد آیت مذکورہ کی یہ ہے کہ ابتداء عالم میں تمام انسان ایک ہی عقیدہ حق کے قائل اور پابند تھے، پھر رفتہ رفتہ اختلافات پیدا ہو گئے، اختلافات پیدا ہونے کے بعد انبیاء علیہم السلام اور کتابیں بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔

اب ایک بات رہ جاتی ہے کہ اور صرف امت واحدہ ہونے کا ذکر کیا گیا، اختلاف پیدا ہونے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا، جو لوگ قرآن کریم کے اسلوب حکیم پر کچھ نظر رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کا جواب مشکل نہیں کہ قرآن کریم احوالِ ماضیہ کے بیان میں قصہ کہانی یا تاریخ کی کتابوں کے سائے قصہ کو کہیں نقل نہیں کرتا، بلکہ درمیان سے وہ حصہ حذف کر دیتا ہے جو اس سیاقِ کلام سے خود بخود سمجھا جاسکے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جو قیدی رہا ہو کر آیا اور خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے یوسف علیہ السلام کے پاس بھیج دو تو قرآن میں اس قیدی کی تجویزِ نقل کرنے کے بعد بات یہاں سے شروع ہوتی ہے، یُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ، اس کا ذکر نہیں کیا کہ بادشاہ نے اس کی تجویز کو پسند کیا، اور اس کو جیل خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا، وہ وہاں پہنچ کر ان سے مخاطب ہوا، کیونکہ پچھلے اور اگلے جلوں کے ملانے سے یہ ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

اسی طرح اس آیت میں وحدتِ ملت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے، لہذا یہاں اختلافات کا وقوع تو ساری دنیا جانتی ہے، ہر وقت مشاہدہ میں آتا ہے، ضرورت اس امر کے اظہار کی تھی کہ ان اختلافاتِ کثیرہ سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی گذر چکا ہے جس میں سارے انسان ایک ہی مذہب و ملت اور ایک ہی دینِ حق کے پیرو تھے، اسی کو بیان فرمایا، پھر جو اختلاف دنیا میں پھیلے ہوئے اور سب کے مشاہدہ میں آتے ہیں ان کے وقوع کا بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی، ہاں یہ بتلایا گیا کہ ان اختلافات میں راویِ حق کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان حق تعالیٰ نے کیا فرمایا، اس کے متعلق ارشاد ہوا اَتَقْبَلُ الذِّبْنَ، یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا جو دینِ حق کا اتباع کرنے والوں کو دائمی آرام و راحت کی خوش خبری اور اس سے اعراض کرنے والوں کو عذابِ جہنم کی وعید سنادیں، اور ان کے ساتھ اپنی وحی اور کتابیں بھیجی جو مختلف عقائد و خیالات میں سے صحیح اور حق کو واضح کر کے بتلا دیں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ انبیاء

$$\frac{1}{2}$$

رسول اور آسمانی کتابوں کے کھلے ہوئے فیصلوں کے بعد بھی یہ دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی، کچھ لوگوں نے ان ہدایات و واضحہ کو قبول نہ کیا، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ قبول نہ کرنے والے اول وہی لوگ ہوئے جن کے پاس یہ انبیاء اور آیات الہیہ بھی گئی تھیں، یعنی اہل کتاب یہود و نصاریٰ، اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں کوئی اشتباہ یا التباس کی گنجائش نہ تھی، کہ ان کی سمجھ میں نہ آئے یا غلط فہمی کا شکار ہو جائیں، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جاننے اور سمجھنے کے باوجود ان لوگوں نے محض ضد اور ہٹ دھرمی سے انکار کیا۔

اور دوسرے اگر وہ ہوا جن کو اللہ تعالیٰ نے راہ ہدایت پر لگا دیا اور جس نے انبیاء و رسول اور آسمانی کتابوں کے فیصلے ٹھنڈے دل سے تسلیم کئے، انھیں دونوں گروہوں کا بیان قرآن کریم نے سورۃ تہا میں اس طرح فرمایا ہے:

خَلَقَكُمْ لِمَنكُم كَافِرًا
بِمَنكُم مُّؤْمِنًا (۲: ۶۳)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا پھر تم میں سے کچھ
کافر و منکر ہو گئے کچھ مؤمن و مسلم

فصلہ مفسرین آیت حکم الناس امة واحدة کا یہ کہ پہلے دنیا کے سب انسان دین حق پر قائم تھے، پھر اختلاف طبائع سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا، ایک عرصہ کے بعد اعمال و عقائد میں اختلاف کی فوج آگئی، یہاں تک کہ حق و باطل میں القباس ہونے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنی کتب میں راہ حق کی ہدایت کرنے کے لئے اور اسی دین حق پر دوبارہ قائم ہو جانے کے لئے بھیجی جس پر سب انسان پہلے قائم تھے، لیکن ان سب ہدایات و نسخہ اور آیات بینات کے ہوتے ہوئے کچھ لوگوں نے مانا اور کچھ لوگوں نے ضد اور عناد سے انکار و انحراف کی راہ اختیار کر لی۔

مسائل

مسئلہ: اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوتیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت سے انبیاء اور کتابیں دنیا میں بھیجیں یہ سب اس واسطے تھیں کہ یہ لوگ جو دینِ حق کی ملتِ واحدہ کو چھوڑ کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے پس پھر ان کو اسی ملتِ واحدہ پر قائم کر دیں، انبیاء کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا آتا کہ جب لوگ اس راہِ حق سے بچلے تو ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نئی بھیجا، اور کتاب اتاری کہ اس کے موافق چلیں، پھر کبھی پہلے تو دوسرا نبی اور کتاب اللہ تعالیٰ نے اسی راہِ حق پر قائم کرنے کے لئے بھیج دیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے تندرستی ایک بیمار یا بے شمار، جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور پرہیز مقرر فرمایا، جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا

$$\frac{1}{2}$$

اور پرہیز اس کے موافق بتلایا، اب آخر میں ایسا جامع نسخہ تجویز فرمایا جو ساری بہاریوں سے بچانے میں اس وقت تک کے لئے کامیاب ثابت ہو جب تک اس عالم کو باقی رکھنا منظور ہو، یہ مکمل اور جامع نسخہ، ایک جامع اصول علاج سب پچھلے نسخوں کے قائم مقام اور آئندہ سے بے نیاز کرنے والا ہو، اور وہ نسخہ جامع اسلام ہے، جس کے لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید گئے، اور کئی کتابوں میں تحریر ہو کر جو پچھلے انبیاء تک تعلیمات ضائع اور گم ہو جانے کا سلسلہ ادھر سے چلا آیا تھا جس کے سبب نبی اور نبی کتاب کی ضرورت پیش آتی تھی اس کا یہ انتظام فرمادیا گیا کہ قرآن کریم کے تعریف محفوظ رہنے کا وہ خود حق تعالیٰ نے لے لیا اور قرآن کریم کی تعلیمات کو قیامت تک ان کی اصلی صورت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے اللہ جل شانہ نے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تاقیامت ایک ایسی جماعت قائم رکھنے کا وعدہ فرمایا جو ہمیشہ دین حق پر قائم رہ کر کتاب و سنت کی صحیح تعلیم مسلمانوں میں مشائع کرتی رہے گی، کسی کی مخالفت و عداوت اُن پر اثر انداز نہ ہوگی، اس لئے اس کے بعد دروازہ نبوت اور دہی کا بند ہو جانا ناگزیر امر تھا، آخر ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہو کہ مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء اور ان کی مختلف کتابیں آنے سے کوئی اس دور میں نہ پڑ جائے کہ انبیاء اور کتابیں لوگوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے اور افتراق پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی ہیں، بلکہ منشاء ان سب انبیاء اور کتابوں کا یہ ہے کہ جس طرح پہلے سارے انسان ایک ہی دین حق کے پیرو ہو کر ملت واحدہ تھے، اسی طرح پھر اُسی دین حق پر سب جمع ہو جائیں۔

مسئلہ: دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مذہب کی بنا پر قومیت کی تقسیم مسلم و غیر مسلم کا در قوی نظریہ میں منشاء قرآنی کے مطابق ہے، آیت **فَبَنَیْکُمْ کَافًۢرًا وَّمِنْکُمْ مَّوَدَّیْنَ** (۱۲:۱۳) اس پر شاہد ہوا اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلام میں اس در قوی نظریے کی اصل بنیاد در حقیقت صحیح متحدہ قومیت پیدا کرنے پر ہے جو ابتداءً آفرینش میں قائم تھی، جس کی بنیاد وطنیت پر نہ تھی بلکہ عقیدہ حق اور دین حق کی پیروی پر تھی، ارشاد قرآنی **کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** بتلایا کہ ابتداءً عالم میں اعتقاد صحیح اور دین حق کی پیروی کے اعتبار سے ایک صحیح اور حقیقی وحدت قومی قائم تھی، بعد میں لوگوں نے اختلافات پیدا کئے، انبیاء نے لوگوں کو اسی اصلی وحدت کی طرف بلایا، جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ اس متحدہ قومیت سے کٹ گئے اور جدا گانہ قوم قرار دیئے گئے۔

مسئلہ: تیسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ ازل سے سنت اللہ یہی جاری ہے کہ بُرے لوگ ہر نبی مبعوث کے خلاف اور ہر کتاب الہی سے اختلاف کو پسند کرتے رہے اور ان کے مقابلہ و مخالفت میں پورا زور خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہے ہیں، تو اب اہل ایمان کو ان کی بدسلوکی اور فساد سے تشدد نہ ہونا چاہئے، جس طرح کفار نے اپنے بڑوں کا طریقہ کفر و عناد اور انبیاء کی مخالفت

کا اختیار کیا، اسی طرح مومنین صالحین کو چاہئے کہ وہ اپنے بزرگوں کا یعنی انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اختیار کریں، کہ اُن لوگوں کی ایذاؤں اور مخالفتوں پر صبر کریں، اور حکمت و موعظت اور نرمی کے ساتھ ان کو دین حق کی طرف بلا تے رہیں، اور شاید اس مناسبت سے اہل آیت میں مسلمانوں کو مصائب و آفات، بر تحمل اور صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ

کہ تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات اُن **الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاسَاءُ وَالضَّرَآءُ وَ**

وگوں کے جیسے جو ہو چکے تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور

رَزَزُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا مَعَهُ مَتٰی

جھڑ بھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اُس کے ساتھ ایمان لائے کب آدے گی

نَصْرُ اللّٰهِ اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ

اللہ کی مدد، مگر رکھو اللہ کی مدد قریب ہے۔

رَبط آیات اور ہر کی آیت میں کفار کا ہمیشہ سے انبیاء و مومنین کے ساتھ اختلاف اور غلا کرنے رہنا مذکور تھا، جس میں ایک گونہ مسلمانوں کو اس طور پر تسلی دینا بھی

مقصود تھا جن کو سہ تنہا کفار سے ایذا ہوتی تھی، کہ یہ خلاف تمہارے ساتھ نیا نہیں ہے ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، آگے ان کفار مخالفین سے انبیاء و مومنین کو انواع انواع کی ایذائیں اور شدائد پہنچنے کی حکایت بیان فرماتے ہیں، اور اس سے بھی مسلمانوں کو تسلی دلاتے ہیں کہ تم کو بھی کفار سے جو ایذائیں پہنچتی ہیں اُن پر صبر کرنا چاہئے، کیونکہ کامل راحت تو آخرت کی محنت ہی اٹھانے سے ہے۔

خلاصہ تفسیر دوسری بات سنو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) جاؤ چلے ہو گے، حالانکہ (ابھی) کچھ مشقت تو اٹھانی ہی نہیں، کیونکہ تم کو ہنوز ان

(مسلمان) لوگوں کا سا محبوب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان پر مخالفین کے سبب ایسی ایسی مشکلی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں

ہوئیں کہ (اس زمانہ کے) پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے (بے قرار ہو کر) بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد (موجود) کب ہوگی (جس پر ان کو جوابے تسلی کی گئی کہ) یاد رکھو! بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد (بہت) نزدیک رہنے والی ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں چند باتیں قابل غور ہیں:

اول یہ کہ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مشقت و محنت کے اور بغیر مصائب و آفات میں مستلا ہوئے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا، حالانکہ ارشادات قرآنی اور ارشادات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مغفرت سے جنت میں داخل ہوں گے، ان پر کوئی مشقت بھی نہ ہوگی، وجہ یہ ہے کہ مشقت و محنت کے درجات مختلف ہیں، ادنیٰ درجہ نفس و شیطان سے مزاحمت کر کے یا دین حق کے مخالفین کے ساتھ مخالفت کر کے اپنے عقائد کا درست کرنا ہے، اور یہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، آگے اوسط اور اعلیٰ درجات ہیں، جس درجہ کی محنت و مشقت ہوگی اسی درجہ کا دخول جنت ہوگا اس طرح محنت و مشقت خالی کوئی نہ رہا، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

أَشَقُّ النَّاسِ بِلَاغَ الشُّبُهَاتِ

ثُمَّ لَا مِثْلَ وَلَا مِثْلَ

صحتہ

”سب سے زیادہ سخت بلائیں اور مصیبتیں

انبیاء علیہم السلام کو پہنچتی ہیں، ان کے بعد جو

ان کے قریب ترین“

دوسری بات یہاں قابل نظر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عرض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی کسی شک و شبہ کی وجہ سے نہ تھا جو ان کی شان کے خلاف ہے بلکہ اس سوال کا منشا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مدد کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا وقت اور مقام متعین نہیں فرمایا، اس لئے حالت خطر میں ایسے الفاظ عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مدد جلد بھیجے جائے، اور ایسی دعا کرنا توکل یا منصب نبوت کے منافی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی الحاج و زاری کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے انبیاء اور صلحاء امت اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُ مِّنْ خَيْرٍ قَلِيلًا

تجھ سے پوچھنے ہیں کیا چیز خرچ کریں کہہ دو کہ جو کچھ تم خرچ کرو مال و سوا مال باپ کے لئے

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا

اور قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافروں کے اور جو کچھ

تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (۲۱۵)

کرو گے تم بھلائی سودہ بے شک اللہ کو خوب معلوم ہے۔

خلاصہ تفسیر

بارہواں حکم، صدقہ کے مصارف

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (ثواب کے واسطے) کیا چیز خرچ کیا کریں (اور کس موقع پر صرف کیا کریں) آپ فرمادیجئے کہ جو مال تم کو صرف کرنا ہو سو (اس کی تعیین تو تمہاری ہمت پر ہے، مگر ہاں موقع ہم بتلائے دیتے ہیں) یاں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا اور جو سائیک کام کرو گے (خواہ براہ خدا میں خرچ کرنا ہو یا اور کچھ ہو) سوائے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیتوں میں مجموعی حیثیت سے یہ مضمون بہت تاکید کے ساتھ بیان ہوا ہے، کہ غزو و فاق کو چھوڑو اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، حکم الہی کے مقابل میں کسی کی بات مت سنو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان و مال خرچ کیا کرو، اور ہر طرح کی شدت اور تکلیف پر تحمل کرو، اب یہاں سے اسی طاعت و فرمانبرداری اور اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے متعلق کچھ جزئیات کی تفصیل بیان ہوتی ہے جو کہ مال و جان اور دیگر معاملات مثل نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق ہیں، اور اوپر سے جو سلسلہ احکام ابواب البرکات جاری ہے اس میں داخل ہیں۔ اور ان جزئیات کا بیان بھی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے کہ اکثر ان میں سے وہ ہیں جن کے متعلق صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، ان کے استفتاء اور سوالات کا جواب براہ راست عرش رحمت سے بواسطہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیا گیا، اس کو اگر یوں سمجھا جائے کہ حق تعالیٰ نے خود فتویٰ دیا تو یہ بھی صحیح ہے اور قرآن کریم کی آیت قُلِ اللَّهُ يُفَصِّلُ الْفُتُوحَ لِمَن يَشَاءُ میں صراحت حق تعالیٰ نے فتویٰ دینے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، اس لئے اس نسبت میں کوئی استبعاد بھی نہیں۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ فتاویٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جو آپ کو بذریعہ وحی تلقین کئے گئے ہیں، بہر حال اس رکوع میں جو احکام شرعیہ صحابہ کرامؓ کے چند سوالات کے جواب میں بیان ہوئے ہیں، وہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، پورے قرآن میں اس طرح سوال و جواب کے انداز سے خاص احکام تقریباً سترہ جگہ میں آئے ہیں، جن میں سے ساٹھ تو اسی جگہ سورۃ بقرہ میں

ہیں ایک سورۃ مائدہ میں ایک سورۃ انفال میں یہ نو سوالات تو صحابہ کرام کی طرف سے ہیں، سورۃ اہزاب میں دو اور سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ کہف، سورۃ قلہ، سورۃ نازعات میں ایک ایک یہ کل چھ سوال کفار کی طرف سے ہیں، جن کا جواب قرآن میں جواب کے عنوان سے دیا گیا ہے۔

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی جماعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بہتر نہیں دیکھی کہ دین کے ساتھ انتہائی شغف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت و تعلق کے باوجود انھوں نے سوالات بہت کم کئے کل تیرہ سوالات میں سوال کیا ہے، جن کا جواب قرآن میں دیا گیا ہے، کیونکہ یہ حضرات بھڑکتے سوال نہ کرتے تھے (قرطبی) متذکرہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں صحابہ کرام کا استفاء یعنی سوال ان الفاظ سے نقل فرمایا گیا ہے، يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ، یعنی لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، یہی سوال اس رکوع میں تین آیتوں کے بعد پھر اپنی الفاظ کے ساتھ دہرایا گیا، وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ، لیکن اس ایک ہی سوال کا جواب آیت متذکرہ میں کچھ اور دیا گیا ہے، اور تین آیتوں کے بعد آنے والے سوال کا جواب اور ہے۔

اس لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب کس حکمت پر مبنی ہیں یہ حکمت اُن حالات و واقعات میں غور کرنے سے واضح ہو جاتی ہیں یہ آیات نازل ہوئی ہیں مثلاً آیت متذکرہ کا شان نزول یہ ہے کہ عربین جو حج نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ مَا نَسْفِقُ مِنْ أَمْوَالِنَا وَآيَاتِنَا نَسْفِقُهَا (اگرچہ ابن المنذر منہری) یعنی ہم اپنے اموال سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں؟ اور ابن جریر کی روایت کے موافق یہ سوال تنہا عمر و ابن جوح کا نہیں تھا، بلکہ مام مسلمانوں کا سوال تھا، اس سوال کے دو جزو ہیں، ایک یہ کہ مال میں سے کیا اور کتنا خرچ کریں، دوسرے یہ کہ اس کا مصروف کیا ہو کر لوگوں کو دیں۔

اور دوسری آیت جو دو آیتوں کے بعد اس سوال پر مشتمل ہے اس کا شان نزول بروایت ابن ابی حاتمؒ یہ ہے کہ جب قرآن میں مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، تو چند صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ اتفاقاً فی سبیل اللہ کا جو حکم ہمیں ملا ہے ہم اس کی وضاحت چاہتے ہیں، کہ کیا مال اور کوئی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، اس سوال میں صرف ایک ہی جزو ہے، یعنی کیا خرچ کریں، اس طرح ان دونوں سوالوں کی نوعیت کچھ مختلف ہو گئی کہ پہلے سوال میں کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں، اس کا سوال تھا، اور دوسرے میں صرف کیا خرچ کریں کا سوال ہے، اور پہلے سوال کے جواب میں جو کچھ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے دوسرے جزو کو یعنی کہاں

خرچ کریں زیادہ اہمیت دے کر اس کا جواب تو صریح طور پر دیا گیا، اور پہلے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر دیدینا کافی سمجھا گیا، اب الفاظ متراپی میں دونوں احزاب پر نظر فرمائیں، پہلے جز یعنی کہاں خرچ کریں کے متعلق ارشاد ہوا کہ مِمَّا كَفَعْتُمْ بَيْنَ يَدَيْكُمْ وَيَا كُنْزِ بَيْنَ يَدَيْكُمْ، یعنی جو کچھ بھی تم کو اللہ کے لئے خرچ کرنا ہو اس کے متعلق مال باپ اور رشتہ دار اور بے باپ کے بچے اور مساکین اور مسافروں میں۔

اور دوسرے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر ان الفاظ سے دیا گیا وَمَا تَفْعَلُوا میں تحذیر يَا كُنْزِ بَيْنَ يَدَيْكُمْ، یعنی تم جو کچھ بھلائی کر دے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہو، اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر کوئی تحدید اور پابندی نہیں کہ مال کی اتنی ہی مقدار صرف کر دو، بلکہ کچھ بھی اپنی استطاعت کے موافق خرچ کر دے اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر و ثواب پاؤ گے۔

الغرض پہلی آیت میں شاید سوال کرنے والوں کے پیش نظر زیادہ اہمیت اسی سوال کی ہو کہ ہم جو مال خرچ کریں، اس کا مصروف کیا ہو کہاں خرچ کریں، اسی لئے اس کے جواب میں اہمیت کے ساتھ مصارف بیان فرمائے گئے، اور کیا خرچ کریں اس سوال کا جواب ضمنی طور پر دیدینا کافی سمجھا گیا، اور بعد دلی آیت میں سوال صرف اتنا ہی تھا کہ ہم کیا چیز اور کیا مال خرچ کریں، اس لئے اس کا جواب ارشاد ہوا ثِلَّةٌ لِّأَنْفُسِكُمْ، یعنی آپ فرمادیں کہ جو کچھ بچے اپنی ضروریات سے وہ خرچ کیا کریں، ان دونوں آیتوں سے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے متعلق چند ہدایات و مسائل معلوم ہوئے۔

مسئلہ: اول یہ کہ دونوں آیتیں زکوٰۃ فرض کے متعلق نہیں، کیونکہ زکوٰۃ فرض کے لئے تو نصاب مال بھی معسر ہو اور اس میں جتنی مقدار خرچ کرنا فرض ہے، وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پوری طرح متعین و مقرر فرمادی گئی ہے، ان دونوں آیتوں میں نہ کسی نصاب مال کی قید ہے، نہ خرچ کرنے کی مقدار بتلائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں آیتیں صدقات نافلہ کے متعلق ہیں، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ پہلی آیت میں خرچ کا مقرر والدین کو بھی مشرر دیا گیا ہے، حالانکہ مال باپ کو زکوٰۃ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق جائز نہیں، کیونکہ ان آیتوں کا تعلق فریضہ زکوٰۃ سے ہے ہی نہیں۔

مسئلہ: دوسری ہدایت اس آیت سے یہ حاصل ہوئی کہ مال باپ اور دوسرے اعداء و استرہاء کو جو کچھ بطور ہدیہ دیا یا کھلایا جاتا ہے اگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی نیت ہو تو وہ بھی موجب اجر و ثواب اور انفاق فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

مسئلہ: ہمیری ہدایت یہ حاصل ہوئی کہ نفل صدقات میں اس کی رعایت ضروری ہے، کہ جو مال اپنی ضروریات سے زائد ہو وہی خرچ کیا جائے، اپنے اہل و عیال کو تنگ میں ڈال کر اور ان کے حقوق کو تلف کر کے خرچ کرنا ثواب نہیں، اسی طرح جس کے ذمہ کسی کا قرض ہے قرضخواہ کو ادا نہ کرے اور نفل صدقات و خیرات میں اڑائے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، پھر ضروریات سے زائد مال کے خرچ کرنے کا جو ارشاد اس آیت میں ہے اس کو حضرت ابوذر غفاریؓ اور بعض دیگر حضرات نے حکم و جوبی مسترار دیا، کہ اپنی ضروریات سے زائد مال زکوٰۃ اور تمام حقوق ادا کر لے کے بعد بھی اپنی ملک میں جمع رکھنا جائز نہیں ضروریات سے زائد جو کچھ ہے سب کا صدقہ کر دینا واجب ہے، مگر جمہور صحابہؓ و تابعینؓ اور ائمہ دینؓ اس پر ہیں کہ ارشاد و شرعی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو وہ ضروریات سے زائد ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اس کو صدقہ کر دینا ضروری یا واجب ہے، صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا

فرض ہوئی تم پر لڑائی اور وہ بری لگتی ہے تم کو اور شاید کہ بری لگے تم کو

شَيْءًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْءًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمھارے حق میں اور شاید تم کو بھل لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمھارے حق میں

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۱۸﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ

اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، تجھ سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو

الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ فِيهِ كَيْدٌ وَصَلُّ عَنْ سَبِيلِ

کراس میں لڑنا کیسا، کہہ دے اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے، اور روکنا اللہ کی راہ سے

اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ

اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے

أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُ

اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک اور لوگوں کو دین سے بھلانا قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور کفار حق ہمیشہ تم سے

يُقَاتِلُوكُمْ مَعْشَى يَوْمِكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنْ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ

لڑتے ہیں تم سے یہاں تک کہ تم کو پھر دین تمھارے دین سے اگر قابو پاویں، اور جو کوئی

يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فِيمَتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ

پھر تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جادے حالت کفر ہی میں تو ایسوں کے منافع ہوتے

أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ

عمل دنیا اور آخرت میں، اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں وہ اس میں

فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۱۹﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجْهَهُمْ

ہمیشہ رہیں گے، بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور لڑے

فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ

اللہ کی راہ میں وہ امید دار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا

رَحِيمٌ ﴿۲۲۰﴾

مہربان ہے۔

خلاصہ تفسیر

تیرہواں حکم فرضیت جہاد جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (ملٹا) گراں (معلوم ہوتا)

ہو، اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی بات کو گراں سمجھو اور (واقع میں) وہ

تمھارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور (واقع میں) وہ

تمھارے حق میں (باعث) خرابی (کا) ہو اور (ہر شے کی حقیقت حال کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اور تم

(پورا پورا) نہیں جانتے (اپنے بڑے کا فیصلہ اپنی خواہش کی بنیاد پر نہ کر دو کچھ اللہ کا حکم ہو جائے، اسی

کو اجالا مصلحت سمجھ کر اس پر کاربند نہ کرو)

چودھواں حکم تحقیق قتال در شہر حرام (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ کا ایک سفر میں

ان کے ہاتھ سے مارا گیا، اور جس روز یہ قصہ ہوا جب کی پہلی تاریخ تھی، مگر صحابہ اس کو جادوی الاخریٰ

کی تیسرے سچے تھے، اور در جب اشہر حرم میں سے ہے کفار نے اس واقعہ پر طعن کیا کہ مسلمانوں نے

شہر حرام کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا، مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

پوچھا اور بعض روایات میں ہے کہ خود بعض کفار تشریف لے بھی حاضر ہو کر اعتراض سوال کیا،

اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے)۔

لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اس میں خاص طور پر (یعنی عدا) قتال کرنا جرم عظیم ہے مگر مسلمانوں سے یہ فعل بالقصد صادر نہیں ہوا، بلکہ تاریخ کی تحقیق نہ ہونے کے سبب غلطی سے ایسا ہو گیا یہ تو تحقیقی جواب ہے اور الزامی جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کا تو کسی طرح منہ ہی نہیں مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا، کیونکہ اگرچہ شہر حرام میں لڑنا جرم عظیم ہے، لیکن ان کفار کی جو حرکتیں ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ (دین) سے (لوگوں کو) روک ٹوک کر زارین مسلمان ہونے پر تکلیفیں پہنچانا کہ ڈر کے مارے لوگ مسلمان نہ ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ کفر کرنا کہ وہاں بہت سے بیت رکھ چھوڑے تھے، اور بتائے خدا کی عبادت کے ان کی عبادت اور طواف کرتے تھے، اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دو سکرمومنین) ان کو (تنگ اور پریشان کر کے) اس (مسجد حرام) سے خارج (ہونے پر مجبور) کر دینا جس سے نوبت ہجرت یعنی ترک وطن کی پہنچی، سو یہ حرکتیں شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ جرم عظیم ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کیونکہ یہ حرکتیں دین حق کے اندر فتنہ پرداز کرنا ہے) اور ایسی فتنہ پردازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے (جو مسلمانوں سے صادر ہوا) بدرجہا (قباحت میں) بڑھ کر ہے (کیونکہ اس قتل سے دین حق کو تو کوئی مضرت نہیں پہنچی بہت سے بہت اگر کوئی جان کر کرے، خود ہی گنہگار ہوگا اور ان حرکتوں سے تو دین حق کو ضرر پہنچتا ہے کہ اس کی ترقی رکتی ہے) اور یہ کفار تمھارے ساتھ ہمیشہ جنگ و جدال کا سلسلہ جاری ہی رکھیں گے، اس غرض سے کہ اگر (خدا نہ کرے) قابو پا دیں تو تم کو تمھارے دین (اسلام) سے پھیر دیں (ان کے اس فعل سے دین کی مزاحمت ظاہر ہے)۔

انجمل ارتداد اور جو شخص تم میں سے اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں، (اور) یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

شہر حرام میں قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کو جواب مذکور منکر گناہ نہ ہونے کا تو اطمینان ہو گیا تھا، مگر اس خیال سے دل شکستہ تھے کہ ثواب تو ہوا ہی نہ ہوگا، آگے اس میں تسلی کی گئی۔

وعدۃ ثواب اخلاص نیت حقیقتہً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے ماہِ خدا میں جو دین کیا ہو اور جہاد کیا ہو، ایسے لوگ تو رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہو کرتے ہیں، (اور تم لوگوں میں یہ صفات علی سبیل منح الخلو موجود ہیں، چنانچہ ایمان اور ہجرت تو ظاہر ہے، رہا اس جہاد خاص میں شبہ ہو سکتا ہے، سو چونکہ تمھاری نیت تو جہاد ہی کی تھی، لہذا ہمارے نزدیک وہ بھی جہاد ہی میں شمار ہے، پھر ان صفات کے ہوتے ہوئے تم کیوں نا امید

ہوتے ہو) اور اللہ تعالیٰ (اس غلطی کو) معاف کر دیں گے اور ایمان و جہاد و ہجرت کی وجہ سے تم پر رحمت کریں گے۔

معارف و مسائل

بعض احکام جہاد مسئلہ:۔ مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں جہاد کے فرض ہونے کا حکم ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے کَتَبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالَ، یعنی تم پر جہاد فرض کیا گیا، ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر مسلمان پر ہر حالت میں فرض ہے، بعض آیات قرآنی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ منسرخین عین کے طور پر ہر مسلمان پر عائد نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے کہ مسلمان کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کرے تو باقی مسلمان سبکدوش بھی جائیں گے، ہاں کسی زمانہ یا کسی ملک میں کوئی جماعت بھی فریضہ جہاد ادا کرنے والی نہ ہے تو سب مسلمان ترک فرض کے گنہگار ہو جائیں گے، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلْجِهَادُ مَا مِیْنِ اِلٰی یَوْمِ اَلْاَقِیَامَةِ کا یہ مطلب ہو کہ قیامت تک ایسی جماعت کا موجود رہنا ضروری ہے جو فریضہ جہاد ادا کرتی ہے، قرآن مجید کی دوسری آیت میں ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیْجٰہِدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَعَلَّکُمْ تُکۡفٰی
وَاَنْتُمْ عَلٰی الْقَوٰعِ دٰیۡمَۃٌ
بھلائی کا وعدہ کیا ہے

کُفِّلَ اللّٰهُ الْمُجٰہِدِیْنَ بِاَمُوَالِہِمۡ
وَاَنْفُسِہِمۡ عَلٰی الْقَوٰعِ دٰیۡمَۃٌ
(۹۵:۴)

اس میں لیے لوگوں سے جو کسی عذر کے سبب یا کسی دوسری دینی خدمت میں مشغول ہو کر جہاد میں شریک نہ ہوں ان سے بھی بھلائی کا وعدہ مذکور ہے، ظاہر ہے کہ اگر جہاد ہر فرد مسلم پر فرض میں ہوتا تو اس کے چھوڑنے والوں سے وعدہ بخشی یعنی بھلائی کا وعدہ ہونے کی صورت تھی اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے:

اُوْکُیۡوۡنَ نٰکِلَ کَثِیۡرٍ مِّنۡ جُنُوْدِ اللّٰہِ
مِیۡنَہُمۡ
چھوٹی جماعت اس کام کیلئے کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ

لَقَدْ لَا تُغۡنِیۡ عَنْکُمۡ کُلُّ فِزۡوَۃٍ وَّیُنۡفِخُ
طَافِیۡۃٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیۡنِ
(۱۱۲:۱۹)

اس میں خود قرآن کریم نے یہ تقسیم عمل پیش فرمائی کہ کچھ مسلمان جہاد کا کام کریں اور کچھ تعلیم دین میں مشغول رہیں، اور یہ جیسی ہو سکتا ہے جبکہ جہاد فرض عین نہ ہو بلکہ فرض کفایہ ہو۔ نیز صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرکتِ جہاد کی اجازت چاہی تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمھارے ماں باپ زندہ ہیں

اس نے عرض کیا کہ اے زندہ ہیں، آپ نے فرمایا کہ پھر جادو، ماں باپ کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ جہاد فرض کفایہ ہے، جب مسلمانوں کی ایک جماعت فریضہ جہاد کو قائم کئے ہوئے ہو تو باقی مسلمان دوسری خدمتوں اور کاموں میں لگ سکتے ہیں، ہاں اگر کسی وقت امام المسلمین ضرورت سمجھ کر بغیر عام کا حکم دے اور سب مسلمانوں کو شرکت جہاد کی دعوت دے تو پھر جہاد سب پر فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن کریم نے سورۃ توبہ میں ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمَّا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَحَارُّوا فَأَجَابُوا أَنَّا مَعِيَ اللَّهُ
ثُمَّ اتَّخَذْتُمْ

”اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم ہرجل بن جاتے ہو؟“

اس آیت میں اسی بغیر عام کا حکم مذکور ہے، اسی طرح اگر خدا نخواستہ کسی وقت کفار کسی اسلامی ملک پر حملہ آور ہوں اور مدافعت کرنے والی جماعت ان کی مدافعت کی پوری طرح قادر اور کافی نہ ہو تو اس وقت بھی یہ فریضہ اس جماعت سے متعدی ہو کر پاس والے سب مسلمانوں پر مائدہ ہو جاتا ہے اور اگر وہ بھی عاجز ہوں تو ان کے پاس والے مسلمانوں پر یہاں تک کہ پوری دنیا کے ہر ہر فرد مسلم پر ایسے وقت جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن مجید کی مذکورہ بالا تمام آیات کے مطالعہ سے مجبور فقہاء و محدثین نے یہ حکم قرار دیا ہے کہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے۔

مسئلہ: اسی لئے جب تک جہاد فرض کفایہ ہوا و لا د کو بغیر ماں باپ کی اجازت کے جہاد میں جانا جائز نہیں۔

مسئلہ: جس شخص کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کے لئے جب تک قرض ادا نہ کر دے اس فرض کفایہ میں حصہ لینا درست نہیں، ہاں اگر کسی وقت بغیر عام کے سبب یا کفار کے نزعہ بے پشت جہاد سب پر فرض عین ہو جائے تو اس وقت نہ والدین کی اجازت شرط ہے نہ شوہر کی اور نہ شتر خواہ کی، اس آیت کے آخر میں جہاد کی ترغیب کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ جہاد اگرچہ طبعی طور پر تمہیں بھاری معلوم ہو، لیکن خوب یاد رکھو کہ انسانی بصیرت و دانشمندی اور تدبیر و محنت عواقب و نتائج کے بارے میں بکثرت فیمل ہوتی ہے، کسی مفید کو مضریا مضر کو مفید سمجھ لینا بڑے سے بڑے ہوشیار عقلمند سے بھی مستبعد نہیں، ہر انسان اگر اپنی عمر میں پیش آنے والے وقائع پر نظر ڈالے تو اپنی ہی زندگی میں اس کو بہت سے واقعات ایسے نظر آئیں گے کہ وہ کسی چیز کو نہایت مفید سمجھ کر حاصل کر رہے ہوتے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ انتہائی مضرتیں یا کسی چیز کو نہایت مضر سمجھ کر اس سے چستنا ب کر رہے ہوتے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ نہایت مفید تھی، انسانی عقل و تدبیر کی رسوائی اس معاملہ میں بکثرت مشاہدہ میں آتی رہتی ہے۔

خویش را دیدم در سوالی خویش

اس لئے فرمایا کہ جہاد و قتال میں اگرچہ بظاہر مال اور جان کا نقصان نظر آتا ہے، لیکن جب حقائق سامنے آئیں گے تو کھلے گا کہ یہ نقصان ہرگز نقصان نہ تھا بلکہ سرسرفیع اور دائمی راحت کسان تھا۔ آیات مذکورہ میں سے دوسری آیت اس پر شاہد ہے کہ اشہر حرم اشیاء یعنی چار مہینے رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم میں قتال حرام ہوا۔ اسی طرح قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں پوری تصریح کے ساتھ اشہر حرم میں قتال کی ممانعت آتی ہے، مثلاً مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرْمٌ لِّكَ الْيَمِينُ الْقَيْصَرُ اور حجۃ الوداع کے معروف و مشہور خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا منها اربعۃ حرم ثلاث متوالیات و رجب مضر۔

ان آیات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ چار مہینوں میں قتال حرام ہے، اور یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہے۔

اور امام تفسیر عطاء بن ابی رباح قسم کھا کر فرماتے تھے کہ یہ حکم ہمیشہ کے لئے باقی ہے، اور بھی متعدد حضرات تابعین اس حکم کو ثابت غیر منسوخ قرار دیتے ہیں، مگر چہرہ فقہاء کے نزدیک اور بقول جصاص عام فقہاء امصار کے مسلک پر یہ حکم منسوخ ہے، اب کسی مہینہ میں قتال ممنوع نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا ناسخ کوئی آیت ہے، اس میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں یعنی نے فرمایا کہ آیت کریمہ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً (۲۶۱:۹) اس کی ناسخ ہے، اور اکثر حضرات نے آیت قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى تَبْلُغُوا الْكُفْرَ (۵:۹) کو ناسخ قرار دیا ہے، اور لفظ حیث کو اس جنگ زمانے کے معنی میں لیا ہے، کہ مشرکین کو جس مہینہ اور جس زمانے میں پاؤ قتل کر دو اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس حکم کا ناسخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل ہے کہ خود آپ نے طائف کا محاصرہ اشہر حرم میں فرمایا، اور حضرت عامر اشعری کو اشہر حرم ہی میں ادھاس کے جہاد کے لئے بھیجا، اسی بناء پر عامہ فقہاء اس حکم کو منسوخ قرار دیتے ہیں، جصاص نے فرمایا دھوقول فقہاء الامصار۔ روح المعانی نے اسی آیت کے تحت میں اور بیضاوی نے سورۃ برأت کے پہلے رکوع کی تفسیر میں اشہر حرم میں حرمت قتال کے منسوخ ہونے پر اجماع اقت نقل کیا ہے، بیان القرآن، مگر تفسیر مظہری میں مذکورہ تمام دلائل کا جواب یہ دیا ہے کہ اشہر حرم کی حرمت کی تصریح خود اس آیت میں موجود ہے، جس کو آیت السیف کہا جاتا ہے، یعنی اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ حُرْمٌ لِّدِينِ اللّٰهِ اِنَّهَا اَشْهُرٌ مُّسْكِرَةٌ فِي كِتَابِ اللّٰهِ يَوْمَ تَخْلَقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرْمٌ (۲۶۱:۹) یہ آیت آیات قتال میں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے، اور خطبہ حجۃ الوداع جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف اتنی روز پہلے ہوا ہے اس میں بھی اشہر حرم کی حرمت کی تصریح موجود ہے، اس لئے آیات

مذکرہ کو اس کا نسخہ نہیں کہا جاسکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ طاقت زد القعدہ میں نہیں، سوال میں ہوا ہے اس لئے اس کو بھی نسخہ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کر دی گئی ہے کہ خود کفار ان ہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے، جس کی تصریح اس آیت میں ہے، **الْأَشْهُرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ** الآیہ - (۱۹۴:۲)

تو خلاصہ یہ ہوا کہ ابتداء قتال تو ان ہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان ہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعت قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتداء کفار کی طرف سے نہ ہو جاتے۔

انجام ارتداد آیت مذکورہ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ** کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ **يَحْتَبِلُ أَهْمًا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ** یعنی ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے۔

مسئلہ دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہو کہ اس کی بی بی نکاح سے بچل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، عالیت اسلام میں نماز، روزہ جو کچھ کیا تھا سب کا عدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی، مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابد الابد کے لئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

مسئلہ اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جائے تو آخرت میں دوزخ سے بچے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکام اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر حج کر چکا تو بشرط وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعی دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ لیکن جو کافر اصل ہوا اور اس حالت میں کوئی نیک کام کر لے اس کا ثواب ملتا رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مگر تو سب بیکار جاتا ہوا حدیث میں اسلمت علی ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ فحش مرتد کی حالت کا فزاصل سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصل سے جو قبول ہو سکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام نہ لادے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہے تو دوام حبس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی اہانت ہوتی ہے، سرکاری اہانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا آثَمُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ

تجھ سے پوچھتے ہیں علم شراب کا اور جوئے کا کہہ دے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدہ

لِلنَّاسِ وَآثَمُهَا أَكْبَرُ مَن نَّفَعِيهِمَا

بہی لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

خلاصہ تفسیر

پندرہواں حکم لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیں گے کہ ان دونوں چیزوں کے استعمال میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور لوگوں کو (بھٹے) فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں اس لئے دونوں قابل ترک ہیں۔

معارف و مسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور جوئے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہوا یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے۔

حرمت شراب اور اس کے متعلقہ امور

ابتداء اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ

مذکرہ کو اس کا نسخہ نہیں کہا جاسکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ طاقت زد القعدہ میں نہیں، سوال میں ہوا ہے اس لئے اس کو بھی نسخہ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کر دی گئی ہے کہ خود کفار ان ہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے، جس کی تصریح اس آیت میں ہے، **الْأَشْهُرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ** الآیہ - (۱۹۴:۲)

تو خلاصہ یہ ہوا کہ ابتداء قتال تو ان ہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان ہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعت قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتداء کفار کی طرف سے نہ ہو جاتے۔

انجام ارتداد آیت مذکورہ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ** کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ **يَحْتَبِلُ أَهْمًا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ** یعنی ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے۔

مسئلہ دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہو کہ اس کی بی بی نکاح سے بچل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، عالیت اسلام میں نماز، روزہ جو کچھ کیا تھا سب کا عدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی، مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابد الابد کے لئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

مسئلہ اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جائے تو آخرت میں دوزخ سے بچے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکام اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر حج کر چکا تو بشرط وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعی دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ لیکن جو کافر اصل ہوا اور اس حالت میں کوئی نیک کام کر لے اس کا ثواب ملتا رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مگر تو سب بیکار جاتا ہوا حدیث میں اسلمت علی ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ غرض مرد کی حالت کافر اصل سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصل سے جو قبول ہو سکتا ہے، اور مرد اگر اسلام نہ لادے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہو تو دوام جس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی اہانت ہوتی ہے، سرکاری اہانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا آثَمُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ

تجھ سے پوچھتے ہیں علم شراب کا اور جوئے کا کہہ دے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدہ

لِلنَّاسِ وَآثَمُھُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِھُمَا

بہی لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

خلاصہ تفسیر

پندرہواں حکم لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیں کہ ان دونوں چیزوں کے استعمال میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور لوگوں کو (بھٹے) فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں اس لئے دونوں قابل ترک ہیں۔

معارف و مسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور جوئے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہوا یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے۔

حرمت شراب اور اس کے متعلقہ امور

ابتداء اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ

وَيَسُدُّ كُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ
فَقُلْ أَنتُمْ مُنْتَهُونَ (۹۱:۵)

اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے،
سو کیا اب بھی باز آؤ گے۔

حُرمت شراب کے تدریجی احکام

احکام الہیہ کی اصلی اور حقیقی حکمتوں کو تو احکام الحاکمین ہی جانتا ہے، پھر احکام شرعیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلام نے احکام میں انسانی جذبات کی بڑی رعایت فرمائی ہے، تاکہ انسان کو ان کے اتباع میں زیادہ تکلیف نہ ہو، خود سترآن کریم نے فرمایا: لَا تَجْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا لَكَ وَتُسَقِّهَا (۲۸۶:۲) یعنی اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ایسا حکم نہیں دیتا جو اس کی قدرت اور وسعت میں نہ ہو۔ اسی رحمت و حکمت کا تقاضا تھا کہ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں بڑی تدریج سے کام لیا۔ شراب کی تدریجی مانعت اور حرمت کی قرآنی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں شراب کے متعلق چار آیتیں نازل ہوئی ہیں، جن کا ذکر ادھر آچکا ہے، ان میں سے ایک آیت سورۃ بقرہ کی ہے جس کی تفسیر آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، اس میں تو شراب کا پیدا ہو جانے والے گناہوں اور مفاسد کا ذکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، حرام نہیں کیا، گویا ایک مشورہ دیا کہ یہ پھوڑنے کی چیز ہے، مگر چھوڑنے کا حکم نہیں دیا۔

دوسری آیت سورۃ نساء کی لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ میں خاص اوقات نماز کے اندر شراب کو حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی۔

تیسری اور چوتھی دو آیتیں سورۃ مائدہ کی ہیں، جو ادھر مذکور ہو چکی ہیں، ان میں صاف اور قطعی طور پر شراب کو حرام قرار دیا۔

شریعت اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں اس تدریج سے اس لئے کام لیا کہ عمر بھر کی عادت خصوصاً نشہ کی عادت کو چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر انتہائی شاق اور گراں ہوتا، علماء نے فرمایا: فِطْرَتُ الْإِنْسَانِ عَلَىٰ طَبْعِهِ مَيْسَرَةٌ (یعنی جیسے بچے کو ماں کا دودھ پینے کی عادت چھوڑ دینا بھاری معلوم ہوتا ہے انسان کو اپنی کسی عادت مستحضر کو بدلنا اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے) اس لئے اسلام نے حکیمانہ اصول کے مطابق اول اس کی بُرائی ذہن نشین کرائی، پھر نمازوں کے اوقات میں منوع کیا، پھر ایک خاص مدت کے بعد قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔ ان جس طرح ابتدائے تحریم شراب میں آہستگی اور تدریج سے کام لینا حکمت کا تقاضا تھا اسی طرح حرام کر دینے کے بعد اس کی مانعت کے قانون کو پوری شدت کے ساتھ نافذ کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں اول سخت وعید و عذاب کی بتلائیں، ارشاد فرمایا کہ یہ اتم الخبائث اور اتم الفواحش ہے، اس کو پی کر آدمی جسے سے گھرے

گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ شراب اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے، یہ دو ایسی نساتی ہیں، اور جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی، پھوڑنے والا، بنانے والا، پینے والا، پلانے والا، اس کو لاد کر لانے والا، اور جس کے لئے لائی جائے، اور اس کا بیچنے والا، خریدنے والا، اس کو ہبہ کرنے والا، اس کی آمدنی کھالے والا، اور پھر صرف زبانی تعلیم و تبلیغ پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ عملی اور قانونی طور پر اعلان فرمایا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب موجود ہو اس کو فلاں جگہ جمع کر دے۔ حتیٰ کہ یہ تعلیم حکم کا پیشال جنداً فرما کر اس کو کراٹھنے پہلا حکم پاتے ہی اپنے اپنے گھر نہیں جو شراب استعمال کیلئے رکھی تھی اُس کو تو اسی وقت پہا دیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مدینہ کی گلیوں میں یہ آواز دی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے تو جس کے ہاتھ میں جو برتن شراب کا تھا اس کو وہیں پھینک دیا، جس کے پاس کوئی سبویا خم شراب کا تھا اس کو گھر سے باہر لاکر توڑ دیا، حضرت انسؓ اُس وقت ایک مجلس میں دُرِ جام کے ساتی بنے ہوئے تھے، ابو طلحہ، ابوعبیدہ، بن جراح، ابی بن کعب، ہبیل، رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہ موجود تھے، منادی کی آواز کان میں پڑتی ہی سب نے کہا کہ اب یہ شراب سب گرا دو، اس کے جام و سبوتوڑ دو، بعض روایات میں ہے کہ اعلان حرمت کے وقت جس کے ہاتھ میں جام شراب ہوں تک پہنچا ہوا تھا اُس نے وہیں سے اس کو پھینک دیا، مدینہ میں اُس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کی زد کا پانی، اور مدینہ کی گلیوں میں عرصہ طویل تک یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بُو اور رنگ مٹی میں بکھر آتا تھا۔

جس وقت اُن کو یہ حکم ملا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب ہو وہ فلاں جگہ جمع کر دے، اس وقت صرف وہ ذخیرے کچھ رہ گئے تھے جو مال تجارت کی حیثیت سے بازار میں تھے، اُن کو فرما کر سردار صحابہ کرامؓ نے بلا تا مل معسرہ جگہ پر جمع فرمادیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے، اور اپنے ہاتھ سے شراب کے مہرت سے مشکیزوں کو چاک کر دیا اور باقی دوسرے صحابہ کرامؓ کے حوالے کر کے چاک کر دیا، ایک صحابی جو شراب کی تجارت کرتے تھے اور ملکب مشم سے شراب درآمد کیا کرتے تھے اتفاقاً اس زمانے میں ابھی ساری رقم جمع کر کے ملکب مشم سے شراب لینے کے لئے گئے ہوئے تھے، اور جب یہ تجارتی مال لے کر واپس ہوئے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کو اعلان حرمت کی خبر مل گئی، جاں نثار صحابیؓ نے اپنے پورے سرمائے اور محنت کی حاصلات کو جس سے بڑے نفع کی امیدیں لئے ہوئے آ رہے تھے اعلان حرمت

سن کر اسی جگہ ایک پہاڑی پر ڈال دیا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اور سوال کیا کہ اب میرے اس مال کے متعلق کیا حکم ہے، اور مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانِ خداوندی کے مطابق حکم دیدیا کہ سب مشکیزوں کو چاک کر کے شراب بہا دو، فرمانبردار محبتِ خدا و رسولؐ نے بلا کسی جھجک کے اپنے ہاتھ سے اپنا پورا سرمایہ زمین پر بہا دیا، یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ اور صحابہ کرامؓ کی حیرت انگیز دے مثال اطاعت ہے جو اس واقعہ میں ظاہر ہوئی، کہ جس چیز کی عادت ہو جائے سب جانتے ہیں کہ چھوڑنا سخت دشوار ہے اور یہ حضرات بھی اس کے ایسے عادی تھے کہ تھوڑی دیر اس سے صبر کرنا دشوار تھا، ایک حکم الہی اور فرمانِ نبویؐ نے ان کی عادات میں ایسا عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا کہ اب یہ شراب اور مچھوے سے ایسے ہی متنفر ہیں، جیسے اس سے پہلے ان کے عادی تھے۔

اسلامی سیاست اور عام ملکی سیاستوں کا فرق عظیم

مذکورہ آیات پھر واقعات میں حرمتِ شراب کے حکم پر مسلمانوں کے عمل کا ایک نمونہ سامنے آ گیا ہے، جس کو اسلام کا معجزہ کہو یا پیغمبرانہ تربیت کا بے مثال اثر یا اسلامی سیاست کا لازمی نتیجہ کہ نشر کی عادت جس کے چھوڑنے کا انتہائی دشوار ہونا ہر شخص کو معلوم ہے، اور عرب میں اس کا رواج اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ چند گھنٹے اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے، وہ کیا چیز تھی جس نے ایک ہی اعلان کی آواز کان میں پڑتے ہی ان سب کے مزاجوں کو بدل ڈالا، ان کی عادتوں میں وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ اب چند منٹ پہلے جو چیز انتہائی مرغوب بلکہ زندگی کا سرمایہ تھی وہ چند منٹ کے بعد انتہائی مبغوض اور فحش و ناپاک ہو گئی۔

اس کے بالمقابل آج کی ترقی یافتہ سیاست کی ایک مثال کو سامنے رکھ لیجئے کہ اب چند سال پہلے امریکہ کے ماہرینِ صحت اور سماجی مصلحین نے جب شراب نوشی کی بے شمار اور انتہائی مہلک خرابیوں کو محسوس کر کے ملک میں شراب نوشی کو قانوناً ممنوع کرنا چاہا تو اس کے لئے اپنے نشر و اشاعت کے وہ نئے سے نئے ذرائع جو اس ترقی یافتہ سیاست کا بڑا کمال سمجھے جاتے ہیں سب ہی شراب نوشی کے خلاف ذہن ہموار کرنے پر لگا دیئے، سینکڑوں اخبارات اور رسائل اس کی خرابیوں پر مشتمل ملک میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے گئے، پھر امریکی دستوں میں ترمیم کر کے امتناعِ شراب کا قانون نافذ کیا گیا، مگر ان سب کا اثر جو کچھ امریکیوں نے دیکھا، اور وہاں کے اربابِ سیاست کی رپورٹوں سے دنیا کے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اس ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم نے اس ممانعتِ قانونی کے زمانے میں عام زمانوں کی نسبت بہت زیادہ شراب استعمال کی، یہاں تک کہ مجبور ہو کر حکومت کو اپنا قانون منسوخ کرنا پڑا۔

عرب مسلمانوں اور موجودہ ترقی یافتہ امریکنوں کے حالات و معاملات کا یہ عظیم منسحق تو ایک حقیقت اور واقعہ ہے جس کا کسی کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں، یہاں غور کرنے کی بات یہ ہو کہ اس عظیم الشان فرق کا اصلی سبب اور راز کیا ہے۔

ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ شریعتِ اسلام نے صرف قانون کو قوم کی اصلاح کے لئے کبھی کافی نہیں سمجھا، بلکہ قانون سے پہلے ان کی ذہنی تربیت کی اور عبادت و زہادت اور فکرِ آخرت کے کیمیائی نسخے سے ان کے مزاجوں میں ایک بڑا انقلاب لا کر ایسے افراد پیدا کر دیئے جو رسولؐ کی آواز پر اپنی جان و مال آبر و سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں مکی زندگی کے پورے دور میں یہی انفراد سازی کا کام ریاضتوں کے ذریعے ہوتا رہا، جب جانِ نثاروں کی جماعت تیار ہو گئی اس وقت قانون جاری کیا گیا، ذہنوں کو ہموار کرنے کے لئے تو امریکہ نے بھی اپنے بے مثال ذرائع استعمال کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان کے سامنے سب کچھ تھا مگر فکرِ آخرت نہیں تھی، اور مسلمانوں کے رگِ پسے میں فکرِ آخرت سمائی ہوئی تھی۔ کاش! آج بھی ہمارے عقلاء اس نسخہ کیمیاء کو استعمال کر کے دیکھیں تو دنیا کو امن و سکون نصیب ہو جائے۔

شراب کے مفاسد اور فوائد میں موازنہ

اس آیت میں شراب اور قمار دونوں کے متعلق قرآن کریم نے یہ بتلایا ہے کہ ان دونوں میں کچھ مفاسد بھی ہیں اور کچھ فوائد بھی، مگر اس کے مفاسد فوائد سے بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر نظر ڈالی جائے کہ ان کے فوائد کیا ہیں اور مفاسد کیا، اور پھر یہ کہ فوائد سے زیادہ مفاسد ہونے کے کیا وجوہ ہیں، آخر میں چند فقہی ضابطے بیان کئے جائیں گے، جو اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں پہلے شراب کو لئے لیجئے، اس کے فوائد تو عام لوگوں میں مشہور و معروف ہیں کہ اس سے لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے، اور وقتی طور پر قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے، رنگ صاف ہو جاتا ہے، مگر ان حقیر وقتی فوائد کے مقابلے میں اس کے مفاسد اتنے کثیر و وسیع اور گہرے ہیں کہ شاید کسی دوسری چیز میں اتنے مفاسد اور مضرات نہ ہوں گے، بدنِ انسانی پر شراب کے مضرات یہ ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ معدے کے فعل کو فاسد کر دیتی ہے، کھانے کی خواہش کم کر دیتی ہے، چہرے کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے، پیٹ بڑھ جاتا ہے، مجموعی حیثیت سے تمام قوی پر یہ اثر ہوتا ہے جو ایک جرمن ڈاکٹر نے بیان کیا ہے کہ جو شخص شراب کا عادی ہو چالیس سال کی عمر میں اس کے بدن کی ساخت ایسی ہو جاتی ہے، جیسے ساٹھ سالہ بوڑھوں کی وہ جسمانی اور قوت کے اعتبار سے ٹھیک سے ہوئے بوڑھوں کی طرح ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ

شراب بگرا اور گردوں کو خراب کر دیتی ہے، بیل کی پیاری شراب کا خاص اثر ہے، یورپ کے شہروں میں بیل کی کثرت کا بڑا سبب شراب ہی کو بتلایا جاتا ہے، وہاں کے بعض ڈاکٹروں کا قول ہے کہ یورپ میں آدمی اموات مرض بیل میں ہوتی ہیں اور آدمی دوسرے امراض میں، اور اس بیماری کی کثرت یورپ میں اسی وقت سے ہوئی جبکہ وہاں شراب کی کثرت ہوئی۔

یہ تو شراب کی جسمانی اور بدنی مضرتیں ہیں، اب عقل پر اس کی مضرت کو تو ہر شخص جانتا ہے، مگر صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ شراب پی کر جب تک نشہ رہتا ہے اُس وقت تک عقل کام نہیں کرتی، لیکن اہل تجربہ اور ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ نشہ کی عادت خود وقت مافکہ کو بھی ضعیف کر دیتی ہے، جس کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی رہتا ہے، بعض اوقات جنون تک اس کی نوبت پہنچ جاتی ہے، المپا اور ڈاکٹروں کا اتفاق ہے کہ شراب نہ جزو بدن بنتی ہے اور نہ اس کا خون بنتا ہے، جس کی وجہ سے بدن میں طاقت کم بلکہ اس کا فعل صرف یہ ہوتا ہے کہ خون میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے جس سے وقتی طور پر قوت کی زیادتی محسوس ہونے لگتی ہے، اور یہی خون کا دفعہ ہیجان بعض اوقات اپنا تک موت کا سبب بھی بن جاتا ہے، جس کو ڈاکٹر ہارٹ نیل ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

شراب کے شرارتیں یعنی وہ رگیں جن کے ذریعے سارے بدن میں روح پہنچتی ہے سخت ہو جاتی ہیں جس سے بڑھا پا جلدی آ جاتا ہے، شراب کا اثر انسان کے حلقوم اور تنفس پر بھی خراب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آواز بھاری ہو جاتی ہے، اور کھانسی دائمی ہو جاتی ہے، اور وہی آخر کار رسل تک نوبت پہنچا دیتی ہے، شراب کا اثر نسل پر بھی برا پڑتا ہے، شرابی کی اولاد کمزور رہتی ہے، اور بعض اوقات اس کا نتیجہ قطع نسل تک پہنچتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شراب پینے کی ابتدائی حالت میں بظاہر انسان اپنے جسم میں چستی و چالاکی اور قوت محسوس کرتا ہے، اسی لئے بعض لوگ جو اس میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں حقائق کا انکار کرتے ہیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ شراب کا یہ زہر ایسا زہر ہے جس کا اثر دیرینہ طور پر ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ سب مضرتیں مشاہدہ میں آ جاتی ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

شراب کا ایک بڑا مفسدہ تمدنی ہے کہ وہ اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتی ہے، اور پھر یہ بغض و عداوت و در تک انسان کو نقصان پہنچاتی ہیں، شریعت اسلام کی نظر میں یہ مفسدہ سب سے بڑا ہے، اس لئے قرآن نے سورۃ مائدہ میں خصوصیت کے ساتھ اس مفسدہ کا ذکر فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَجْمَعًا وَيُطَهِّرَ الْبَاطِلَ فِي الْخَمْرِ وَالنَّكَاحِ** (۹۱: ۵)

”یعنی شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جڑے کے ذریعے تمہارے آپس میں بغض و عداوت پیدا کر دے“ شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مدہوشی کے عالم میں بعض اوقات آدمی اپنا پوشیدہ راز بیان کر ڈالتا ہے جس کی مضرت اکثر بڑی تباہ کن ہوتی ہے، خصوصاً وہ اگر کسی حکومت کا ذمہ دار آدمی ہے اور راز بھی حکومت کا راز ہے، جس کے اظہار سے پورے ملک میں انقلاب آ سکتا ہو اور ملکی سیاست اور جنگی مصالح سب برباد ہو جاتے ہیں، ہوشیار جاسوس ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں۔

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو ایک کھلونا بنا دیتی ہے، جس کو دیکھ کر بچے بھی ہنستے ہیں، کیونکہ اس کا کلام اور اس کی حرکات سب غیر متوازن ہو جاتی ہیں، شراب کا ایک عظیم تر مفسدہ یہ ہے کہ وہ ام الخبائث ہے، انسان کو تمام بُرے سے بُرے جرائم پر آمادہ کر دیتی ہے، زنا اور قتل اکثر اس کے نتائج ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ عام شراب خانے زنا اور قتل کے اڈے ہوتے ہیں، یہ شراب کی جسمانی مضرتیں ہیں، اور اس کی روحانی مضرت تو ظاہر ہی ہے، کہ نشہ کی حالت میں نہ نماز ہو سکتی ہے نہ اللہ کا ذکر نہ اور کوئی عبادت، اسی لئے قرآن کریم میں شراب کی مضرت کے بیان میں فرمایا: **وَيُضِلُّكُمْ كَثِيرًا ذِكْرَ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ** (۹۱: ۵) یعنی شراب تم کو ذکر اللہ اور نماز سے روکتی ہے۔

اب مالی مضرت اور نقصان کا حال سنئے جس کو ہر شخص جانتا ہے، کسی بستی میں اگر ایک شراب خانہ کھل جاتا ہے تو وہ پوری بستی کی دولت کو سمیٹ لیتا ہے، اس کی قیاس بے شمار ہیں، اور بعض اقسام تو بے حد گراں ہیں، بعض اعداد و شمار لکھنے والوں نے صرف ایک شہر میں شراب کا مجموعی خرچ پوری مملکت فرانس کے مجموعی خرچ کے برابر بتلایا ہے۔

یہ شراب کے دینی، دنیوی جسمانی اور روحانی مفسدہ کی مختصر فہرست ہے جس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ام الخبائث ”یا اثم الفواحش“ ہے، جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا یہ قول ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ اس نے کہا کہ اگر آرمے شراب خانے بند کر دیے جاتیں تو میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ آرمے شفاخانے اور آدھی جیل خانے بے ضرورت ہو کر بند ہو جائیں گے۔ (تفسیر المنار لفتح عبیدہ، ص ۲۲۶ ج ۲)

علامہ طنطاوی نے اپنی کتاب التجوہر میں اس سلسلے کی چند اہم معلومات لکھی ہیں، ان میں سے بعض یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ایک فرانسیسی محقق ہنری اپنی کتاب ”تحوط و سوانح فی الاسلام“ میں لکھتے ہیں: ”بہت زیادہ ہلک ہتھیار جس سے اہل مشرق کی بیخ کنی کی گئی اور وہ دھماکا

تو ارجح سے مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ یہ شراب تھی۔ ہم نے الجوز اثر کے لوگوں کے خلاف یہ ہتھیار آزمایا، لیکن ان کی اسلامی شریعت ہمارے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی، اور وہ ہمارے اس ہتھیار سے متاثر نہیں ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی نسل بڑھتی ہی چلی گئی، یہ لوگ اگر ہمارے اس تحفہ کو قبول کر لیتے جس طرح کہ ان کے ایک منافق قبیلے نے اس کو قبول کر لیا ہے تو یہ بھی ہمارے سامنے ذلیل و خوار ہو جاتے، آج جن لوگوں کے گھروں میں ہماری شراب کے دودھ چل رہے ہیں وہ ہمارے سامنے اتنے حقیر و ذلیل ہو گئے ہیں کہ سر نہیں اٹھا سکتے۔ ایک انگریز قانون دان بتا رہا ہے کہ:

”اسلامی شریعت کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شراب حرام ہے، ہم نے دیکھا کہ جب افریقہ کے لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو ان کی نسلوں میں پاگل پن سراپت کرنے لگا، اور یورپ کے جن لوگوں کو اس کا چسکہ لگ گیا ان کی بھی عقلوں میں تغیر آنے لگا، لہذا افریقہ کے لوگوں کے لئے بھی اس کی ممانعت ہونی چاہئے، اور یورپین لوگوں کو بھی اس پر شدید سزائیں دینی چاہئیں۔“

غرض جس بھلے مانس نے بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ یہ جس ہے، شیطانی عمل ہے، زہر ہے، تباہی اور بربادی کا ذریعہ ہے، اس آئم الخبائث سے باز آ جاؤ،

ذَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ - (۱۱:۵)

شراب کی حرمت و ممانعت کے متعلق قرآن کریم کی چار آیتوں کا بیان اور پر آچکا ہے سورہ نحل میں ایک جگہ اور بھی نشہ کی چیزوں کا ذکر ایک دوسرے انداز سے آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی یہاں ذکر کر دیا جائے، تاکہ شراب و نشہ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات مجموعی طور پر سامنے آجائیں، وہ آیت یہ ہے:

وَمِنْ شَرَابِ النَّخْلِ وَالْأَعْنَابِ تَخْذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَإِثْرًا حَسَنًا، لَنْ يَفْزَ لَكُمْ لَذِيَّةٌ لَّيَقْتُمُ يَتَفَلَّكُونَ (۱۶:۱۷)

اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل جو عقل رکھتے ہیں۔

تشریح و تفسیر پھل آیتوں میں حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا ذکر تھا جو انسانی غذائیں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں

پہلے دودھ کا ذکر کیا، جس کو قدرت نے حیوان کے پیٹ میں خون اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف ستھری غذا انسان کے لئے عطا کر دی، جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ نسقیم استعمال فرمایا، کہ ہم نے دودھ پلایا، اس کے بعد سنرا یا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے اپنی غذا اور منفعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا کچھ دخل ہے، اور اسی دخل کے نتیجہ میں دو طرح کی چیزیں بنائی گئیں، ایک نشہ آور چیز جس کو غریب شراب کہا جاتا ہے، دوسری رزق خن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تر و تازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیئے، اور ان سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دیدیا، اب یہ اس کا انتخاب کہ اس سے کیا بنائے، نشہ آور چیز بنا کر عتلا کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمت خداوندی ہے، جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ ان کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت نعت ہونے سے نہیں بچل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کونسا استعمال حلال ہے کونسا حرام ہے، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا کہ ”سکر“ کے مقابل ”رزق خن“ رکھا، جس سے معلوم ہوا کہ سکر اچھا رزق نہیں، سکر کے معنی جہور و فستقین کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں، روح المعانی، قرطبی (جصاص)

یہ آیات اتفاق امت مکی ہیں، اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نزل آیات کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی اور مسلمان مام طور پر پیتے تھے، مگر اُس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پیا اچھا نہیں، بعد میں صراحت شراب کو شدت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہو گئے (ہذا ملخص مانی الجصاص والقرطبی)

۱۷ بعد مامانے اس کے معنی سکر یا بے نشہ نبیذ کے ہیں (جصاص، قرطبی)، مگر اس جگہ اس خلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲ منہ

حرمت قمار (جوا)

میسر مصدر ہے، اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، یا سر تقسیم کر نیوالے کو کہا جاتا ہے، جاہلیت عرب میں مختلف قسم کے جوتے رائج تھے جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جو اکھیلا جاتا تھا، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے بعض محروم رہتے تھے، محروم رہنے والے کو پوتے اونٹ کی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی، گوشت سب فقرائیں تقسیم کیا جاتا خود استعمال نہ کرتے تھے۔

اس خاص جوتے میں چونکہ فقراء کا فائدہ اور جو اکھیلنے والوں کی فداوت بھی تھی، اسی لئے اس کھیل کو باعث فخر سمجھتے تھے، جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو بخوس اور مخوس کہتے تھے۔

تقسیم کی مناسبت سے قمار کو میسر کہا جاتا ہے، تمام صحابہؓ و تابعینؓ اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جوتے کی تمام صورتیں داخل اور سب حرام ہیں، ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے احکام المسترآن میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن عمرؓ اور قتادہؓ اور معاذ بن صالحؓ اور عطاءؓ اور طاؤسؓ نے فرمایا:

المیسر القمار حتی لعب الصبیان بالکعب والجنون، یعنی ہر قسم کا قمار میسر ہے، یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے ٹکڑوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ۔

اور ابن عباسؓ نے فرمایا اَلْمَخَاطَرُ مِنَ الْقِمَارِ یعنی مخاطرہ قمار میں سے ہے۔ (جصاص) ابن سیرین نے فرمایا جس کام میں مخاطرہ ہو وہ میسر میں داخل ہے۔ (روح البیان)

مخاطرہ کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کیا جائے جو نفع و ضرر کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے، جیسے آجکل کی لائٹری کے مختلف طریقوں میں پایا جاتا ہے، یہ سب قسمیں قمار اور میسر میں داخل اور حرام ہیں، اس لئے میسر یا قمار کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں، اور اسی بناء پر نفع خالص یا تادان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں بھی برابر ہوں دشامی، ص ۲۵۵ جلد ۲ کتاب الخطر والاباحۃ، مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید پر تادان پڑ جائے، اور یہ بھی ہے کہ عمر پر پڑ جائے، اس کی جتنی قسمیں اور صورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں یا آئندہ پیدا ہوں وہ سب میسر اور قمار اور جو اکھلائے گا، معنی حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار اور تجارتی لائٹری کی تمام صورتیں سب اس میں داخل ہیں، ہاں اگر صرف ایک جانب العام مقرر کیا جائے

کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو بہ انعام ملے گا، اس میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے، کیونکہ اس میں معاملہ نفع و ضرر کے درمیان دائر نہیں، بلکہ نفع اور عدم نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لئے اعادیث صحیحہ میں شرط نج اور جو سر وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے، جن میں مال کی ہرجیت پائی جاتی ہے، تاش پر اگر روپیہ کی ہرجیت ہو تو وہ بھی میسر میں داخل ہے۔
صحیح مسلم میں بروایت بریدہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نزد شیر (جو سر) کھیلتا ہے وہ گویا خنزیر کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شرط نج میسر یعنی جوتے میں داخل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا شرط نج تو نزد شیر سے بھی زیادہ بڑی ہے (تفسیر ابن کثیر)

ابتداء اسلام میں شراب کی طرح قمار بھی حلال تھا، مگر جب سورۃ روم کی آیات غُلِبَتِ الرُّومُ نازل ہوئی، اور مقرر آنے خبر دی کہ اس وقت روم اگرچہ اپنے حریف کسری سے مغلوب ہو گئے، لیکن چند سال بعد پھر رومی غالب آجائیں گے اور مشرکین مکہ نے اس کا انکار کیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان سے اسی طرح قمار کی شرط بٹھرائی، کہ اگر اتنے سال میں رومی غلب آئے تو اتنا مال تمہیں دینا پڑے گا، یہ شرط مان لی گئی، اور واقعہ قرآن کی خبر کے مطابق پیش آیا، تو ابوبکرؓ نے یہ مال وصول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، آپؐ نے اس واقعہ پر اظہار مسرت فرمایا مگر مال کو صدقہ کرنے کا حکم دیدیا۔

کیونکہ جو چیز آئندہ حرام ہونے والی تھی اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حلال ہونے کے زمانے میں بھی اس سے محفوظ فرما دیا تھا، اسی لئے شراب اور تمباکو سے ہمیشہ آپؐ نے جہتنباب کیا، اور خاص خاص صحابہ کرامؓ بھی ان چیزوں سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جبریل امینؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جعفر طیار کی چار خصلتیں زیادہ محبوب ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا کہ آپ میں وہ چار خصلتیں کیا ہیں، عرض کیا کہ میں نے اس کا اظہار اب تک کسی سے نہیں کیا تھا، مگر جب کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دیدی تو عرض کرتا ہوں کہ وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ میں نے دیکھا کہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے اس لئے میں کہیں اس کے پاس نہیں گیا، اور میں نے بتوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کسی کا نفع و ضرر نہیں، اس لئے جاہلیت میں بھی کہیں بت پرستی نہیں کی، اور مجھے چونکہ اپنی بیوی اور لڑکیوں کے معاملہ میں سخت غیرت ہے اس لئے میں نے کہیں زنا نہیں کیا، اور میں نے دیکھا کہ جھوٹ بولنا دنیایت اور رذالت کی بات، ہر

اس لئے کبھی جہالت میں بھی جھوٹ نہیں بولا (روح السببان)

قادر کے سامنے اور اجتماعی نقصاناً (تاریخ جوئے کے متعلق بھی قرآن کریم نے وہی ارشاد فرمایا جو شراب کے متعلق آیا ہے، کہ اس میں کچھ منافع بھی ہیں مگر نفع سے اس کا نقصان و ضرر بڑھا ہوا ہے، اس کے منافع کو تو ہر شخص جانتا ہے، کہ جیت جاتے تو بیٹھے بیٹھے ایک فقیر بد حال آدمی ایک ہی دن میں مالدار و سرمایہ دار بن سکتا ہے، مگر اس کی معاشی، اجتماعی، سماجی اور روحانی خرابیاں اور مفاسد بہت کم لوگ جانتے ہیں، اس کا اجالی بیان یہ ہے کہ جوئے کا کھیل سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے ضرر پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع ہارنے والے کے نقصان ہی نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کا رد بارے کوئی دولت بڑھتی نہیں وہ اسی طرح منجمد حالت میں رہتی ہے اس کھیل کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور انسانی اخلاق کی موت ہے، کہ جس انسان کو نفع رسائی خلق اور ایثار و ہمدردی کا پیکر ہونا چاہئے، وہ ایک خوشخوار و درندہ کی خاصیت اختیار کر لے کہ دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں اپنی راحت اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے، اور اپنی پوری قابلیت اس خود غرضی پر صرف کرے، بخلاف تجارت اور بیع و شراء کی جائز صورتوں کے، ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے، اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بھگتی ہے، اور خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

ایک بھاری نقصان جوئے میں یہ ہے کہ اس کا عادی اصل کمائی اور کسب کا مادہ محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی خواہش یہی رہتی ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک شرط لگا کر دوسرے کا مال چند منٹ میں حاصل کرے، جس میں نہ کوئی محنت ہے نہ مشقت، بعض حضرات نے جوئے کا نام میسر رکھنے کی یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دوسرے کا مال اپنا بن جاتا ہے، جوئے کا معاملہ اگر درچار آدمیوں کے درمیان دائر ہو تو اس میں بھی مذکورہ مضرتیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں، لیکن اس نئے دور میں جس کو بعض سطحی نظروالے انسان عاقبت نا اندیشی سے ترقی کا دور کہتے ہیں، جیسے شراب کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے نام رکھ لئے گئے، سود کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے اجتماعی طریقے بنگلہ کے نام سے ایجاد کر لئے گئے ہیں، اسی طرح قمار اور جوئے کی بھی ہزاروں قسمیں چل گئیں جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تنقوڑا تنقوڑا روبرو ہر جمع ہوتا ہے، اور جو نقصان ہوتا ہو وہ ان سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا، اور جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں، لیکن قوم کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے، اس لئے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے، حالانکہ

اس میں وہ سب مضرتیں موجود ہیں جو درچار آدمیوں کے جوئے میں پائی جاتی ہیں، اور ایک حیثیت سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے خراب اثرات دور رس اور پوری قوم کی برابری کا سامان ہیں، کیونکہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے مام افراد کی دولت گھٹتی جائیگی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرکوز ہو جائے گی، جس کا مشاہدہ سٹڈ بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے، اور اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے حوالے ہو سکے، قرآن کریم نے اس کا اعلان خود تقسیم دولت کا اصول بیان کرتے ہوئے اس طرح فرمادیا ہے: اِنِّیْ لَا یُکُوْنُ ذُوْلَةُ الْبَیِّنِ الْاَغْنِیَا وَیُنْکَدُ (۵۹: ۱)، یعنی مال نے کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ دولت سمٹ کر صرف سرمایہ داروں میں جمع نہ ہو جائے۔

قمار یعنی جوئے کی خرابی یہ بھی ہے کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس میں لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کا سبب ہوتا ہے، ہارنے والے کو طبعی طور پر جیت جانے والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور یہ تمدن و معاشرت کے لئے سخت ہملک چیز ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے خاص طور پر اس مفسدہ کو ذکر فرمایا ہے:

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یَّوْذِعَ
بَیْنَکُمْ الْعَدَاوَةَ وَالبَغْضَا وَفِی
الْعَنْرِ وَالتَّمَنِّیِّ وَیَصُدُّکُمْ
عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَتَعَنِ الصَّلٰوةِ (۵: ۱۱۱)

شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے
کے ذریعے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض
و نفرت پیدا کر دے اور تم کو اللہ کے ذکر اور نماز
سے روک دے ۱۱

اسی طرح قمار کا ایک لازمی اثر یہ ہے کہ شراب کی طرح آدمی اس میں مست ہو کر ذکر اللہ اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے شراب اور قمار کو ایک ہی جگہ ایک انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ معنوی طور پر قمار کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو آدمی کو اس کے بھلے بُرے کی فکر سے غافل کر دیتا ہے، مذکورہ آیت میں بھی ان دونوں چیزوں کو جمع کر کے دونوں کے یہ مفاسد ذکر فرمائے ہیں، کہ وہ آپس کی عداوت و بغض کا سبب بنتی ہیں، اور ذکر اللہ اور نماز سے مانع بن جاتی ہیں۔

قمار کی ایک اصولی خرابی یہ بھی ہے کہ یہ باطل طریقہ پر دوسرے لوگوں کا مال ہضم کرنے کا ایک طریقہ ہے، کہ بغیر کسی معقول معاوضہ کے دوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے، اسی کو

قرآن کریم نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے،

لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ

تو لوگوں کے مال باطل طریقہ پر مت

يَا بَايِلُ - (۱۸۸: ۲)

کھاؤ

قمار میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ دفعہ بہت سے گھر برباد ہو جاتے ہیں، لکھتی آدمی فقیر بن جاتا ہے، جس سے صرف یہی شخص متاثر نہیں ہوتا، جس نے جرم قمار کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان معیشت میں پڑ جاتا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو پوری قوم اس سے متاثر ہوتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے اس کی مالی ساکھ کو دیکھ کر اس سے معاہدے اور معاملے کئے ہوئے ہیں یا قرض دیئے ہوئے ہیں وہ اب دیوالیہ ہو جائے گا تو ان سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

قمار میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی قوت عمل سست ہو کر رہی منافع پر لگ جاتی ہے، اور وہ بجائے اس کے کہ اپنے ہاتھ یا دماغ کی محنت سے کوئی دولت بڑھا کر اس کی فکر اس بات میں محصور ہو کر رہ جاتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کی کمائی پر اپنا قبضہ جائے۔ یہ مختصر فرست ہو قمار کے مفسدہ کی جن سے نہ صرف اس جرم کا مرتکب متاثر ہوتا ہو بلکہ اس کے سب متعلقین اہل و عیال اور پوری قوم متاثر ہوتی ہے، اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا: **وَإِنَّهُمْ مِمَّا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا**، یعنی شراب و قمار کے مفسدان کے نفع سے زیادہ ہیں۔

چند فقہی ضابطے اور فوائد | اس آیت میں شراب اور قمار کے بعض فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے رکنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس سے ایک اہم نتیجہ

یہ نکل آیا کہ کسی چیز یا کسی کام میں کچھ دنیوی منافع ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ اس کو شرعاً حرام قرار دیا جائے، کیونکہ جس طرح محسوسات میں اس دوا اور غذا کو مضر کہا جاتا ہے جس کی مضرتیں بہ نسبت اس کے فائدے کے زیادہ سخت ہوں، درزیوں کو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی منافع سے خالی نہیں، زہر قاتل میں سانپ اور بچھو میں، درندوں میں کتے فوائد ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کو مضر کہا جاتا ہے، اور ان کے پاس جانے سے بچنے کی ہدایت کی جاتی ہے، اسی طرح معنوی اعتبار سے جن کاموں کے مفسدان کے منافع سے زائد ہوں شرعاً ان کو حرام کر دیا جاتا ہے، چوری، ڈاکہ، زنا، اغوار، دھوکہ، فریب وغیرہ تمام جرائم میں کوئی ناسمجھ ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اگر یہ بالکل بے فائدہ ہوتے تو کوئی عقل و ہوش والا انسان ان کے پاس نہ جاتا، حالانکہ ان سب جرائم میں کامل وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہوشیاری عقلمندی میں معروف سمجھے جاتے ہیں، اس سے ہی معلوم ہوا کہ فوائد تو کچھ نہ کچھ تمام جرائم میں ہیں، مگر چونکہ انکی

مضرت فائدہ سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے کوئی عقلمند انسان ان کو مفید اور جائز نہیں کہتا، شریعت اسلام نے شراب اور خمر کے تحت حرام قرار دیا ہے، کہ اس کے فوائد سے زیادہ مضرت اور دینی و دنیوی مضرتیں ہیں۔

ایک اور فقہی ضابطہ | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جلب منفعت سے دفع مضرت مقدم ہے، یعنی ایک کام کے ذریعے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی کوئی مضرت بھی پہنچتی ہے تو مضرت سے بچنے کے لئے اس منفعت کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہوتا ہے، ایسی منفعت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مضرت کے ساتھ حاصل ہو۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ

اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہے جو بچے اپنے خرچ سے اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ

لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۸۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ط

تمہارے واسطے حکم تاکہ تم فکر کرو، دنیا و آخرت کی باتوں میں

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الِیْتِمٰی قُلْ اِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ وَّ اِنْ تَخَاطَبُوهُمْ

اور تم سے پوچھتے ہیں یتیموں کا حکم کہہ دے سنو ازانان کے کام کا بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ ملا تو وہ

فَاٰخِرًا نَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمَصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ

نہما کہ بھائی ہیں اور اللہ جانتا ہے خرابی کرنے والے اور سنوارنے والے کو اور اگر اللہ چاہتا تو

لَاَعْنَتُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۹۰﴾ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُرَاتِ

تم پر مشقت ڈالنا بیشک اللہ زبردست جو تدبیر والا، اور نکاح مت کر دو مشرک عورتوں سے

حَتّٰی یُؤْمِنُوْا وَلَا مَآةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَلَا تُؤْمِنُ

جب تک ایمان نہ لے آئیں اور اہلستہ لونڈی مسلمان بہتر ہے مشرک بی بی سے اگرچہ وہ تم کو بھل گئی،

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُرَاتِ حَتّٰی یُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ

اور نکاح نہ کرو مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور اہلستہ غلام مسلمان بہتر ہے مشرک

مُشْرِکٍ وَلَا تُؤْمِنُ بِکُمْ اُولٰٓئِکَ یَدْعُوْنَ اِلٰی النَّارِ وَاللّٰهُ یَدْعُوْا

سے اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے

إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ

جنت کی طرف اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بتلاتا ہے اپنے حکم لوگوں کو تاکہ وہ

يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۲۱﴾

تصیحت قبول کریں۔

خلاصہ تفسیر

۱۹ سو لہواں حکم، مقدار انفاق اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ زین خیرات میں کتنا خرچ کیا کریں آپ فرمادیجئے کہ جتنا آسان ہو کہ اس کے خرچ کرنے سے خود پریشان ہو کر دنیوی تکلیف میں یا کسی کا حق ضائع کر کے آخری تکلیف میں پڑ جائیں، اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم کو ان کا علم ہو جائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کرنے سے پہلے دنیا و آخرت کے معاملات میں (ان احکام کو) سوچ لیا کرو اور سوچ کر ہر معاملہ میں ان احکام کے موافق عمل کیا کرو۔

۲۰ ستر ہواں حکم، مخالفتِ تمیم رچو نکہ ابتداء میں مثل ہندوستان کے عرب میں بھی تمیموں کا حق دینے میں پوری حسیا ط نہ تھی، اس لئے یہ وعید سنائی گئی کہ تمیموں کا مال کھانا ایسا ہے جیسا دوزخ کے انگارے پیٹ میں بھرنا، تو سننے والے ڈر کے مارے اتنی احتیاط کرنے لگے کہ ان کا کھانا بھی الگ بکولتے اور الگ رکھواتے، اور اتفاقاً اگر بچہ کم کھانا تو کھانا بچتا اور ستر ہواں حکم کیونکہ اس کا استعمال نہ ان لوگوں کے لئے جائز تھا، اور تمیم کے مال کو صدقہ کر دینے کا اختیار تھا، اس طرح تکلیف بھی ہوتی اور تمیم کا نقصان بھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، اس کے متعلق آیت میں یہ ارشاد آیا، اور لوگ آپ سے تمیم بچوں (کے خرچ علیحدہ یا شامل رکھنے کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اصل مقصود ہمارا ان کے اموال کھانے کی ممانعت سے یہ ہے کہ ان کی مصلحت کو ضائع نہ کیا جائے، اور جب خرچ شامل رکھنے میں ان کی مصلحت ہے تو ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا علیحدہ خرچ رکھنے سے جو خلاف مصلحت ہے، زیادہ بہتر ہے اور تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو کچھ ڈر کی بات نہیں کیونکہ وہ (بچے) تمہارے (دینی، بھائی میں راور بھائی بھائی شامل رہا ہی کرتے ہیں) اور اللہ تم مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو (الگ الگ) جانتے ہیں اس لئے کھانے پینے میں اشتراک ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں یتیم کی مصلحت ضائع ہو جائے اور بلا علم و بلا قصد کچھ کی بیشی ہو بھی جائے تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی

نیک نیتی معلوم ہے اس لئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو اس معاملہ میں سخت قانون معتر کر کے، تم کو مصیبت میں ڈال دیتے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (مگر قانون سہل اس لئے مقرر فرمایا کہ وہ) حکمت والے بھی، ہیں (ایسا حکم نہیں دیتے جو نہ ہو سکے)

۱۸ اور نکاح مت کر دو کہ کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ مسلمان اٹھارہواں حکم مناکحت کفار نہ ہو جاویں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی دیکوں نہ ہو وہ

ہزار درجہ بہتر ہے کافر عورت سے (چاہے وہ آزاد بی بی ہی کیوں نہ ہو) گودہ رکافر عورت بوجہ مال یا جمال کے (تم کو اچھی معلوم ہو) مگر پھر بھی واقع میں مسلمان عورت ہی اس سے اچھی ہے) اور (اسی طرح اپنے اختیار کی) عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک وہ مسلمان نہ ہو جاوے اور مسلمان مرد (چاہے) غلام (ہی کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ بہتر ہے کافر مرد سے) چاہے وہ آزاد ہی کیوں نہ ہو) گودہ رکافر مرد بوجہ مال یا جاہ کے (تم کو اچھا ہی معلوم ہو) مگر پھر بھی واقع میں مسلمان ہی اس سے اچھا ہے، اور وہ ان کافروں کے برا ہونے کی اور وہی اصل سبب ان سے ممانعت نکاح کا ہے یہ ہے کہ یہ (کافر) لوگ دوزخ (میں جانے) کی تحریک دیتے ہیں (کیونکہ کفر کی تحریک کرتے ہیں اور اس کا انجام جہنم ہے) اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت (کے حاصل کرنے) کی تحریک کرتے ہیں اپنے حکم سے (اور اس حکم کا بطور اس طرح ہوا کہ کفار کے متعلق یہ حکم صادر فرمادیا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے، تاکہ ان کی تحریک کے اثر سے پوری حفاظت رہ سکے، اور اس سے محفوظ رہ کر جنت اور مغفرت حاصل ہو جائے) اور اللہ تعالیٰ اس واسطے اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں (اور سختی جنت و مغفرت ہو جاویں)

فوائد زبانِ قرآن مسئلہ: جو قوم اپنی وضع اور طرز سے اپنی کتاب سمجھ جاتے ہوں، لیکن عقائد کی تحقیق کرنے سے کتابی ثابت نہ ہوں اس قوم کی عورتوں سے نکاح درست نہیں، جیسے آجکل عورتانگریزوں کو عام لوگ عیسائی سمجھتے ہیں، حالانکہ تحقیق سے ان کے بعض عقائد بالکل ملحدانہ ثابت ہوئے کہ نہ خدا کے قائل نہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے معتقدہ انجیل کی نسبت آسمانی کتاب ہونے کا اعتقاد سوائے لوگ عیسائی نہیں ایسی جماعت میں کی جو عورت ہوا سے نکاح درست نہیں لوگ غلطی کرتے ہیں کہ بلا تحقیق یورپ کی عورتیں بیاہ لاتے ہیں۔

مسئلہ: اس طرح جو مرد ظاہری حالت میں مسلمان سمجھا جائے لیکن عقائد اس کے کفر تک پہنچے ہوں اسے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں اور اگر نکاح ہو جانے کے بعد ایسے عقائد خراب ہو جاویں تو نکاح کو جاتا ہے جیسے آجکل بہت آدمی اپنے مذہب کے نادانانہ سنس لے اثر سے اپنے عقائد تباہ کر لیتے ہیں لڑکی والوں پر واجب کہ پیانے کے وقت اول عقائد کی تحقیق کر لیا کریں تب زبان دیں۔

معارف و مسائل

مسلم و کافر کا باہمی ازدواج ممنوع ہے آیات مذکور میں ایک اہم مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ مسلمان مردوں کا نکاح کافر عورتوں سے اور کافر مردوں کا نکاح مسلمان عورتوں سے جائز نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کافر مرد اور عورتیں انسان کو جہنم کی طرف لے جانے کے سبب بنتے ہیں، کیونکہ ازدواجی تعلقات، آپس کی محبت و مودت اور یگانگت کو چاہتے ہیں، اور بغیر اس کے ان تعلقات کا اصلی مقصد پورا نہیں ہوتا، اور شرکین کے ساتھ اس قسم کے تعلقات قریب محبت و مودت کا لازمی اثر ہے کہ ان کے دل میں بھی کفر و شرک کی طرف میلان پیدا ہو یا کم از کم کفر و شرک سے نفرت ان کے دلوں سے نکل جائے، اور اس کا انجام یہ ہے کہ یہ بھی کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں اور اس کا نتیجہ جہنم ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انسان کو جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے، اور صاف صاف اپنے احکام بیان فرمادیتا ہے تاکہ لوگ نصیحت پر عمل کریں، اس جگہ چند باتیں قابل غور ہیں:-

اول یہ کہ اس آیت میں لفظ مشرک سے اگر مطلقاً غیر مسلم مراد ہوں تو قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی بنا پر اہل کتاب کی غیر مسلم عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے **وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُذِنَ لَكُمُ الْكِتَابُ مِنْ قَبْلِكُمْ** (۵:۵۱)، اور اگر مشرک سے خاص وہ غیر مسلم مراد ہیں جو اہل کتاب نہیں تو یہ آیت اپنی جگہ عام ہے تمام ان غیر مسلموں کو جو کسی پیغمبر اور آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ مسلم و کافر کے درمیان ازدواجی تعلقات کو حرام قرار دینے کی جو وجہ شرعاً کریم میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے تعلقات شریعہ کفر و شرک میں مبتلا ہو جانے کا سبب بن سکتے ہیں، یہ بات تو بظاہر تمام غیر مسلم فرقوں میں ماسدی ہے، پھر اہل کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے۔

جواب ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا اختلاف اسلام کے ساتھ بہ نسبت دوسرے غیر مسلموں کے کم اور ہلکا ہے، کیونکہ عقائد اسلام کے تین عمود ہیں توحید، آخرت، رسالت، ان میں سے عقیدہ آخرت میں تو اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی اپنے اصل مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ متفق ہیں، اسی طرح خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا خود ان کے اصل مذہب میں بھی کفر ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کے غلو میں مشرک بنک جا پہنچے۔

اب بنیادی اختلاف صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں

مانتے، اور اسلام میں یہ عقیدہ بھی بنیادی عقیدہ ہے، اس کے بغیر کوئی انسان مؤمن نہیں ہو سکتا بہر حال دوسرے غیر مسلم فرقوں کی نسبت سے اہل کتاب کا اختلاف ہلکا اور کم ہے، اس لئے اس میں مفسدہ کا خطرہ زیادہ نہیں۔

تیسری بات قابل غور یہ ہے کہ جب اہل کتاب کا اختلاف ہلکا قرار دے کر ان کی عورتوں سے نکاح مسلمان کا جائز ہوا تو اس کے برعکس مسلمان عورتوں کا نکاح بھی غیر مسلم اہل کتاب سے جائز ہو جانا چاہئے، مگر ذرا غور کرنے سے فرق واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کچھ فطرۃً ضعیف ہے اور پھر شوہر اس پر ماکم اور نگران بنایا گیا ہے، اس کے عقائد و نظریات سے عورت کا متاثر ہو جانا مستبعد نہیں، اس لئے اگر مسلمان عورت غیر مسلم کتابی کے نکاح میں رہے تو اس کے عقائد خراب ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، بخلاف اس کے کہ غیر مسلم کتابی عورت مسلمان کے نکاح میں رہے تو اس کے خیالات کا اثر شوہر پر پڑنا اصولاً مستبعد ہے، کوئی بے اصول اور افراط کا شکار ہو جائے یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

چوتھی بات قابل غور یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات میں جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ طرفین پر یکساں ہوتا ہے، اس لئے جیسے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان کے عقائد غیر مسلم سے متاثر ہو جائیں اسی طرح یہ بھی تو احتمال ہے کہ معاملہ برعکس ہو، غیر مسلم کے عقائد مسلمان سے متاثر ہو اور وہ ہی اسلام قبول کر لے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے ازدواجی تعلقات کو ممنوع نہ کیا جائے۔

لیکن یہاں محنت کی بات یہ ہے کہ جب کسی چیز میں ایک نفع کی امید بھی ہو اور کسی ضرر کا خطرہ بھی ہو تو عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ضرر سے بچے گا اہتمام نفع کی فکر سے زیادہ ضروری ہے، فائدہ کا ایک حکیمانہ مقولہ مشہور ہے کہ **عقل مند تریاق بیعتین دزہر گمان مخور** اس لئے اس نفع کی امید کو نظر انداز کیا گیا کہ شاید وہ غیر مسلم متاثر ہو کر اسلام قبول کر لے، اہتمام اس کا کیا گیا کہ مسلمان متاثر ہو کر کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

پانچویں بات قابل غور یہ ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مردوں کو نکاح کی اجازت کے بھی معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کر لیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا، اولاد ثابت ہوگی، لیکن روایات حدیث اس پر شاہد ہیں کہ یہ نکاح بھی پسندیدہ نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو اپنے نکاح کے لئے دیندار صالح عورت تلاش کرنا چاہئے تاکہ خود اس کے لئے بھی دین میں معین ثابت ہو، اور اس کی اولاد کو بھی دیندار ہونے کا موقع میسر آئے، اور جب غیر مسلم مسلمان عورت سے نکاح پسند نہیں کیا گیا تو یہ غیر مسلم سے کیسے پسند کیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب خبر پہنچی عراق و شام کے مسلمانوں میں کچھ ایسے اندیشے

کی کثرت ہونے لگی تو ذریعہ شرم ان کو اس سے روک دیا گیا، اور اس پر توجہ دلائی گئی کہ یہ ازدواجی تعلق دینا نہ بھی مسلم گھرانوں کے لئے خرابی کا سبب ہے، اور سیاست بھی در کتاب الآثار (لامام محمدؒ) اور آج کے غیر مسلم اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور ان کے سیاسی مفکر و فریب اور سیاسی شادیاں اور مسلم گھرانوں میں داخل ہو کر ان کو اپنی طرف مائل کرنا اور ان کے راز حاصل کرنا وغیرہ جس کا استراخود بعض مسیحی مصنفین کی کتابوں میں میجر جنرل اکبر کی کتاب حدیث دفاع میں اس کی کچھ تفصیلات حوالوں کے ساتھ مذکور ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کی دور بین نظریں ان واقعات کو دیکھ رہی تھیں خصوصاً اس زمانہ کے یورپ کے اکثر وہ لوگ جو عیسائی یا یہودی کہلاتے جاتے ہیں، اور مردم شماری کے رجسٹروں میں ان کی قومیت عیسائی یا یہودی لکھی جاتی ہے اگر ان کے حالات کی تحقیق کی جائے تو ان میں بکثرت ایسے لوگ ملیں گے جن کو عیسائیت اور یہودیت سے کوئی تعلق نہیں وہ بالکل ملحد بے دین ہیں، نہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں نہ انجیل کو، نہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے نہ تورات پر نہ خدا تعالیٰ پر نہ آخرت پر ظاہر ہے کہ حلت نکاح کا استرانی حکم ایسے لوگوں کو شامل نہیں، ان کی عورتوں سے نکاح قطعاً حرام ہے ایسے لوگ ظاہر ہے کہ آیت قرآن وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُذِنَ لَكُنَّ بِهِنَّ أَنْ تَكُونَ لَكُمْ مِثْلُ مَا كُنَّ لَكُمْ دَاخِل نہیں ہوتے، غیر مسلموں کی طرح ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی قطعاً حرام ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحْضِيِّ قُلْ هُوَ أَذَىٰ فَأَعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي

اور تم سے پوچھتے ہیں حکم حیض کا کہہ دے وہ گندگ ہے سو تم الگ رہو عورتوں سے حیض

الْمَحْضِيَّةُ وَلَا تَقْرَبُوا حَتَّىٰ يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ

کے وقت اور نزدیک نہ ہو ان کے جب تک پاک نہ ہوں پھر جب خوب پاک ہو جاویں تو جاؤ ان کے

مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ

پس جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے بیشک اللہ کو پسند آتے ہیں توبہ کرنے والے اور پسند آتے ہیں

الْمُتَطَهِّرِينَ ۝ نِسَاءُ كُفْرًا لَكُمْ فَأَتُوا بِأَرْجُلِكُمُ إِلَىٰ

گندگی سے بچنے والے، تمہاری عورتیں تمہاری کہتی ہیں سو جاؤ اپنی کہتی ہیں جہاں سے

سَلَّمْتُمْ زَوْقَ مَوَالِئِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ

چاہو اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو

مُلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

اس سے ملنا ہو اور خوش خبری سننا ایمان والوں کو

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۱۹، حیض میں جماع (القول) وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ اور لوگ

کی حرمت اور پاکی کی شرائط آپ سے حیض کی حالت میں صحبت وغیرہ کرنے کا حکم پوچھتے ہیں، آپ

فرما دیجئے کہ وہ (حیض) زندگی کی چیز ہے، تو حالت حیض میں عورتوں کے ساتھ صحبت کرنے سے

علحدہ رہا کرو اور اس حالت میں، ان سے قربت مت کرو جب تک وہ (حیض سے) پاک نہ ہو جاویں

پھر جب وہ (عورتیں) اچھی طرح پاک ہو جاویں کہ ناپاکی کا شک شک شبہ نہ رہے تو ان کے پاس

آ جاؤ (یعنی ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے تم خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے)

یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے (مثلاً اتفاقاً یا بے احتیاطی سے حالت

حیض میں صحبت کر بیٹھا پھر متنبہ ہو کر توبہ کر لی) اور محبت رکھتے ہیں پاک سات رہنے والوں سے (جو

حالت حیض میں صحبت کرنے سے اور دوسرے مہنیا سے بچتے ہیں، اور حالت پاکی میں اجازت

صحبت کی دینا پھر اس قید سے اجازت دینا کہ آگے کے موقع میں صحبت ہو، اس لیے کہ تمہاری بیوی

تمہارے لئے (بمنزلہ) کھیت کے ہیں جس میں لطف بجائے تم کے اور بچہ بجائے پیداوار کے ہے)

سو اپنے کھیت میں جس طرف سے چاہو آ جاؤ اور جس طرح کھیتوں میں اجازت ہے اسی طرح

بیویوں کے پاس پاکی کی حالت میں ہر طرف سے آنے کی اجازت ہے خواہ کر دھ سے ہو یا پیچھے

سے یا آگے بیٹھ کر ہو یا اوپر یا نیچے لیٹ کر ہو، یا جس ہیئت سے ہو، مگر آنا ہو ہر حال میں کھیت

کے اندر کہ وہ خاص آگے کا موقع ہے، کیونکہ پیچھے کا موقع کھیت کے مشابہ نہیں، اس میں صحبت

نہ ہو، اور ان لذات میں ایسے مشغول مت ہو جاؤ کہ آخرت ہی کو بھول جاؤ، بلکہ آئندہ کے واسطے

اپنے لئے کچھ اعمال صالحہ کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں ڈرتے رہو، اور یہ یقین رکھو

کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے

ایمان داروں کو جو نیک کام کریں، خدا سے ڈریں، خدا تعالیٰ کے سامنے جائے کافین رکھیں جوئی

کی خبر سننا دیجئے کہ ان کو آخرت میں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی۔

وَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصَلُّوا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیزگاری اور لوگوں

بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۳﴾

میں صلح کرانے سے بچ جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۲، نیک کام نہ کرنے کی قسم اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعے سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نبی کے اور تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ تم یہ نیک کام نہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برائیالات مت لاؤ)

لَا يُؤْخِذُكُمُ اللّٰهُ بِالْغُفْوٰی اَیْمَانُكُمْ وَلٰكِنْ یُّؤْخِذُكُمْ

بِیْمَا كَسَبَتْ فُلُوکُكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۴﴾

بہیں پکڑتا تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری، لیکن پکڑتا ہے تم کو ان قسموں پر

جن کا قصد کیا تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۳، جھوٹی قسمیں کھانیکا حکم اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دار دیگر نہ فرما دیں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر (جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا)

لیکن دار دیگر نہ فرما دیں گے اس جھوٹی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں کہ ایسی بیہودہ قسم پر دار دیگر نہ فرمائی، حلیم ہیں کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے کی سزائیں آخرت تک کی ہمت دیں

لَّذِیْنَ یُّؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَابِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ

جو لوگ قسم کھا لیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے اُن کے لئے ہمت ہر چار مہینے کی پھر اگر

فَاَوْوُوا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۵﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

باہم مل گئے تو اللہ بخشنے والا ہنسبان ہے، اور اگر ٹھہرایا چھوڑ دینے کو

فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۶﴾

تو بیشک اللہ سنتے والا جانتے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۴، ایلا رکا حکم لِّلَّذِیْنَ یُّؤْلُوْنَ (الی قولہ) سَمِيعٌ عَلِیْمٌ یعنی جو لوگ (بلا قصد مت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا بیٹھے ہیں اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے ان کیلئے

چار مہینے تک کی ہمت ہے سوا اگر (ان چار مہینے کے اندر) یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کر لیں (تب تو نکاح باقی رہے گا اور) اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ کفارہ سے) معاف کر دیں گے (اور جو نکاح اب بانی کے حقوق اور اگر نہ نکاح اس پر) مدت فرمادیں گے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو (چار ماہ گزرتے ہی قطعی طلاق پڑ جائیگی اور) اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْبٍ وَلَا یَحِلُّ

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور ان کو حلال

لَهُنَّ اَنْ یَّكُنَّ مِنْ مَّا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْ اَسْرَاحِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنُ

ہیں کہ چھار رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں

بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ اَحْسَبُ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا

اللہ پر اور پہلے دن پر اور اُن کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے واپس لینے کا اس مدت میں اگر چاہیں

اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ

سلوک سے رہنا، اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا اُن پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو

عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ۚ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۱۷﴾

عورتوں پر فضیلت ہے، اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۵، مطلقہ لِّلْمُطَلَّقَاتِ یَتَرَبَّصْنَ (الی قولہ) اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا اور طلاق دی ہوئی عورتیں جن میں اتنی صفتیں ہوں، خاوند نے اُن سے صحبت یا خلوت چھوڑ دی ہو

وَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصَلُّوا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیزگاری اور لوگوں

بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۳﴾

میں صلح کرانے سے بچ جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۲، نیک کام نہ کرنے اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعے سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نبی کے اور کی قسم کی ممانعت تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ تم نیک کام نہ کریں گے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو اور دل میں برائیالات مت لاؤ)

لَا يُؤْخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤْخِذُكُمْ

بیش پکڑتا تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری ، لیکن پکڑتا ہے تم کو ان قسموں پر

بِمَا كَسَبَتْ فُلُوكُمْ وَمَا كَسَبَتْ فُلُوكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۱۴﴾

جن کا قصہ کیا تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۱، جھوٹی قسمیں کھانیکا حکم اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دار و گیر نہ فرمادیں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر (جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا)

لیکن دار و گیر نہ فرمادیں گے اس جھوٹی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں کہ ایسی بیہودہ قسم پر دار و گیر نہ فرمائی، حلیم ہیں کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے کی سزائیں آخرت تک کی ہمت دی

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ

جو لوگ قسم کھا لیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے اُن کے لئے ہمت ہر چار مہینے کی پھر اگر

فَاءَوْوْ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۵﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

باہم مل گئے تو اللہ بخشنے والا ہنسبان ہے اور اگر ٹھہرایا چھوڑ دینے کو

فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۶﴾

تو بیشک اللہ سنتے والا جانتے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۲، ایلار کا حکم لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ (الی قولہ) سَمِيعٌ عَلِيمٌ یعنی جو لوگ (بلا قصد مت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا جیتے ہیں اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے ان کیلئے

چار مہینے تک کی ہمت ہے سو اگر (ان چار مہینے کے اندر) یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کر لیں (تب تو نکاح باقی رہے گا اور) اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ کفارہ سے) معاف کر دیں گے (اور جو نکاح اب بانی کے حقوق اور اگر نہ لگا اس پر) مدت فرمادیں گے اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو (چار ماہ گزرتے ہی قطعی طلاق پڑ جائیگی اور) اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور ان کو حلال

لَهُنَّ أَنْ يَكُنَّ مِنْ مَّا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ

ہیں کہ چھار رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

اللہ پر اور پہلے دن پر اور اُن کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے واپس لینے کا اس مدت میں اگر چاہیں

إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ

سلوک سے رہنا اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا اُن پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو

عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۱۷﴾

عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۳، مطلقہ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ (الی قولہ) إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا اور طلاق دی ہوئی عورتیں جن میں اتنی صفتیں ہوں، خاوند نے اُن سے صحبت یا خلوت چھوڑ کی ہو

اگرچہ گناہ ہوتا ہے لیکن کفارہ نہیں آتا، اس کے مقابلہ میں وہ قسم جس پر کفارہ بھی آتا ہے منعقد کھلاتی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ قصداً یوں قسم کھائے کہ میں فلاں فعل کروں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا، اس میں خلاف کرنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔

(۴) اگر کوئی قسم کھائے کہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کروں گا اس کی چار صورتیں ہیں: ایک یہ کہ کوئی مدت معین نہ کرے، دوم یہ کہ چار مہینے کی مدت کی قید لگا دے، سوم یہ کہ چار ماہ سے زیادہ کی مدت کی قید لگا دے، چہاں یہ کہ چار ماہ سے کم کی مدت کا نام لے، پس صورت اول دوم اور سوم کو شرع میں ایلا کہتے ہیں، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا آدے تو قسم کا کفارہ ادا نہ کیا جائے اور نکاح باقی ہے، اور اگر چار ماہ گزر گئے اور قسم نہ توڑی، تو اس عورت پر قطعی طلاق پڑ گئی، یعنی بلا نکاح رجوع کرنا درست نہیں رہا، البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کر لیں تو درست ہے، حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی، اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہوگا، اور اگر قسم پوری کر لی جب بھی نکاح باقی ہے، (بیان القرآن)

معارف و مسائل

مرد و عورت کے فرق اور میاں بیوی کے باہمی حقوق و فرائض اور ان کے درجات کے بیان میں ایک شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کئی رکوع تک اسی ضابطہ کی اہم جزئیات کا بیان ہوا ہے۔

اسلام میں عورت کا موقف اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عورت کے اس موقف کی کچھ تشریح کر دی جائے جو اسلام نے اس کو عطا کیا ہے، جس کو سمجھ لینے کے بعد یقینی طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک عادلانہ اور معتدلانہ نظام کا مقصد یہی تھا، اور یہی وہ مقام ہے جس سے اونچ نیچ یا انحطاط انسان کے دین و دنیا کے لئے عظیم خطرہ بن جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو دنیا پر دو پیریں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم کی بقاء اور تعمیر و ترقی میں عود کا درجہ رکھتی ہیں، ایک عورت، دوسرے دولت، لیکن تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو یہی دونوں چیزیں دنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی ہیں، اور غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنا کچھ دشوار نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصل میں دنیا کی تعمیر و ترقی اور اس کی رونق کا ذریعہ ہیں، لیکن جب کہیں ان کو اپنے اصلی مقام اور موقف سے اِدھر اُدھر کر دیا جاتا ہے تو یہی

ان کو جین آتا ہو، آزاد ہوں، یعنی شرعی قاعدہ سے لونڈی نہ ہوں) اپنے آپ کو نکاح سے روکے رکھیں، عین جین ختم ہونے تک (اور اس کو مدت کہتے ہیں) اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم و بچہ دان میں پیدا کیا ہو (خواہ حل ہو یا جین) اس کو پوشیدہ کریں (کیونکہ اس کے پوشیدہ کرنے سے عدت کا حساب غلط ہو جاوے گا) اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہیں (بوجہ اس کے کہ اس یقین کا مقتضایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں کہ قیامت میں نافرمانی پر سزا نہ ہو جاوے) اور ان عورتوں کے شوہر (جب کہ ان کو طلاق رجعی ملی ہو جس کا بیان آگے آئے گا) ان کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں اس عدت کے اندل اور اس لوٹا لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ رجعت کرنے سے اصلاح کا قصد رکھتے ہوں (ورنہ تنگ کرنے کے لئے رجعت کرنا لا حاصل ہے، اور رجعت تو ہو ہی جاوے گی اور یہ حکم اصلاح کا اس لئے کیا گیا کہ) عورتوں کے حقوق ہیں (مردوں پر) جو کہ نفس و جوبین، مثل اپنی کے حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں (مردوں کے ان کو) قاعدہ (شرعی) کے موافق (ادا کیا جاوے) اور راتنی بات ضرور ہے کہ مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے (اس لئے ان کے حقوق کی نوعیت عورتوں کے حقوق کی نوعیت سے بڑھی ہوئی ہے) اور اللہ تعالیٰ زبردست (حاکم) ہیں، (اور) حکیم (بھی) ہیں۔

مسائل متعلقہ آیت (۱) اگر غلبہ شہوت سے حالت جین میں صحبت ہو گئی، تو خوب توبہ کرنا از بیان القرآن واجب ہے اور کچھ خیر خیرات بھی دیدے تو زیادہ بہتر ہے۔

(۲) پیچھے کے موقع میں اپنی بی بی سے بھی صحبت کرنا حرام ہے۔
(۳) لغو قسم کے دو معنی ہیں، ایک توبہ کہ کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ نکل گئی، یا سبکی تو ارادے سے، مگر اس کو اپنے گمان میں صحیح سمجھتا ہے جیسے اپنے علم و گمان کے مطابق قسم کھا بیٹھا کہ زید آگیا ہو اور واقع میں وہ نہ آیا تھا، یا آئندہ بات پر اس طرح قسم نکل گئی کہ کہنا چاہتا تھا کچھ اور بے ارادہ منہ سے قسم نکل گئی اس میں گناہ نہیں ہوتا، اور اس کو اسی واسطے لغو کہتے ہیں آخرت میں اس پر مواخذہ نہیں ہوگا، اور اس کے مقابلہ میں جس پر مواخذہ ہونے کا ذکر منسخر مایا ہے یہ وہ قسم ہے جو قصداً جھوٹی سمجھ کر کھائی ہو اس کو لغو تو کہتے ہیں، اس میں گناہ ہوتا ہے، مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک کفارہ نہیں آتا، اور لغو بالمعنی المذكور میں بدرجہ اولیٰ کفارہ نہیں، اس آیت میں انہی دونوں کا بیان ہے، جن میں کفارہ نہیں۔

دوسرے معنی لغو کے یہ ہیں جس پر کفارہ نہ ہو اور اس کو لغو اس لئے کہیں گے کہ مواخذہ دنیوی یعنی کفارہ اس پر نہیں آتا، اس معنی کے لحاظ لفظ لغو لغو کو بھی شامل ہے، کہ اس میں

چیزیں دنیا میں سب سے بڑا زلزلہ سمجھی جاتی ہیں۔

فتر آن نے انسان کو نظام زندگی دیا ہے اس میں ای دلوں چیزوں کو اپنے اپنے مقام پر بار کھا گیا ہے کہ ان کے فوائد و منافع زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں، اور فتنہ و فساد کا نام نہ رہے، دولت کا صحیح مقام، اس کے حاصل کرنے کے ذرائع اور خرچ کرنے کے طریقے اور تقسیم دولت کا عادلانہ نظام یہ ایک مستقل علم ہے جس کو "اسلام کا معاشی نظام" کہا جاسکتا ہے، اس کا بیان انشاء اللہ کسی اور موقع پر ہوگا، احقر کا مطبوعہ رسالہ "تقسیم دولت" بھی ضروری اشارات کا کام دے سکتا ہے۔

اس وقت عورت اور اس کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے، اس کے متعلق آیت مذکورہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے اسی طرح مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے، ہاں اتنا فرق ضروری ہے کہ مردوں کا رزق عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور تقریباً ہی مضمون سورہ نسا کی آیت میں اس طرح آیا ہے۔

”میں مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے
کہ بڑائی اللہ نے دی ایک کو ایک پر اور
اس واسطے کہ خرچ کئے انھوں نے اپنے مال“

اسلام سے پہلے عمارتوں کی حیثیت گھر ملو استعمال کی اشیاء سے زیادہ نہ تھی، چوپاؤں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی، اس کو اپنی شادی بیاہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہ تھا، اس کے ادباً جس کے حوالے کر دیتے وہاں جانا پڑتا تھا، عورت کو اپنے رشتہ داروں کی میراث میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا بلکہ وہ خود گھر ملو اشیاء کی طرح مال وراثت سمجھی جاتی تھی، وہ مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی، اس کی ملکیت کسی چمیسز پر نہ تھی، اور جو چیزیں عورت کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں اس کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا کوئی اختیار نہ تھا ہاں اس کے شوہر کو ہر قسم کا اختیار تھا کہ اس کے مال کو جہاں چاہے اور جس طرح چاہے خرچ کر ڈالے، اس کو پوچھنے کا بھی کوئی حق نہ تھا، یہاں تک کہ یورپ کے وہ ممالک جو آجکل دنیا کے سب سے زیادہ متقدم ملک سمجھے جاتے ہیں ان میں بعض لوگ اس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ عورت کے انسان ہونے کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔

عورت کے لئے دین و مذہب میں بھی کوئی حصہ نہ تھا نہ اس کو عبادت کے قابل سمجھا جاتا نہ جنت کے، آدم کی بعض مجلسوں میں باہمی مشورہ سے یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ ایک ناپاک جانور ہے جس میں رُوح نہیں، عام طور پر باپ کے لئے لڑکی کا قتل بلکہ زندہ درگور کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا۔

بلکہ یہ عمل باپ کے لئے عزت کی نشانی اور شرافت کا معیار تصور کیا جاتا تھا، بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کو کوئی بھی قتل کر دے نہ تو اس پر قصاص واجب ہے نہ خوں بہنا، اور اگر شوہر مر جائے تو بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جلا کر سیتی کر دیا جاتا تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد اور آپ کی نبوت سے پہلے مشتمل میں فرانس نے عورت پر یہ احسان کیا کہ بہت سے اختلافات کے بعد یہ قرار دیا کہ عورت ہے تو انسان مگر وہ صرف مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

الفرض پوری دنیا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام و مذاہب نے عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہوا تھا کہ جس کو سن کر بدن کے روتے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس بیچاری مخلوق کے لئے نہ کہیں عقل و دانش سے کام لیا جاتا تھا نہ عدل و انصاف سے۔

دوسرے نام یہ ہیں :
قربان جائیے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے دین حق کے جس نے دنیا کی آنکھیں کھولیں، انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھلایا، عدل و انصاف کا قانون جاری کیا، عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں، اس کو آزاد و خود مختار بنایا، وہ اپنی جان و مال کی ایسی ہی مالک مستراروی گئی جیسے مرد، کوئی شخص خواہ باپ دادا ہی ہو بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا، اور اگر بلا اس کی اجازت کے نکاح کر دیا جائے تو وہ اس کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر نا منظور کرنے تو باطل ہو جاتا ہے، اس کے اموال میں کسی مرد کو بغیر اس کی رضا و اجازت کے کسی تصرف کا کوئی حق نہیں، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد وہ خود مختار ہے کوئی اس پر جبر نہیں کر سکتا، اپنے رشتہ داروں کی میراث میں اس کو بھی ایسا ہی حصہ ملتا ہے جیسا کہ بزرگوں کو، اس پر خرچ کرنے اور اس کے راضی رکھنے کو شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے ایک عبادت قرار دیا، شوہر اس کے حقوق واجبہ ادا نہ کرے تو وہ اسلامی عدالت کے ذریعہ اس کو ادائیہ حقوق پر درجہ طلاق پر مجبور کر سکتی ہے۔

اور مردوں کی سیادت اور عورت کو اس کے حقوقی مناسبتہ نہ دینا ظلم و جور اور قسوت و شقاوت
نکرانی سے بالکل آزاد کر دینا بھی تھی جس کو اسلام نے مثایا ہے، اسی طرح ان کو کھگے ہمارے چھوڑ دینا
اور مردوں کی نگرانی و سیادت سے آزاد کر دینا، اس کو اپنے گزارے
اور معاش کا خود مشغول بنانا بھی اس کی حق تلفی اور بربادی ہے نہ اس کی ساخت اس کی متحمل ہے اور
نہ گھریلو کاموں کی ذمہ داری اور اولاد کی تربیت کا عظیم الشان کام جو فطرۃً اس کے سپرد ہے وہ اس کا
متحمل ہے۔

علاوہ ازیں مردوں کی سیادت و نگرانی سے نکل کر عورت پورے انسانی معاشرہ کے لئے خطرہ عظیم ہے جس سے دنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنے پیدا ہونا لازمی اور روزمرہ کا مشاہدہ

ہے، اس لئے قرآن کریم نے عورتوں کے حقوق و واجبات کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ
 وَلِلرِّجَالِ عَلَى النِّسَاءِ دَرَجَةٌ مِثْلُ دَرَجَةِ عَوْرَتَيْنِ مِثْلُ دَرَجَةِ عَوْرَتَيْنِ مِثْلُ دَرَجَةِ عَوْرَتَيْنِ
 یہ کہ مردان کے ٹکراؤں اور ذمہ داریوں۔

مگر جس طرح اسلام سے پہلے جاہلیتِ اولیٰ میں اقوامِ عالم سب اس غلطی کا شکار تھیں کہ عورتوں کو ایک گھریلو سامان یا چوپایہ کی حیثیت میں رکھا ہوا تھا، اسی طرح اسلام کے زمانہ انحطاط میں جاہلیتِ آخری کا دور شروع ہوا، اس میں پہلی غلطی کا ردِ عمل اس کے بالمقابل دوسری غلطی کی صورت میں کیا جا رہا ہے، کہ عورتوں پر مردوں کی اتنی سیادت سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے اور کرانے کی سعی مسلسل جاری ہے، جس کے نتیجے میں فحش دے حیاتی عالم ہو گئی، دنیا جھگڑوں اور فساد کا گھر بن گئی، قتل و خون ریزی کی اتنی کثرت ہو گئی کہ جاہلیتِ اولیٰ کو مات دیدی، عرب کا مشہور مقولہ ہے: "أَلْبَاهِلُ رَأَتْهَا مَطْبَرُ طَبْخِ أَوْ مُكْسَرِ طَبْخِ" یعنی جاہل آدمی کبھی اعتدال پر نہیں رہتا، اگر افراط یعنی حد سے زیادہ کرنے سے باز آ جاتا ہے تو کوتاہی اور تقصیر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ۔

یہی حال اس وقت ابنا سے زمانہ کلہ ہے کہ یا تو عورت کو انسان کہنے اور سمجھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے اور آگے بڑھے تو یہاں تک پہنچے کہ مردوں کی سیادت و مگرانی جو مردوں، عورتوں اور پوری دنیا کے لئے عین حکمت و مصلحت ہے اس کا بخوا بھی گردن سے اُٹا کر اجا رہا ہے، جس کے نتائج بدروزانہ آنکھوں کے سامنے آرہے ہیں، اور یقین کیجئے کہ جب تک وہ قرآن کے اُس ارشاد کے سامنے نہ جھکیں گے ایسے فتنے روز بڑھتے رہیں گے۔

آج کی حکومتیں دنیا میں قیام امن کے لئے روز نئے نئے قانون بناتی ہیں، اس کے لئے نئے ادارے قائم کرتی ہیں، کروڑوں روپیہ اُن پر صرف ہوتا ہے، لیکن فتنے جن چٹھے سے پھوٹ رہے ہیں اس کی طرف دھیان نہیں دیتیں، اگر آج کوئی کمیشن اس تحقیق کے لئے بٹھایا جائے کہ فساد و خون ریزی اور بربادی کی وجہ اس کی تحقیق کرے تو خیال یہ ہے کہ پچاس فی صد سے زائد ایسے جرائم کا سبب عورت اور اس کی بے مہار آزادی نکلتے گی، مگر آج کی دنیا میں نفس پرستی کے غلبہ نے بڑے بڑے حکماء کی آنکھوں کو خیر کیا ہوا ہے، خواہ شائبہ نفسانی کے خلاف کسی مصلحانہ تدبیر کو گوارا نہیں کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب کو نور ایمان سے منور فرمائیں اور اپنی کتاب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر پورا عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، کہ وہی دنیا و آخرت میں سرمایہ سعادت ہو۔

مسئلہ : اس آیت کے ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ ستران حکیم نے زوجین کو ان کے ذمہ عائد ہونے والے فرائض بتلائے کہ مردوں کے ذمہ عورتوں کے حقوق ادا کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے کہ عورتوں پر مردوں کے حقوق کا ادا کرنا فرض ہے اس میں اشارہ ہے کہ ہر فریق کو اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے بجائے اپنے فرائض پر نظر رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ایسا کر لیں تو مطالبہ حقوق کا قضیہ ہی دنیا میں نہیں آئے گا، کیونکہ مرد کے فرائض ہی عورت کے حقوق ہیں اور عورت کے فرائض ہی مرد کے حقوق ہیں، جب فرائض ادا ہو گئے تو خود بخود حقوق ادا ہو جائیں گے، آجکل دنیا کے سارے جھگڑے یہاں سے چلتے ہیں کہ ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ تو سامنے رکھتا ہے مگر اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل ہے اس کا نتیجہ مطالبہ حقوق کی جنگ ہوتی ہے جو آجکل عام طور پر حکومتوں اور عوام میں زوجین میں، اور دوسرے اہل معاملہ میں چلی ہوئی ہے، قرآن کریم کے اس اشارہ نے معاملہ کے رُخ کو یوں بدلا ہے کہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے فرائض پورا کرنے کا اہتمام کرے، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں مساومت اور عفو و درگزر سے کام لے، اگر اس سترانی تعلیم پر دنیا میں عمل ہونے لگے تو گھروں اور خانانوں کے بلکہ ملکوں اور حکومتوں کے بیشتر نزاعات ختم ہو جائیں۔

مرد و عورت میں درجہ کا تقوُّن و نہی معاملات میں ہے، آخرت کی فضیلت میں اس کا کوئی اثر نہیں

دنیا میں نظام عالم اور انسانی فطرت اور خود عورتوں کی مصلحت کا تقاضا ہی تھا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک قسم کی حاکمیت اور نگرانی کا نہ صرف حق دیا جائے بلکہ اُن پر لازم کیا جائے، اسی کا بیان آیت ”الْحَيَّاتُ قَوَّامُونَ عَلَى النَّسَاءِ“ میں آیا ہے، لیکن اس سے سب مردوں کا سب عورتوں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ فضیلت عند اللہ کا تمام ترمذار ایمان اور عمل صالح پر ہے، وہاں درجات کی ترقی و تفسیر ایمان اور عمل کے درجات کے مطابق ہوتا ہے، اس لئے امور آخرت میں یہ ضروری نہیں کہ مردوں ہی کا درجہ عورتوں سے بلند ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے اور حسب تصریح آیات و روایات ایسا ہو گا بھی کہ بعض عورتیں اپنی طاعت و عبادت کے ذریعہ بہت سے مردوں پر فائق ہو جائیں گی، اُن کا درجہ بہت سے مردوں سے بڑھ جائے گا۔

فسرآن مجید میں احکام شرعیہ اور اعمال کی جزاء و سزا اور ثواب و عذاب کے بیان میں اگرچہ حسب تصریح قرآن کریم عورتیں اور مرد بالکل برابر ہیں اور جن احکام میں کچھ فرق ہے، ان کو مستقل طور پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، لیکن عام طور پر خطاب مردوں کو کیا گیا ہے، اور صیغہ مذکر کے استعمال کئے گئے ہیں، اور یہ بات صرف قرآن کریم کے ساتھ مخصوص نہیں، عام طور پر حکومتوں کے قوانین میں بھی صیغہ مذکر کے استعمال کئے جاتے ہیں، حالانکہ قانون مرد و عورت کے لئے عام ہوتا ہے۔ اس کا ایک سبب تو وہی منسوق ہے جس کا ذکر فسرآن کریم کی آیات میں مذکور ہوا ہے، کہ مردوں کو عورتوں

پراکھ جلیت سے تفوق حاصل ہے۔

دوسری بات شاید یہ بھی مضمون ہو کہ مستورات کے ذکر کے لئے بھی ستر ہی بہتر ہے، لیکن قرآن کریم میں جا بجا مردوں کی طرح عورتوں کا ذکر نہ ہونے سے اُن کو خیال پیدا ہوا تو اُمّ المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اظہار کیا تو سورۃ احزاب کی یہ آیت نازل ہو گئی۔
 اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْكَافِرِيْنَ وَالْكَافِرَاتِ الْاُولٰٓئِكَ
 مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا مستقل ذکر واضح کر دیا گیا کہ طاعت و عبادت اور اس کی وجہ سے حق تعالیٰ کے قرب و رضا اور درجاتِ جنت میں عورتوں کا درجہ مردوں سے کچھ کم نہیں، (یہ روایت لسانی ہنسند احمد اور تفسیر ابن جریر وغیرہ میں مفصل مذکور ہے)

اور تفسیر ابن کثیر میں ایک روایت یہ ہے کہ بعض مسلمان عورتیں ازواجِ مطہرات کے پاس آئیں اور کہا کہ تشران کریم میں جا بجا مردوں کا تو ذکر ہے عورتوں میں سے ازواجِ مطہرات کا بھی مستقل ذکر ہو کر مگر ہم مسلمان عورتوں کا ذکر نہیں، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی نظام میں عورتوں پر مردوں کا ایک گونہ تفوق اور حاکمیت انکی مصلحت اور حکمت کا تقاضا ہے، اور نہ ٹیک و بدعل کی جزاء و سزا اور درجات کا آخرت میں کوئی فرق نہیں۔

تشران کریم میں ایک دوسری جگہ بھی مضمون اور بھی وضاحت سے اس طرح مذکور ہے۔
 مِّنْ عَمَلٍ صَالِحٍ مِّنْ
 ذَكَرَ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مِّنْ اٰیٰتِ الْكِتٰبِ
 خِیۡوۃٌ حٰطِیۃٌ (۹۴: ۱۶)
 میں جو مرد و عورت ٹیک عمل کرے اور
 مومن بھی ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا
 کریں گے

اس تمہید کے بعد اصل آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، ارشاد فرمایا اَلَّذِیۡنَ یُعِیۡبُوۡنَ اٰیٰتِیۡنِیۡ
 ان کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں جیسے کہ اُن کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں، اس میں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور خدا داد تفوق کی بنا پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر رہے ہیں، مگر عورتوں کے حقوق کی ہوتی چاہئے، کہ وہ عادتاً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کر سکتیں۔

دوسرا اشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورت کے حقوق ادا کرنے میں مسابقت کرنا چاہئے، اور یہاں جو لفظ "مثل" کے ساتھ دونوں کے حقوق کی مثلیت اور مساوات کا ارشاد ہے اس کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جس طرح کے کام مرد کرے اسی طرح کے عورت بھی، یا برعکس کیونکہ مرد عورت میں تقسیم کار اور ہر ایک کے فرائض فطرۃً جدا جدا ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے حقوق کی

ادائیگی یکساں طور پر واجب ہے، اور اس میں کوتاہی اور تفصیر کی سزا بھی یکساں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ تشران کریم نے ایک مختصر سے جملے میں ایک عظیم الشان فہم حقوق و فرائض کو کیسا سمویا ہے، کیونکہ مفہوم آیت میں عورتوں کے تمام حقوق مردوں پر اور مردوں کے تمام حقوق عورتوں پر داخل اور شامل ہیں (بحر محیط) اس جملے کے آخر میں ایک لفظ بِالْعُرُوۡفِ اور بڑھا کر آپس میں پیش آنے والے جھگڑوں کا خاتمہ فرمادیا کہ حقوق کی ادائیگی معروف طریقے پر کی جائے، کیونکہ معروف کے معنی یہ ہیں کہ جو شرعاً بھی منکر و ناجائز نہ ہو اور عام عادات اور عرف کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی تشدد اور زیادتی نہ ہو اس کا حاصل یہ ہوا کہ زوجین کے حقوق اور ان کو ازیت سے بچانے کے معاملہ میں خالص ضابطہ پڑی کافی نہیں، بلکہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے دیکھا جائے گا کہ اس معاملہ میں دوسرے کو کوئی ایذا یا ضرر تو نہیں پہنچتا، جو چیزیں عرف و عادت کے اعتبار سے ایذا اور اضرار کی قرار دی جائیں وہ ممنوع و ناجائز ہوں گی، مثلاً بے رخی، بے اتھالی یا ایسے افعال اور حرکات جن سے دوسرے کو ایذا پہنچے، یہ چیزیں قانونی دفعات میں تو نہیں آسکتیں، مگر بِالْعُرُوۡفِ کے لفظ نے ان کا احاطہ کر لیا، اس کے بعد فرمایا وَ لِّلّٰی تَحٰی اَلْعِبْرَۃَ ذَرَجَۃً
 اس کا مشہور مطلب مفہوم تو یہی ہے کہ حقوقِ طرفین مساوی ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے فردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کا تفوق اور حاکمیت عطا فرمادی ہے، اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں جس کی طرف آخر آیت کے الفاظ وَاللّٰهُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ میں اشارہ فرمادیا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس جملے کا مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلہ میں بڑا درجہ دیا ہے، اس لئے اُن کو زیادہ تحمل سے کام لینا چاہئے کہ اگر عورتوں کی طرف سے اُن کے حقوق میں کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو اُن کا درجہ یہ ہے کہ یہ اس کو برداشت کریں، اور صبر سے کام لیں، اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں (قرطبی)

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَیۡنِ فَاِمَسَاکُ بِمَعْرُوۡفٍ اَوْ تَسْرِیۡمٌ بِاِحْسَانٍ وَلَا

طلاق جس ہے دو بار تک اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بحسنِ طرح سے اور تم کو

یَجْعَلُ لَّکُمۡ اَنْ تَاْخُذُوۡا مِمَّا اَتٰیۡمُوهُنَّ شَیۡئًا اَلَّا اَنْ یَّخَافَا

رہا نہیں کہ لیسو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جبکہ خاوند عورت دونوں ڈریں اس

اَلَا یُقِیۡمَ اَحَدٌ وَّدَاللّٰہِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیۡمَ اَحَدٌ وَّدَاللّٰہِ

بات سے کہ قائم نہ رکھ سکیں گے حکم اللہ کا پھر اگر تم لوگ ڈرو اس بات کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکم

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا

تو کہہ گناہ نہیں دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دیکر چھوٹ جاوے اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں سو ان آگے مت بڑھو

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سودی لوگ ہیں ظالم ، پھر اگر اس عورت کو طلاق

فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ مُحْشَىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَ ۚ فَإِنْ طَلَّقَهَا

دی یعنی تیسری بار تو اب حلال نہیں اسکو وہ عورت اس کے بعد جب تک کہ نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا پھر اگر طلاق دے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۚ وَ

دوسرا خاوند تو کہہ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ باہم بل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم اور یہ حدیں

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

باندھی ہوئی ہیں اللہ کی بیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۵، طلاق رجعی کی تعداد

طلاق دو مرتبہ کی ہے پھر (دوسرے طلاق دینے کے بعد دوبار اختیار نہیں) خواہ (یہ کہ رجعت کر کے عورت کو) قاعدہ کے مطابق رکھ لے (خواہ وہ)

کر رجعت نہ کرے، عدت پوری ہونے سے، اور اس طرح) اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے۔

حکم نمبر ۲۶، خلع

اور کہا ہے یہ بات حلال نہیں کہ (تیسریوں کو چھوڑنے کے وقت ان سے) کہہ بھی لو (اگرچہ وہ یہی) اسی (مال) میں سے (کہیں نہ ہو) جو تم نے (ہی ہرمیں) ان کو دیا تھا اگر (ایک صورت البتہ حلال ہے)

وہ (کہہ کر) مایاں ہوئی (ایسے ہوں کہ) دونوں کو خطرہ ہو کہ (دوبارہ حقوق زوجیت) وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ

ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے مگر تم کو (یعنی مایاں ہوئی کو) یہ خطرہ ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی

کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اس حال کے لینے دینے نہیں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑاتے، (بشرطیکہ ہر سے زیادہ نہ ہو) یہ سب احکام خدائی ضابطے ہیں، تم انچ

باہر نہ نکلیں اور جو شخص خدائی ضابطوں (کو توڑ کر) باہر نکل جائے تو ایسے لوگ اپنا ہی نقصان کرنے والے ہیں۔

حکم نمبر ۲۷، تین طلاقیں کے بعد حلال

(بھی) دیدے تو پھر سہ عورت اس (تیسری طلاق

دینے کے بعد اس شخص کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک وہ اس خاوند کے سوا دوسرے شخص کے ساتھ

(عدت کے بعد) نکاح نہ کرے، (اور حقوق زوجیت صحبت کے ادا نہ کرے) پھر اگر یہ دوسرا خاوند

اس کو طلاق دیدے (اور اس کی عدت بھی گزر جائے) تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ

دوبارہ آپس میں نکاح کر کے بدستور پھر مل جاویں، بشرطیکہ دونوں کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہو کہ آئندہ

خاوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے اور یہ خاوندی ضابطے ہیں حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو دانشمندی ہیں۔

معارف و مسائل

طلاق و نکاح کے احکام پورے قرآن کریم میں بہت سی آیتوں میں آئے ہیں مگر یہ چند آیتیں جو یہاں مذکور ہیں

طلاق کے معاملہ میں ہم ضابطوں کی حیثیت رکھتی ہیں ان کو سمجھنے کیلئے پہلے نکاح کی شرعی حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔

نکاح و طلاق کی شرعی حیثیت | نکاح کی ایک حیثیت تو ایک باہمی معاملے اور معاہدے کی ہے، جیسے

اور حکیمانہ نظام | بیع و شراء اور لین دین کے معاملات ہوتے ہیں، دوسری

حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے، اس پر تو تمام امت کا اتفاق ہے کہ نکاح عام معاملہ

و معاہدات سے بالاتر ایک حیثیت شرعی عبادت و سنت کی رکھتا ہے، اسی لئے نکاح کے

منعقد ہونے کے لئے باجماع امت کچھ ایسی شرائط ضروری ہیں جو عام معاملات بیع و شراء

میں نہیں ہوتیں۔

اول تو یہ کہ ہر عورت سے اور ہر مرد سے نکاح نہیں ہو سکتا، اس میں شریعت کا ایک

مستقبل قانون ہے، جس کے تحت بہت سی عورتوں اور مردوں کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا۔

دوسرے تمام معاملات و معاہدات کے منعقد اور مکمل ہونے کے لئے کوئی گواہی شرط

نہیں، گواہی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب فریقین میں اختلاف ہو جائے، لیکن نکاح ایسا

معاملہ نہیں، یہاں اس کے منعقد ہونے کیلئے بھی گواہوں کا سامنے ہونا شرط ہے، اگر دو مرد و عورت

بغیر گواہوں کے آپس میں نکاح کر لیں، اور دونوں میں کوئی مندرجہ ذیل بھی اختلاف و عکاسی نہ کرے

اس وقت بھی شرعاً وہ نکاح باطل کا عدم ہے جب تک گواہوں کے سامنے دونوں کا ایجاب و

قبول نہ ہو، اور سنت یہ ہے کہ نکاح اعلان عام کے ساتھ کیا جائے، اسی طرح کی اور بہت سی

شرائط اور آداب ہیں، جو معاملہ نکاح کے لئے ضروری یا مستنون ہیں۔

امام عظیم ابو حنیفہ اور بہت سے دوسرے حضرات ائمہ کے نزدیک تو نکاح میں معاملہ

اور معاہدہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت و سنت کی حیثیت غالب ہے، اور قرآن و سنت

کے شواہد اس پر قائم ہیں۔

نکاح کی اجمالی حقیقت معلوم کرنے کے بعد طلاق کو سمجھنے، طلاق کا حاصل نکاح کے

معاملے اور معاہدے کو ختم کرنا ہے، جس طرح شریعت اسلام نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت سے کر عام معاملات و معاہدات کی سطح سے بلند رکھا ہے اور بہت سی پابندیاں اس پر لگائی ہیں اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی عام لین دین کے معاملات کی طرح آزاد نہیں رکھا، کہ جب چاہیے جس طرح چاہے اس معاملہ کو فسخ کر دے، اور دوسرے سے معاملہ کرے، بلکہ اس کے لئے ایک خاص حکیمانہ قانون بنایا ہے، جس کا بیان آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے اسلامی تعلیمات کا اصل رخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لئے ہو، اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ اس معاملہ کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا، نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد تک کی نوبت پہنچتی ہے، اور پورا معاشرہ بڑی طرح اس سے متاثر ہوتا ہے، اسی لئے جو اسباب اور وجوہ اس معاملہ کو توڑنے کا سبب بن سکتے ہیں قرآن و سنت کی تعلیمات نے ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، زوجین کے ہر معاملے اور ہر حال کے لئے جو ہدایتیں قرآن و سنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، ٹوٹنے نہ پائے، ناموافقت کی صورت میں اول انہام و تفہیم کی پھر زجر و تنبیہ کی ہدایتیں دی گئیں، اور اگر بات بڑھ جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان ہی کے چند افراد کو حکم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی، آیت **حُكِّمَتْ قُنُ أَهْلِهِ وَحُكِّمَتْ قُنُ أَهْلِهِمَا** (۲۳۰) میں خاندان ہی کے افراد کو ثالث بنانے کا ارشاد کس قدر حکیمانہ ہے، کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر گیا تو بات بڑھ جائے اور دلوں میں زیادہ بعد پیدا ہو جائے کا خطرہ ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ اصلاح حال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، اور تعلق نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے طرفین کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے، ایسی حالت میں اس ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی طرفین کے لئے راحت اور سلامتی کی راہ ہو جاتی ہے، اس لئے شریعت اسلام نے بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا کہ رشتہ ازدواج ہر حال میں ناقابل فسخ ہی رہے، بلکہ طلاق اور فسخ نکاح کا قانون بنایا، طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا، جس میں عادتاً فکر و تدبیر اور تحمل کا مادہ عورت سے زائد ہوتا ہے، عورت کے ہاتھ میں یہ آزاد اختیار نہیں دیا، تاکہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہو جانا جو عورت میں بہ نسبت مرد کے زیادہ ہے وہ طلاق کا سبب نہ بن جائے۔

لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہیں رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم و ستم پہنچے ہی پر مجبور ہو جائے، اس کو یہ حق دیا کہ حاکم شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور شکایات

کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کر اسکے اطلاق حاصل کر سکے، پھر مرد کو طلاق کا آزاد اختیار تو دیا، مگر ازل تو یہ کہہ دیا کہ اس اختیار کا استعمال کرنا اللہ کے نزدیک بہت مبغوض و مکروہ ہے، صرف مجبوری کی حالت میں اجازت ہے، حدیث میں ارشاد نبوی ہے:

ابغض الحلال الى الله الطلاق
یعنی حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔

دوسری پابندی یہ لگائی کہ حالت غیظ و غضب میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کریں، اسی حکمت کے ماتحت حالت حیض میں طلاق دینے کو ممنوع قرار دیا، اور حالت طہر میں بھی جس طہر میں صحت و بہستری ہو چکی ہے، اس میں طلاق دینے کو اس بنا پر ممنوع قرار دیا کہ اس کی وجہ سے عورت کی عدت طویل ہو جائے گی، اس کو تکلیف ہوگی، ان دونوں چیزوں کے لئے قرآن کریم کا ارشاد یہ آیا **فَطَلِّقُوهُنَّ رِعَظَةً** (۲۳۱) یعنی طلاق دینا ہو تو ایسے وقت میں دو جس میں بلا وجہ عورت کی عدت طویل نہ ہو، حیض کی حالت میں طلاق ہوتی تو موجودہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا، اس کے بعد طہر اور پھر طہر کے بعد حیض سے عدت شمار ہوگی، اور جس طہر میں بہستری ہو چکی ہے، اس میں یہ امکان ہے کہ حل رہ گیا ہو تو عدت وضع حل تک طے مل ہو جائیگی طلاق دینے کے لئے مذکورہ وقت طہر کا مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اس انتظار کے وقفہ میں بہت ممکن ہو کہ غصہ فرد ہو، معافی تلافی ہو کر طلاق کا ارادہ ہی ختم ہو جائے۔

تیسری پابندی یہ لگائی کہ معاہدہ نکاح توڑنے اور فسخ کرنے کا طریقہ بھی وہ نہیں رکھا جو عام بیع و شراء کے معاملات و معاہدات کا ہے کہ ایک مرتبہ معاہدہ فسخ کر دیا تو اسی وقت اسی منٹ میں فریقین آزاد ہو گئے، اور پہلا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، ہر ایک کو اختیار ہو گیا کہ دوسرے سے معاہدہ کرے، بلکہ معاملہ نکاح کو قطع کرنے کے لئے ازل تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے، پھر اس پر عدت کی پابندی لگا دی کہ عدت پوری ہونے تک معاملہ نکاح کے بہت سے اثرات باقی رہیں گے عورت کو دوسرا نکاح حلال نہ ہوگا، مرد کے لئے بھی بعض پابندیاں باقی رہیں گی۔

چوتھی پابندی یہ لگائی کہ اگر صاف و صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی گئی ہے تو طلاق دیتے ہی نکاح نہیں ٹوٹا، بلکہ رشتہ ازدواج عدت پوری ہونے تک قائم ہے، دوسرا عدت میں اگر یہ اپنی طلاق سے رجوع کرے تو نکاح سابق بحال ہو جائے گا۔

لیکن یہ رجوع کرنے کا اختیار صرف ایک یا دو طلاق تک محدود کر دیا گیا، تاکہ کوئی ظالم شوہر ایسا نہ کر سکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے، پھر رجوع کر کے اپنی قید میں رکھتا رہے، اس کو

حکم یہ دیدیا کہ اگر کسی نے تیسری طلاق بھی دیدی تو اب اس کو رجوع کرنے کا بھی اختیار نہیں بلکہ اگر دونوں راضی ہو کر آپس میں دوبارہ بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے جس کا ذکر آگے آتا ہے، دوبارہ نکاح بھی آپس میں حلال نہیں۔

آیات مذکورہ میں اسی نظام طلاق کے اہم احکام کا ذکر ہے، اب ان آیات کے الفاظ پر غور کیجئے، پہلی آیت میں اول تو ارشاد فرمایا، اِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مَرْءَةً یعنی طلاق دوہی مرتبہ ہے، پھر ان دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ چمک رکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا، بلکہ عدت پوری ہونے تک مرد کو اختیار ہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر رجوع نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق ختم ہو جائے گا، اسی مضمون کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا فَاِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مَرْءَةً اَوْ كَسْرَتْ يَمِيْنًا یعنی یا تو شرعی قاعدے کے مطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر خوب صورتی اور خوش معاملگی کے ساتھ اس کی مدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

ابھی تیسری طلاق کا ذکر نہیں آیا، درمیان میں ایک اور مسئلہ بیان فرمادیا جو ایسے حالات میں عموماً زیر بحث آجاتا ہے، وہ یہ کہ بعض ظالم شوہر بیوی کو نہ رکھنا چاہتے ہیں، نہ اس کے حقوق کی فکر کرتے ہیں، نہ طلاق دیتے ہیں، بیوی تنگ ہوتی ہے، اس کی مجبوری سے یہ ناجائز فائدہ اٹھا کر طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال کا یا کم از کم مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، ارشاد فرمایا وَلَا يَحِلُّ لَكَمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا كَسَبَتْ هُنَّ لِنَفْسِكُمْ یعنی تمہارے لئے حلال نہیں کہ طلاق کے معاوضہ میں ان سے اپنا دیا ہوا مال اور مہر وغیرہ واپس لیتے۔ البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ فرمادی کہ اس میں مہر کی واپسی یا معافی جائز کر دی، وہ یہ کہ عورت بھی یہ محسوس کرے کہ طبیعتوں میں بعد و مخالفت کی وجہ سے میں شوہر کے حقوق ادا نہیں کر سکتی، اور مرد بھی یہی سمجھے تو ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مہر کی واپسی یا معافی کے بدلے میں طلاق دی جائے اور لی جائے۔

یہ مسئلہ ضمنی بیان فرمانے کے بعد پھر تیسری طلاق کا ذکر اس طرح فرمایا اِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مَرْءَةً فَلَا تَحِلُّ لَكَ مِنْ بَعْدِ مَحْضِ مَتْلَبِكَ وَرَوْجًا غَيْرَ ذَٰلِكَ۔ یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی (جو شرعاً پسندیدہ نہ تھی) تو اب نکاح کا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا، اور چونکہ اس نے شرعی حد دے سے تجاوز کیا کہ بلا وجہ تیسری طلاق دیدی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو وہ بھی نہیں کر سکتے اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدت طلاق پوری کر کے)

میں دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوق زوجیت ادا کر کے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے (یا مر جائے) تو اس کی مدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے، آیت کے آخری جملے اِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَتَرَاجَعَا کا یہی مطلب ہے۔

میں طلاق اور اس کے یہاں تشرآن کریم کے اسلوب بیان پر غور کرنے سے یہ بات پوری وضاحت احکام کی تفصیل کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک پہنچا جائے، تیسری طلاق تک نوبت پہنچانا مناسب نہیں، الفاظ اِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مَرْءَةً کے بعد تیسری طلاق کو حروف ان کے ساتھ اِنْ طَلَّقَهَا فرمانے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ سیدھی تعبیر یہ تھی کہ اِنْ طَلَّقَ مَرْءٌ مَرْءَةً کہا جاتا، اس کو چھوڑ کر یہ تعبیر اختیار کرنے میں واضح اشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک پہنچنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ امام مالک اور بہت سے فقہاء نے تیسری طلاق کی اجازت ہی نہیں دی وہ اس کو طلاق بدعت کہتے ہیں، اور دوسرے فقہاء نے میں طلاق کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، ان فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بھی طلاق سنت کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا مسنون اور محبوب ہے، بلکہ طلاق بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاق سنت اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں۔

قرآن و سنت کے ارشادات اور تعامل صحابہ و تابعین سے عد طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے تو طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالت طہر میں دیدے جس میں مجامعت نہ کی ہو، اور یہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، عدت ختم ہونے کے ساتھ رشتہ نکاح خود ٹوٹ جائے گا، اس کو فقہاء نے طلاق احسن کہا ہے، اور حضرات صحابہ نے اسی کو طلاق بہتر طریق قرار دیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں حضرت ابراہیم نخعی سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام طلاق دینے میں اس کو پسند کرتے تھے کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دی جائے اور عدت طلاق تین حیض پورے ہونے دینے جائیں تاکہ عورت آزاد ہو جائے۔

قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ سے اس کی بھی اجازت نکلتی ہے کہ دو طلاق تک دیدی جائے

مگر مؤثرات کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرمادیا گیا ہے کہ دو طلاق بیک لفظ دیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں، انطلاقاً خلافت سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی، مگر مؤثرات میں ایک ترتیب و تراخی کی طرف مشیر ہے، جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں، مثال سے یوں سمجھئے کہ کوئی شخص کسی کو دو روپیہ ایک دفعہ دیدے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہریں دو طلاق دی جائیں (روح المعانی)

بہر حال دو طلاقوں تک قرآن حکیم کے الفاظ سے ثابت ہے، اس لئے باتفاق ائمہ فقہاء یہ طلاق سنت میں داخل ہے، یعنی بدعت نہیں، تیسری طلاق کے غیر مستحسن ہونے کی طرف تو خود اسلوب قرآن میں واضح اشارہ پایا جاتا ہے، اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔ اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے تیسری طلاق کا مبغوض و مکروہ ہونا ثابت ہوتا ہے، امام نسائی نے بروایت محمود بن لبید نقل کیا ہے کہ:-

ان خبر رسول الله صلى الله عليه وسلم	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دی
وسمعتني عن رجل طلق امرأته	کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو
ثلاث تطليقات جميعا فقام	ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں، آپ غصہ
غضبا ناثما قال اي لعن بكتاب	ہو کر کھڑے ہو گئے، اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب
الله وانا بين اظهركم حتى قام	کی کتاب کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ میں تمہارے
رجل وقال يا رسول الله الا اقله	درمیان موجود ہوں اتنے میں ایک آدمی کھڑا
رفاني كتاب الطلاق، ص ۹۶	ہو گیا اور کہنے لگا، اے اللہ کے رسول کیا میں کو

قتل کر دوں!

اس حدیث کی اسناد کو حافظ ابن قیم نے صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے، (زاد المعاد) اور جوہر نفی میں علامہ اور دہلوی نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور ابن کثیر نے اسناد جید، ابن حبشہ نے ردائہ موقوف فرمایا ہے۔

اس بنا پر حضرت امام مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ فقہاء نے تیسری طلاق کو مطلقاً ناجائز اور طلاق بدعت قرار دیا ہے، دوسرے ائمہ نے تین طہروں میں تین طلاقوں کو اگرچہ طلاق سنت میں داخل کہہ کر طلاق بدعت سے نکال دیا ہے، مگر اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ شریعت اسلام نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے، بلکہ منشاء

شریعت کا تو یہ ہے کہ اول تو طلاق پر اقدام ہی ایک مبغوض و مکروہ فعل ہے، اگر مجبوری اس اقدام کی نوبت آجائے تو اس کے کم سے کم درجے یعنی ایک طلاق پر اکتفا کیا جائے اور عدت گزارنے میں تو عدت ختم ہوتے ہی یہی ایک طلاق رشتہ زوجیت قطع کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی، اور عورت آزاد ہو کر دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی گی، یہی طریقہ طلاق احسن کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ حکمت اور فائدہ بھی ہے کہ صریح الفاظ طلاق سے ایک طلاق دینے کی صورت میں طرفین کے لئے مصالحت کی راہیں کھلی ہیں، عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے تو صرف طلاق سے رجوع کر لینا بقا نکاح کے لئے کافی ہو گا، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ نکاح ٹوٹ چکے گا اور عورت آزاد ہو جائے گی، مگر پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ اگر دونوں میں اب مصالحت ہو جائے اور باہم نکاح کرنا چاہیں تو نکاح جدید اسی وقت ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس طلاق احسن کے طریقے پر اکتفا نہ کرے، دوران عدت میں مزید ایک طلاق صریح اور صاف لفظوں میں دیدے تو اس نے قطع نکاح کے دو درجے طے کر لئے جس کی ضرورت نہ تھی اور ایسا کرنا شرعاً پسندیدہ بھی نہ تھا، مگر بہر حال دو درجے طے ہو گئے، مگر ان دو درجوں کے طے ہو جانے تک بھی بات دیں رہی، کہ دوران عدت میں رجعت کا اختیار باقی ہو، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد بتراضی طرفین نکاح جدید ہو سکتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دو طلاق تک پہنچنے میں شوہر نے اپنے اختیارات کی ایک کڑی اور توڑ ڈالی اور اس سمرچہ پر پہنچ گیا کہ اگر اب ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے تو معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

جس شخص نے یہ دو درجے طلاق کے طے کر لئے اس کے لئے آگے یہ ہدایت دی گئی کہ **يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ رُدْ بِذِكْرِكَ نِكَاحَ امْرِئَاتِكَ الَّيْنَ أَنْكَحْتَ بِغَيْرِ إِذْنِي** یعنی طلاق سے رجعت کر کے روک لینا کافی ہے، اگر ایسا کر لیا تو سابق نکاح ہی کی بنیاد پر تعلق زوجیت بحال ہو جائے گا۔

دوسرے اس میں شوہر کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگر اس کا ارادہ اصلاح حال اور صلح و صفائی کے ساتھ زندگی گزارنے کا ہے تب تو رجعت پر اقدام کرے ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گزر کر تعلق زوجیت ختم ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ بغیر ارادہ اصلاح کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لئے رجعت کرے۔

اس کے بالمقابل **أَوْ تَسِرَ إِلَيْكِ الْبَغْضَاءُ** فرمایا، تسریع کے معنی کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں، اس سے اشارہ کر دیا کہ قطع تعلق کے لئے کسی مزید طلاق یا دوسرے کسی عمل کی

منرویت نہیں، بغیر رجعت کے عدت ختم ہو جانا ہی تعلقات زوجیت ختم کرنے کے لئے کافی ہو۔ امام حدیث ابو داؤد نے ہر روایت ابو زرین اسدی نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے الطَّلَاقِ مَوْثِقِینَ فرمایا، تیسری طلاق کا یہاں کیوں ذکر نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ تِسْرَیْ یُحْکِمُ بِهَا حِسَابَیْنِ جو بعد میں مذکور ہے وہی تیسری طلاق ہے، (روح المعانی) مطلب اس کا چہرہ علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جو کام تعلقات زوجیت کے کلی انقطاع کا تیسری طلاق سے ہوتا وہی کام اس طرزِ عمل سے ہو جاتا کہ عدت کے اندر رجعت ذکر کرے، اور جس طرح اِمْتِنَانِ کے ساتھ بِمَعْرِوْفٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت فرمادی کہ رجعت کر کے بیوی کو رد کا جائے تو حرجِ سلوک کے ساتھ رد کا جائے ہی طسرح تِسْرَیْ یُحْکِمُ کے ساتھ پیاختساب کی قید لگا کر یہ ہدایت دیدی کہ طلاق ایک معاملہ کا نسخ ہے، شریف انسان کا کام یہ ہے کہ جس طرح معاملہ اور معاہدہ خوش دلی اور حُجْنِ سَلُوک کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح اگر فریغ معاہدہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی غصہ یا لڑائی جھگڑے کے ساتھ نہ کریں، بلکہ وہ بھی احسان و سلوک کے ساتھ کریں، کہ رخصت کے وقت مطلقہ بیوی کو کچھ تحفہ، کپڑے وغیرہ کا دے کر رخصت کریں، جس کا ذکر قرآن کریم کی دوسری آیت میں ہے:

مَتَّعُوْهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرًا
وَعَلَى الْمَعْتَدِ قَدَرًا۔ (۲۳۶:۲)

اور اگر اس نے اس پر بھی ایسا نہ کیا بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب اس نے اپنے سائے اختیارات شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کر کے بلاوجہ اور بلا ضرورت ختم کر دیتے تو اب اس کی سزا یہ ہے کہ نہ رجعت ہو سکے اور نہ بغیر دوسری شادی کے آپس میں نکاح ہو سکے۔ اگر کسی نے غیر مستحسن یا غیر مشروع طریقہ سے اس کا جواب عقلی اور عرفی طور پر تو یہی ہے کہ کسی فعل کا جرم و تین طلاق دیدی تو اس کا اثر کیا ہوگا؟ گناہ ہونا اس کے مؤثر ہونے میں کہیں بھی مانع نہیں ہوتا، قتل ناحق جرم و گناہ ہے، مگر جس کو گولی یا تلوار مار کر قتل کیا گیا ہے وہ تو قتل ہو ہی جاتا ہے، اس کی موت تو اس کا انتظار نہیں کرتی کہ یہ گولی جائز طریقہ سے ماری گئی ہے یا ناجائز طریقہ سے، چوری کرنا اتفاق مذاہب جرم و گناہ ہے، مگر جو مال اس طرح غائب کر دیا گیا وہ تو ہاتھ سے بھل ہی جاتا کہ اس طرح تمام معاصی اور جبرائیم کا یہی حال ہے کہ ان کا جرم و گناہ ہونا ان کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتا۔

اس اصول کا مقتضی یہی ہے کہ شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرنا اور بلاوجہ

اپنے سائے ختیاارات طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہوا جیسا کہ سابقہ روایت میں لکھا جا چکا ہے، اور اس لئے جہور امت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، مگر ان سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا اقدام کر لیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہئے جو جائز طلاق کا ہوتا، یعنی تین طلاق واقع ہو جائیں، اور رجعت ہی کا ختیاار نہیں، نکاح جدید کا اختیار بھی سلب ہو جائے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس پر شاہد ہے کہ انہما بخصب کے باوجود آپ نے تینوں طلاقیں کو نافذ فرمایا، جس کے بہت سے واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں اور جن علماء نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں ان میں ان واقعات کو جمع کر دیا ہے، حال میں مولانا ابوالزہرہ محمد سرزاد صاحب کی کتاب عمدة الاثبات بھی اس مسئلہ پر شائع ہو گئی ہے جو بالکل کافی ہے، یہاں صرف دو تین حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

عمود بن لبید کی روایت جو بحوالہ نسائی اور پر لکھی گئی ہے اس میں تین طلاقیں بیک وقت دینے پر انتہائی ناراضگی کا اظہار تو منقول ہے، یہاں تک کہ بعض صحابہؓ نے اس شخص کو مستوجب قتل سمجھا، مگر یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کی طلاق کو ایک رجعی طلاق قرار دیکر بیوی اس کے حوالے کر دی ہو۔

بلکہ دوسری روایت جو آگے آتی ہے جس طرح اس میں اس کی تصریح موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر کی بیک وقت تین طلاق کو باوجود ناراضی کے نافذ فرمادیا، اسی طرح مذکورہ حدیث عمود بن لبید کے متعلق قاضی ابوبکر بن عربی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر کی تین طلاقیں کی طرح اس کی بھی تین طلاقیں کو نافذ فرمادیا تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

فلم یردہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
بل امضاه کما فی حدیث عویمر
العجلانی فی اللعان حیث مضی
طلاقہ الثلاث ولم یردہ
رشد یسین ابی داؤد طبع مصر ۱۳۱۳
از عمدة الاثبات

دوسری حدیث صدیقہ عائشہؓ کی صحیح بخاری میں بالفاظ ذیل ہے:

ان رجلاً طلق امرأته ثلاثاً
ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق

فَنَزَوِجَتْ فَطَلَّقَ فَتَلَ الْمَنِيِّ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّحَصَلَ
لِلْأَوَّلِ قَالَ لَاحِثِي يَذْوِقُ عَيْلَتَهَا
كَمَا ذَاقَهَا الْأَوَّلُ

صحیح بخاری، ص ۲۷۹، ج ۲
صحیح مسلم، ص ۴۶۳

دی اس عورت نے دوسری بگڑ نکاح کیا
تو اس دوسرے شوہر نے بھی اُسے طلاق
دیدئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا
کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہے؟
آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ دوسرا
شوہر اس سے بدمستی کر کے لطف اندوز نہ ہو جائے

جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا، اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی؟
انفاظ روایت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں طلاق بیک وقت دی گئی تھیں، شروع حدیث
فتح الباری عمدۃ القاری قسطلانی وغیرہ میں روایت کا مفہوم یہی تشرار دیا گیا ہے کہ بیک وقت تین
طلاق دی گئیں اور حدیث میں یہ فیصلہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاق کو
نافذ تشرار دے کر یہ حکم دیا کہ جب تک شوہر ثانی سے ہمبستری اور صحبت نہ ہو جائے، تو اس کے
طلاق دینے سے شوہر اول کے لئے حلال نہیں ہوگی۔

تیسری روایت حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا، اور اس کے بعد عرض کیا:

فَلَمَّا خَرَفَا قَالَ عُوَيْمِرُ كَذِبْتُ
عَلَيْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ اِنْ اَمْسَكْتَهَا
فَطَلَّقْتُهَا ثَلَاثًا قَبْلَ اَنْ يَأْمُرَهُ
النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
صحیح بخاری مع فتح الباری، ص ۳۰۱، ج ۲
صحیح مسلم، ص ۱۵۲۸

پس جب وہ دونوں لعان سے فارغ
ہو گئے تو عویمیر نے کہا اے اللہ کے رسول میں
اس پر مجبوت ہونے والا ہوں گا، اگر میں نے
اس کو اپنے پاس رکھ لیا تو عویمیر رضی اللہ عنہ
نے اس کو تین طلاقیں دیدی قبل اس کے
کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں حکم دے

اور ابو ذر نے اس واقعہ کو بروایت حضرت ہبل بن سعد نقل کر کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

فَالْفَنُّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَكَانَ مَا صَنَعَ عِنْدَ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
سَنَةً قَالَ سَعْدُ بْنُ حَفْصَةَ هَذَا
عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ فَمَضَتْ السَّنَةُ بَعْدَ فِي

تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے لہجہ
فرادیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے جو کچھ پیش آیا وہ سنت قرار پایا
سعد فرماتے ہیں اس موقع پر میں رسول
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا
پس اس کے بعد لعان کرنے والوں کے

الْمُتَلَاحِثِينَ اِنْ يَفْتَرِقَ بَيْنَهُمَا
ثُمَّ لَا يَجْعَلُ حَانَ اَبْدًا رَابِدًا وَادُّ
ص ۳۰۱، طبع اصم المطابع

ایسے میں یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ ان کے درمیان
تفریق کر دی جائے، اور پھر وہ کبھی بھی
جمع نہ ہوں؟

اس حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
حضرت عویمیر کی بیک وقت تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ فرمایا ہے۔

اور محمود بن لبید کی سابقہ روایت میں بھی ابو بکر ابن عربی کی روایت کے مطابق تین طلاقیں
کو نافذ کرنے کا ذکر موجود ہے، اور بالفرض یہ بھی نہ ہوتا تو یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کو ایک
طلاق رجعی تشرار دے کر بیوی اس کے سپرد کر دی ہو۔

الحاصل مذکورہ تینوں احادیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ اگرچہ تین طلاق بیک وقت رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سخت ناراضی کا موجب تھیں مگر بہر حال اثر ان کا یہی ہوا کہ تینوں
طلاقیں واقع قرار دی گئیں۔

حضرت فاروق اعظم کا واقعہ مذکورہ صدر تحریر سے یہ ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاق کو تین قرار
اور اس پر اشکال جواب دینا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا، مگر یہاں ایک
اشکال حضرت فاروق اعظم کے ایک واقعہ سے پیدا ہوتا ہے، جو صحیح مسلم اور اکثر کتب حدیث
میں منقول ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ
الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَابْنِ بَكْرٍ
وَمُسْتَبِينَ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَّاقُ
الثَّلَاثِ وَاحِدَةٌ فَقَالَ عُمَرُ بِنُ
الْغَطْلَبِ اِنَّ النَّاسَ قَلِيٌّ سَتَجْعَلُوا
فِي امْرِكَانَتِ لِهَمٍّ فَبِهِ اَنَاةٌ فَلَوْ
اَمْضَيْنَا عَلَيْهِمْ فَاَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ

تھنرت ابن عباس سے روایت ہے کہ:
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور حضرت
ابوبکر کے عہد خلافت میں اور حضرت عمر کی خلافت
کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ
تین طلاقیں کو ایک قرار دیا جاتا تھا تو حضرت عمر
نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں، ایک ایسا معاملہ
میں جس میں ان کے لئے ہلکتی تھی تو مناسب رہو گا
ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں، تو آپ نے ان پر نافذ کر دیا

(صحیح مسلم، ص ۴۴، ج ۱)

فاروق اعظم کا یہ اعلان فقہاء صحابہ کے مشورہ سے صحابہ و تابعین کے مجمع عام میں ہوا کسی سے
اس پر انکار یا تردید منقول نہیں، اسی لئے حافظ حدیث امام ابن حجر المذہبی نے اس پر اجماع نقل کیا
ہے، ذر قانی شرح مؤطا میں یہ الفاظ ہیں:

والجمہور علی وقوع الثلاث بل
یحییٰ ابن عبد البر الاجماع
قائل ان خلافہ لا یلتفت الیہ
وذرقانی شرح مؤطا ص ۱۶۷ (۳۳۰)
اور شیخ الاسلام نووی نے شرح مسلم میں فرمایا:
قال الشافعی ومالك والوحيفة
راحمد وجماهير العلماء من
السلف والخلف يعق الثلاث
وقال طائفة وبعض اهل الظاهر
لا يعقون الا واحدًا۔

(شرح مسلم ص ۱۳۴۸)

امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں منسرایا:

فخطب عمر بن الخطاب
جميعاً وفيهم اصحاب رسول الله
صلی اللہ علیہ وسلم رضی اللہ
عنہم الذین قد علموا ما تقدم
من ذلك في زمن رسول الله
صلی اللہ علیہ وسلم فلم ينكر علیہ
منهم منكر ولم يدفعه دافع
(شرح معانی الآثار ص ۲۸۹)

مذکورہ واقعہ میں اگرچہ امت کے لئے عمل کی راہ باجماع صحابہ و تابعین معتمد ہو گئی کہ تین
طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہے، مگر
اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی، اور بعض
دوسرے شخص سے نکاح و طلاق کے اس کے لئے حلال نہ ہوگی۔

لیکن علمی اور فطری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد
روایات حدیث کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر
خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے، اس کو رجعت یا نکاح جسد کی

اجازت نہیں دی، پھر اس واقعہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے اس کلام کا کیا مطلب ہوگا،
کہ عہد رسالت میں اور عہد صدیقی میں اور دو سال تک عہد فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا
تھا، فاروق اعظمؓ نے تین طلاق کا فیصلہ منسرایا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اسی طرح تسلیم کر لیا جائے کہ عہد رسالت، عہد صدیقی میں
تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا، تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا، اور بالفرض
ان سے کوئی غلطی بھی ہو گئی تھی تو تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو کیسے تسلیم کر لیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضرات فقہاء و محدثین نے مختلف جوابات دیئے ہیں، ان میں
صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جس کو امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اصح کہہ کر نقل کیا ہے،
کہ فاروق اعظمؓ کا یہ منسردمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع طلاق ثلاث کی ایک خاص صورت
کے متعلق منسردمانا جائے، وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ بیک وقت طلاق تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق
کہے یا میں نے طلاق دی طلاق دی طلاق دی کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں، ایک یہ کہ کہنے والے
نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں، دوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لئے
مکر رہا ہو، تین طلاق کی نیت نہ ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی کے اقرار سے
ہو سکتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی،
اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ محض تاکید
کے لئے یہ الفاظ مکرر ہوئے تھے تو آپ اس کے حلفی بیان کی تصدیق فرمادیتے اور اس کو ایک ہی
طلاق قرار دیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ
انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ البتہ کے ساتھ طلاق دیدی تھی، یہ لفظ عرب کے عرب عام میں تین
طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، مگر میں اس کا مفہوم صریح نہیں تھا، اور حضرت رکانہؓ نے کہا کہ میری
نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے ان کو قسم دی، انہوں نے اس پر حلف کر لیا، تو آپ نے ایک ہی طلاق قرار دیدی۔

یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی میں مختلف سندوں اور مختلف الفاظ کے
ساتھ منقول ہے، بعض الفاظ میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں
مگر ابوداؤد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکانہؓ نے لفظ البتہ سے طلاق دی تھی، یہ لفظ چونکہ
عام طور پر تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے کسی راوی نے اس کو تین طلاق سے تعبیر کر دیا ہو

بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکائذ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انھوں نے حلف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، اُن سوال کی کوئی ضرورت رہتی۔ اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و نیت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار گھٹ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بیوی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو سہی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے، انھوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب لوں کی مخفی نیت اور صاحب معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکورہ صدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انھوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی
امورکانت لہم فیہ اناة فلو
امضینا علیہم

”لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے
معاملہ میں جن میں اُن کے لئے ہلکت تھی،
تو مناسب بیگا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں“

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرار طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت میں بھی تین ہی قرار دی جاتی تھیں، ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا اصرار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تھا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف کیا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، والحمد للہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شرح حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے، واللہ الموفق والبعید

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی تھیں تو عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی مدت کو تو رکھ لو ان کو موافق دستور کے یا

سَرَّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ

چھوڑ دو ان کو مکمل طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ اُن پر زیادت کر دو اور جو ایسا

يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا

کر گنجائش بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنس

وَأَذْكُرُوا لِعَمَّتِ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو اتاری تم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةَ يَعِظُكُمْ بِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ

بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکائذ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انھوں نے حلف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، اُن سوال کی کوئی ضرورت رہتی۔ اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و نیت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا ماحیا گھٹ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بیوی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو سہی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے، انھوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب لوں کی مخفی نیت اور صاحب معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکورہ صدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انھوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی
امور کانت لهم فیہ اناة فلو
امضینا علیہم

”لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے
معاملہ میں جن میں اُن کے لئے ہلکت تھی،
تو مناسب بیگا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں“

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرار طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت میں بھی تین ہی قرار دی جاتی تھیں، ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا اصرار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تھا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف کیا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، والحمد للہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شرح حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے، واللہ الموفق والبعید

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی تھیں تو عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی مدت کو تو رکھ لو ان کو موافق دستور کے یا

سَرَّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَنْ

چھوڑ دو ان کو مکمل طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ اُن پر زیادت کر دو اور جو ایسا

يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَةَ اللَّهِ هُزُوًا ۚ

کر چکا وہ بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنس

وَأَذْكُرُوا لِعَمَتِ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو اتاری تم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةَ يَعْطِيكُمْ بِهِ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ

عَلِيمٌ ۝ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَبُغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ

جانتا ہے، اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو اب نہ رد کرو ان کو

أَنْ يَتَّكِنَ آُرَ وَأَجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ذَلِكَ

اس سے کہ نکاح کر لیں اپنے انہی خاوندوں سے جبکہ راضی ہو جاویں آپس میں موافق دستور کے یہ نصیحت

يُوعِظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَُمَ آَزْكِي

اس کو کی جاتی ہے جو کہ تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اس میں تمہارا مال

لَكُمْ وَأَطْهَرٌ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

بڑی سخنراں پر اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۸، عورتوں کو طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں تو تم کو مکلف رکھنے کی ممانعت

ان کو قاعدہ کے موافق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدہ کے موافق ان کو

رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت رد کرو اس ارادہ سے کہ ان پر ظلم کیا جائے، اور جو شخص یہاں

برتاؤ کرے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اور حق تعالیٰ کے احکام کو کھیل نہ بناؤ، اور حق تعالیٰ کی جرم پر عینیں یہاں

کو یاد کرو، اور خصوصاً کتاب و حکمت کی باتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر (اس حیثیت سے) نازل فرمائی ہے کہ ان کے

ذریعہ تم کو نصیحت فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

حکم نمبر ۲۹، عورتوں کو نکاح ثانی اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دیدو اور عورتیں اپنی میعادِ عدت پوری کر چکیں

سے منع کرنے کی ممانعت تو تم ان کو اس امر سے مت رد کرو کہ وہ اپنے (تجویز کئے ہوئے) شوہروں سے نکاح

کر لیں جبکہ باہم سب رضا مند ہو جائیں قاعدہ کے موافق، اس ضمن میں نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے

اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر یقین رکھتا ہو، اس نصیحت کا قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ صغائی اور زیادہ پاکی کی

بات ہے، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔

معارف و مسائل

ان سے پہلے بھی دو آیاتوں میں قانونِ طلاق کی اہم دفعات اور اسلام میں طلاق کا عادلانہ اور معتدلانہ نظام قرآن کریم کے حکیمانہ اسلوب کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اب مذکورہ صدر و آیاتوں میں چند احکام و مسائل مذکور ہیں۔

احکام طلاق کے بعد رجعت یا انقطاع پہلی آیت میں پہلا مسئلہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ جب مطلقہ رجعی نکاح دونوں کے لئے خاص ہدایات عورتوں کی عدت گزرنے کے قریب آئے تو شوہر کو دو اختیار

حاصل ہیں، ایک یہ کہ رجعت کر کے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دے، دوسرے یہ کہ رجعت نہ

کرے، اور تعلقِ نکاح ختم کر کے اس کو بالکل آزاد کر دے۔

لیکن دونوں اختیاردوں کے ساتھ قرآن کریم نے یہ قید لگائی کہ رکھنا ہو تو قاعدہ کے

مطابق رکھا جائے، اور چھوڑنا ہو تب بھی شرعی قاعدے کے مطابق چھوڑا جائے، اس میں

بالمختصر ذکرِ کالفظ دونوں جگہ ملجھ ملجھ لاکر اس کی طرف اشارہ فرما دیا ہے کہ رجعت کے

لئے بھی کچھ شرائط اور قواعد ہیں اور آزاد کرنے کے لئے بھی، دونوں حالتوں میں سے جس کو بھی

اختیار کرے شرعی قاعدے کے موافق کرے، محض وقتی غصے یا جذبات کے ماتحت نہ کرے اور

عورتوں کے شرعی قواعد کا کچھ حصہ تو خود فتران میں بیان کر دیا گیا ہے، باقی تفصیلات رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

مثلاً اگر واقعہ طلاق کے بعد مفارقت کے ناگوار عواقب کا خیال کر کے رہے یہ ہو جائے

کہ رجعت کر کے نکاح قائم رکھنا ہے تو اس کے لئے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے غصہ ناراضی

کو دل سے نکال کر خیر معاشرت کے ساتھ زندگی گزارنا اور حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنا

پیش نظر ہو، عورت کو اپنی قید میں رکھ کر سستانا اور تکلیف پہنچانا مقصود نہ ہو، اسی کے لئے آیہ

متذکرہ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے، وَلَا تَمْسِكُوهُنَّ مِنزَآرٍ لِّتَعْتَدْنَ ۚ یعنی عورتوں کو اپنی

نکاح میں اس لئے نہ رد کرو کہ ان پر ظلم کرو۔

دوسرا قاعدہ رجعت کا یہ ہے جو سورۃ طلاق میں ذکر کیا گیا ہے، وَأَشْهَدُ وَأَذْذِ مَحْ

عَدِلَ قَبْلُكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ بَلَدُ (۲۰۶:۵) اور آپس میں سے دو معتبر شخص کو گواہ کر لو، پھر اگر

گواہی کی حاجت پڑے تو ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے بلا رو رعایت گواہی دو

مطلب یہ ہے کہ جب رجعت کا ارادہ کرو تو اس پر دو معتبر مسلمانوں کو گواہ بنا لو، اس

میں کمی فائدہ ہے، ایک یہ کہ اگر عورت کی طرف سے رجعت کے خلاف کوئی دعویٰ ہو تو اس

گواہی سے کام لیا جاسکے۔

دوسرے خود انسان کو اپنے نفس پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، اگر رجعت پر شہادت

کا قاعدہ نہ جاری کیا جاتے تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص عدت پوری گذر جانے کے بعد بھی اپنی

غرض یا شیطانی اغوار سے یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ میں نے عدت گزرنے سے پہلے رجعت کر لی تھی۔

ان مفاسد کے انسداد کے لئے فتران نے یہ قاعدہ مقرر فرما دیا کہ رجعت کرو تو اس پر

دو معتبر گواہ بناو۔

معاملہ کا دوسرا رخ یہ تھا کہ عدت کی ہمت اور غور و فکر کا وقت ملنے کے باوجود دونوں کا انقباض اور ناراضی ختم نہ ہوئی اور قطع تعلقی ہی برقرار رکھنا، تو اس صورت میں بہت اندیشہ ہوتا ہے کہ دشمنی اور انتقامی جذبے بھڑک اٹھیں، جن کا اثر دو شخصوں سے متعدد ہو کر دو خاندانوں تک پہنچ سکتا ہے، اور طرفین کی دنیا و آخرت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، اس کے انسداد کے لئے مختصر طور پر تو یہی ارشاد فرمایا گیا کہ **اَوْ مَتْرُكُوْنٌ بِمَخْرُؤٍ** یعنی چھوڑنا اور قطع کرنا ہی ہو تو وہ بھی قاعدے کے موافق کریں اس قاعدہ کی کچھ تفصیلات خود مترآن کریم میں مذکور ہیں، باقی تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قولی اور عملی بیان سے ثابت ہیں۔

مثلاً اس سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا، **وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا اَيْمَانًا اَنْتُمْ بَيْنَكُمْ** شیعہ، یعنی بلا کسی عذر شرعی کے ایسا نہ کرو کہ عورت سے طلاق کے معاوضہ میں اپنا دیا ہوا سامان یا مہر واپس لے لو، یا کچھ اور معاوضہ طلب کرو۔

اور اس کے بعد ایک آیت میں ارشاد فرمایا **وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِمَا مَعَرُوْنَ حَقًّا عَلٰى الْمُسْتَقِيْنِ** (۲۴/۱۲) سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق مقرر ہوا ہے، ان پر جو اللہ سے ڈرتے ہیں، فائدہ پہنچانے کی تفسیر، رخصت کے وقت مطلقہ عورت کو کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا کپڑے کا دینا ہے، اس میں طلاق دینے والے شوہر پر مطلقہ بی بی کے کچھ حقوق واجب و لازم کر کے اور کچھ بطور احسان و سلوک کے عائد کر دیئے گئے ہیں، جو بلند اخلاق اور محسن معاشرت کی پاکیزہ تعلیم ہے، اور جس میں اس طرف ہدایت ہے کہ جس طرح نکاح ایک معاملہ اور باہمی معاہدہ تھا اسی طرح طلاق بھی ایک معاملہ کا ختم کرنا ہے، اس فیج معاملہ کو دشمنی اور جنگ و جدل کا سامان بنانے کی کوئی وجہ نہیں، معاملہ کا انقطاع بھی خوب صورتی اور حسن سلوک کے ساتھ ہونا چاہئے، اگر طلاق کے بعد مطلقہ بی بی کو فائدہ پہنچایا جائے۔

اس فائدہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایام عدت میں اس کو اپنے گھر میں رہنے دے، اس کا پورا خرچ برداشت کرے، اگر مہر اب تک نہیں دیا ہے اور خلوت ہو چکی تو پورا مہر ادا کرے، اور خلوت سے پہلے ہی طلاق کا واقعہ پیش آگیا ہے تو آدھا ہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرے، یہ تو سب حقیقی واجب ہیں جو طلاق دینے والے کو لازمی طور پر ادا کرنا ہیں، اور مستحب اور افضل یہ بھی ہے کہ مطلقہ بی بی کو رخصت کرنے کے وقت کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا دے کر رخصت کیا جائے، سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے کہ جو چیسریں عرفاً جنگ و جدل اور لڑائی جھگڑے کے اسباب اور خاندانوں کی تباہی تک پہنچانے والی ہیں ان کو دائمی محبت و مسرت میں تبدیل کر دیا گیا۔

ان سب احکام کے بعد ارشاد فرمایا **وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ**، یعنی جو شخص ان حدود و خداوندی کے خلاف کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، آخرت میں تو ظاہر ہے کہ وہاں ہر ظلم و جور کا انتقام بارگاہ خداوندی میں لیا جائے گا، اور جب تک مظلوم کا بدلہ ظالم سے نہ لے لیا جائے گا آگے نہ بڑھے گا۔

اور دنیا میں بھی اگر بصیرت اور تجربہ کے ساتھ غور کیا جائے تو نظر آئے گا کوئی ظالم بظاہر تو مظلوم پر ظلم کر کے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتا ہے، لیکن اس کے نتائج بدایں دنیا میں بھی اس کو اکثر ذلیل و خوار کرتے ہیں، اور وہ سمجھے یا نہ سمجھے اکثر ایسی آفتوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ اس کو دنیا میں بھی کچھ نہ کچھ چکھنا پڑتا ہے، اسی کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے

پنداشت بستمگر کہ جفا بر ما کرد

بر گردن دے بماند و بر ما بگذشت

مترآن کریم کا اسلوب حکیم اور خاص انداز بیان ہے، کہ وہ قانون کو دنیا کے قوانین تعزیرات کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مرتبہ انداز میں قانون کا بیان اس کی حکمت و مصلحت کی وضاحت اس کے خلاف کرنے میں انسان کی مضرت و نقصان کا ایسا سلسلہ بیان کرتا ہے جس کو دیکھ کر کوئی انسان جو انسانیت کے جامے سے باہر ہو ان جرائم پر اقدام کر ہی نہیں سکتا، ہر قانون کے پیچھے خدا کا خوف، آخرت کا حساب، لایا جاتا ہے۔

نکاح و طلاق کو کھیل نہ بناؤ | دوسرا مسئلہ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو کھیل نہ بناؤ، **وَلَا تَخْلِعُوْا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا**، کھیل بنانے کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ نکاح و طلاق کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو حدود و شروط مقرر کر دیئے ہیں ان کی خلاف ورزی کرنا، اور دوسری تفسیر حضرت ابو الدرداءؓ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ طلاق دے کر یا غلام آزاد کر کے مکر جاتے اور کہتے تھے کہ میں نے تو ہنسی مذاق میں کہہ دیا تھا، طلاق یا عتاق کی نیت نہیں تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ طلاق و نکاح کو اگر کسی نے کھیل یا مذاق میں بھی پورا کر دیا تو وہ نافذ ہو جائے گا نیت نہ کرنے کا عذر مسموع نہ ہو گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں ہنسی کے طور پر کرنا اور واقعی طور پر کرنا دونوں برابر ہیں، ایک طلاق، دوسرے عتاق، تیسرے نکاح راخرجہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ وابن المنذر عن عبادۃ بن الصامتؓ۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اس حدیث میں یہ الفاظ منقول ہیں،

فرمایا گیا کہ اگر ان ردقوں کی رضامندی نہ ہو کوئی کسی پر زبردستی کرنا چاہے تو سب کو روکنے کا حق ہے، یا رضامندی بھی ہو مگر شرعی قاعدہ کے موافق نہ ہو، مثلاً بلاقح آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنے پر رضامند ہو جائیں، یا تین طلاقیں کے بعد ناجائز طور پر آپس میں نکاح کر لیں، یا ایام عدت میں دوسرے شوہر سے نکاح کا ارادہ ہو تو ہر مسلمان کو بالخصوص اُن لوگوں کو جن کا ان مرد و عورت کے ساتھ تعلق ہے ردکنے کا حق حاصل ہے، بلکہ بہتر استطاعت روکنا واجب ہے۔

اسی طرح کوئی لڑکی بلا اجازت اپنے اولیاء کے اپنے کفو کے خلاف دوسرے کفو میں نکاح کرنا چاہے، یا اپنے بہرِ مثل سے کم پر نکاح کرنا چاہے جس کا اثر خاندان پر پڑتا ہے، جس کا اس کو حق نہیں، تو یہ رضامندی بھی قاعدہ شرعی کے مطابق نہیں، اس صورت میں لڑکی کے اولیاء کو اس نکاح سے روکنے کا حق حاصل ہے، اِذَا تَرَ اَهْلًا کے الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ناقلم بالغہ لڑکی کا نکاح بغیر اس کی رضایا اجازت کے نہیں ہو سکتا۔

آیت کے آخر میں تین جملے ارشاد فرمائے گئے، ایک یہ کہ ذَلِیْقٌ یُّوعَظُّ بِہِ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ، یعنی یہ احکام اُن لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، اس میں اشارہ ضرور دیا گیا کہ اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی ان احکام الہیہ کا پورا پابند ہو، اور جو لوگ ان احکام کے اتباع میں کوتاہی کرتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ ان کے ایمان میں خلل ہے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فسر مایا کہ **ذِیْکُمُ اَزْکٰی لَکُمُ وَاٰخِرُھُمْ** یعنی ان احکام کی پابندی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔ اس میں اشارہ فرمایا گیا کہ ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ گناہوں کی غلاظت میں آلودگی اور فتنہ و فساد ہے، کیونکہ عاتلہ بالغہ جو ان لڑکیوں کو مطلقاً نکاح سے روکا گیا تو ایک طرف اُن پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہے، اور دوسری طرف اُن کی عفت و عصمت کو خطرہ میں ڈالنا ہے، تیسرے اگر خدا نخواستہ وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں، تو اس کا وبال ان لوگوں پر بھی عائد ہوگا جنہوں نے ان کو نکاح سے روکا، اور وبالِ آخرت سے پہلے بہت ممکن ہے کہ ان مجبور عورتوں کا یہ ابتلا، خود مردوں میں جنگ و جدال اور قتل و قتال تک نوبت پہنچا دے جیسا کہ رات دن مشاہدہ میں آتا ہے، اس صورت میں وبالِ آخرت سے پہلے ان کا عمل دنیا ہی میں وبال بن جائے گا، اور اگر مطلقاً نکاح سے تو نہ روکا، مگر ان کی پسند کے خلاف دوسرے شخص سے نکاح پر مجبور کیا گیا تو اس کا نتیجہ بھی دائمی مخالفت اور فتنہ و فساد یا طلاق و خلع ہوگا، جس کے ناگوار

اثرات ظاہر ہیں، اس لئے فرمایا گیا کہ ان کو ان کے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کرنے سے باز رکھنا ہی تمھارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔

تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** یعنی تمہاری مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔ اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ مطلقہ عورتوں کو نکاح سے روکتے ہیں وہ اپنے نزدیک اس میں کچھ مصالح اور فوائد سوچتے ہیں، مثلاً اپنی عزت و غیرت کا تحفظ، یا یہ کہ ان کی شادی کے بدلے کچھ مالی منفعت حاصل کی جائے، اس شیطانی تمکبیس اور بے جا مصلحت اندیشی کے ازالہ کے لئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور فائدوں سے خوب واقف ہیں، ان کی رعایت کر کے احکام دیتے ہیں اور تم چونکہ حقائق امور اور معاملات کے انجام سے بے خبر ہو، اس لئے اپنے ناتمام غور و فکر اور ناقص رائے سے کبھی ایسی چیزوں کو مصلحت اور فائدہ سمجھ لیتے ہو جن میں تمہاری ہلاکت و بربادی ہے، تم جس عزت و غیرت کو تمنا کرتے پھرتے ہو اگر مطلقہ عورتیں بے قابو ہو گئیں تو سب عزت خاک میں مل جائے گی، اور مالی منافع کے ناجائز تصورات ممکن ہے کہ تمہیں ایسے فتنوں اور جھگڑوں میں مبتلا کر دیں جن میں مال کے ساتھ جان کا بھی خطرہ ہو جائے۔

قانون درازی اور اسکی تنفیذ میں
مصریٰ کریم کا بیضیر حکماء ہوں

مصریٰ کریم نے اس جگہ ایک قانون پیش فرمایا کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق نکاح سے رد کرنا جرم ہے، اس قانون کو بیان فرمانے کے بعد اس پر عمل کرنے کو سہل اور اس کے لئے عوام کے ذہنوں کو ہموار کرنے کے واسطے تین جملے ارشاد فرمائے جن میں سے پہلے جملے میں رد و قیامت کے ماب اور جرائم کی سزا سے ڈرا کر انسان کو اس قانون پر عمل کرنے کے لئے آمادہ فرمایا، دوسرے جملے میں اس قانون کی خلاف ورزی میں جو مفاسد اور انسانیت کے لئے مضرتیں ہیں ان کو مبتلا کر قانون کی پابندی کے لئے تیار کیا، تیسرے جملے میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمہاری اپنی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون کی پابندی کرو، اس کے خلاف کرنے میں اگر تم کوئی مصلحت سوچتے ہو تو وہ تمہاری کوتاہ نظری اور عواقب سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

قرآن کریم کا یہ اسلوب اور طرزِ بیان صرف یہیں نہیں بلکہ تمام احکام میں جاری ہے کہ ایک قانون بتایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ اور آخرت کے حساب و عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، ہر قانون کے آگے پیچھے **إِنَّمَا لِلَّهِ ثَمَرُ النَّاسِ** یا **إِنَّ اللَّهَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ**، **إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ** وغیرہ جملے لگائے ہوئے ہیں، قرآن ساری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے ایک مکمل نظامِ حیات اور ہر شعبہ زندگی پر حاوی قانون

ہو، اس میں حدود و تعزیرات کا بھی بیان ہے، لیکن اس کی اداساری دنیا کے قانون کی کتابوں سے نرالی ہے، اس کا طرز بیان حاکمانہ سے زیادہ مرتبہ ہے، اس میں ہر قانون کے بیان کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی انسان اس قانون کی خلاف ورزی کر کے مستحق سزا نہ بنے، دنیا کی حکومتوں کی طرح نہیں کہ انہوں نے ایک قانون بنادیا، اور شائع کر دیا، جو کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنی سزا بھگتنا ہے۔

اس کے علاوہ اس اسلوب قرآن اور اس کے مخصوص انداز بیان سے ایک دُور رس بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دیکھنے سننے کے بعد انسان اس قانون کی پابندی صرف اس بناء پر نہیں کرتا کہ اگر خلاف کرے گا تو دنیا میں اس کو کوئی سزا مل جائے گی، بلکہ دنیا کی سزا سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی سزا کی فکر ہوتی ہے، اور اسی فکر کی بناء پر اس کا ظاہر و باطن خفیہ و علانیہ برابر ہو جاتا ہے، وہ کسی ایسی جگہ میں بھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا جہاں کسی ظاہری یا خفیہ پولیس کی بھی رسائی نہ ہو، کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ذرہ ذرہ سے باخبر ہیں، یہی سبب ہے کہ شرآئی تعلیم نے جو اصول معاشرت تیار کئے تھے ہر مسلمان اس کی پابندی کو اپنا مقصد حیات تصور کرتا تھا۔

شرآئی نظام حکومت کا یہی ہستیاز ہے کہ اس میں ایک طرف قانون کی حدود و قیود کا ذکر ہے تو دوسری طرف ترغیب و ترہیب کے ذریعہ انسان کے اخلاق و کردار کو ایسا بلند کیا گیا ہے کہ قانونی حدود و قیود اس کے لئے ایک طبعی چیز بن جاتی ہیں، جس کے سامنے وہ اپنے جذبات اور تمام نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے، دنیا کی حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور انہیں جسرم و سزائے واقعات پر ذرا گہری نظر ڈالنے تو معلوم ہو گا کہ نرے قانون سے کبھی کسی قوم یا فرد کی اصلاح نہیں ہوتی محض پولیس اور فوج سے کبھی جرائم کا انسداد نہیں ہوا جب تک قانون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خوف و عظمت کا سکہ اس کے قلب پر نہ بیٹھے، جرائم سے روکنے وال چیز دراصل خوفِ خدا اور خوفِ حسابِ آخرت ہے، یہ نہ ہو تو کوئی شخص کسی سے جرائم کو نہیں چھڑا سکتا۔

وَالْوَالِدَتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ

اور بچے والی عورتیں دودھ پلا دیں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری

أَنْ يُلَيَّمَنَّ الرُّضَاعَةَ عَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِشْقُهُنَّ وَكِتَابَتُهُنَّ

کرے دودھ کی مدت اور لڑکے والے یمن باپ پر ہے کھانا اور کپڑا اُن عورتوں کا

بِالْمَعْرُوفِ لَا تَكْلَفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارُّ وَالِدُهَا بَوْلًا

موافق دستور کے، تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر اس کی گنجائش کی موافق، نہ نقصان دیا جائے ان کو اس کے بچہ کی

وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ يُولَدُ لَهُ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَرَادَ الْفَصْلُ

وجہ سے اور نہ اس کو جس کا وہ بچہ ہے یعنی باپ کو اس کے بچہ کی وجہ اور اُنہوں پر بھی یہی لازم ہے پھر اگر باپ چاہیں کہ دودھ

عَنْ تَرْضَاهُ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَادَ ثَمَرَانِ

پھر اگر باپ یا والدین دونوں کے اندر ہی اپنی رضا اور مشورے سے تو اُن پر کچھ گناہ نہیں اور اگر تم دوگ چاہو کہ دودھ

تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا أَنْتُمْ

پلاؤ کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں جب کہ حوالے کر دو جو تم نے دینا پھر یا تمہارا

بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

موافق دستور کے اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۱۳ رضاعت | اور مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں (یہ مدت اس کے لئے ہے) جو شیر خوارگی

کی تکمیل کرنا چاہے، اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان ماؤں کا کھانا کپڑا قاعدہ کے موافق، اور کسی شخص کو کوئی حکم نہیں دیا

جائے اگر اس کی برداشت کے موافق، کسی ماں کو یہ نہیں پوچھنا چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ کسی کے بچے کی تکلیف دینی

چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور اگر باپ زندہ نہ ہو تو (مثلاً طریق مذکور کے) (بچہ کی پرورش کا انتظام) اس کے (محرم قرابت

دار کے) ذمہ ہے جو (شرعاً بچہ کا) وارث (ہونے کا حق رکھتا) ہے پھر (یہ بچہ لوگ) اگر دونوں (ماں اور باپ) دو سال تک (یا) دودھ

دودھ پھر دینا چاہیں، یہی رضاعتی اور مشورے سے تو بھی ان دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں اور اگر تم لوگ (ماں باپ کے ہوتے

ہوئے بھی کسی مصلحت ضروریہ سے مثلاً یہ کہ ماں کا دودھ اچھا نہیں پتے کو منہ نہ ہوگا) اپنے بچوں کو کسی اور ماں کا دودھ پلانا چاہو

تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ اُن کے حوالے کر دو جو کچھ ان کو دینا ہے کیا ہے، قاعدہ کے موافق، اور حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور

یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہا ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں رضاعت یعنی بچوں کو دودھ پلانے کے متعلق احکام ہیں، اس سے پہلے اور

بعد کی آیات میں طلاق کے احکام مذکور ہیں، درمیان میں دودھ پلانے کے احکام اس مناسبت سے

ذکر کئے گئے ہیں کہ عموماً طلاق کے بعد بچوں کی پرورش اور دودھ پلانے یا پلوانے کے معاملات زیر نزاع آجاتے ہیں اور ان میں جھگڑے فساد ہوتے ہیں، اس لئے اس آیت میں ایسے مسئلہ احکام بیان فرمادیے گئے جو عورت و مرد دونوں کے لئے سہل اور مناسب ہیں، خواہ دودھ پلانے یا چھڑانے کے معاملات قیام نکاح کی حالت میں پیش آئیں یا طلاق دینے کے بعد، بہرہ و صورت اس کا ایک ایسا نظام بتا دیا گیا جس سے جھگڑے فساد یا کسی فریق پر ظلم و تعدی کا راستہ نہ رہے۔ مثلاً آیت کے پہلے جملے میں ارشاد فرمایا، وَالَّذِينَ إِذَا أَتَوْا آلِهَةً يَسْأَلُونَ عَنْهَا وَقَالَ امْنِ جبکہ کوئی عذر قوی اس سے پہلے دودھ چھڑانے کے لئے مجبور نہ کرے۔

اس آیت سے رضاعت کے چند مسائل معلوم ہوئے۔

دودھ پلانا ماں کے | اول یہ کہ دودھ پلانا یا دیا ناں کے ذمہ واجب ہے، بلا عذر کسی مندرجہ نامراض کے ذمہ واجب ہے | سبب دودھ نہ پلانے تو گنہگار ہوگی، اور دودھ پلانے پر وہ شوہر سے کوئی اجرت و معاوضہ نہیں لے سکتی، جبکہ اس کے اپنی نکاح میں ہو، کیونکہ وہ اس کا اپنا فرض ہے۔

پوری مدت رضاعت | دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ پوری مدت رضاعت دو سال ہے، جب تک کوئی خاص عذر مانع نہ ہو بچے کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے لئے پوری مدت دو سال دی گئی ہے، اس کے بعد دودھ نہ پلایا جائے، البتہ بعض آیات قرآن اور احادیث کی بناء پر امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اگر تین مہینے یعنی ڈھائی سال کے عرصہ میں بھی دودھ پلادیا تو احکام رضاعت کے ثابت ہو جائیں گے، اور اگر بچے کی کمزوری وغیرہ کے عذر سے ایسا کیا گیا تو گناہ بھی نہ ہوگا، ڈھائی سال پورے ہونے کے بعد بچہ کو ماں کا دودھ پلانا باتفاق حرام ہے۔

اس آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد ہے وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لاکھٹ گئے نفس الاوشعہا، یعنی باپ کے ذمہ ہے ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق، کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیا جاتا جس کو وہ برداشت نہ کر سکے۔

اس میں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ ماؤں کے لئے تو قرآن نے لفظ وَالَّذِينَ استعمال کیا، مگر باپ کے لئے مختصر لفظ وَالَّذِينَ چھوڑ کر وَالَّذِينَ اختیار فرمایا، حالانکہ قرآن میں دوسری جگہ لفظ والد بھی مذکور ہے، لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ مگر یہاں والد کی جگہ مَوْلُودِ کے اختیار کرنے میں ایک خاص راز ہے، وہ یہ کہ پورے قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب اور طرز بیان ہے کہ وہ کسی قانون کو دنیا کی حکومتوں کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مرتباً اور مشفقاً

طرز سے بیان کرتا ہے، اور ایسے انداز سے بیان کرتا ہے، جس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا انسان کے لئے آسان ہو جائے۔

یہاں بھی چونکہ بچے کا نفقہ باپ کے ذمہ ڈالا گیا ہے، حالانکہ وہ ماں باپ کی مستاع مشترک ہے، تو ممکن تھا کہ باپ کو یہ حکم کچھ بھاری معلوم ہو اس لئے بجائے والد کے مَوْلُودِ کا لفظ اختیار کیا (وہ شخص جس کا بچہ ہے) اس میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگرچہ بچے کی تولید میں ماں اور باپ دونوں کی شرکت ضرور ہے، مگر بچہ باپ ہی کا کہلاتا ہے، نسب باپ ہی سے ملتا ہے، اور جب بچہ اس کا ہوا تو ذمہ داری خرچ کی اس کو بھاری نہ معلوم ہونی چاہئے۔ بچے کو دودھ پلانا ماں کے ذمہ | تیسرا مسئلہ شرعیہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ دودھ پلانا اور ماں کا نان و نفقہ و ضرورتیہاں کے ذمہ ہے، لیکن ماں کا نان نفقہ اور ضروریات زندگی باپ کے ذمہ ہیں | باپ کے ذمہ ہے، اور یہ ذمہ داری جس وقت تک بچے کی ماں اس کے نکاح میں یا عدت میں ہے اس وقت تک اور طلاق اور عدت پوری ہونے کے بعد نفقہ ضرورتیہ تو ختم ہو جائے گا، مگر بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ دینا باپ کے ذمہ پھر بھی لازم رہے گا (منظری)

زوجہ کا نفقہ شوہر کی حیثیت | چوتھا مسئلہ اس پر توافق ہے کہ میاں بیوی دونوں امیر مالدار ہوں تو نفقہ طلاق کے مناسب ہونا چاہئے یا زوجہ کی واجب ہوگا اور دونوں غریب ہوں تو نفقہ غریبانہ واجب ہوگا، البتہ جب دونوں کے حالات مالی مختلف ہوں تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، صاحب ہدایہ نے خصائص کے اس قول پر فتویٰ دیا ہے کہ عورت غریب اور مرد مال دار ہو تو اس کا نفقہ درمیانہ حیثیت کا دیا جائے گا کہ غریبوں سے زائد مال داروں سے کم، اور کرخی کے نزدیک اعتبار شوہر کے حال کا ہوگا، فتح القدیر میں بہت فقہاء کا فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، واللہ اعلم (فتح القدیر ج ۲ ص ۲۲۲)

آیت مذکورہ میں احکام کے بعد ارشاد فرمایا لَا تَنْفَارُوا إِلَىٰ الْيَتَامَىٰ وَالْيَتَامَىٰ يَتَوَكَّلُونَ عَلَيْكُمْ فَيَكُونُوا كَالْجُرُومِ یعنی نہ تو کسی ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف میں ڈالنا جائز ہے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے، مطلب یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ آپس میں ضد اضدی نہ کریں، مثلاً ماں دودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سجدہ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا بھی تو بچہ ہے، یہ مجبور ہوگی اور پلا دے گی، یا باپ مفلس ہے، اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں پھر دودھ پلانے سے اس لئے انکار کرے کہ اس کا بھی تو بچہ ہے، جھک مار کر کسی سے پلوالے گا۔

ماں کو دودھ پلانے پر مجبور | لَا تَنْفَارُوا إِلَىٰ الْيَتَامَىٰ کا بکوں کا ہے یا بچوں کا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کرنے یا نہ کرنے کی تفصیل | ماں اگر بچے کو دودھ پلانے سے کسی ضرورت کے سبب انکار کرے

تو باپ کو اسے مجبور کرنا جائز نہیں، اور اگر بچہ کسی دوسری عورت یا جانور کا دودھ نہیں لیتا تو ماں کو مجبور کیا جائے گا، یہ مسئلہ ذیل آیت میں ہے۔

عورت جب تک نکاح میں ہے چھٹا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچہ کی ماں دودھ پلانے کی اجرت تو اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت ہے تو جب تک اس کے نکاح یا عدت کے اندر ہے، اجرت کے مطالبہ کا حق نہیں، یہاں اس کا نان نفقہ جو باپ کے ذمہ ہے وہی کافی ہے، مزید اجرت کا مطالبہ باپ کو ضرر پہنچاتا ہے، اور اگر طلاق کی عدت گزر چکی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے، اب اگر یہ مطلقہ بیوی اپنے بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ باپ سے طلب کرتی ہے تو باپ کو دینا پڑے گا، کیونکہ اس کے خلاف کرنے میں ماں کا نقصان ہے، شرط یہ ہے کہ یہ معاوضہ اتنا ہی طلب کرے کہ جتنا کوئی دوسری عورت لیتی ہے، زائد کا مطالبہ کرے گی تو باپ کو حق ہوگا کہ اس کی بجائے کسی اتنا کا دودھ پلاوے۔

قیم بچے کے دودھ پلانے آیت متذکرہ میں اس کے بعد یہ ارشاد ہے: **وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ** کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یعنی اگر باپ زندہ نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے یا پلانے کا انتظام اس شخص پر ہے جو بچے کا جائز وارث اور محرم ہو، یعنی اگر بچہ مر جائے تو جن کو اس کی وراثت پہنچتی ہو وہی باپ نہ ہونے کی حالت میں اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے، اگر ایسے وارث کئی ہوں تو ہر ایک پر بقدر میراث اس کی ذمہ داری عائد ہوگی، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ قیم بچے کو دودھ پلانے کی ذمہ داری وارث پر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نابالغ بچے کا خرچہ دودھ پھیرنے کے بعد بھی وارثوں پر ہوگا، کیونکہ دودھ کی کوئی خصوصیت نہیں، مقصود بچے کا گزارہ ہے، مثلاً اگر قیم بچے کی ماں اور دادا زندہ ہیں تو یہ دونوں اس بچے کے محرم بھی ہیں، اور وارث بھی، اس لئے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدر حصہ میراث عائد ہوگا، یعنی ایک ہتائی خرچہ ماں کے ذمہ اور دو ہتائی دادا کے ذمہ ہوگا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قیم پوتہ کا حق دادا پر اپنے بالغ بیٹوں سے بھی زیادہ ہو، کیونکہ بالغ اولاد کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں اور قیم پوتے کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے، ہاں میراث میں بیٹوں کے موجود ہوتے ہوئے پوتے کو حقدار بنانا اصول میراث اور انصاف کے خلاف ہے، کہ قریب تر اولاد کے ہوتے ہوئے بعید کو دینا معقول بھی نہیں، اور صحیح بخاری کی حدیث لا ذی رحمۃ ذکر کے بھی خلاف ہے، البتہ دادا کو یہ حق ہے کہ اگر ضرورت سمجھے تو قیم پوتہ کے لئے کچھ وصیت کر جائے، اور یہ وصیت بیٹوں کے حصہ سے زائد بھی ہو سکتی ہے اسی طرح قیم پوتہ کی ضرورت کو بھی پورا کر دیا گیا اور وراثت کا اصول کہ قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو نہ دیا جائے یہ بھی محفوظ رہا۔

دودھ چھڑانے کے احکام اس کے بعد آیت متذکرہ میں ارشاد ہوتا ہے **وَإِنْ أَرَادَ افْتِسَالًا عَنْ قَرَابَتِهِمْ فَأُولَٰئِكَ سَائِدُونَ** یعنی اگر بچے کے ماں باپ دونوں آپس کی رضاعت اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کریں کہ شیر خوارگی کی مدت یعنی دو سال سے کم میں ہی دودھ چھڑادیں، خواہ ماں کی معذوری کے سبب یا بچے کی کسی بیماری کے سبب، تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں، آپس کے مشورے اور رضامندی کی مشروط اس لئے لگائی کہ دودھ چھڑانے میں بچے کی مصلحت پیش نظر ہونی چاہئے، آپس کے لڑائی جھگڑے کا بچے کو سختہ مشق نہ بنائیں۔

آخر میں ارشاد فرمایا گیا **وَإِنْ أَرَادْتُمْ أَنْ تُسَلِّمُوا أَوْلَادَكُمْ** کا دودھ پلانے کے احکام **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا أَنْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ** یعنی اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کی کسی مصلحت سے ماں کی بجائے کسی اتنا کا دودھ پلاؤ تو اس میں بھی کچھ گناہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی ہوا اجرت معسرہ کی گئی تھی وہ پوری پوری ادا کر دیں، اور اگر اس کو معسرہ اجرت نہ دی گئی تو اس کا گناہ ان کے ذمہ ہے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے مضر ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دودھ پلانے سے روک دے اور کسی اتنا سے پلاوے۔

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے اس سے معاملہ تنخواہ یا اجرت کا پوری صفائی کے ساتھ طے کر لیا جائے کہ بعد میں جھگڑا نہ پڑے، اور پھر وقت مقررہ پر یہ طے شدہ اجرت اس کو سپرد بھی جائے، اس میں مال مثول نہ کرے۔

یہ سب احکام رضاعت بیان کرنے کے بعد تشریح کرنے کے لئے مخصوص انداز اور اسلوب کے ساتھ قانون پر عمل کو آسان کرنے اور ظاہر و غائب ہر حال میں اس کا پابند رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے علم محیط کا تصور سامنے کر دیا، ارشاد ہوتا ہے **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ** یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کھلے اور چھپے اور ظاہر و غائب کو پوری طرح دیکھ رہا ہے، اور وہ تمہارے دلوں کے مخفی ارادوں اور نیّتوں سے باخبر ہیں، اگر کسی فریق نے دودھ پلانے یا چھڑانے کے مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کی یا بچے کی مصلحت کو نظر انداز کر کے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو وہ حق سزا ہوگا۔

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَنكُم مِّن دُونِ أُولَٰئِكَ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِمْ اور جو لوگ مجاہدین تم میں سے اور چھوٹے مجاہدین اپنی عورتیں تو چاہتے ہیں کہ وہ عورتیں انتظام میں رکھیں، ان کو

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْسُوهُنَّ
 کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگا یا ہو اور نہ معشر کیا ہو ان کے
 فَرِيضَةٍ بِمَا مَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِمِ قَدْ رُكِبَ وَعَلَى الْمَقْتَدِرِ قَدْ رُكِبَ مَتَاعًا
 لئے کچھ ہوا اور ان کو کچھ خرچہ دو مقدور دالے ہر اس کے موافق ہو اور تنگی دالے ہر اس کی موافق جو خرچہ کرے
 بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۱۳۰ وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ
 قاعدہ کے موافق ہو لازم ہر تنگی کرنے والوں پر ۱ اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور
 أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا
 ٹھہرا ہے تمہیں تم ان کے لئے ہر تو لازم ہوا آدھا اس کا کہ تم معشر کر چکے تھے مگر یہ کہ درگزر
 أَنْ يَتَعَفَّوْا أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بَيْنَهُمَا عَقْدٌ أَوْ يَتَعَفَّوْا أَقْرَبُ
 کر میں عذبتیں یا درگزر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہو اگر نکاح کی بین خاوند اور تم مرد درگزر کر دو تو قریب
 لِلتَّقْوَى وَلَا تَلْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنْ أَنْتُمْ تَعْمَلُونَ بِصِيرَةٍ ۱۳۱
 پر یہ ہر گارہی اور نہ بھلا دو احسان کرنا آپس میں بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۳، طلاق قبل الدخول کی صورت | طلاق قبل الدخول کے سنی یہ ہیں کہ زوجین میں ایک جانی اور خلوت
 میں ہر کے وجوب اور عدم وجوب کا بیان | صحیح سے پہلے ہی طلاق کی نوبت آجائے، اس کی دو صورتیں ہیں، یا
 تو اس نکاح کے وقت ہر معشر کی مقدار متعین نہیں کی گئی، یا مقدار ہر متعین کر دی گئی، پہلی
 صورت کا حکم اولاً مذکور ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْسُوهُنَّ
 یعنی تم پر دہرا کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دیدو کہ ان کو تم نے ہاتھ لگا یا
 ہے اور نہ ان کے لئے کچھ ہر معشر کیا ہے، (سو اس صورت میں ہر اپنے ذمہ مت سمجھو) اور (دوسرے)
 ان کو (ایک) فائدہ پہنچاؤ صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، اور تنگ دست
 کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے،
 خوش معاملہ لوگوں پر (یعنی سب مسلمانوں پر) کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب ہی کو حکم ہے، مراد اس

سے ایک جوڑا پڑوں کا دینا ہے۔
 اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے، وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ (الای قولہ) إِنْ أَنْتُمْ تَعْمَلُونَ
 بِصِيرَةٍ اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ اور ان کے لئے کچھ
 ہر بھی مقرر کر چکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا ہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف (واجب) ہو
 (اور نصف معاف) مگر (دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں، ایک صورت تو) یہ کہ وہ عورتیں
 (اپنا نصف) بھی معاف کر دیں (تو اس صورت میں نصف بھی واجب نہ رہا) یا (دوسری
 صورت) یہ (ہے) کہ وہ شخص رعایت کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق (رکھنا اور توڑنا) ہو
 یعنی خاوند پورا ہر ہی اس کو دیدے تو اس صورت میں خاوند کی مرضی سے پورا ہی ہر داکرنا ہوگا
 اور (ایک) تمہارا (اپنے حقوق کو) معاف کر دینا بہ نسبت وصول کرنے کے (تقریبی سے زیادہ قریب
 ہے) کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تعوی کی بات ہو
 اور آپس میں احسان (اور رعایت) کرنے سے غفلت مت کر دو، (بلکہ ہر شخص دوسرے کے
 ساتھ رعایت کرنے کا خیال رکھا کرے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے
 ہیں (تو تم اگر کسی کے ساتھ رعایت و احسان کر دے) اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر تم کو
 دیں گے، (بیان القرآن)

معارف و مسائل

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْسُوهُنَّ
 لحاظ سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں ان میں سے دو کا حکم ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ ہر معشر
 نہ صحبت و خلوت، دوسری یہ کہ ہر تو مقرر ہو لیکن صحبت و خلوت کی نوبت نہ آئے، تیسری صورت
 یہ ہے کہ ہر بھی معشر ہو اور صحبت کی بھی نوبت آدے، اس میں جو ہر مقرر کیا ہے پورا دینا ہوگا،
 یہ حکم شرآن مجید میں دوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے، چوتھی صورت یہ ہے کہ ہر معین نہ کیا،
 اور صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی، اس میں ہر مثل پورا دینا ہوگا، یعنی جو اس عورت کی قوم میں
 رواج ہے، اس کا بیان بھی ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔

مذکورہ آیت میں پہلی دو قسموں کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس میں سے پہلی صورت کا حکم یہ ہو
 کہ ہر کچھ واجب نہیں مگر زوج پر واجب ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دیدے، کم از کم یہی
 کہ ایک جوڑا پڑے کا دیدے، دراصل شرآن کریم نے اس عطیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی،
 البتہ یہ بتلادیا کہ مالدار کو اپنی حیثیت کے مطابق دینا چاہئے، جس میں اس کی ترغیب ہے صاحب صحبت

اس میں تنگی سے کام نہ لے، حضرت جن نے ایسے ہی ایک واقعہ میں مطلقہ عورت کو بیس ہزار کا عطیہ دیا، اور قاضی شریح نے پانسو روپے کا، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدے (قرطبی)

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ جس عورت کا ہر نکاح کے وقت مقرر ہوا ہو، اور اس کو قبل صحبت و خلوت صحیحہ کے طلاق دیدی ہو تو مقرر کئے ہوئے مہر کا نصف مرد کے ذمے واجب ہوگا، البتہ اگر عورت معاف کر دے یا مرد پورا دیدے تو اختیار سیاری بات ہے، جیسا کہ آیت **إِلَّا أَنْ يَعْفُوَنَّ أَوْ يُعْفُوا إِلَيْهَا** یعنی **يُعْفُوَنَّ عَنْهَا** کا معنی معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مرد کے پورا ہر روپے کو بھی معاف کئے لفظ سے شاید اس لئے تعبیر کیا کہ عام عادت عرب کی یہ تھی کہ مہر کی رقم شادی کے ساتھ ہی دیدی جاتی تھی، تو طلاق قبل از خلوت کی صورت میں وہ نصف واپس لینے کا حق دار ہو گیا، اب اگر وہ رعایت کر کے اپنا نصف واپس نہ لے تو یہ بھی معاف ہی کر لے، اور معاف کر لے کر افضل اور اقرب للفقوی قرار دیا، کیونکہ یہ معافی علامت اس کی ہے کہ تعلق نکاح کا قطع کرنا بھی احسان اور حسن سلوک کے ساتھ ہوا جو مقصد شریعت اور موجب ثواب عظیم ہے، خواہ معافی عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

(۲) **الَّذِي يَعْفُو عَنْهَا** کا معنی نکاح کی تفسیر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی **وَلِيَّ عَقْدٍ فِي النِّكَاحِ** یعنی عقد نکاح کا مالک شوہر ہے، یہ حدیث دارقطنی میں بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جندہ منقول ہے، اور حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی (قرطبی) اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نکاح مکمل ہو جانے کے بعد نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا مالک شوہر ہے، طلاق دہی دے سکتا ہے، عورت کا طلاق میں کوئی اختیار نہیں۔

حِفْظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ۝۳۹

خبردار رہو سب نمازوں سے اور پنج والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمْنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا

پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھو یا سوار پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح

عَلَيْكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝۴۰

کہ تم کو بکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۳ نمازوں کی حفاظت کا بیان | اس سے آگے جیسے طلاق وغیرہ کے احکام ہیں، درمیان میں نماز کے احکام بیان منسرا تا اشارہ اس طرف ہے کہ مقصود اصلی توجہ الی الحق ہے، اور معاشرت اور معاملات کے احکام سے علاوہ اور مصامتوں کے اس توجہ کی حفاظت اور ترقی بھی مقصود ہے، چنانچہ جب ان کو خدائی احکام سمجھ کر عمل کیا جاوے گا تو توجہ لازم ہوگی، پھر یہ کہ ان احکام میں ادائے حقوق عباد بھی ہے اور حقوق عباد کے اتلاف سے درگاہ الہی سے دوری ہوتی ہے، جس کے لازم میں سے حق و عہد دونوں کی طرف سے بے توجہی ہے، چونکہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ظاہر ہے اس لئے اس کے درمیان میں لانے سے اس توجہ کے مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہوگی، تاکہ بندہ اس توجہ کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔

حِفْظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ والی قول، **مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ** حفاظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز (یعنی عصر) کی (خصوصاً) اور (نماز میں) کھڑے ہو اگر اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے، پھر اگر تم کو (باقاعدہ نماز پڑھنے میں کسی دشمن وغیرہ کا) اندیشہ ہو تو کھڑے کھڑے یا سوار پر چڑھے چڑھے (جس طرح بن کے خواہ قبلہ کی طرف بھی منہ ہو یا نہ ہو اور گورگور و بھور صرف اشارہ ہی سے ممکن ہو) پڑھ لیا کرو (اس حالت میں بھی اس پر حفاظت رکھو اس کو ترک مت کرو) پھر جب تم کو (بالکل) اطمینان ہو جاوے (اور اندیشہ جانا نہ کہ تو تم خدا تعالیٰ کی یاد (یعنی اولائے نماز) اس طریق سے کرو جو تم کو (اطمینان کی حالت میں) سکھایا ہے جس کو تم (پہلے سے) نہ جانتے تھے۔

معارف مسائل

کثرت سے علماء کا قول بعض احادیث کی دلیل سے یہ ہے کہ پنج والی نماز مردانہ عصر کے کچھ اس کے ایک طرف دو نمازیں دن کی ہیں فجر اور ظہر اور ایک طرف دو نمازیں رات کی ہیں، مغرب اور عشاء، اس کی تاکید خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی گئی کہ اکثر لوگوں کو یہ وقت کام کی مصروفیت کا ہوتا ہے، اور عاجزی کی تفسیر حدیث میں سکوت کے ساتھ آئی ہے۔

اسی آیت سے نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت ہوتی ہے، پہلے کلام کرنا درست تھا۔ اور یہ نماز کھڑے کھڑے اشارہ سے جب صحیح ہوگی جب ایک جگہ کھڑا ہو سکے، اور اس میں سجدے کا اشارہ ذرا زیادہ پست کرے، اور چلنے سے نماز نہیں ہوگی، البتہ جب ایسا ممکن نہ ہو، مثلاً عین لڑائی کا وقت ہو، تو نماز کو قضا کر دیا جاوے گا، دوسرے وقت پڑھ لیں۔ (بیان القرآن)

وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ

اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو وہ وصیت کر دیں اپنی عورتوں کو اور جو

مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا

خرچ دینا ایک برس تک بغیر نکالنے کے گھر سے پھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ

فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۱﴾

کر رہی وہ عورتیں اپنے حق میں بھلی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ،

وَلِلْمُطَلَّاقِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۳۲﴾ كَذَلِكَ

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ہے فائدہ کے موافق لازم ہو پر ہر کاروں پر اسی طرح

يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۳۳﴾

بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے حکم تاکہ تم سمجھ لو۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۱، بیوہ عورت کی سکونت اور متاع کی بعض اقسام کا بیان

لوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویوں کو (ان کے

ذمہ لازم ہے کہ وہ وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے واسطے ایک سال تک (نان و نفقہ

اور گھر میں سکونت رکھنے سے) منتفع ہونے کی اس طور پر کہ وہ گھر سے نکالی نہ جا دیں ہاں اگر چاہیں

دس دن کے بعد یا وضع حل کے بعد عدت گزار کر خود نکل جاویں تو تم کو کوئی گناہ نہیں،

اس قاعدہ کی بات میں جس کو اپنے باپے میں (تجویز کریں) جیسے نکاح وغیرہ اور اللہ تعالیٰ

زبردست ہیں (ان کے خلاف حکم مت کر دو) اور حکمت والے ہیں (کہ تمام احکام میں تمہاری

مصلحتیں ملحوظ رکھی ہیں گو تمہاری فہم میں نہ آسکیں)

وَلِلْمُطَلَّاقِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۚ (القول) لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۚ اور سب طلاق

دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا (کسی درجہ میں معسر ہی) قاعدہ کے موافق (اور یہ) مقرر ہوا

ہے ان پر جو (شرک و کفر سے) پرہیز کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں پر خواہ یہ معسر ہو نا و جب کے

درجہ میں ہو یا استحباب کے مرتبہ میں) اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے (عمل کرنے کے) لئے اپنے احکام

بیان فرماتے ہیں اس توقع پر کہ تم (ان کو) سمجھو (اور عمل کرو)۔

معارف مسائل

(۱) وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (القول) وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ زمانہ جاہلیت میں

وفات زوج کی عدت ایک سال تھی اور اسلام میں بجائے ایک سال کے چار مہینے دس دن

مقرر ہوئے جیسا کہ آیت یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا بَلَغَتِ الْأَشْهُرَ الرَّبْعَةَ وَالْعَشْرَ وَالسَّادِسَةَ

مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ چونکہ اس وقت تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا،

اور بیوی کا کوئی حصہ میراث میں معسر نہ ہوا تھا، بلکہ اوروں کے حق کا مدار محض مردے کی

وصیت پر تھا جیسا کہ آیت عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ (۱۸۰:۲) کی تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اسلئے

یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہو تو سال بھر تک

اس کو رہنے کا حق حاصل ہے، اور اسی کے ترکہ سے اس مدت میں اس کو نان و نفقہ بھی دیا جاوے

اس آیت میں اسی کا بیان ہے، اور خاوند دل کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں،

اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا، اس کو اس کے وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا اس لئے

وارثوں کو تو گھر سے نکالنا جائز نہ تھا، لیکن خود اس کو جائز تھا کہ خود اس کے گھر نہ رہے، اور اپنا

حق ورثہ کو چھوڑ دے، بشرطیکہ عدت پوری ہو چکے، اور نکاح وغیرہ سب درست تھا، اور یہی

مراد ہے قاعدہ کی بات سے، البتہ عدت کے اندر نکلتا اور نکاح کرنا وغیرہ سب گناہ تھا عورت

کے لئے بھی اور جو منع کر سکے اور نہ روکے اس کے لئے بھی، پھر جب آیت میراث کی نازل

ہوئی، گھر بار سب ترکہ میں سے عورت کا حق مل گیا، اسوائے حصہ میں رہے، اور اپنے حصہ

سے خرچ کرے، یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

(۲) وَلِلْمُطَلَّاقِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۚ مطلقہ عورتوں کو متاع یعنی فائدہ پہنچانا اس سے

پہلی آیات میں بھی آچکا ہے مگر وہ صرف دو قسم کی مطلقات کے لئے تھا، جن کو صحبت خلوت

سے پہلے طلاق ہو گئی ہو، ایک کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ جوڑا دیا جائے، دوسری کو فائدہ پہنچانا یہ

تھا کہ آدھا مہر دیا جائے، اب وہ طلاق والیاں رہ گئیں جن کو صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی جاوے

سوائے جس کا مہر معسر رکھا گیا ہو اس کو فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ پورا مہر دینا چاہئے، اور جس کا مہر معسر

نہ اور قاعدہ سے مراد یہ تفصیل ہو جائے گی، اور ہر صورت کے وجوب اور استحباب کا فرق دوسرے دلائل سے ثابت

کھا جائے گا، اور حقا کو واجب کے معنی میں نہیں لے اور علی الزام کے لئے نہ ہوگا، بلکہ محض تاکید کے لئے

ہوگا جو درجہ استحباب ہی ہیں (بیان العسکران)

نہ کیا جاوے اس کے لئے بعد دخول کے ہر مثل واجب ہو، یہ متاع بمعنی مطلق فائدہ پہنچانا اس تفصیل سے تو دلالت ہے، اور اگر متاع سے مراد فائدہ خاص یعنی تحفہ یا جوڑا دینا ہی لیا جائے تو ایک مطلقہ کو تو دینا واجب ہے، جس کا ذکر اقبل میں آچکا ہے، اور باقی سب اقسام میں مستحب، اور اگر متاع سے مراد نفقہ لیا جاوے تو جس طلاق میں عدت ہے اس میں عدت گزرنے تک واجب ہے، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن، غرض آیت اپنے الفاظ عامہ سے سب صورتوں کو شامل ہے۔

الْمُتَرَاتِي الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

بیان دیجھا کہ ان لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے

فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى

پھر فرمایا ان کو اللہ نے کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ کر دیا بیشک اللہ فضل کرنے والا ہے

النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۲۳۳﴾ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور لڑو اللہ کی راہ میں

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۳۴﴾

اور جان لو کہ اللہ بے شک خوب سنتا جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

دائے مخاطب، کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے سوائے اللہ کے

ان کے لئے (حکم) فرمادیا کہ مر جاؤ (سب مر گئے) پھر ان کو جلا دیا، بیشک اللہ تعالیٰ بڑا افضل کرنے والے ہیں لوگوں کے حال پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور اس اقد پر غور کر کے اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں (جہاد کرنے اور نہ کرنے والوں کی باہم سننے اور ہر ایک کی نیت جانتے ہیں) اور سب کو مناسب جزا دیں گے

معارف و مسائل

یہ تین آیتیں جو اوپر مذکور ہوئی ہیں ان میں ایک عجیب بلیغ انداز میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے کی ہدایت ہے کہ ان احکام کے بیان کرنے سے پہلے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ذکر کیا گیا ہے، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ موت و حیات تقدیر الہی کے

تاریخ ہے، جنگ و جہاد میں جانا موت کا سبب نہیں، اور بزدلی سے جان بچرانا موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں، تفسیر ابن کثیر میں سلب صحابہ اور تابعین کے حوالہ سے اس واقعہ کی تشریح یہ بیان کی ہو کہ بنی اسرائیل کی کوئی جماعت ایک شہر میں بستی تھی، اور وہاں کوئی سخت دیوار طاعون وغیرہ پھیلا، یہ لوگ جو تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھے گھبرا اٹھے، اور موت کے خوف سے اس شہر کو چھوڑ کر سب کے سب دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان میں جا کر مقیم ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اور دنیا کی دوسری قوموں پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ موت سے کوئی شخص بھاگ کر جان نہیں چھڑا سکتا، دو فرشتے بھیج دیئے، جو میدان کے دونوں سروں پر آکھڑے ہوئے، اور کوئی ایسی آواز دی جس سے سب کے سب بیک وقت فرے ہوئے رہ گئے، ایک بھی زندہ نہ رہا، اس پاس کے لوگوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، یہاں پہنچے، دس ہزار انسانوں کے کفن و دفن کا انتظام آسان نہ تھا، اس لئے ان کے گرد ایک احاطہ کھینچ کر حظیرہ جیسا بنادیا، ان کی لاشیں حسب دستور محل مٹائیں، ہڈیاں پڑی رہ گئیں، ایک زمانہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر جن کا نام حسرت قبیل بتلایا گیا ہے، اس مقام پر گزرے، اس حظیرہ میں جگہ جگہ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے، بذریعہ وحی ان کو ان لوگوں کا پورا واقعہ بتلادیا گیا، حضرت حزقیل علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ ان لوگوں کو پھر زندہ فرما دے، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، اور انھیں حکم دیا گیا کہ آپ ان شکستہ ہڈیوں کو اس طرح خطاب فرمائیں۔

ایہما العظام البالیۃ ان اللہ

تین لے پڑی ہڈیوں اللہ تمھیں حکم دیتا ہے

یا مریک ان تجبعی

کہ ہر جوڑکی ہڈی اپنی جگہ جمع ہو جائے

پیغمبر کی زبان سے خدا تعالیٰ کا حکم ان ہڈیوں نے سنا اور حکم کی تعمیل کی، جن کو دنیا عین عقل بے شعور سمجھتی ہے مگر دنیا کے ہر ذرہ ذرہ کی طرح وہ بھی تابع فرمان اور اپنے وجود کے مناسب عقل و ادراک رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مطیع ہیں، مگر ان کریم نے آیت اعطی کل شیئ خلقاً ثقیلاً (۵۰:۱۶) میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا پھر اس کو اس کے مناسب حال ہدایت فرمائی، مولانا رومی نے ایسے ہی امور کے متعلق فرمایا ہے

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

بہر حال ایک آواز پر ہر انسان کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ لگ گئیں، پھر حکم ہوا کہ اب ان کو یہ آواز دو۔

کو یہ آواز دو۔

ایہما العظام ان اللہ یا مریک | تین لے پڑی اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے

ان تمکنتی لحمًا وعصًا وجلدًا | اپنا گوشت ہن لہا اور پٹھے اور کھال درست کر ڈیو
یہ کہنا تھا کہ ہڈیوں کا ہڑ دھا پھر ان کے دیکھتے دیکھتے ایک مکمل لاش بن گئی، پھر حکم ہوا کہ
اب ارواح کو یہ خطاب کیا جائے:-

اہتما الالہ! ان اللہ یا مریک | یعنی اے ارواح تمہیں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے
ان ترجع کل روح الی الجسد | کہ اپنے اپنے بدنوں میں لوٹ آئیں، جن کی تعمیر
الذی کانت تعمرو | وحیات اُن سے وابستہ تھی۔

یہ آواز دیتے ہیں اُن کے سامنے سارے لاشے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور حیرت سے چاروں طرف
دیکھنے لگے، سب کی زبانوں پر تھا مُبْتَخَاتُكَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ۔

یہ واقعہ ہمارے دنیا کے فلاسفوں اور عقلاء کے لئے دعوتِ فکر اور منکرینِ قیامت پر حجت
قاعدہ ہونے کے ساتھ اس ہدایت پر بھی مشتمل ہے کہ موت کے خوف سے بھاگنا خواہ جہاد سے
ہو یا کسی دباؤ و طاعون سے اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر ایمان رکھنے والے کے لئے ممکن نہیں، جو کچھ
یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہو، اس سے ایک سیکنڈ پہلے آسکتی ہے، اور ایک سیکنڈ
مؤخر ہو سکتی ہے، اس لئے یہ حرکت فضول بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہونے کی
وجہ بھی۔

اب اس واقعہ کو تفسیر قرآن کے الفاظ سے دیکھئے، بیان واقعہ کے لئے قرآن نے فرمایا
أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَخْرُجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ، یعنی کیا آپ نے ان لوگوں کے واقعہ کو نہیں دیکھا جو
اپنے گھروں سے بخوفِ موت نکل کھڑے ہوئے تھے:-

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہزاروں
برس پہلے کا ہے، اس کے دیکھنے کا حضورؐ سے سوال ہی نہیں ہو سکتا، تو یہاں أَلَمْ تَرَ فرمانے کا کیا
منشا ہے، مفسرین نے فرمایا ہے کہ ایسے تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ
أَلَمْ تَرَ کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ آپ کے زمانے سے پہلے کا ہے، جس کے دیکھنے
کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا، ان سب مواقع میں رویت سے رویت قلبی مراد ہوتی ہے، جس کے معنی
میں علم و ادراک یعنی أَلَمْ تَرَ ایسے مواقع میں أَلَمْ تَعْلَمُ کے معنی میں ہوتا ہے، لیکن اس کو لفظ أَلَمْ تَرَ
متر سے تعبیر کرنے میں حکمت اس واقعہ کے مشہور و مشہود ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے، کہ یہ واقعہ
ایسا یقینی ہے جیسے کوئی آج دیکھ رہا ہو اور دیکھنے کے قابل ہو، أَلَمْ تَرَ کے بعد حسرتِ اِلٰی
بڑھانے سے اردوئے زبان اس کی طرف اشارہ بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد تفسیر قرآن میں اُن کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا وَهُمْ أَكْثَرُ

یعنی دو لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اس تعداد کی تعیین میں روایات مختلفہ ہیں، لیکن عربی
زبان کے قاعدہ سے یہ لفظ جمع کثرت ہے، جس کا اطلاق دس سے کم پر نہیں ہوتا، اس سے معلوم
ہوا کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

اس کے بعد ارشاد ہے فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا، یعنی کہہ دیا اُن کو اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ
اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بلا واسطہ بھی ہو سکتا ہے اور بلا واسطہ کسی فرشتے کے بھی، جیسے دوسری آیت میں
ارشاد ہے، إِذَا أَرَادَ شَيْءًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ۔ (۸۲: ۲۶)

اس کے بعد فرمایا ہے إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ، یعنی اللہ تعالیٰ بڑا افضل کرنے
والے ہیں لوگوں پر، اس میں وہ فضل بھی داخل ہے جو بنی اسرائیل کی اس قوم کو دوبارہ زندہ کر کے
فرمایا، اور یہ فضل بھی شامل ہے جو یہ واقعہ امت محمدیہ کو بتلا کر ان کے لئے درسِ عبرت بنا دیا۔

آخر میں غفلت شعار انسان کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا وَيَكُنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ
یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے ہزاروں مظاہر انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، مگر اس کے
باوجود اکثر انسان شکر گزار نہیں ہوتے:-

مسائل متعلقات

اس آیت سے چند مسائل اور احکام مستفاد ہوئے:-

۱۔ **تدبیر و تدبیر** | اول یہ کہ تقدیر الہی کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی، اور جہاد سے یا
طاعون وغیرہ سے بھاگنا جان بچانے کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، اور نہ اُن میں قاسم رہنا
موت کا باعث ہوتا ہے، بلکہ موت کا ایک وقت معین ہے نہ اُس میں کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔

۲۔ **دوسرا مسئلہ** یہ ہے کہ جس شہر میں کوئی وبا یا مرض طاعون وغیرہ
پھیل چکا ہو اس سے بھاگ کر کہیں پھیل چکا ہو اس سے بھاگ کر دوسری جگہ جانا جائز نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
ان جہادوں کا حکم ہے کہ ارشاد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو وہاں جانا
بھی درست نہیں، حدیث میں ہے:-

ان هذا القسم عذب به الامم
قبلکم فاذا اصابکم به فی الارض
فلا تدخلوها واذ وقع بارض
وانتم ہا فلا تخرجوا فراساً
(بخاری و مسلم، ابن کثیر)

یعنی اس بیماری طاعون کچھ بڑا اللہ تعالیٰ نے
تم سے پہلے قوموں پر عذاب نازل فرمایا ہے،
سو جب تم یہ سنو کہ کسی شہر میں طاعون وغیرہ
وبا یا مرض پھیل رہا ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر
کسی بستی میں یہ مرض پھیل جائے اور تم وہاں موجود
ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہ بھلو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ ملک شام کے قصد سے سفر کیا، سرحد شام پر تبرک کے قریب ایک مقام سرخ ہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں سخت طاعون پھیلا ہوا ہے، یہ طاعون ملک شام کی تاریخ میں ایک عظیم سانحہ تھا، یہ طاعون عمواس کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ اول یہ طاعون ایک بستی عمواس نامی میں شروع ہوا، جو بیت المقدس کے قریب ہے، پھر سارے ملک میں پھیل گیا، ہزار ہا انسان جن میں بیت سے صحابہؓ و تابعینؓ بھی تھے، اس طاعون میں شہید ہوئے۔

فاروق اعظمؓ نے طاعون کی شدت کی خبر سنی تو اسی مقام پر ٹھہر کر صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ ہمیں ملک شام میں اس وقت جانا چاہئے یا رہیں ہونا مناسب ہے، اس وقت جتنے حضرات مشورہ میں شریک تھے ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق کوئی حکم سنا ہو، بعد میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس معاملے کے متعلق یہ ہے:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم
ذكر الوجه فقال رجز وعذاب
عن رب به الامم ثم بقي منه
بقية فيذهب الموت ويأتي
الاخرى فمن يبع به بارض
فلا يقدر من عليه ومن كان
بارض وقع بها فلا يخرج فراغ
منه، رواه البخاري عن انس
بن زيد واخرجه الاثمة بمثله۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے جب یہ حدیث سنی تو رفقہ کو واپسی کا حکم دیدیا، حضرت ابو عبیدہؓ ملک شام کے عامل و امیر مقرر بھی اس مجلس میں موجود تھے، فاروق اعظمؓ کا یہ حکم سن کر فرمانے لگے، افراسامہ من قد راندہ، یعنی کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں! فاروق اعظمؓ نے جواب میں فرمایا، ابو عبیدہؓ کا ش یہ بات کوئی اور کہتا، یعنی تمہاری زبان سے ایسی بات قابلِ تعجب ہے، اور پھر فرمایا:

فعم نعمة من قدر الله الخ
قد راندہ

بیشک ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی نعمت کی طرف بھاگتے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

در امانہ طاعون رشاد ہوئی | رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مذکور سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا بستی کی بھشتیں میں طاعون وغیرہ امراض وبائی پھیلے ہوئے ہوں باہر والوں کو وہاں جانا ممنوع ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو اس جگہ سے بخوبی موت بھاگنا ممنوع ہے۔

اور اس کے ساتھ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نہ کسی جگہ جانا موت کا سبب ہے، نہ کہیں سے بھاگنا نجات کا سبب، اس اہم عقیدہ کے ہوتے ہوئے حکم مذکور بڑی دور رس حکمتوں پر مبنی ہے، باہر والوں کو وہاں جانے سے روکنے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ ممکن ہے وہاں پہنچ کر کسی کی عمر ختم ہو چکی ہو اور اس مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہو گیا تو مرنے والے کو کسی یہ گمان ہو گا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو زندہ رہتا، اور دوسروں کو بھی یہی خیال ہو گا کہ یہاں آنے سے اس کی موت واقع ہوئی، حالانکہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے لکھا ہوا تھا، اس کی عمر اتنی ہی تھی، کہیں بھی رہتا، اس وقت اس کی موت لازمی تھی، اس حکم میں مسلمانوں کے عقیدہ کو تذبذب سے بچایا گیا کہ وہ غلطی کا شکار نہ ہوں۔

دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ جس جگہ تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہو یا جہاں ہلاکت کا اندیشہ ہو وہاں نہ جائے، بلکہ معتد در بھرا ایسی چیزوں سے بچنے کی فکر کرے جو اس کے لئے مضر یا ہلاکت کا سبب بن سکتی ہیں، اور اپنی جان کی حفاظت ہر انسان کے ذمے پر واجب قرار دی ہے، اس قاعدہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تقدیر الہی پر ایمان کامل رکھتے ہوئے احتیاطی تدبیروں میں کمی نہ کرے، اور ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ نہ جائے جہاں جان کا خطرہ ہو۔ اسی طرح اس بستی کے رہنے والوں کو بخوبی موت وہاں سے بھاگنے کی ممانعت میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔

ایک حکمت تو اجتماعی اور عوامی ہے کہ اگر یہ بھاگنے کا سلسلہ چلا تو امیر اور پیسے والے اور قدرت و طاقت والے آدمی تو بھاگ جائیں گے، مگر بستی میں ایسے ضعیف، مرد و عورت کا بھی عادی ہونا لازمی ہے جو کہیں جانے پر قدرت نہیں رکھتے، ان کا حشر کیا ہو گا، اول تو وہ تنہا رہ کر ہیبت ہی سے مرنے لگیں گے، پھر ان میں جو بیمار ہیں ان کی خبر گیری کون کرے گا، مر جائیں گے تو دفن کفن کا انتظام کیسے ہو گا۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ موجود ہیں بعید نہیں کہ ان میں اس مرض کے جرائم اثر کر چکے ہوں ایسی حالت میں وہ سفر کریں گے تو اور زیادہ مصیبتوں اور مشقتوں کے شکار ہوں گے۔

سفر کی حالت میں بیمار ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان پر کیا گزرے گی، ابن المدینی نے علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

ما فرأى أحد من الوباء فسلم
(قرطبی) | یعنی جو شخص وہاں سے بھاگتا ہے وہ بھی مسلم نہیں رہتا۔

تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر ان میں مرض کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں تو یہ مختلف بستیوں میں پہنچیں گے، تو وہاں وہابی جراثیم پھیلیں گے، اور اگر اپنی جگہ صبر و توکل کے ساتھ ٹھہرے رہے تو بہت ممکن ہے کہ مرض سے نجات حاصل ہو جائے، اور بالفرض اسی مرض میں موت مقدر تھی تو ان کو اپنے صبر و ثبات کی وجہ سے درجہ شہادت کا ملے گا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:

روى البخارى عن يحيى بن يعمر
عن عائشة أنها أخبرته أنها
سألت رسول الله صلى الله عليه
وسلم عن الطاعون فأخبرها
النبي صلى الله عليه وسلم أنه
كان عذاباً يبعثه الله على من
يشاء فجعل الله رحمة
للمؤمنين فليس من عبد
يقوم الطاعون فيمكث في بلد
صابراً يعلم أنه لن يصيبه إلا
ما كتب الله له إلا كان له مثل
اجر شهيد وهذا تفسير لقوله
صلى الله عليه وسلم الطاعون
شهادة والمطعون شهيد

(قرطبی ص ۲۳۵ ج ۲)

میں ارشاد ہے کہ طاعون شہادت ہے اور طاعون زدہ شخص شہید ہے۔

بعض خاص صورتوں کا استثنا | حدیث کے الفاظ میں فلا تخرجوا فراراً منه آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موت سے فرار کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی دوسری ضرورت سے دوسری جگہ چلا جائے تو وہ اس ممانعت میں داخل نہیں، اسی طرح اگر کسی شخص کا عقیدہ اپنی جگہ پختہ ہو

کہ یہاں سے دوسری جگہ چلا جانا مجھے موت سے نجات نہیں دے سکتا، اگر میرا وقت آگیا ہے تو یہاں جاؤں گا موت لازمی ہے، اور وقت نہیں آیا تو یہاں رہنے سے بھی موت نہیں آئے گی! یہ عقیدہ پختہ رکھتے ہوئے محض آب ہوا کی تبدیلی کے لئے یہاں سے چلا جائے تو وہ بھی ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی ضرورت سے اس جگہ میں داخل ہو جاں و بار پھیلی ہوئی ہے، اور عقیدہ اس کا پختہ ہو کہ یہاں آنے سے موت نہیں آئے گی وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے، تو ایسی حالت میں اس کے لئے وہاں جانا بھی جائز ہوگا۔

تیسرا مسئلہ اس آیت سے استفادہ ہوا کہ بخوف موت چہاد سے بھاگنا بھی حرام ہے، قرآن کریم میں یہ مسئلہ دوسری جگہ زیادہ تفصیل اور وضاحت سے آیا ہے، جس میں بعض خاص صورتوں کو مستثنیٰ بھی فرمایا گیا ہے۔

جو مضمون اس آیت کا ہے تقریباً یہی مضمون دوسری آیت میں چہاد سے بھاگنے والوں یا اس میں شامل نہ ہونے والوں کے بارے میں آیا ہے، ارشاد یہ ہے:

الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا مَعَهُ
لَقَدْ قَالُوا أَطَاعُوا مَا قَاتِلُوا
لَنْ قَادِرُوا عَلَيْنَا
الْمُوتِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

یعنی کچھ لوگ خود بھی چہاد میں شریک ہوئے اور چہاد میں شریک ہو کر شہید ہو جانے والوں کے متعلق لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری بات نہ سنی اس لئے مارے گئے، اگر یہ ہمارے ہاتھ تو قتل نہ ہوتے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ ان سے فرما دیں کہ اگر موت کے چہاد میں شریک ہیں تو اوروں کی کیا فکر کرتے ہو تم خود اپنی فکر کرو اور اپنے آپ کو موت سے بھاگو، مگر چہاد میں جانے نہ جانے پر موقوف نہیں، تمہیں گھر بیٹھے ہوئے بھی آخر موت آئے گی۔

عماہد قدرت سے ہے کہ صحابہ کرام کے سب بڑے جنگی جرنیل سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی اسلامی عمر ساری چہاد ہی میں گزری ہے، وہ کسی چہاد میں شہید نہیں ہوئے، بیمار ہو کر گھر میں وفات پائی، وفات کے قریب اپنے بستر پر مرنے کا افسوس کرتے ہوئے مگر والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں فلاں فلاں عظیم الشان جنگوں اور چہادوں میں شریک ہوا، اور میرا کوئی عضو ایسا نہیں جس میں تیر یا نیزے یا چوٹ کے زخم کا اثر و نشان نہ ہو، مگر افسوس ہے کہ میں اب گدھے کی طرح بستر پر مر رہا ہوں، خدا تعالیٰ بزدلوں کو آگام نہ دے، اُن کو میری نصیحت پہنچاؤ۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بطور تمہید لایا گیا تھا، اگلی آیت میں چہاد و قتال

کا حکم دیا گیا جو اس قصہ کے ذکر کرنے سے اصل مقصود تھا، کہ جہاں دین جانے کو موت یا جہنم کو نجات نہ سمجھو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کر کے فلاح دارین حاصل کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری سب باتیں سننے والے اور جاننے والے ہیں۔
تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت کا ذکر ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعَّه لَهُ أَضْعَافًا

کون شخص ہے ایسا جو قرض دے اللہ کو اچھا قرض پھر دوگنا کر دے اللہ اس کو کتنی

کثیراً ۱۷ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ مَنْ ذَا الَّذِي يَرْجِعُونَ ۱۸

گنا اور اللہ ہی سبکی کر دیتا ہے اور وہی کٹا کٹ کر دیتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹاؤ جاؤ گے۔

خلاصہ تفسیر

جہاد و غیرہ کا خبریں (کون شخص ہے ایسا) جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا یعنی اخلاص کے
انفاق کی توفیق (ساتھ) پھر اللہ تعالیٰ اس (قرض کے ثواب) کو بڑھا کر بہت سے حصے کر دے اور
اس کا اندیشہ مت کر دو کہ خرچ کرنے سے مال کم ہو جائے گا، کیونکہ یہ تو اللہ ہی کے قبضہ میں ہے
وہی (کم کر دیتے ہیں اور وہی) فراخی کرتے ہیں (کچھ خرچ کرنے نہ کرنے پر اس کا اصل مدار نہیں) اور
تم اسی کی طرف (بجھڑنے کے) لے جاتے جاؤ گے (سو اس وقت نیک کام میں خرچ کرنے کی جبراً
اور واجب موقع پر خرچ نہ کرنے کی سزا تم کو ملے گی)

معارف و مسائل

(۱) يَقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا قرض سے مراد نیک عمل کرنا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں
خرچ کرنا ہے، اس کو قرض مجازاً کہہ دیا، ورنہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے، مطلب یہ ہے کہ مجھے
قرض کا عوض ضروری دیا جاتا ہے اسی طرح تمہارے انفاق کا عوض ضروری ملے گا، اور بڑھانے کا
بیان ایک حدیث میں آیا ہے، کہ ایک خیر اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے تو خدا تعالیٰ اس کو اتنا
بڑھاتے ہیں کہ وہ اُحد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بندوں کو قرض دیا جائے

اور اُن کی حاجت برآری کی جائے، چنانچہ حدیث میں مشرطن دینے کی بہت فضیلت وارد ہوئی
ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ مَسَلَ لِقَرْضٍ مَسْلَمًا قَرْضًا

مَرَّةً إِلَّا كَانَ كَصَدَقَتِهِ مَرَّتَيْنِ

(منہری بھلائی میں مارج)

دفعہ صدقہ کرنے کے برابر ہے ۵

(۲) ابن عربی فرماتے ہیں اس آیت کو سنکر لوگوں کے تین فرقے ہو گئے، پہلا فرقہ اُن
بد نصیب لوگوں کا ہے جنہوں نے یہ آیت سن کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب ہماری طرف
محتاج ہے، اور ہم غنی ہیں، اس کا جواب قرآن کریم کی ایک اور آیت لَعَنَ سَبِيحُ اللَّهِ
قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ (۱۸۱۳) سے دیا۔ دوسرا فرقہ اُن لوگوں کا ہے
جنہوں نے اس آیت کو سن کر اس کے خلاف کیا، اور بخل ہی کو اختیار کر لیا، مال کی طرف زیادہ
رغبت اور اس کی حرص نے ان کو اس طرح باندھ لیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے
کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ تیسرا فرقہ ان مخلص مسلمانوں کا ہے جنہوں نے فوراً ہی اس آیت پر
عمل کر لیا، اور اپنا پسندیدہ مال اللہ کے راستے میں دیدیا، جیسا کہ ابوالدرداء وغیرہ، جب یہ آیت
نازل ہوئی تو حضرت ابوالدرداء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور
آپ سے پوچھا، اللہ کے رسول! میرے مال باپ آپ پر قربان ہوں، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے
قرض مانگتے ہیں، حالانکہ وہ قرض سے مستغنی ہیں؟ آپ نے فرمایا، ہاں اللہ تعالیٰ یہ چاہتے
ہیں کہ اس کے ذریعے تم کو جنت میں داخل کر دیں، ابوالدرداء نے یہ سنکر کہا، اللہ کے
رسول ہاتھ بڑھائیں، آپ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا، ابوالدرداء نے کہنا شروع کیا:
میں کھجور کے دو باغوں کا مالک ہوں، اس کے علاوہ میری ملک میں کچھ نہیں، میں اپنی
یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔

آپ نے اُن سے فرمایا ایک اللہ کے راستے میں وقف کر دو اور دوسرا اپنے اہل و عیال
کی معاشی ضرورت کے لئے باقی رکھو۔ ابوالدرداء نے کہا آپ گواہ رہے، ان دونوں میں سے
بہترین باغ جس میں کھجور کے چھ سو درخت ہیں، اس کو میں اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں،
آپ نے فرمایا اللہ تمہیں اس کے بدلے میں جنت عطا کریں گے۔

ابوالدرداء اپنے گھر کے اور بیوی کو اس کی اطلاع دیدی، تو وہ بھی ابوالدرداء کے
اس بہترین سودے پر بہت خوش ہوئیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَمْ مِّنْ عَدُوٍّ لِّدَاخٍ وَدَاخٍ لِّدَاخٍ

کھجوروں سے لبریز ہے شمار درخت اور کٹا

لَا بُدَّ لِلَّذِينَ أَحْرَحَ

(قرطبی)

مطلات کس قدر ابوالدرداء کے لئے تیار ہیں

(یعنی جنت میں)

(۳) قرض میں واپسی کے وقت اگر زیادتی کی شرط نہ ٹھہرائی گئی ہو اور اپنی طرف سے قرض سے کچھ زیادہ ادا کر دیا، تو یہ پسندیدہ ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان خياركم احسنكم قضاءً

”تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے حق (قرض) کو اچھے طریقے سے ادا کرے“

لیکن اگر زیادتی کی شرط ٹھہرائی گئی تو وہ حرام ہے اور سود ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذْ قَالُوا لِنَبِيِّ

کیا دیکھا تو نے ایک جماعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے بعد جب انہوں نے کہا اپنے نبی سے

لَهُمْ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ

مقرر کرد ہمارے لئے ایک بادشاہ تاکہ ہم لڑیں اللہ کی راہ میں پیغمبر نے کہا کیا تم سے بھی یہ توقع ہو کہ

عَلَيْكُمْ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ

اگر حکم ہو لڑائی کا تو تم اس وقت نہ لڑو وہ بولے ہم کو کیا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں اور ہم

قَدْ أَخْرَجَنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَايَنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا

تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے اور بیٹوں سے پھر جب حکم ہوا اُن کو لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے

إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ

مگر تھوڑے سے ان میں کے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو ظالموں کو اور فرمایا اُن سے اُن کے نبی نے

إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ

یہ کہ اللہ نے معترف فرمایا تمہارے لئے طالت کو بادشاہ کہنے لگے کیونکر ہو سکتی ہو اس کو حکومت

عَلَيْنَا وَمَنْ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ

ہم پر اور ہم زیادہ ستم ہیں سلطنت کے اس سے اور اس کو نہیں ملی کثایت مال میں

قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

پیغمبر نے کہا بیشک اللہ نے پسند فرمایا اس کو تم پر اور زیادہ فراخی دی اس کو علم اور جسم میں

وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ وَقَالَ لَهُمْ

اور اللہ دیتا ہے ملک اپنا جس کو چاہے اور اللہ بے غرض کرنا اسباب کچھ جاننے والا، اور کہا بنی اسرائیل

نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ

ہے اُن کے نبی نے کطاوت کی سلطنت کی نشانی یہ کہ آوری تمہارا پاس ایک صندوق کہ جس میں تہی خاطر ہے

مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ

تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بھی ہوئی چیزیں ہیں اُن میں سے جو چھوڑ گئی تھی، موسیٰ اور ہارون کی اولاد اور

الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

انجیل کے اس صندوق کو فرشتے، بیشک اُس میں پوری نشانی ہے تمہارا واسطہ اگر تم یقین رکھتے ہو،

فَلَمَّا أَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ

پھر جب ابھرا طالت لڑو میں نے کر کہا ہے شک اللہ تمہاری آزمائش کرتا ہے ایک نہر سے

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا

سوس لے انی یا اس نہر کا تو وہ میرا نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بیشک میرا ہے مگر

مَنْ أَغْرَقَ غُرْفَةً فَيْدٍ ۚ فَنَسِيَ بَوَائِمُهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ط

جو نہی ہوئے ایک چھوٹے پانی سے، بھول گیا سب سے اس کا پانی مگر تھوڑوں نے ان میں سے

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ

پھر جب اُتر ہوا طالت اور ایمان والے ساتھ اس کے تو کہنے لگے طاقت نہیں ہم کو آج

بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلِقُوا اللَّهَ كَم

جالت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی کہنے لگے وہ لوگ جن کو خیال تھا کہ ان کو اللہ سے ملانے والا

مِنْ فِتْنَةٍ قَلِيلٌ غَلَبَتْ فِئَةٌ كَثِيرَةٌ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝

تھوڑی جماعت غالب ہوئی بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہو

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَبَثَّتْ

اور جب سامنے ہوئے جالت کے اور اس کی فوجوں کے تو بولے اور ب ہمارا ڈال دے ہمارے صبر کو اور ہمارے

أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۵۱﴾ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ

دکھ ہمارے پاؤں اور ہماری مدد کر اس کافر قوم پر ۔ پھر شکست دی مومنوں کو کافروں کے ہاتھوں سے

وَقَتْلَ دَاوُدَ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مَا

اور مار ڈالا داؤد نے جالوت کو اور دی داؤد کو اللہ نے سلطنت اور حکمت اور سکھایا اُن کو جو چاہا

يَشَاءُ وَكَوَلَدَ فَحُ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ

اور اگر نہ ہوتا دفع کر دیتا اللہ کا ایک کو دوسرے کو خراب ہو جاتا ملک ۔

وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۲۵۲﴾

لیکن اللہ بہت بھلا ہے جہاں کے لوگوں پر ۔

خلاصہ تفسیر

رَبِّ آیات | مقصود اس مقام میں زیادہ ترغیب قتال کی ہے، اور پر کا قصہ اسی کی تحدید ہے، اتفاق فی سبیل اللہ کا مضمون اسی کی تائید ہے، آگے طاوت و جالوت کا قصہ اسی کی تاکید ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اس قصے میں قبض و بسط کا بھی مشاہدہ کرایا، جس کا ذکر قبل کی آیت وَاللَّهُ يَبْغِضُ وَيُبْغِضُ میں آیا ہے، کہ نفیر کو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے بادشاہت چھین لینا سب اسی کے اختیار میں ہے۔

طالوت اور جالوت کا قصہ | (اے مخاطب) کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے، تحقیق نہیں ہوا، (جس سے پہلے

اُن پر کافر جالوت غالب آچکا تھا، اور ان کے کئی صوبے دبا لئے تھے) جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم (اس کے ساتھ ہو کر) اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں، اس پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے کہ تم (اس وقت) جہاد نہ کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کونسا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ جہاد کے لئے ایک محرک بھی ہے، وہ یہ کہ ہم دُان کافروں کے ہاتھوں، اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں (کیونکہ ان کی بعض بستیاں بھی کافروں نے دبا لی تھیں اور ان کی اولاد کو بھی قید کر لیا گیا تھا) پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثناء ایک قلیل مقدار کے (باقی) سب پھر گئے، (جیسا کہ آگے جہاد کی غرض سے بادشاہ کے معترض رہنے کا اور ان لوگوں کے پھر جانے کا تفصیل بیان آتا ہے) اور

اللہ تعالیٰ ظالموں کو دین خلافت محکم کرنے والوں کو) خوب جانتے ہیں، (سب کو مناسب سزا دیں گے) اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طاوت کو بادشاہ معترض

(رایا، کہنے لگے ان کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ

مستحق ہیں، اور ان کو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی، کیونکہ طاوت غریب آدمی تھے) ان پیغمبر نے

(جواب میں) فرمایا کہ (اول تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں اُن کو منتخب فرمایا ہے (اور انتخاب کی

مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں) اور (دوسرے) علم (سیاست و حکمرانی) اور جہاد میں اس کو

ریا دی ملا ہے (اور بادشاہ ہونے کے لئے اس علم کی زیادہ ضرورت ہے، تاکہ ملکی انتظام پر قادر ہو اور جہاد

میں باہر مٹی ہے کہ موافق و مخالف کے قلب میں وقعت و ہیبت ہو) اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ

(اکھ ملک ہیں) اپنا ملک جس کو چاہیں دیں (ان سے کوئی سوال کا منصب نہیں رکھتا) اور (چوتھے)

اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں (کہ کون لیاقت سلطنت کی رکھتا ہے) اور (جب ان لوگوں نے پیغمبر سے

یہ درخواست کی کہ اگر کوئی ظاہری جہت بھی ان کی منجانب اللہ بادشاہ ہونے کی ہم مشاہدہ کر لیں تو

اور زیادہ اطمینان ہو جائے، اس وقت) اُن سے اُن کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (منجانب اللہ)

بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (بدون تمہارے لئے ہوئے) آجائے

جس میں سکین (اور برکت) کی چیز ہے، تمہارے رب کی طرف سے (یعنی تورات اور تورات کا منجانب

اللہ ہوتا ہے) اور کچھ بھی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام

پہناتے تھے (یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ غرض) اُس صندوق کو فرشتے نے آدیں

اس (طرح کے صندوق کے آجانے) میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لائے

والے ہو، پھر جب (بنی اسرائیل نے طاوت کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور جالوت کے مقابلے کے

لئے دم بھج گئے اور) طاوت فوجوں کو لے کر اپنے مقام یعنی بیت المقدس سے عمالقہ کی

طرف، چلے گئے انہوں نے (اپنے ہمراہی پیغمبر کی وحی کے ذریعے دریافت کر کے) ساتھیوں سے (

ہمارا کہ اب حق تعالیٰ (استقلال دے) استقلال میں (تمہارا امتحان کریں گے) ایک نہر کے ذریعے

(جوراء میں آئے گی اور تم شدت تشنگی کے وقت اُس پر گزرو گے) سو جو شخص اس سے (افراط

کے ساتھ) پانی پیوے گا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں، اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے (اور اصل

حکم یہی ہے) وہ میرے ساتھیوں میں ہے، لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو اتنی نعمت

ہے، طمغہ نہ ہرراتے میں آئی، پیاس کی تھی شدت) سو سب نے اس سے (بے تحاشا) پینا شروع

کر دیا، مگر تھوڑے سے آدمیوں نے ان میں سے (احتیاط کی، کسی نے بالکل نہ پیا ہوگا، کسی نے

چلے سے زیادہ نہ پایا ہوگا) سوجب طاہوت اور جو زمینیں ان کے ہمراہ تھے نہر سے پار اتر گئے، اور اپنے بچ کو دیکھا تو تھوڑے سے آدمی رہ گئے، اُس وقت بعض آدمی آپس میں کہنے لگے کہ آج تو ہمارا بچ اتنا کم ہے کہ اس حالت سے ہم میں جاہوت اور اس کے لشکر کے مقابلے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی (یہ سنکر) ایسے لوگ جن کو یہ خیال (پیش نظر) تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہونے والے ہیں کہنے لگے کہ کثرت سے (ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ) بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہیں، (اصل چیز استقلال ہے) اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتے ہیں، اور جب (دیارِ علاقہ میں پہنچے اور) جاؤ اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آگئے تو (دعا میں حق تعالیٰ سے) کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر (یعنی ہمارے قلوب پر) استقلال (غیر سے) نازل فرمائیے اور (مقابلہ کی وقت) ہمارے قدم جمائے رکھتے، اور ہم کو اس کا فرقہ پر غالب کیجئے، پھر طاہوت والوں نے جاہوت والوں کو خدا تعالیٰ کے حکم سے شکست دیدی اور داؤد علیہ السلام نے (جو کہ اس وقت طاہوت کے لشکر میں تھے اور اس وقت تک نبوت وغیرہ نہ ملی تھی) جاہوت کو قتل کر ڈالا (اور منظر و منصور واپس آئے) اور اس کے بعد (ان کو) یعنی داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سلطنت اور حکمت (یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے) عطا فرمائی اور بھی جو منظور ہوا انکو تعلیم فرمایا (جیسے غیر آلات کے زرہ بنانا اور جانوروں کی بولی سمجھنا) آگے اس واقعہ کی مصلحت مآثر فرماتے ہیں) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو (جو کہ مفسد ہوں) بعضوں کے ذریعے سے (جو کہ مصلح ہوں وقتاً فوقتاً) دفع کرتے رہا کرتے ہیں (یعنی اگر مصلحین کو مفسدین پر غالب نہ کرتے رہتے) تو سرزمین (تمام) فساد سے پُر ہو جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں چنانچہ والوں پر اس لئے وقتاً فوقتاً اصلاح فرماتے رہتے ہیں۔

معارف و مسائل

- ۱۔ اِذْ قَالُوا لِنَبِيِّنَا اَنْتُمْ اَبْعَثْتُمْ لَنَا نَارًا تَقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، ان بنی اسرائیل نے حق تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا تھا، کفارِ علاقہ ان پر مسلط کر دیئے گئے، اُس وقت ان لوگوں کو اصلاح کی فکر ہوئی، اور جس نبی کا یہاں ذکر ہے ان کا نام شموئیل مشہور ہے۔
- ۲۔ اَنْ يَّاتِيَكُمْ التَّابُوتُ، بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں تبرکات تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کی بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے رکھتے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا، جب جاہوت بنی اسرائیل پر غالب آیا، تو یہ صندوق بھی وہ

لے گیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کیا کہ وہ کافر جہاں صندوق کو رکھتے ہیں وہاں اور بلا آئی، پانچ شہر ویران ہو گئے، ناچار ہو کر دو بیلوں پر اس کو لاد کر ہانک دیا، فرشتے بیلوں کو ہانک کر طاہوت کے دروازے پر پہنچا گئے، بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طاہوت کی (ادشاہت پر یقین لائے، اور طاہوت نے جاہوت پر فوج کشی کر دی اور موسم نہایت گرم تھا۔

۳۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بَشَعًا، اس امتحان کی حکمت اور توجیہ احقر کے ذوق میں معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش و خروش میں بھیڑ بھڑکاہٹ ہو جایا کرتا ہے، لیکن وقت پر جنے والے کم ہوتے ہیں، اور اُس وقت ایسوں کا اکثر جانا باقی لوگوں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کا ملحد کرنا منظور تھا، اس کا یہ امتحان معسر رکھا گیا جو کہ نہایت ہی مناسب ہے، کیونکہ قتال میں ضرورت استقلال و جفاکشی کی ہوتی ہے، سو شدتِ پیاس کے وقت بے وقت والی ملنے پر مضبوط کرنا دلیل استقلال کی اور اندھے بازوؤں کی طرح جاگنا دلیل بے استقلال کی ہے، آگے فرقہ حادث ہو کہ زیادہ پانی پینے والے غیبی طور پر بھی زیادہ بیکار اور اذکار رفتہ ہو گئے، ہزاروں المعانی میں بسند ابن ابی حاتم حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، اور اس قصے میں جو احوال و اقوال مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے لوگ تھے۔

۱۔ اہل ایمان جو امتحان میں پورے اُترے، اور کامل جو امتحان میں پورے اُترے، مگر اپنی قلت کی فکر ہوئی، اور کامل جن کو یہ بھی فکر نہیں ہوئی۔

بَلَّغْ اٰیٰتِ اللّٰهِ تَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۚ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

۱۔ کہیں اللہ کی پس ہم بھگے کو سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک اور تو بیشک ہمارے رسولوں میں ہے۔

خلاصہ تفسیر

۱۔ کہہ سورہ کریم کا ایک بڑا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات ہے، اس لئے جس جگہ مضمون کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اس کا اعادہ کر دیا جاتا ہے، اس موقع پر اس قصہ کی صحیح صحیح خبر دینا جب کہ آپؐ نے نہ کسی سے پڑھا نہ کہیں سنا نہ دیکھا، ایک مجزہ ہے جو آپؐ کی نبوت کی صحیح دلیل ہے، اس لئے ان آیات میں آپؐ کی نبوت پر استدلال فرماتے ہیں:

یہ آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہوا، اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح طور پر ہم استدلال

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ

یہ سب رسولؐ فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے کوئی تو وہ ہے

مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ

کہ کلام فرمایا اس سے اللہ نے اور بلند کئے بعضوں کے درجے اور دیئے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے

الْبَيِّنَاتِ وَآيَدْنَاهُ رُوحَ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتُلَ الَّذِينَ

کو مجیزے مرتد اور قوت دی اس کو روح القدس یعنی جبریلؑ اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ

مِنْ بَعْدِهِمْ مَنْ بَعْدَ مَا جَاءَ ثَمُمُ الْبَيِّنَاتِ وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ

جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کے پاس صاف ہم لیکن ان میں اختلاف پڑ گیا،

مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتُلُوا أَفْوَاقًا وَلَكِنْ

پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے ، لیکن

اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿۱۲﴾

اللہ کرتا ہے جو چاہے ۔

خلاصہ تفسیر

بعض انبیاءؑ اور امتوں کے کچھ احوال یہ حضرات مرسلین (جن کا ذکر ابھی انکے بَنِ الْمُرْسَلِينَ میں آیا ہے) ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے، (مثلاً بعضے

ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ (بلا واسطہ فرشتہ کے) ہم کلام ہوئے ہیں، (مراد موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں میں (اعلیٰ مقام سے) سرفراز کیا، اور ہم نے حضرت

عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو کھلے کھلے دلائل (یعنی معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبریل علیہ السلام) سے فرمائی رہبر وقت یہود سے انکی حفاظت

کرنے کے لئے ساتھ رہتے تھے) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (امت کے) جو لوگ ان (پیغمبروں) کے بعد ہوئے ہیں رکبھی دین میں اختلاف کر کے) باہم قتل و قتال نہ کرتے بعد

اس کے کہ ان کے پاس (دلائل) پیغمبروں کی معرفت، پہنچ چکے تھے (جن کا مقتضایا تھا) ان کے قبول پر متفق رہنا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو بعض حکمتیں منظور تھیں، اس لئے ان میں اتقان

نہیں نہیں پیدا کیا) وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے، سو ان میں کوئی تو ایمان لایا، اور کوئی کافر رہا، (پھر اس اختلاف میں فوجیت قتل و قتال بھی پہنچ گئی) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل و قتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتے ہیں (اپنی قدرت سے) وہی کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

(۱) تِلْكَ الرُّسُلُ الْآیۃ اس مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عہد تسل دینا ہوا کیونکہ جب آپؐ کی رسالت دلیل سے ثابت تھی، جسکو اُنْكَارُ الْمُرْسَلِينَ میں بھی فرمایا ہوا اور پھر بھی منکرین نہ مانتے تھے، تو یہ آپؐ کے رنج و افسوس کا محل تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات سننا دی کہ اور بھی پیغمبر مختلف درجوں کے گزرے ہیں، لیکن ایمان مام کسی کی امت میں نہیں ہوا، کسی نے موافقت کی کسی نے مخالفت، اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں مگر ہر شخص پر منکشف نہ ہوں، مگر اجمالاً اتنا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ کوئی حکمت ضرور ہے۔

(۲) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ یہاں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ یہ آیت صراحتہ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بعض انبیاءؑ بعض سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تفضلوا بین انبیاء اللہ
یز فرمایا:

لا تختیرونی علی موسیٰ -
اور فرمایا:

لا اقول ان احدا افضل من یونس بن مثنیٰ
میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی یونس بن مثنیٰ سے افضل ہے

ان احادیث میں بعض انبیاءؑ کو بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے! جواب یہ ہے کہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت دواں نہ کرے کسی نبیؐ کے افضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے یہاں ان کا مرتبہ بہت زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا علم رائے اور قیاس سے حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن قرآن و سنت کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاءؑ کی بعض پر فضیلت معلوم ہو گئی تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے گا۔

رہا آپ کا یہ ارشاد کہ لا اقول ان احد افضل من یونس بن مثنیٰ اور لا تخیرونی علیٰ موسیٰ تو یہ اس وقت سے متعلق ہے جب کہ آپ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپ کو یہ بات بتلا دی گئی اور صحابہ کرام سے آپ نے اس کا اظہار بھی فرمادیا (منظہری)

(۲) وَمَنْ يَخْلُقْ مِنْ كَلِمَةِ اللَّهِ، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہم کلامی گویا واسطہ فرشتہ کے ہو مگر بے حجاب نہ تھی، پس سورۃ شوریٰ کی آیت مَا كَانُوا يَنْشُرُونَ لَكُمْ إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ (۲۱) جس میں بے حجاب کلام کی نفی کی گئی اس سے کچھ تعارض نہ رہا، البتہ بعد موت کے بے حجاب کلام ہونا بھی شرعاً ممکن ہے، پس وہ شوریٰ کی آیت دنیا کے اعتبار سے ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمْ يَوْمٌ لَا

اے ایمان والو خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو روزی دی پہلے اس دن کے آنے سے

بَيِّعَ فِيهِ وَلَا خُلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۱﴾

کس میں نہ خرید و فروخت ہو اور نہ شافی اور نہ سفارش اور جو کافر ہیں وہی ہیں ظالم۔

خلاصہ تفسیر

الغنائی سبیل اللہ اے ایمان والو خرچ کرو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں قبل اس کے کہ وہ دن آجائے (یعنی قیامت کا دن) جس میں کوئی چیز اعمال خیر کا بدل نہ ہو سکے گی، کیونکہ اس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی نہ کوئی چیز دے کر اعمال خیر کی خرید کرے گی اور نہ (ایسی) دوستی ہوگی نہ کوئی تم کو اپنے اعمال خیر دیدے اور نہ (بلا اذن الہی کسی کی) کوئی سفارش ہوگی جس سے اعمال خیر کی تم کو حاجت نہ رہے، اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں نہ اعمال اور مال کو بے موقع استعمال کرتے ہیں، اس طرح کہ طاعات بدنیہ و مالیہ کو ترک اور معصیت الیہ و دلیہ کو اختیار کرتے ہیں تم تو ایسے نہ بنو۔

معارف و مسائل

اس سورۃ میں عبادات و معاملات کے متعلق احکام کثیر بیان فرمائے ہیں جن میں سب کی تعمیل لازم کرنا اور بھاری ہے، اور تمام اعمال میں زیادہ دشوار انسان کو جان اور مال کا خسران

کرنا ہوتا ہے، اور احکام الہی اکثر جو دیکھے جاتے ہیں یا جان کے متعلق ہیں یا مال کے، اور گناہ میں بندہ کو جان یا مال کی محبت اور رعایت ہی اکثر مبتلا کرتی ہے، گویا ان دونوں کی محبت گناہوں کی جڑ اور اس سے نجات جملہ طاعات کی ہوسلت کا منشاء ہے، اس لئے ان احکامات کو بیان فرما کر قتال اور اتفاق کو بیان فرمایا مناسب ہوا، وَقَالُوا إِنَّا تَسْبِيلُ اللَّهِ الْخَيْرُ أَوَّلُ كَلِمَاتٍ تَحَا اور مَنْ ذَا الَّذِي يَنْهَىٰ عَنْ اللَّهِ الْخَيْرُ مِنْ دُونِ مَا كَذَرُہ، اس کے بعد قصہ طاہر سے اول کی تاکید ہوئی تو اب أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ الْخَيْرُ سے دوسرے کی تاکید منظور ہے، اور چونکہ الغنائی مال پر بہت امور عبادات و معاملات کے موقوف ہیں، تو اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا، چنانچہ اب جو رکوع آتے ہیں ان میں اکثروں میں امر ثانی یعنی الغنائی مال کا ذکر ہے، خلاصہ معنی یہ ہوا کہ عمل کا وقت ابھی ہے، آخرت میں تو نہ عمل پختے ہیں نہ کوئی دوستی سے دیتا ہے، نہ کوئی سفارش سے بچھڑا سکتا ہے، جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے سب کا بھالنے والا نہیں پکڑ سکتی اس کو ادھم اور نہ نیند

لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا

اس کا ہی جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور ایسا کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اسی

بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ

اجازت سے جانتا ہے جو کچھ خلقت کے رد و ردی اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ سب احاطہ نہیں

مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ

کر سکے کسی چیز کا اس کی معلوآتیں سے مگر جتنا کہ وہی چاہے گنجائش ہو اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین

وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۲۲﴾

اور گراں نہیں اس کو بھالنا ان کا اور وہی ہے سب سے بزرگ و عظیم والا

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندہ ہے (جس کو کبھی موت نہیں آسکتی) سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کا) نہ اس کو ادھم دیا سکتی ہے اور نہ نیند (دیا سکتی ہے)

اسی کے ملک میں سب کچھ (بھی) آسمانوں میں (موجودات) ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت گے وہ جانتا ہے ان تمام موجودات کے تمام حاضر و غائب حالات کو اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علی میں نہیں لاسکتے مگر جس قدر علم دینا وہی چاہے اس کی کرسی (اتنی بڑی ہے کہ اس) نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں (آسمان و زمین) کی حفاظت کچھ گراں نہیں گذرتی اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

معارف و مسائل

آیت الکرسی کے نام فضائل | یہ آیت قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہے، احادیث میں اس کے بڑے فضائل و برکات مذکور ہیں مستند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سب آیات الفضل قرار دیا ہے، اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ تشرآن میں کونسی آیت سب سے زیادہ عظیم ہے، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا آیت الکرسی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا، اے ابوالمنذر تمہیں علم مبارک ہو۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشرآن میں عظیم تر آیت کونسی ہے؟ فرمایا آیت الکرسی، (ابن کثیر عن احمد بن محمد) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ بقرہ میں ایک آیت ہے جو سیدۃ آیات القرآن ہے، وہ جس گھر میں پڑھی جائے شیطان اس سے بچل جاتا ہے۔

نسانی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہر نماز فرض کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرے تو اس کو جنت میں داخل ہونے کے لئے بجز موت کے کوئی مانع نہیں ہے، یعنی موت کے بعد فوراً وہ جنت کے آثار اور راحت و آرام کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔

اس آیت میں اللہ جل شانہ کی توحید ذات و صفات کا بیان ایک عجیب و غریب انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس میں اللہ جل شانہ کا موجود ہونا، زندہ ہونا، سمیع و بصیر ہونا، مشکل ہونا، واجب الوجود ہونا، دائم و باقی ہونا، سب کائنات کا موجد و خالق ہونا، تغیرات اور تاثرات سے بالاتر ہونا، تمام کائنات کا مالک ہونا، صاحب عظمت و جلال ہونا، کہ اس کے آگے کوئی بغیر اس کی اجازت کے بول نہیں سکتا، ایسی قدرت کا ملکہ مالک ہونا کہ سارے عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے والی رکھنے اور ان کا نظام محکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتا ہے نہ سستی، ایسے علم

محیط کا مالک ہونا جس سے کوئی کھل یا چھپی چیز کا کوئی ذرہ یا قطرہ باہر نہ رہے، یہ اجمالی مفہوم ہے اس آیت کا، اب تفصیل کے ساتھ اس کے الفاظ کے معنی سنئے:

اس آیت میں دس جملے ہیں، پہلا جملہ ہے **اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ**، اس میں لفظ **اللَّهُ** اسم ذات ہے، جس کے معنی ہیں وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک **لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ** میں اسی ذات کا بیان ہے، کہ قابل عبادت اس ذات کے سوا کوئی چیز نہیں۔

دوسرا جملہ ہے **الْعَلِيُّ الْقَبِيضُ** لفظ **عَلِيٌّ** کے معنی عربی زبان میں ہیں زندہ، اس کے آہستہ میں یہ لفظ لاکر یہ بتلانا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے، وہ موت سے بالاتر ہے، لفظ **قَبِيضٌ** قیام سے نکلا ہے، قیام کے معنی کھڑا ہونا، قائم کھڑا ہونے والے کو کہتے ہیں، قیوم اور قیام مبالغہ کے صیغہ ہوتا ہے، ان کے معنی ہیں وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے، قیوم حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو چیزیں خود اپنے وجود و بقا میں کسی دوسرے کی محتاج ہوں وہ کسی دوسری چیز کو کیا سنبھال سکتی ہیں؟ اس لئے کسی انسان کو قیوم کہنا جائز نہیں، جو لوگ عبد القیوم کے نام کو بگاڑ کر صرف قیوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

اللہ جل شانہ کے اسماء صفات میں حتی و قیوم کا مجموعہ بہت سے حضرات کے نزدیک اسم علم ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر میں میں نے ایک وقت یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں آپ کیا کر رہے ہیں، پہنچا تو دیکھا کہ آپ سجدہ میں پڑے ہوئے بار بار یا علی یا قیوم یا حتی یا قیوم کہہ رہے ہیں۔

تیسرا جملہ **لَا تَأْخُذُكَ شَيْئٌ** ہے، لفظ **شَيْئٌ** شین کے زبر کے ساتھ، اُدغمہ کو کہتے ہیں، جو نیند کے ابتدائی آثار ہوتے ہیں، اور **تَأْخُذُ** مکمل نیند کو، اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ جل شانہ اُدغمہ اور نیند سے بے خبری و بالا ہے، پچھلے جملے میں لفظ قیوم نے جب انسان کو یہ بتلایا کہ اللہ جل شانہ سارے آسمانوں زمینوں اور ان میں سارے والی تمام کائنات کو تھامے اور سنبھالے ہوئے ہیں اور ساری کائنات اسی کے ہوائے قائم ہے، تو ایک انسان کا خیال اپنی جبلت و فطرت کے مطابق اس طرف جانا ممکن ہے کہ جو ذات پاک اتنا بڑا کام کر رہی ہے اس کو کسی وقت تھکان بھی ہونا چاہئے کچھ وقت آرام اور نیند کے لئے بھی ہونا چاہئے، اس دوسرے جملے میں محدود علم و بصیرت اور محدود قدرت رکھنے والے انسان کو اس پر متنبہ کر دیا کہ اللہ جل شانہ کو اپنے اوپر یا دوسری مخلوقات پر قیاس نہ کرے، اپنا جیسا سمجھے، وہ مثل و مثال سے بالاتر ہے، اس کی قدرت کا ملکہ کے سامنے یہ سارے کلام نہ کچھ مشکل ہیں، نہ اُس کے لئے بھکان کا سبب ہیں، اور اس کی ذات پاک تمام تاثرات اور محاکات کعب اور ادغمہ اور نیند سے بالاتر ہے۔

جو تھا جملہ ہے لَمْ تَلَفِ السَّمُوتِ وَمَلَكِ الْاَرْضِ، اس کے شروع میں لفظ لَمْ کا لام تملک کے معنی کے لئے آگیا ہے، جس کے معنی یہ ہوتے کہ تمام چیزیں جو آسمانوں یا زمین میں ہیں سب اللہ کی ملک ہیں، وہ مختار ہے، جس طرح چاہے اُن میں تصرف فرمادے۔

پانچواں جملہ ہُوَ مَنْ ذَا الَّذِي يَخْلُقُ عِنْدَهُ لَا يَأْذِيهِ، یعنی ایسا کون ہے جو اس کے آگے کسی سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے، اس میں چند مسائل بیان فرادیئے ہیں:

اول یہ کہ جب اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے، کوئی اس سے بڑا اور اس کے اوپر حکم نہیں تو کوئی اس سے کسی کام کے بارے میں باز پرس کرنے کا بھی حق دار نہیں، وہ جو حکم جاری فرمائیں اس میں کسی کو چون و چسرا کی مجال نہیں، ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص کسی سفارش و شفاعت کرے سو اس کو بھی واضح فرمادیا کہ بارگاہِ عزت و جلال میں کسی کو مجال دم زدن نہیں، ہاں کچھ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں جن کو خاص طور پر کلام اور شفاعت کی اجازت دیدی جائیگی، غرض بلا اجازت کوئی کسی کی سفارش و شفاعت بھی نہ کر سکے گا، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں سب سے پہلے میں ساری امتوں کی شفاعت کروں گا، اسی کا نام مقام محمود ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

چھٹا جملہ ہے يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے گچھے کے تمام حالات واقعات سے واقف و باخبر ہے، آگے اور پیچھے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات و واقعات حق تعالیٰ کے علم میں ہیں، اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ آگے سے مراد وہ حالات ہیں جو انسان کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور پیچھے سے مراد اس سے مخفی واقعات و حالات ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ انسان کا علم تو بعض چیزوں پر ہے، اور بعض پر نہیں، کچھ چیزیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں کچھ چھپی ہوئی، مگر اللہ جل شانہ کے سامنے یہ سب چیزیں برابر ہیں، اس کا علم ان سب چیزوں کو یکساں محیط ہے، اور ان دونوں مفہوموں میں کوئی تعارض نہیں، آیت کی وسعت میں یہ دونوں داخل ہیں۔

ساتواں جملہ وَلَا يَخِيطُونَ لِيُكْوِيَ عِلِّيَّةً إِلَّا بِمَا شَاءَ، یعنی انسان اور تمام مخلوقات اللہ کے علم کے کسی حصہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، مگر اللہ تعالیٰ ہی خود جس کو جتنا حصہ علم عطا کرنا چاہیں صرف اتنا ہی اس کو علم ہو سکتا ہے، اس میں بتلادیا گیا کہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط صرف اللہ جل شانہ کی خصوصی صفت ہے، انسان یا کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں ہو سکتی۔

آٹھواں جملہ ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمُوتِ وَالْاَرْضَ، یعنی اس کی کرسی اتنی بڑی ہے

جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سمیت ہوتے ہیں، اللہ جل شانہ نشست و برخاست اور خیز و مکان سے بالاتر ہیں، اس قسم کی آیات کو اپنے معاملات پر قیاس نہ کیا جائے، اس کی کیفیت و حقیقت کا ادراک انسانی عقل سے بالاتر ہے، البتہ مستند روایات حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور کرسی بہت عظیم الشان جسم ہیں جو تمام آسمان اور زمین سے بڑھا بیڑے ہیں ابن کثیرؒ نے بروایت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کرسی کیا اور کیسی ہے، آپؐ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی حلقہ انگشتری جیسا ڈال دیا جائے۔

اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ عرش کے سامنے کرسی کی مثال بھی ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں انگشتری کا حلقہ۔

نواں جملہ ہے وَلَا يَؤْخَذُكُمْ حِفْظُهُمْ، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان دونوں عظیم مخلوقات آسمان و زمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس قادر مطلق کی قدرت کا ملکہ کے سامنے یہ سب چیزیں نہایت آسان ہیں۔

دسواں آخری جملہ ہُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ، یعنی وہ عالی شان اور عظیم الشان ہے، پچھلے ترجموں میں حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے کمالات بیان ہوئے ہیں، ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ہر عقل رکھنے والا انسان یہی کہنے پر مجبور ہے کہ ہر عزت و عظمت اور بلندی و برتری کی مالک و سزاواردہی ذات پاک ہے، ان دس جملوں میں اللہ جل شانہ کی صفات کمال اور اس کی توحید کا مضمون پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ آگیا۔

لَا اِكْرَاهُ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ

برہنہستی نہیں دین کے معاملہ میں بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے اب جو کوئی نہ مانے گمراہ

بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنُ بِاللّٰهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَا

کرنے والوں کو اور یقین لادے اللہ پر تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط جو ٹوٹنے والا

لَقَدْ اٰتٰنَا اللّٰهَ تَسْمِيْعًا عَلِيْمًا

نہیں اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے

خلاصہ تفسیر

دین اسلام کے قبول کرنے میں زبردستی (کافی نفع کوئی موقع) نہیں دیکھ کر ہدایت یقیناً عمر اسی سے ممتاز ہو چکی ہے (یعنی اسلام کا حق ہونا دلائل سے واضح ہو چکا ہے، تو اس میں اکراہ کا موقع ہی کیا ہے، اکراہ تو غیر پسندیدہ چیز پر مجبور کرنے سے ہوتا ہے، اور جب اسلام کی غرض یقیناً ثابت ہے، تو جو شخص شیطان سے براعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد (یعنی اسلام قبول کرے) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تمام لیا جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں (اقوال ظاہری کے) اور خوب جاننے والے ہیں (احوال باطنی کے)

معارف مسائل

اسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاکت اور محرومی سے محفوظ رہتا ہے، اس لئے اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تھام کر گرنے سے مامون رہتا ہو اور جس طرح ایسی رسی کے ٹوٹ کر گرنے کا خطرہ نہیں اور یوں کوئی رسی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے، اسی طرح اسلام میں کسی قسم کی ہلاکت اور خسران نہیں ہے، اور خود کوئی اسلام کو ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے (بیان القرآن)

اس آیت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں زبردستی نہیں ہو، حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم اس کے معارض ہے۔

اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبول ایمان پر مجبور کرنے کے لئے نہیں ہے، ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی ذمہ داری میں رکھنے اور ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے، بلکہ دفع فساد کے لئے ہے، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو نا پسند ہے، جس کے دہے کا فریب ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وَيُغَوِّونَ فِي الْأَرْضِ فساداً
لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (۱۳، ۱۵)

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دور کرنے کا حکم دیا ہے، پس ان لوگوں کا قتل ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بچھو اور دیگر موذی جانوروں کا قتل۔ اسلام نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہج وغیرہ کے قتل کو عین میدان جہاد میں بھی سختی سے روکا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی ان لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا ہے جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہو گئے ہوں۔

اسلام کے اس طرز عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس سے وہ دنیا میں ظلم و ستم کو مٹا کر عدل و انصاف اور امن و امان قائم رکھنا چاہتا ہے، حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اس نے کہا: اَنَا عَجُوزٌ كَبِيرَةٌ وَالْمَوْتُ إِلَيَّ قَرِيبٌ "تین میں ایک قریب المرگ بڑھیا ہوں، آخری وقت میں اپنا مذہب کیوں چھوڑ دوں؟" حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو اس کو ایمان پر مجبور نہیں کیا، بلکہ یہی آیت تلاوت فرمائی: لَّا أَكْرَاهُ فِي الدِّينِ یعنی دین میں زبردستی نہیں ہے۔

درحقیقت ایمان کے قبول پر جبر و اکراہ ممکن بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ایمان کا تعلق ظاہری اعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر و اکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے، اور جہاد و قتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہذا اس کے ذریعے سے ایمان کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیات جہاد و قتال آیت "لَّا أَكْرَاهُ فِي الدِّينِ" کے معارض نہیں ہیں۔ (منظہری، مستطبی)

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ

اشد دھماکہ ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف اور جو لوگ

كَفَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ يُخْرِجُهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ

کافر ہوئے ان کے رفیق ہیں شیطان نکالتے ہیں ان کو روشنی سے اندھیروں کی طرف

أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ

یہی لوگ ہیں دوزخ میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَى قَوْلِهِ خَالِدُونَ ۝ اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، ان کو دیکھو تاریکیوں سے نکال کر یا بچا کر نور (اسلام) کی طرف

لاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں ان کے ساتھی شیاطین ہیں (انسی یا جنتی) وہ ان کو نور (اسلام) سے نکال کر یا بچا کر دھند (تاریکیوں کی طرف) لے جاتے ہیں، ایسے لوگ (جو اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں) دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔

اس آیت سے ایمان کا سب سے بڑی نعمت اور کفر کا سب سے بڑی مصیبت ہونا بھی معلوم ہوا اور یہ بھی کہ کافروں کی دوستی میں بھی ظلمت ہے۔

معارف مسائل

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کی بابت اس وجہ کہ دی تھی اللہ

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ

لے اسکو سلطنت جب کہا ابراہیم نے میرا رب جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے وہ بولائیں میں چلاتا ہوں اور مارتا ہوں

قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالنَّمِيسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا

کہا ابراہیم نے بیشک وہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے اب تو لے آ اس کو

مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

مغرب سے تب حیران رہ گیا وہ کافر اور اللہ سیدھی راہ نہیں دکھاتا

الظَّالِمِينَ ﴿۵﴾

بے انصافوں کو۔

خلاصہ تفسیر

راے مخاطب کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا یعنی مزدک کا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں (یعنی توبہ توبہ وہ خدا کے وجود ہی کا منکر تھا) اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی (یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ نعمت سلطنت پر احسان ماننا اور ایمان لانا اس کے برعکس انکار اور کفر شروع کر دیا اور یہ بات اس وقت شروع ہوا تھا جب ابراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ خدا کیسا ہے جواب میں) فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ چلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی زندہ کرنا اور مارنا اس کی قدرت میں ہے) وہ کوڑے معزز چلانے مارنے کا مطلب تو سمجھا نہیں کہنے لگا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں (میں بھی چلاتا اور مارتا ہوں) چنانچہ جسکو چاہوں قتل کر دوں یہ تو مارنا ہے اور جسکو چاہوں قتل سے معاف کر دوں یہ چلانا ہے) ابراہیم علیہ السلام نے (جب دیکھا کہ بالکل ہی بھڑی عقل کا ہے کہ اس کو چلانا اور مارنا سمجھتا ہے حالانکہ چلانے کی حقیقت بے جان چیز میں جان ڈال دینا ہے اسی طرح مارنے کا معاملہ سمجھو اور قرآن سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ چلائے اور مارے کی حقیقت سمجھ گاہ نہیں اس لئے اس ضرورت سے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق

سے نکلتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال کر دکھلا) اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر اور کچھ جواب نہ بن آیا اس کا مقتضی یہ تھا کہ وہ ہدایت کو قبول کرتا مگر وہ اپنی گمراہی پر جا رہا اس لئے ہدایت نہ ہوئی اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

معارف و مسائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کافر کو دنیاوی عزت و شرف اور ملک و سلطنت عطا کر دیں تو اس نام سے تعبیر کرنا جائز ہے نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مناظرہ اور مجادلہ کرنا بھی جائز ہے تاکہ حق و باطل میں فرق ظاہر ہو جائے (قرطبی)

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی مغرب سے نکالے دے اس شبہ کا یہ ہو کہ اس کے قلب میں بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے اور یہ مشرق سے نکلتا اسی کا فعل ہے اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے اور یہ شخص پیغمبر ہے اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہوگا اور ایسا ہونے سے انقلاب عظیم عالم میں پیدا ہوگا کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں مثلاً لوگ اس مہجرے کو دیکھ کر مجھ سے مخوف ہو کر ان کی راہ پر ہولیں اور اسی حجت میں سلطنت جاتی رہے، یہ جواب تو اس لئے دیا اور دوسرا کوئی جواب تھا نہیں اس لئے حیران رہ گیا (بیان القرآن)

أَوَكَلَّيْنِي مَرْغَىٰ قَرِيْبَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرْوَةِ شِمَاءٍ قَالَ أَنَىٰ يُحْيِي

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو کہ گذرا وہ ایک شہر پر اور وہ گر پڑا تھا اپنی جھٹوں پر بولا کیوں کر زندہ کرے گا

هَٰذَا اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِنَا ۚ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ

اس کو اللہ مرنے چھوڑے پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے تئو برس پھر اٹھایا اس کو کہا تو کہتی

كَمْ لَبِثْتُ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَلْ لَّبِثْتُ مِائَةَ

دیر یہاں رہا بولائیں رہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم کہا نہیں بلکہ تو رہا تئو برس

عَامٍ ۖ فَالْظُّرُّ إِلَىٰ طَعَامٍ مَّكٍ وَشَرَابٍ لَّمْ يَتَسَنَّ ۖ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ

اب دیکھ اپنا کھانا اور پینا سٹر نہیں گیا اور دیکھ اپنے گدے کو

وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ ۖ وَانْظُرْ إِلَىٰ الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ

اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا لوگوں کی واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم انکو کس طرح اٹھا کر جوڑ دیں

تَكُونُهَا الْحَمْدُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ

بہر ان پر پہناتے ہیں گوشت، پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہو کہ بیشک

قَدِيرٌ ۝

اللہ ہر چیز پر قادر

خلاصہ تفسیر

اَوْحَا لَنِي مَرَّةً عَلَى قَرْبَةٍ وَهِيَ تَحَادِيثُهُ (الی قولہ) اَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ
کیا تم کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے، جیسے ایک شخص تھا کہ (چلتے چلتے) ایک بستی پر ایسی
حالت میں اس کا گزر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے، یعنی پہلے چھتیں گریں
پھر ان پر دیواریں گر گئیں، مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ سے وہ بستی ویران ہو گئی تھی، اور سب آدمی مریز
گئے تھے، وہ شخص یہ حالت دیکھ کر حیرت سے کہنے لگا کہ (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو
یعنی اس کے مردوں کو اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریں گے (یہ تو
یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں مردوں کو جلا دیں گے، مگر اس وقت کے چلانے کا جو خیال غالب ہوا
تو بوجہ اس امر کے عجیب ہونے کے ایک حیرت سی دل پر غالب ہو گئی، اور چونکہ خدا تعالیٰ ایک کام
کو کئی طرح کر سکتے ہیں، اس لئے طبیعت اس کی متلاشی ہوئی کہ خدا جانے جلا دینا کس صورت سے
ہو گا، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس کا تماشا اس کو دنیا ہی میں دکھلا دیں، تاکہ ایک نظیر کے واقع ہو جائے
سے لوگوں کو زیادہ ہدایت ہو سو اس لئے) اللہ تعالیٰ نے اس شخص (کی جان قبض کر کے اس کو)
تو بڑے تک مردہ رکھا، پھر (سو برس کے بعد) اس کو زندہ اٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ تو کتنی مدت
اس حالت میں رہا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا، یا ایک دن سے بھی کم (کنا یہ بڑی
مدت قلیل ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ تو (اس حالت میں) تو بڑے رہا ہے، (اور اگر
اپنے بدن کے اندر تغیر نہ ہونے سے تعجب ہو) تو اپنے کھانے پینے کی چیز کو دیکھ لے کہ (ذرا)
نہیں سڑی گئی (ایک قدرت تو ہماری یہ ہے) اور (دوسری قدرت دیکھنے کے واسطے) اپنے
(سواری کے) گدھے کی طرف نظر کر کہ گل سڑ کر کیا حال ہو گیا ہے، اور ہم عنقریب اس کو
تیرے سامنے زندہ کئے دیتے ہیں) اور (ہم نے تجھ کو اس لئے مار کر زندہ کیا ہے) تاکہ ہم تجھ کو
(اپنی قدرت کی) ایک نظیر لوگوں کے لئے بنادیں کہ اس نظیر سے بھی قیامت کے روز زندہ
ہونے پر استدلال کر سکیں) اور اب اس گدھے کی، ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح

ترکیب دیئے دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں (پھر اس میں جان ڈال دیتے ہیں، غرض
یہ سب امور یوں ہی کر دیئے گئے) پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص کو (مشاہدہ سے) واضح ہو گئی
تو (بے ہمتی و جوش میں آکر) کہہ اٹھا کہ میں (دل سے) یقین رکھتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ
ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُنْجِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوْمِئًا ثُمَّ قَالَ

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اے پروردگار میرے دکھلا دے مجھ کو کیونکر زندہ کرے گا تو مردہ، فرمایا کیا تو نے یقین کیا

قَالَ بَلَىٰ وَلَئِنْ لَيُطْمِئِنُّ قَلْبِي عَلَىٰ مَا أَفْعَلُ فَأَرْبَعَةٌ مِّنَ الطَّيْرِ

کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے کہ چاہتا ہوں کہ تمہیں ہو جاؤ میرے دل کو فرمایا تو کھڑے چار جانور اڑنے والے

فَصَرَّ هُنَّ إِلَيْكَ لَمَّا جَعَلَ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ

پھر ان کو بلانے لگا تو ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو بلا

يَا تَيْنِكَ سَعْيَاكُ وَأَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست حکمت والا

خلاصہ تفسیر

اور اس وقت کے واقعہ کو یاد کر جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ
اے میرے پروردگار مجھ کو (یہ) دکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو (قیامت میں مثلاً) کس کیفیت سے
زندہ کریں گے (یعنی زندہ کرنے کا تو یقین ہے، لیکن زندہ کرنے کی مختلف صورتیں اور کیفیتیں
ہو سکتی ہیں وہ معلوم نہیں، اس لئے وہ معلوم کرنے کو دل چاہتا ہے، اس سوال سے کسی کم سمجھ
آدمی کو اس کا شبہ ہو سکتا تھا کہ معاذ اللہ ابراہیم علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان
یقین نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے خود یہ سوال قائم کر کے بات کھول دی، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام
سے اس سوال کے جواب میں اول، ارشاد فرمایا کہ کیا تم (اس پر) یقین نہیں لاتے، انھوں نے
(جواب میں) عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لانا، لیکن اس عرض سے یہ درخواست کرتا ہوں تاکہ میرے
قلب کو (معتین صورت زندہ کرنے کی مشاہدہ کرنے سے) سکون ہو جاوے (ذہن دوسرے احتمال
سے چکر میں نہ پڑے) ارشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے بلا لو،

اور نظام محکم نے ایک انسان کے بدن میں جم فرمادیے، اگر غافل اور کوتاہ نظر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنے ہی تن بدن کی تحقیق (ریسرچ) کرنے بیٹھ جائے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا وجود خود ایسے بے شمار اجزاء سے مرکب ہے جو کوئی مشرق کا ہے کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دنیا کا کوئی شمالی حصہ کا، آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اجزاء قدرت کے نظام محکم نے اس کے بدن میں جم فرمادیے ہیں، اور مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر اسی طرح منتشر ہو جائیں گے، تو اب دوسری مرتبہ پھر ان کا جم فرمادینا اس کی قدرت کاملہ کے لئے کیا دشوار ہے، جس نے پہل مرتبہ اس کے وجود میں ان منتشر ذرات کو جم فرمادیا تھا۔

واقعہ مذکورہ پر چند سوالات آیت متذکرہ بالا کے مضمون میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں،
مع جوابات
 اول یہ کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا، جبکہ وہ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر ایمان لانے میں اس وقت کی ساری دنیا سے زیادہ یقین پر تھے؟

اس کا جواب اس تقریر کے ضمن میں آچکا ہے جو اوپر کی گئی ہے کہ درحقیقت حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال کسی شک و شبہ کی بناء پر تھا ہی نہیں، بلکہ سوال کا منشاء صرف یہ تھا کہ حق تعالیٰ قیامت میں مردوں کو زندہ کریں گے، ان کی قدرت کاملہ سے یہ کسی طرح بھی مستبعد یا حیرت انگیز نہیں، بلکہ یقینی ہے، لیکن مردہ کو زندہ کرنے کا کام انسان کی طاقت سے باہر ہے، اس نے کبھی کسی مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں اور مردہ کو زندہ کرنے کی کیفیات اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں، انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہوا جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام الطینان ہے، اسی کے لئے حضرت خلیل اللہ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان اور الطینان میں کیا فرق ہے، ایمان اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسول کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جائے، اور الطینان سکون قلب کا نام ہے، بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقین کامل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے، حضرت خلیل اللہ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان و یقین تھا، سوال صرف کیفیت احیاء کے متعلق تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق تھا، اصل حیات بعد الموت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، تو پھر ارشاد ربانی **اَوْ لَمْ تُؤْمِنُ** یعنی کیا آپ کو یقین نہیں؟ فرمانے کا کوئی موقع نہیں رہتا؟
 جواب یہ ہے کہ جو سوال حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمایا کہ اصل واقعہ میں کوئی شک نہیں، لیکن اس سوال کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ زندہ کرنے کی کیفیت دریافت کرنا منظور ہے۔

ابنی الفاظ سوال کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو اصل قدرت میں شبہ یا انکار سے پیدا ہوا کرتا ہے، جیسے آپ کسی بوجھ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ فلاں آدمی اس کو نہیں اٹھا سکتا اور آپ اس کا عاجز ہونا ظاہر کرنے کے لئے کہیں کر دیکھیں تم کیسے اس بوجھ کو اٹھاتے ہو، جو کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوال کا یہ غلط مفہوم بھی کوئی لے سکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس غلط بات سے بری ثابت کرنے کے لئے ہی یہ ارشاد فرمایا **اَوْ لَمْ تُؤْمِنُ** تاکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے جواب میں بتلی فرما کر ان فرماؤں کی زد سے نکل جائیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس سوال ابراہیم سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر الطینان حاصل نہ تھا، حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر عالم غیب سے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین و الطینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، کیونکہ مجھے ایمان بالغیب ہی سے الطینان کامل حاصل ہے، تو جب بعض امتیوں کو درجہ الطینان حاصل ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے خلیل کو الطینان کا درجہ حاصل نہ ہو؟

اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ الطینان کے بھی بہت سے درجات ہیں، ایک الطینان ہو جو اولیاء اللہ اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے اعلیٰ مقام الطینان ہو جو عام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے بھی مافوق ہے، جو خاص خاص کو بصورت مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو درجہ الطینان کا حاصل تھا وہ بلاشبہ حضرت خلیل اللہ کو حاصل تھا، بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ الطینان جو مقام نبوت کے ساتھ خاص ہے، اس الطینان میں حضرت خلیل اللہ اور سب امتیوں سے فائق تھے، پھر جس کو وہ طلب فرماتے ہیں وہ سب کے لئے معتمد الطینان ہے جو خاص خاص انبیاء کو عطا فرمایا جاتا ہے، جیسے سرور کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرنا الطینان خاص بخشا گیا۔

الغرض اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اطمینان حاصل نہ تھا، یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اطمینان کامل جو مشاہدہ سے حاصل ہوا کرتا ہے وہ نہ تھا، اسی کے لئے یہ درخواست فرمائی تھی۔

آیت کے آخر میں فرمایا، اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ۔ بین اللہ تعالیٰ زبردست ہیں، اور حکمت والے ہیں، زبردست ہونے میں قدرت کاملہ کا بیان فرمایا، اور حکمت والا کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ بمقتضائے حکمت ہر ایک کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا، ورنہ حق جل شانہ کے لئے کوئی دشوار نہیں کہ ہر انسان کو مشاہدہ کرا دیں، مگر پھر ایمان بالنبی کی جو فضیلت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہو کہ جیسے ایک دانہ اس سے اُگھیں

سَبْعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ

سات بائیس ہر مال میں تتر تتر دانے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے

يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۶۶﴾ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي

چاہے اور اللہ بے نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال

سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يَتَّبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَهُمْ

اللہ کی راہ میں، پھر خرچ کر کے پیچیدہ نا احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں انہی کے لئے ہے

أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۲۶۷﴾

ثواب اُن کا اپنے رب کے یہاں، اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ غمیں ہوں گے

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ

جواب دینا نرم اور درگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے پیچھے ہوتا نا احسان اور اللہ بے پروا

عَنِ حُلَيْمٍ ﴿۲۶۸﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتَكُمْ بِالسَّنَنِ

ہر نہایت غفلت والا، اے ایمان والو! مت مٹا کر اپنی خیرات احسان رکھ کر

وَالَّذِي كَانِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ

اور ایذا دے کر اس شخص کی طرح جو خرچ کر لے اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو اور یقین نہیں رکھتا کہ اللہ

الْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ ثَرَابٌ فَأَصَابَهُ

ہر اور قیامت کے دن ہر سوا اس کی مثال ایسی ہی جیسے صاف پتھر کے اُس پر پڑی ہے کچھ مٹی پھر برست آئی

وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ

زور کا مینہ تو کر پھوڑا اس کو بالکل صاف کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے ثواب میں چیز کا جو انھوں نے کایا اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿۲۶۹﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ

نہیں دکھاتا، سیدھی راہ کافروں کو، اور مثال اُن کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ

ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ حَبَّةٍ كُرْبُوتٍ

کی خوشی حاصل کرنے کو اور اپنے دلوں کو ثابت کر کے ایسی ہو ایک باغ ہر بلند زمین پر

أَصَابَهَا وَابِلٌ فَانْتَأَتْ أَكْطَا ضَعْفَيْنِ فَإِنْ لَّمْ يُصِيبْهَا وَابِلٌ فَطُلُّ

اس پر پڑا زور کا مینہ تو لایا وہ باغ اپنا پھل دو چند اور اگر نہ پڑا اس پر مینہ تو پھوڑا ہی کاٹا ہے،

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۷۰﴾ أَيُّودٌ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ

اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے، کیا پسند آتا ہے تم میں سے کسی کو یہ کہ ہر دے اس کا ایک باغ

مِنْ تَخْيِيلٍ وَأَعْتَابُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ

کھجور کا اور انگور کا بہتی ہوں نیچے اس کے بہریں اس کو اس باغ میں اور بھی سب

الشَّجَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّتٌ ضَعُفَاءٌ مِنْ أَصَابِهِ

طرح کا میرہ ہو حاصل اور آگیا اس پر بڑھاپا اور اس کی اولاد میں ضعیف تب آپڑا اس باغ پر

إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ

ایک بجولا جس میں آگ تھی جس سے وہ باغ جل اٹھا، یوں سمجھانا ہے تم کو اللہ آیتیں

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۷۱﴾

تاکہ تم غور کرو۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی امور خیر میں) اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت رعنا اللہ ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں جمیں (اور) ہر بالی کے اندر ستودا لے ہوں (اسی طرح خدا تعالیٰ ان کا ثواب سات سو حصہ تک بڑھاتا ہے) اور یہ السنو فی خدا تعالیٰ جسکو چاہتا ہے (بعد اس کے اخلاص اور مشقت کے) عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں وہ سب کو یہ السنو فی دے سکتے ہیں مگر ساتھ ہی (جاننے والے) بھی (اس لئے) اخلاص نیت وغیرہ کو دیکھ کر عطا فرماتے ہیں) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے اس پر زبان سے) احسان جتلاتے ہیں اور نہ (برتاؤ سے اس کو) آزار پہنچاتے ہیں ان لوگوں کو ان کے عمل کا ثواب ملے گا ان کے پروردگار کے پاس (جا کر) اور نہ (قیامت کے دن) ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے (ناداری کے وقت جواب میں معقول و مناسب بات کہہ دینا اور اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلاوے یا اصرار سے تنگ کرے تو اس سے) درگزر کرنا ہزار درجہ بہتر ہے ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد آزار پہنچا یا جائے اور اللہ تعالیٰ خود غنی ہیں کسی کے مال کی ان کو حاجت نہیں، جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے واسطے پھر آزار کس بنا پر پہنچا یا جائے اور آزار دینے پر جو فوراً سزا نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ (علم بھی) ہیں، اے ایمان والو تم احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات (کے ثواب بڑھانے) کو برباد مت کر دو جس طرح وہ شخص (خود خیرات کے اصل ثواب ہی کو برباد کر دیتا ہے) جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم قیامت پر (مراد اس سے) بعزیز نفی ایمان کے منافق ہے) سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو اس پر) جب کچھ مٹی (آگنی) ہو اور اس مٹی میں کچھ گھاس پھوس جم آیا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے سو اس کو جیسا تھا ویسا ہی (بالکل صاف کر دے) اسی طرح اس منافق کے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہو گیا جو ظاہر میں ایک نیک عمل جس میں امید ثواب ہو معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے لفاق نے اس شخص کو ویسا ہی کورا ثواب سے خالی چھوڑ دیا، چنانچہ قیامت میں) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (کیونکہ کمائی نیک عمل ہے اور اس کا ہاتھ لگنا ثواب کا ملنا ہے) اور ثواب ملنے کی شرط ایمان اور اخلاص ہے اور ان لوگوں میں یہ مفعول ہے، کیونکہ ریاکار بھی ہیں اور کافر بھی ہیں) اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو قیامت کے

روز ثواب کے گھر یعنی جنت کا) راستہ نہ بتلا دیں گے کیونکہ کفر کی وجہ سے ان کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوا جس کا ثواب آخرت میں ذخیرہ ہوتا اور وہاں حاضر ہو کر اس کے صلہ میں جنت میں پہنچائے جاتے) اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے (جو کہ خاص اس عمل سے ہوگی) اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان) میں بھٹکی پیدا کریں (تاکہ دوسرے اعمال صالحہ سہولت سے پیدا ہو کر) پس ان لوگوں کے نفعات و صدقات کی حالت (مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلے پر ہو کہ اس جگہ کی ہوا لطیف اور بار آور ہوتی ہے اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ (باغ) لطافت ہوا اور بارش کے سبب اور باغوں سے یا اور دفعوں سے) دونا (چوگنا) پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا میٹھ نہ پڑے تو ہلکی پھوار (یعنی خفیف بارش) بھی اس کو کافی ہے (کیونکہ زمین اور مرقع اس کا اچھا ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے جب وہ اخلاص دیکھتے ہیں ثواب بڑھا دیتے ہیں) بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کہ جو روں کا اور انگوروں کا (یعنی زیادہ درخت اس میں ان کے ہوں اور اس (باغ) کے (درختوں کے) نیچے ہنریں چلتی ہوں) جس سے وہ خوب سرسبز و شاداب ہوں اور اس شخص کے یہاں اس باغ میں (علاوہ کہ جو روں اور انگوروں کے) اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پالا گیا ہو (جو کہ زمانہ زیادہ احتیاج کا ہوتا ہے) اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جنہیں (کمانے کی) قوت نہیں اس صورت میں اہل و عیال سے بھی اس کو توقع خبر گیری کی نہیں ہوگی، بس وجہ معاش صرف وہی باغ ہوا) سو ایسی حالت میں یہ قصہ ہو کہ اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ (کا مادہ) ہو پھر اس سے) وہ باغ جل جائے (ظاہر بات ہے کسی کو اپنے لئے یہ بات پسند نہیں آسکتی، پھر اسی کے مشابہ تو یہ بات بھی ہے کہ اول صدقہ دیا یا کوئی اور نیک کام کیا جس کے قیامت میں کار آمد ہونے کی امید ہو جو کہ وقت ہو گا غایت احتیاج کا اور زیادہ مدد قبول ہو گا اپنی طاعات پر پھر ایسے وقت میں معلوم ہو گا کہ ہمارے احسان جتلانے یا غیب کو ایذا دینے سے ہماری طاعات باطل یا بے برکت ہو گئیں، اس وقت کیسی سخت حسرت ہوگی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہو گیا پس جب تم مثال کے واقعہ کو پسند نہیں کرتے تو ابطال طاعات کو کیسے گوارا کرتے ہو) اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے (سمجھانے کے) لئے تاکہ تم سو جا کرو (اور سوچ کر اس کے موافق عمل کیا کرو)۔

معارف و مسائل

یہ سورۃ بقرہ کا چھتیسواں رکوع ہے جو آیت نمبر ۲۶۱ سے شروع ہوتا ہے، اب سورۃ بقرہ کے پانچ رکوع باقی ہیں جن میں آخری رکوع میں تو کلیات اور اہم اصولی چیزوں کا بیان ہے، اس سے پہلے چار رکوع میں آیت نمبر ۲۶۱ سے ۲۸۳ تک کل ۲۳ آیات ہیں، جن میں مالیات سے متعلق خاص ہدایات اور ایسے ارشادات ہیں کہ اگر دنیا آج ان پر پوری طرح مامل ہو جائے تو معاشی نظام کا وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے، جس میں آج کی دنیا چار سو بھٹک رہی ہے، کہیں سرمایہ داری کا نظام ہے تو کہیں اس کا رد عمل اشتراکیت اور اشتالیست کا نظام ہے، اور ان نظاموں کے باہمی ٹکراؤ نے دنیا کو قتل و قتال اور جنگ و جدال کا ایک جہنم بنا رکھا ہے، ان آیات میں اسلام کے معاشی نظام کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے، جس کے دوسرے ہیں:

۱۔ اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی رضا کے لئے حاجت مند مفلس لوگوں پر خرچ کرنے کی تعلیم جس کو صدقہ و خیرات کہا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرے سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی ہدایات۔ ان میں سے پہلے دو رکوع صدقہ و خیرات کے فضائل اور اس کی ترغیب اور اس کے متعلق احکام و ہدایات پر مشتمل ہیں، اور آخری دو رکوع سودی کاروبار کی حرمت و مانعت اور قرض ادا کر کے جائز طریقوں کے بیان میں ہیں۔

جو آیات اور پرکھی گئی ہیں ان میں اول اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل کا بیان فرمایا گیا۔ اس کے بعد ایسی شرائط کا بیان ہے جن کے ذریعے صدقہ و خیرات اللہ کے نزدیک قابل قبول اور موجب ثواب بنجائے، پھر ایسی چیزوں کا بیان ہو جو انسان کے صدقہ و خیرات کو برباد کر کے نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق بنا دیتی ہیں۔

اس کے بعد دو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ایک اُن نفقات و صدقات کی جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوں دوسرے اُن نفقات و صدقات کی جو غیر مقبول اور فاسد ہوں۔

یہ پانچ مضمون ہیں جو اس رکوع میں بیان ہوئے ہیں۔

یہاں ان مضامین سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کو کہیں بہ لفظ انفاق بیان فرمایا ہے، کہیں بہ لفظ اطعام، کہیں بہ لفظ صدقہ اور کہیں بہ لفظ ایتاء الزکوٰۃ، ان الفاظ تشریعی اور ان کے جگہ جگہ استعمال پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ لفظ انفاق، اطعام، صدقہ عام ہیں، جو ہر قسم کے صدقہ و خیرات اور رضائے الہی حاصل کرنے

کے لئے ہر قسم کے خرچ پر حاوی ہے، خواہ فرض و واجب ہوں، یا نفلی اور مستحب، اور زکوٰۃ فرض کے لئے قرآن نے ایک ممتاز لفظ ایتاء الزکوٰۃ استعمال فرمایا ہے، جس میں اس کی طرت اشارہ ہو کہ اس خاص صدقہ کے لئے حاصل کرنے اور خرچ کرنے دونوں میں کچھ خصوصیات ہیں۔

اس رکوع میں اکثر لفظ انفاق سے اور کہیں لفظ صدقہ سے تعبیر کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہو کہ یہاں عام صدقات و مبرات کا بیان ہے، اور جو احکام یہاں ذکر کئے گئے ہیں وہ ہر قسم کے صدقات اور اللہ کے لئے خرچ کرنے کی سب صورتوں کو شامل اور حاوی ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ پہلی آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یعنی چھپ کر یا جہاد میں، یا فقراء و مساکین اور یتیموں پر یا بہ نیت امداد اپنے عزیز و دوستوں پر، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک دانہ گہوں کا عمدہ زمین میں بولے، اس دانہ سے گہوں کا ایک پودا نکلے، جس میں ساٹ خوشے گہوں کے پیدا ہوں، اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ایک دانہ سے ساٹ سو دانے حاصل ہو گئے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا اجر و ثواب ایک لے کر ساٹ سو تک پہنچتا ہو، ایک پیسہ خرچ کرے تو سات سو پیسوں کا ثواب حاصل ہو سکتا ہے۔

صحیح و معتبر احادیث میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اس کا دس گنا ملتا ہے، اور سات سو گئے تک پہنچ سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ: ہمارا درجہ میں ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو درہم کے برابر ہے، یہ روایت ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد بیان کی ہے۔

الغرض اس آیت نے بتلایا کہ اللہ کی راہ میں ایک روپیہ خرچ کرنے والے کا ثواب ستاسو روپے کے خرچ کے برابر ملتا ہے۔

قبولیت صدقات کی لیکن تشریح حکیم نے اس مضمون کو بجائے مختصر اور صاف لفظوں میں بیان کرنے مثبت شرائط کے دانہ گندم کی مثال کی صورت میں بیان فرمایا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح کا ششکار ایک دانہ گندم سے سات سو دانے اُسی وقت حاصل کر سکتا

ہو جب کہ یہ دانہ عمدہ ہو خراب نہ ہو، اور دانہ ڈالنے والا کا ششکار بھی کا ششکار ہی کے فن سے پورا واقف ہو، اور جس زمین میں ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو، کیونکہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہو گئی تو یا یہ دانہ ضائع ہو جائے گا ایک دانہ بھی نہ نکلے گا، اور یا پھر ایسا بار آور نہ ہوگا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

اسی طرح عام اعمال صالحہ اور خصوصاً انفاق فی سبیل اللہ کی مقبولیت اور زیادتی اجر کے لئے بھی یہی تین شرطیں ہیں کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ پاک اور حلال ہو،

کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال مال کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔
دوسرے خرچ کرنے والا بھی نیک نیت اور صالح ہو، بدیتی یا نام و نمود کے لئے خرچ کرنے والا اس ناواقف کاشتکار کی طرح ہے جو دانہ کو کسی ایسی جگہ ڈال دے کہ وہ ضائع ہو جاتے۔

تیسرے جس پر خرچ کرے وہ بھی صدقہ کا مستحق ہو، کسی نااہل پر خرچ کر کے ضائع نہ کرے، اس طرح اس مثال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت بھی معلوم ہو گئی، اور ساتھ ہی اس کی تین شرطیں بھی، کہ مال حلال سے خرچ کرے، اور خرچ کر لے کا طریقہ بھی سنت کے مطابق ہو، اور مستحقین کو تلاش کر کے اُن پر خرچ کرے، محض جیب بیکال ڈالنے سے یہ فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

دوسری آیت میں صدقہ کرنے کے صحیح اور مسنون طریقہ کا بیان اس طرح فرمایا گیا، ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، اور نہ جن کو دیا گیا ہے ان کو کوئی ایذا پہنچاتے ہیں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، نہ اُن پر آئندہ کے لئے کوئی خطرہ ہو، اور نہ گذشتہ پر کوئی بوجھ و غم۔

قبولیت صدقہ کی منفی شرائط | اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی دو منفی شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک یہ کہ دے کر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کو عملاً ذلیل و خوار نہ سمجھیں، اور کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی حقارت و ذلت محسوس کرے یا اس کو ایذا پہنچے۔

تیسری آیت قَوْلُ مَعْرُوفٍ میں بھی صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ان دو شرطوں کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کا بیان اس سے پہلے آیت میں ہو چکا ہے، ایک یہ کہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے کسی پر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی ذلت و حقارت محسوس کرے، یا جس سے اس کو ایذا پہنچے۔

وضاحت اس طرح کی گئی کہ ناداری یا معذوری کی حالت میں سائل کے جواب میں کوئی معقول و مناسب غرض پیش کر دینا، اور اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلائے تو اس سے درگزر کرنا ہزار درجہ بہتر ہے، ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد اس کو ایذا پہنچائی جائے، اور اللہ تعالیٰ خود غنی و حلیم ہیں، اُن کو کسی کے مال کی حاجت نہیں، جو خرچ کرتا ہے اپنے نفع کے لئے کرتا ہے، تو ایک عاقل انسان کو خرچ کرنے کے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے، کہ میرا کسی پر احسان نہیں، میں اپنے نفع کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اور اگر لوگوں کی طرف سے کوئی ناشکری بھی محسوس کرے تو اخلاقِ الہیہ کے تابع ہو کر غفور و درگزر سے کام لے۔

چوتھی آیت میں اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے اور بھی تاکید کے ساتھ اس طرح ارشاد فرمایا کہ اپنے صدقات کو برباد نہ کرو، زبان سے احسان جتلا کر یا برتاؤ سے ایذا پہنچا کر۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جس صدقہ و خیرات کے بعد احسان جتلانے یا مستحقین کو ایذا پہنچانے کی صورت ہو جائے وہ صدقہ باطل کا عدم ہے، اُس پر کوئی ثواب نہیں، اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی ایک اور شرط کا اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص لوگوں کے دکھانے اور نام و نمود کے واسطے خرچ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی صاف پتھر پر کچھ مٹی جم جائے، اور اس میں کوئی دانہ بوسے پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے اور وہ اس کو بالکل صاف کر دے، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی، اور اللہ تعالیٰ کا فر لوگوں کو راستہ نہ دکھلائیں گے، اس سے قبولیت صدقہ و خیرات کی یہ مشروط معلوم ہوئی، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا ہوئی اور ثواب آخرت کی نیت سے خرچ کرے، دکھلانے یا نام و نمود کی نیت سے نہ ہو، نام و نمود کی نیت سے خرچ کرنا، اپنے مال کو برباد کرنا ہے، اور آخرت پر ایمان رکھنے والا مؤمن بھی اگر کوئی خیرات محض نام و نمود اور ریاء کے لئے کرتا ہے تو اس کا بھی یہی حال ہو کہ اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا، پھر اس جگہ لَا يُوَفِّيَنَّكَ اللّٰهُ کے اضافہ سے شاید اس طرف اشارہ کرنا منظور ہو کہ ریاء کاری، اور نام و نمود کے لئے کام کرنا اس شخص سے متصور ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، ریاء کاری اس کے ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فر لوگوں کو راستہ نہ دکھائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بھی ہوتی ہدایات اور آیات جو سب انسانوں کے لئے عام ہیں، انہیں جو ان ہدایات پر نظر نہیں کرتے بلکہ تمسخر اور استہزاء کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اُن کو توفیق سے محروم کر دیتے ہیں، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہدایت قبول نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں صدقہ مقبولہ اور انفاق مقبول کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ جو لوگ اپنے مال خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی نیت سے خرچ کرتے ہیں کہ اپنے نفسوں میں بخل پیدا کریں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باغ ہو کسی ٹیلے پر اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ اپنا پھل لایا ہو و چند اور اگر ایسے زور کی بارش بھی نہ پڑے تو ہلکی پھوٹا بھی اس کے لئے کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے جانتے ہیں۔

اس میں اخلاص نیت اور رعایت شرائطِ مذکورہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بڑی فضیلت اس مثال سے واضح کر دی گئی کہ نیک بدیتی اور اخلاص کے ساتھ تمہارا بھی خرچ کیا جائے تو وہ کافی اور موجب خیراتِ آخرت ہے۔

چھٹی آیت میں صدقہ و خیرات میں شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی کر لے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو کہ جو راہ انگریزوں کا اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پالا گیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس باغ پر ایک گولہ آدے جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جائے اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدی بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھا پالا گیا، اس کے اولاد بھی بڑا اور اولاد بھی چھوٹے سچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں کسی کا باغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر باغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ باغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو باغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو باغ کے جل جانے یا لٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدی شدت جستیاچ کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک باغ لگایا، اور وہ باغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھا پالا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحب عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور سچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگایا ہوا باغ جل جائے تو صدمہ شدید ہوگا، اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے ربا کاری سے صدقہ و خیرات کیا یہ گویا اس نے باغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کمانے اور دوبارہ باغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پھل کمانی محفوظ ہوتا کہ ضعیفی میں کام آئے، اور اگر اس حالت میں اس کا باغ اور مال متاع جل جائے تو اس کے دکھ اور ذلکی انتہاء نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو ربا خورد کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا ہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہوگا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے اتفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی کچھ شرائط معلوم ہوں گی:

اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جملانا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بغیر ان کی رضا مندی کے بندیا کم کر کے صدقہ و خیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجت مند داروں کو محروم کر کے سائے مال کو صدقہ و خیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتظام کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُود سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا حق ہوگا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہو جو شریعت کی رُود سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ كَسْبَتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا

اے ایمان والو خرچ کر دو مستحکم چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَكُمْ مِنَ الْخَيْثِ مِنْهُ تَنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ

ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصہ ذکر و گندی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کر دو، حالانکہ تم

چھٹی آیت میں صدقہ و خیرات میں شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی کر لے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو کھجور اور انگوروں کا اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پالا گیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس باغ پر ایک گولہ آدے جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جائے اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدیں بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھا پالا گیا، اس کے اولاد بھی بڑا اور اولاد بھی چھوٹے سچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں کسی کا باغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر باغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ باغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو باغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو باغ کے جل جانے یا لٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدیوں شدتِ جستیاچ کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک باغ لگایا، اور وہ باغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھا پالا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحبِ عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور سچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگایا ہوا باغ جل جائے تو صدمہ شدید ہوگا، اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے رباہ کاری سے صدقہ و خیرات کیا یہ گویا اس نے باغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کمانے اور دوبارہ باغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پھل کمانی محفوظ ہوتا کہ ضعیفی میں کام آئے، اور اگر اس حالت میں اس کا باغ اور مال متاع جل جائے تو اس کے دکھ اور ذلکی انتہاء نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو رباہ و خورد کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا ہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہوگا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے اتفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی کچھ شرائط معلوم ہوں گی:

اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جملانا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بغیر ان کی رضا مندی کے بندیا کم کر کے صدقہ و خیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجت مند داروں کو محروم کر کے سائے مال کو صدقہ و خیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتظام کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُود سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا حق ہوگا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہو جو شریعت کی رُود سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ كَسْبَتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا

اے ایمان والو خرچ کرو مستحکم چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَتَّبِعُوا الْغَيْبَ مِنْهُ تَنفِقُونَ وَلَسْتُمْ

ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصد کرو گندمی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو، حالانکہ تم

بَاخِذْ بِهِ إِلَّا أَنْ تُغْنِيَ وَافِيَةٌ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿۱۲۰﴾

اس کو کسی نہ لوگے مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور جان رکھو کہ اللہ بے پرواہی خوبوں والا ،

الْكَافِرُ يُعَذِّبُكُمْ بِالْفَقْرِ وَيَا مَرْكُومًا بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعْلَمُكُمْ

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا اور حکم کرتا ہے بھجائی کا اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو

مَغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۲۱﴾ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ

اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ بہت کثافت والا ہے سب کچھ جانتا ہے، عنایت کرتا ہے کچھ جس کو

يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ

چاہے اور جس کو سمجھ مل ہے اُس کو بڑی غری مل اور نصیحت دی قبول کرتے ہیں

إِلَّا أُولَ الْأَلْبَابِ ﴿۱۲۲﴾ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ

جو عقل والے ہیں ، اور جو خرچ کر دے تم خیرات یا قبول کر دے کوئی منت تو

تَذَرُّوْنَ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهَا وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿۱۲۳﴾ إِنْ تَبَدَّلَا

بیشک اللہ کو سب معلوم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ، اگر ظاہر کر کے دو

الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفَوْهَا وَتُؤْتَوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهِيَ

خیرات تو کیا اچھی بات ہے ، اور اگر اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ

خَيْرٌ لَّكُمْ وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

بہتر ہو تمہارے حق میں اور دور کرے گا کچھ گناہ تمہارے اور اللہ تمہارے کاموں سے

خَيْرٌ ﴿۱۲۴﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدًى مِّنْ لِّكِنَّا اللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ

خوب خبر دار کہ تیرا ذمہ نہیں اُن کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لادے جس کو چاہے ،

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفْسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ

اور جو کچھ خرچ کر دے تم مال سراپہ ہی واسطے جب تک کہ خرچ کر دے اللہ ہی کی رضا جوئی

اللَّهُ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ لِّيُؤْتِيَ لِيَكُمُ وَأَنْتُمْ لَا تَظْلَمُونَ ﴿۱۲۵﴾

میں اور جو خرچ کر دے خیرات سوہری ملے گی تم کو اور تمہارا حق نہ رہے گا ،

لِلْفَقْرِ أَمْ الَّذِينَ أَحْبَسُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا

خیرات اُن فقیروں کیلئے ہے جو رکے ہوئے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے

فِي الْأَرْضِ يُحِبُّهُمْ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءُ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ

ملک میں کچھ اُن کو ناواقف مالدار اُن کے سوال نہ کرنے سے تو پہچانتا ہے اُن کو

بِسِيمَتِهِمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ

اُن کے چہرے سے ، نہیں سوال کرتے لوگوں سے پٹ کر ، اور جو کچھ خرچ کر دے گا اُن کی چیز وہ

اللَّهُ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۱۲۶﴾ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

بیشک اللہ کو معلوم ہے ، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کو اور دن کو

سِرًّا أَوْ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا تَخَوْفُ عَلَيْهِمْ

چھپا کر اور ظاہر میں تو اُن کے لئے ثواب ہر ان کا اپنے رب کے پاس اور نہ ڈرہی اُن پر

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۲۷﴾

اور نہ وہ غمیں ہوں گے ۔

مُحَلِّصَةٌ تَفْسِير

اے ایمان والو! نیک کام میں خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور (عمدہ چیز کو)

اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے رکام میں لانے کے لئے زمین سے پیدا کیا اور ردی (ناکارہ) چیز

کی طرف نیست مت لے جایا کر وہ اس میں سے خرچ کر دو حالانکہ (دوسری) چیز اگر کوئی تم کو تمہارا

حق واجب کے عمن یا سوغات میں دینے لگے تو تم کبھی اس کے لینے والے نہیں ، ہاں مگر چشم پوشی

(اور رعایت) کر جاؤ تو اور بات ہے ، اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں (جو ایسی

ناکارہ چیزوں سے خوش ہوں) تعریف کے لائق ہیں (یعنی ذات و صفات میں کامل ہیں تو ان کے

دربار میں چیز بھی کامل تعریف کے لائق ہی پیش کرنا چاہئے) شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے ،

کہ اگر خرچ کر دے یا اچھا مال خرچ کر دے تو محتاج ہو جاؤ گے ، اور تم کو بڑی بات (یعنی بخل)

کا مشورہ دیتا ہے ، اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے (خرچ کرنے پر اور اچھی چیز خرچ کرنے پر)

اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا (یعنی چونکہ نیک جگہ خرچ کرنا طاعت ہے

اور طاعت سے معصیت کا کفارہ ہو جاتا ہے، لہذا اس سے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ کسی کو دنیا میں بھی اور آخرت میں تو سب کو خرچ کا عوض بھی زیادہ کر کے دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ وسعت دلتے ہیں (وہ سب کچھ دے سکتے ہیں) خوب جاننے والے ہیں رزیت کے موافق عثرہ دیتے ہیں اور یہ سب مضامین بہت ظاہر ہیں، لیکن ان کو وہی سمجھتا ہے جس کو دین کا فہم ہو اور اللہ تعالیٰ ہر دین کا فہم جس کو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں اور (پچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کا فہم مل جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی (کیونکہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے برابر نافع نہیں) اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں) اور ہم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانگتے ہو سو حق تعالیٰ کو سب کی بقیہ اطلاع ہے اور بے جا کام کرنے والوں کا رقیامت میں کوئی ہمراہی (حمایتی) نہ ہوگا، اگر تم ظاہر کر کے دو صدقات کو تب بھی ابھی بات ہے اور اگر ان کا اخفاء کرو اور اخفاء کے ساتھ، فقیروں کو دید و تب اخفاء تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کی خوب خبر رکھتے ہیں، اگرچہ کہ بہت سے صحابہ کفار کو بایں مصلحت خیرات نہ دیتے تھے کہ شاید اسی تدبیر سے کچھ لوگ مسلمان ہو جاویں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی رائے دی تھی اس لئے اس آیت میں دونوں طرح کے خطاب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان (کافروں) کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ (فرض واجب) نہیں (جس کے لئے اتنی دوا درازا ہتام کئے جاویں) (لیکن یہ تو) خدا تعالیٰ کا کام ہے جس کو چاہیں ہدایت پر لے آریں، آپ کا کام صرف ہدایت کا پہنچا دینا ہے خواہ کوئی ہدایت پر آوے یا نہ آوے اور ہدایت کا پہنچا دینا کچھ اس ممانعت پر موقوف نہیں) اور (اے مسلمانو!) جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو اور اس فائدہ کا بیان یہ ہے کہ تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے بجز رضا جوئی ذات پاک حق تعالیٰ کے (کہ ثواب اس کے لازم سے ہے اور یہ ہر حاجت مند کی رفع حاجت کرنے سے حاصل ہوتی ہے، پھر مسلمان فقیر کی تخصیص کیوں کی جائے) اور (نیز) جو کچھ مال خرچ کر رہے ہو یہ سب (یعنی اس کا عوض اور ثواب) پورا پورا تم (ہی) کو در آخرت میں مل جائیگا اور تمہارے لئے اس میں ذرا کمی نہ کی جاوے گی (سو تم کو اپنے عوض سے مطلب رکھنا چاہئے) اور عوض ہر حال میں ملے گا پھر تم کو اس سے کیا بحث کہ ہمارا صدقہ مسلمان ہی کو ملے کافر کو نہ ملے، (مگر) اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ (یعنی دین کی خدمت) میں، اور اسی خدمت دین میں مقید اور مشغول رہنے سے) وہ لوگ (طلب معاش کے لئے) کہیں ملک میں چلے پھرنے کا رعاۃ (امکان نہیں رکھتے) اور (ناواقف ان کو بالدار خیال کرتا ہے ان کے

سوال سے بچنے کے سبب سے (البتہ) تم ان لوگوں کو ان کے طرز (ہیئت) سے پہچان سکتے ہو (کیونکہ فرقہ و فادے سے چہرے اور بدن میں ایک گونہ اضطلال ضرور آجاتا ہے اور یوں) وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے (جس سے کوئی ان کو حاجت مند سمجھے، یعنی مانگتے ہی نہیں، کیونکہ اکثر جو لوگ مانگنے کے عادی ہیں وہ لپٹ کر ہی مانگتے ہیں) اور رازان لوگوں کی خدمت کرنے کو جو مال خرچ کر دے بیشک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے اور لوگوں کو دینے سے ان کی خدمت کا فیض زیادہ ثواب دیں گے) جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں (یعنی بلا تخصیص اوقات) پوشیدہ اور آشکارا (یعنی بلا تخصیص حالات) سو ان لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا (قیامت کے روز) ان کے رب کے پاس (جا کر) اور نہ (اس روز) ان پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا) ہے اور نہ وہ معلوم ہوں گے۔

معارف و مسائل

اس سے قبل کے رکوع میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا بیان تھا، اب اسی سے متعلقہ امور کا مزید بیان اس رکوع کی سات آیات میں کیا گیا ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَتِفَقُّوْا** (القول) **عَنِ النَّبِيِّ** (شان نزول سے طیب کے معنی عمدہ کے لئے) گئے ہیں، کیونکہ بعض لوگ خراب چیزیں لے آتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی، اور بعض نے عموم لفظ سے طیب کی تفسیر حلال سے کی ہے، کیونکہ پوری عمدہ جب ہی ہوتی ہے جب حلال بھی ہو، پس اس بناء پر آیت میں اس کی بھی تاکید ہوگی، اور پہلی تفسیر پر دوسرے دلائل سے اس تاکید کو ثابت کیا جاوے گا، اور یاد رکھو کہ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس عمدہ چیز ہو اور پھر وہ بُری بھی چیز خرچ کرے، جیسا کہ لفظ **مَا كَسَبْتُمْ** اور اخراجنا اس کے موجود ہونے پر اور **لَا تَبْتَغُوا الْخَيْرَاتِ مِنْهُ تَنْفَعُونَ**، عمدہ کئی چیز کے خرچ کرنے پر دلالت کر رہا ہے، اور جس کے پاس اچھی چیز ہو یہی نہیں وہ اس مانعت سے بُری ہے، اور اس کی وہ بُری بھی مقبول ہے لفظ **مَا كَسَبْتُمْ** سے بعض علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ والد کا اپنے بیٹے کی کمائی سے کھانا جاتا رہے، لقولہ علیہ السلام۔

تمہاری اولاد تمہاری کمائی کا ایک پائیر حصہ ہو، پس تم اپنی اولاد کی کمائی سے مزے سے کھاؤ۔

أُولَٰئِكَ مِنْ طَيْبِ أَكْسَابِكُمْ
تَكُلُوا مِنْ أَمْوَالِ أُولَٰئِكَ كُمْ
هَنِيئًا (مستطبی)

عشر ارضی کے احکام | **مِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ** میں لفظ **أَخْرَجْنَا** سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عشری زمین میں عشر واجب ہے، اس آیت کے

کیا گیا ہو، اور مقصود اس کہنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سب چیزوں کا علم ہے وہ اس کی جزاء دیں گے، یہ اس لئے سنایا تاکہ حدود و شرائط کی رعایت کی ترغیب اور عدم رعایت سے ترہیب ہو، اور بے جا کام کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروری شرائط کی رعایت نہیں کرتے، ان کو صریحاً وعید سنادی۔

إِنْ تَبَدَّلَ الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ رَأًى قَوْلِهِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ بظاہرہ آیت فرض اور نفل سب صدقات کو شامل ہے، اور سبب اخفاء ہی انفل ہے، اس میں دینی مصلحت بھی ہے، کہ ریا سے اجد ہے، لینے والا بھی نہیں شرماتا، اور دنیوی مصلحت بھی ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی، اور مراد افضلیت اخفاء سے آیت میں انفلت فی نفسہ ہے، پس اگر کسی مقام پر کسی مارض سے مثلاً نفع نہمت یا امید اقتداء وغیرہ سے اہلکار کو ترجیح ہو جائے تو افضلیت فی نفسہ کے منافی نہیں، بَلْكَفَرْتُمْ عَنْكُمْ قَوْلُكُمْ كَفَارَةٌ سَيِّئَاتٍ پھر اخفاء کے ساتھ تو خاص نہیں، صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے اخفاء کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ اخفاء میں نیچے اگر کوئی ظاہری فائدہ نظر نہ آئے تو منقبض نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ تمہارے گناہ اللہ معاف کرتا ہے، اور یہ تمہارے لئے فائدہ عظیم ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ هُدًى هُمْ رَأًى قَوْلِهِ وَإِنْ تَبَدَّلَ الصَّدَقَاتِ ه آیت میں بتلایا گیا کہ نیت بھی تمہاری اصل میں اپنے ہی نفع حاصل کرنے کی ہے، اور واقع میں بھی حاصل خاص تم ہی کو ہوگا، پھر ان زوائد پر کیوں نظر کی جاتی ہے، کہ یہ نفع خاص اسی طریق سے حاصل کیا جاوے کہ مسلمان ہی کو صدقہ دیں، اور کافر کو نہ دیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس صدقہ سے مراد صدقہ نفلی ہے جس کا ذمی کافر کو بھی دینا جائز ہے، زکوٰۃ مراد نہیں ہے، کیونکہ وہ سوائے مسلمان کے کسی دوسرے کو دینا حرام نہیں۔ (مظہری)

مسئلہ: حربی کافر کو کسی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔
مسئلہ: کافر ذمی یعنی غیر حربی کو صرف زکوٰۃ و عشر دینا جائز نہیں، اور دوسرے صدقات واجبہ و نفل سب جائز ہیں، اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں۔

لَلْفَقْرِ آجِ الَّذِينَ أَحْمَسُوا فِيَّ مَسِيلِ اللَّهِ (الی قولہ) فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ یہاں فقراء سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو دینی مشغولیت کی وجہ سے دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتے۔
يَحْسِبُهُمُ الْبَاحِلُ أَغْنِيَائًا مِنَ التَّعَفُّفِ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی فقیر تبتی کپڑے پہنے ہوئے ہو تو اس کی وجہ سے اس کو غنی نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کو فقیر ہی کہا جائے گا

اور ایسے آدمی کو زکوٰۃ دینا بھی صحیح ہوگا (قرطبی)
تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ سے معلوم ہوا کہ علامات کو دیکھ کر حکم لگانا صحیح ہے، چنانچہ اگر کوئی مردہ اس قسم کا پایا جائے کہ اس پر زنا ہے اور اس کا ختنہ بھی نہیں کیا ہوا ہو تو اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا (قرطبی)

لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا، اس آیت سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ پست کر نہیں دیتے لیکن بغیر پست کر مانگنے کی نفی نہیں ہے، چنانچہ بعض حضرات کا یہی قول ہے، لیکن جہور کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سوال بالکل ہی نہیں کرتے، لِأَنَّهُمْ مَتَّعِفُونَ عَنِ الْمَسْأَلَةِ عَقَّةً تَامَةً (قرطبی)

آٹھویں آیت الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ آمَرَ الدِّينِ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ میں ان لوگوں کے اجر عظیم اور فضیلت کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہیں، تمام حالات و اوقات میں رات میں اور دن میں، خفیہ اور علانیہ ہر طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہتے ہیں، اس کے ضمن میں یہ بھی بتلادیا کہ صدقہ و خیرات کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، نہ رات اور دن کی کوئی تعیین ہے، اس طرح خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہر بشریکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، نام و نمود مقصود نہ ہو، خفیہ خرچ کرنے کی فضیلت بھی اسی حد تک ہو کہ علانیہ خرچ کرنے کے لئے کوئی ضرورت داعی نہ ہو، اور جہاں ایسی ضرورت ہو وہاں علانیہ خرچ کرنا ہی افضل ہے۔

روح المعانی میں بحوالہ ابن عساکر نقل کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں اسی طرح خرچ کئے کہ دس ہزار دن میں، دس ہزار رات میں، دس ہزار خفیہ اور دس ہزار علانیہ، بعض مفسرین نے اس آیت کا شان نزول اسی واقعہ صدیق اکبرؓ کو لکھا ہے، اسکے شان نزول کے متعلق اور بھی مختلف اقوال ہیں۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَخْطُئُ جَوَلُوكَ كَهَاتِهِ سَوْد نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس الشَّيْطَانِ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا کہو گے ہوں جن نے پست کر یہ حالت ان کی اس واسطے ہو کہ انھوں نے کہا کہ اگر یہی تو ایسی ہی جیسے سود لیا
وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَكَ مَوْعِظَةٌ مِنْ

رَبِّهِ قَاتِلْهُ فَاَلَمْ يَكُنْ لَكَ دُونَهُ حَمِيْلٌ وَاَمْرٌ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ

طرف سے اور وہ باز آگیا تو اس کو اسلئے ہر چہ اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے ہو اور جو کوئی

فَاُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۰ يَمْحَقُ اللّٰهُ

پھر بڑی سورتوں کی لوگ ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ، مٹا دے اللہ

الرِّبَا وَيُرِي الصَّدَقَاتِ ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝۱۱

سود اور بڑھاتا ہر خیرات کو اور اللہ خوش نہیں کسی ناشکر گنہگار سے ،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور

اٰتَوْا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَاَلَا

دیتے رہے زکوٰۃ ان کیلئے ہے ثواب ان کا ان کے رب کے پاس اور نہ ان کو خوف ہے اور

لَهُمْ يَخْزَوْنَ ۝۱۲ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا

نہ وہ غمگین ہوں گے ، اے ایمان والو! اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ

بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنَّ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۳ اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاَذٰ نُوْا

باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا، پس اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ

يَخْرِبُ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ ۚ وَاِنْ تَبْتَغُوْا فَلََكُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ

لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارا واسطے ہر اصل مال تمہارا

لَا تُظْلَمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝۱۴ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلَى

نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ، اور اگر ہے تنگدست تو مہلت دینی چاہئے کشاکش

مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۵ وَاتَّقُوا

ہونے تک اور بخش دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو سمجھ ہے ، اور ڈرتے رہو

يَوْمَ تَرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ

اس دن سے جس دن لوٹائے جائے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کایا اور

لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۱۶

ان پر ظلم نہ ہوگا

خلاصہ تفسیر

جو لوگ سود کھاتے ہیں (یعنی لیتے ہیں) نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر

جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے جھلی بنا دیا ہو پھٹ کر (یعنی حیران و ہوش)

پس سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سود خوار) لوگوں نے (سود کے حلال ہونے پر استدلال کرنے کے

لئے) کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے، (کیونکہ اس میں بھی مقصود نفع حاصل کرنا ہوتا ہے،

اور بیع یقیناً حلال ہے، پھر سود بھی جو کہ اس کا مثل ہے حلال ہونا چاہئے) حالانکہ (دونوں

میں کھلا فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود

کو حرام کر دیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف

(اس بارہ میں) نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل اور اس کفر کے قول سے) یعنی حلال کہنے

(سے) باز آگیا (یعنی حرام سمجھنے لگا اور لینا بھی چھوڑ دیا) تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے

(لینا) ہو چکا ہے وہ اس کا رہا (یعنی ظاہر شرع کے نزدیک اس کی یہ توبہ قبول ہوگئی، اور لیا ہوا

مال اسی کی ملک ہے) اور (باطنی) معاملہ اس کا (کہ وہ دل سے باز آیا ہے یا منافقانہ توبہ کر لی ہے)

(یہ خدا کے حوالے رہا، اگر دل سے توبہ کی ہوگی عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، تم کو

بدگمانی کا کوئی حق نہیں) اور جو شخص (نصیحت مذکور سن کر بھی اسی قول اور اس فعل کی

طرف) پھر عود کرے تو روبرو اس کے کہ ان کا یہ فعل خود گناہ کبیرہ ہے) یہ لوگ دوزخ میں

جائیں گے (اور روبرو اس کے کہ ان کا یہ قول کفر ہے اس لئے) وہ اس (دوزخ) میں ہمیشہ

رہیں گے (اور گو سود لینے سے فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے، لیکن مال کا کار) اللہ تعالیٰ سود

کو مٹاتے ہیں (کبھی تو دنیا ہی میں سب برباد ہو جاتا ہے ورنہ آخرت میں تو یقینی برباد ہو)

کیونکہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور (برخلاف اس کے صدقہ دینے میں گو فی الحال مال گھٹتا

معلوم ہوتا ہے، لیکن مال کا اللہ تعالیٰ) صدقات کو بڑھاتے ہیں، (کبھی تو دنیا میں بھی

ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے، کیونکہ وہاں اس پر بہت سا ثواب ملے گا، جیسا اوپر

آیات میں مذکور ہوا) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں) کسی کفر کرنے

والے کو (جو کہ قول مذکور کے مثل کلمات کفر منہ سے بکے) اور اسی طرح پسند نہیں کرتے

کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو کہ فعل مذکور یعنی سود کے مثل کلمات کا مرتکب ہو)۔

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کا ثواب ہوگا ان کے پروردگار کے نزدیک اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطرہ واقع ہونے والا نہیں ہوگا اور نہ وہ (کسی مقصود کے قوت ہونے سے) مغموم ہوں گے،

لے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اسٹہمارس لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تمہارے خلاف جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جاویں گے (اس قانون کے بعد) نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے نہ تم اصل مال سے زیادہ لینے لگو اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پاوے گا (کہ تمہارا اصل مال بھی نہ دلا یا جاوے) اور اگر (قرضدار) تنگ دست ہو اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے (تو اس کو) ہمت دینے کا حکم ہے (سود کی تک) یعنی جب اس کے پاس ادا کی گنجائش ہو (اور یہ بات) کہ بالکل معاف ہی کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

اور (مسلمانو!) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا، (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگزاری درست رکھو، اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو) :

معارف و مسائل

ان آیات میں رہا یعنی سود کی حرمت اور اس کے احکام کا بیان شروع ہوا ہے، یہ مسئلہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے، ایک طرف سود و ربا پر قرآن و سنت کی شدید وعیدیں اور دوسری طرف دنیا کی اقتصادیات میں اس کا جو لازم بن جانا اور اس سے نجات کی مشکلات کا مسئلہ طویل الذیل ہے، اور کئی حیثیتوں سے اس پر غور کرنا ہے۔

اول اس بارے میں قرآن کی آیات کی صحیح تفسیر اور احادیث مجیمہ کے ارشادات میں غور کر کے یہ متعین کرنا کہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں ربا کیا چیز ہے، اور کن کن معاملات کو شامل ہے، اور اس کی حرمت کس بھمت و مصلحت پر مبنی ہے، اس میں کس قسم کی مضرتیں ہیں۔ دوسری حیثیت اس کی عقلی اور معاشی ہے کہ کیا فی الواقع سود و ربا ایسی چیز ہے جو دنیا کی اقتصادی ترقی کی ضامن ہو سکے، اور جس کو نظر انداز کرنے کا لازمی نتیجہ تجارت اور عوام اقتصادیات کی تباہی ہو، یا سارا چکر صرف خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل رماؤں کی پیداوار ہے، ورنہ بغیر اس کے بھی تمام معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف مشکلات کا حل بلکہ دنیا میں اقتصادی امن و اطمینان سود کے چھوڑنے پر موقوف ہے، اور یہ کہ دنیا کے اقتصادی مصائب کا سبب بڑا سبب سود و ربا ہے۔

یہ دوسری بحث ایک معاشی اور اقتصادی مسئلہ ہے، جس کے تحت میں بہت سی اصولی اور فروعی طویل بحثیں ہیں، جن کا تعلق تفسیر قرآن سے نہیں، اس لئے اس جگہ پہلی ہی بحث پر اکتفا کیا جاتا ہے، وہ بھی خاصی طویل ہے۔

بہ جہ آیتیں ہیں جن میں سود کی حرمت اور احکام کا بیان ہے، ان میں سے پہلی آیت کے پہلے جملہ میں سود خوروں کے انجام بد اور محشر میں ان کی رسوائی اور گراہی کا ذکر ہے، ارشاد ہے: کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ آدمی جس کو کسی شیطان جن نے لپٹ کر جھلی بنا دیا ہو، حدیث میں ہے کہ کھڑے ہونے سے مراد محشر میں قبر سے اٹھنا ہے کہ سود خور جب قبر سے اٹھے گا تو اس پاگل و مجنون کی طرح لٹھے گا جس کو کسی شیطان جن نے جھلی بنا دیا ہو۔

اس جملہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جنات و شیاطین کے اثر سے انسان بیہوش یا مجنون ہو سکتا ہے، اور اہل تجربہ کے متواتر مشاہدات اس پر شاہد ہیں، اور حافظ ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اطباء اور فلاسفہ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، کہ صرع، بیہوشی، یا جنون مختلف اسباب سے ہو کرتا ہے، ان میں بعض اوقات جنات و شیاطین کا اثر بھی اس کا

سبب ہوتا ہے، جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے ان کے پاس بجز ظاہری استبعاد کے کوئی دلیل نہیں۔

دوسری بات یہ غور طلب ہے کہ قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ سود خور محشر میں پھل یا بھجنوں ہو کر اٹھیں گے، بلکہ دیوانہ پن یا بے ہوشی کی ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے، کہ جیسے کسی کو شیطان نے پٹ کر خطی بنا دیا ہو، اس میں شاید یہ اشارہ ہے کہ بیہوش و بھجن تو بعض اوقات چُپ چاپ پڑا بھی رہتا ہے، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ شیطان کے خطی بنائے ہوؤں کی طرح بھواس اور ہڈیاں اور دوسری مجنونانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔

اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ بیماری سے بیہوش یا بھجن ہو جانے کے بعد چونکہ احساس بالکل باطل ہو جاتا ہے، اس کو تکلیف یا عذاب کا بھی احساس نہیں رہتا، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ آسیب زدہ کی طرح تکلیف و عذاب کو پوری طرح محسوس کرے گا۔

اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جرم و سزائیں کوئی مناسبت ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا کسی شخص یا جماعت کے کسی جرم کے مقابلہ میں دی جاتی ہے، وہ یقیناً اس جرم کے مناسب ہوتی ہے، اس لئے سود خوروں کو خطی بنا کر محشر میں اٹھانا شاید اس کا اظہار ہو کہ سود خور روپے پیسہ کی حرص میں اس قدر مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے نہ کسی کی شرم مانع ہوتی ہے، وہ چونکہ اپنی زندگی میں درحقیقت بیہوش تھا، اس لئے محشر میں بھی اسی حالت میں اٹھایا گیا، یا یہ سزا اس لئے دی گئی کہ دنیا میں اس نے عقلی رنگ میں اپنی بے عقلی کو ظاہر کیا، کہ بیع کو مثل سود قرار دیا، اس لئے اس کو بے عقل کر کے اٹھا دیا گیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آیت میں سود کھانے کا ذکر ہے اور مراد مطلقاً سود لینا اور اس کا استعمال کرنا ہے، خواہ کھانے میں استعمال کرے یا لباس میں یا مکان اور اس کے فرنیچر میں، لیکن اس کو کھانے کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو چیز کھائی جائے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا، بخلاف دوسری ضرورتوں کے استعمال کے کہ اس چیز کو واپس لیا دیا جاسکتا ہے، اس لئے مکمل قبضہ اور تصرف کو کھا جانے کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہو، اور نہ صرف عربی زبان میں بلکہ اردو، فارسی وغیرہ اکثر زبانوں کا یہی محاورہ ہے۔

اس کے بعد دوسرے جملہ میں سود خوروں کی اس سزا کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان لوگوں نے دو جرم کئے ایک تو بذریعہ سود کے حرام مال کھایا، دوسرے اس کو حلال سمجھا اور

حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا بیع و شراء بھی تو ربی کی مثل ہے، جس طرح ربی کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح بیع و شراء کے ذریعہ نفع مقصود ہے، اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہونی چاہئے، حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں، اس جگہ بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ لوگ یوں کہتے کہ ربی بھی تو مثل بیع کے ہے، جب بیع حلال ہے تو ربی بھی حلال ہونا چاہئے، مگر انھوں نے طرز بیان بدل کر حرام کہنے والوں پر ایک قسم کا اتہاز کیا، کہ تم ربی کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو۔

تیسرے جملے میں ان لوگوں کے اس قول کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ یہ لوگ بیع کو ربی کی مثل اور برابر قرار دیتے ہیں، حالانکہ بحکم خداوندی ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو حلال قرار دیا اور دوسرے کو حرام، پھر دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔

اس جواب میں یہ بات قابل غور ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض تو عقلی طور پر تھا کہ جب دونوں معاملوں کا مقصد نفع کمانا ہے تو دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے عقلی شبہ کا جواب عقلی طور پر فرق بیان کر کے نہیں دیا، بلکہ حاکمانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مالک الملک و المملکت اللہ جل شانہ ہے وہ ہی ہر چیز کے نفع و ضرر اور بھلے برے کو پوری طرح جانتا ہے، جب اس نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دیدیا، تو سمجھ لو کہ جس چیز کو حرام کیا ہے اس میں ضرر کوئی نقصان و ضرر اور کوئی خباثت ہے، خواہ عام انسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے، کیونکہ مجموعہ نظام عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع و ضرر کا احاطہ صرف وہی علیم و خیر کر سکتا ہے، جس کے علم سے کوئی ذرہ جہاں چھپا ہوا نہیں ہے، عالم کے افراد یا جماعتیں اپنے اپنے مصالح اور مضرتوں کو پہچان سکتے ہیں، پورے عالم کے نفع و ضرر کا احاطہ نہیں کر سکتے، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے حق میں مفید نظر آتی ہیں، مگر پوری قوم یا پورے ملک کے لئے اس میں مضرت ہوتی ہو، اس کے بعد تیسرے جملہ میں یہ ارشاد ہے کہ سود حرام ہونے سے پہلے جس شخص نے کوئی رقم جمع کر لی تھی، لیکن جب سود کو حرام قرار دیدیا گیا، تو اگر آئندہ کے لئے اس نے توبہ کر لی، اور باز آگیا، تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہر شرع کے حکم سے اُسی کی ہو گئی، اور باطنی معاملہ اس کا کہ وہ دل سے باز آیا، یا منافقانہ توبہ کر لی، اس کا یہ معاملہ خدا کے حوالہ ہے۔ اگر دل سے توبہ کی ہے تو عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، عام لوگوں کو بدگمانی کرنے کا حق نہیں ہو، اور جو شخص نصیحت سن کر بھی اسی قول و فعل کی طرف پھر عود کرے تو

چونکہ یہ فعل سود خوری گناہ ہے، یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے، اور چونکہ اُن کا یہ قول کہ سود مثل بیع کے حلال ہے کفر ہے اس لئے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹانے میں اور صدقات کو بڑھانے میں، یہاں سود کے ساتھ صدقات کا ذکر ایک خاص مناسبت سے لایا گیا ہے، کہ سود اور صدقہ دونوں کی حقیقت میں بھی تضاد ہے، اور ان کے نتائج بھی متضاد ہیں، اور عموماً ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی غرض و نیت بھی متضاد ہوتی ہے۔

حقیقت کا تضاد تو یہ ہے کہ صدقہ میں تو بغیر کسی معاوضہ کے اپنا مال دوسروں کو دیا جاتا ہے، اور سود میں بغیر کسی معاوضہ کے دوسرے کا مال لیا جاتا ہے، ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی نیت اور غرض اس لئے متضاد ہے کہ صدقہ کرنے والا محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثوابِ آخرت کے لئے اپنے مال کو کم یا ختم کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے، اور سود لینے والا اپنے موجود مال پر ناجائز زیادتی کا خواہشمند ہے، اور نتائج کا متضاد ہونا قرآن کریم کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سود سے حاصل شدہ مال کو یا اس کی برکت کے شادی ہے، اور صدقہ کرنے والے کے مال یا اس کی برکت کو بڑھانے میں جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مال کی ہوس کو نپوالے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا جو اپنے مال کی کمی پر راضی تھا، اس کے مال میں برکت ہو کر اس کا مال یا اس کے ثمرات و فوائد بڑھ جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آیت میں سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ مٹانا اور بڑھانا آخرت کے متعلق ہے کہ سود خور کو اس کا مال آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا بلکہ اس پر وبال بن جائے گا، اور صدقہ خیرات کرنے والوں کا مال آخرت میں ان کے لئے ابدی نعمتوں اور راحتوں کا ذریعہ بنے گا، اور یہ بالکل ظاہر ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اور عامہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ سود کا مٹانا اور صدقہ کا بڑھانا آخرت کے لئے تو ہے ہی، مگر اس کے کچھ آثار دنیا میں بھی مشاہدہ میں آتے ہیں۔ سود جس مال میں شامل ہو جاتا ہے، بعض اوقات تو وہ مال خود ہلاک و برباد ہو جاتا ہے، اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے جاتا ہے، جیسے کہ ربوہ سسٹم کے بازاروں میں اس کا ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فقیر بن جاتے ہیں، بے سود کی تجارتوں میں بھی نفع و نقصان کے احتمالات رہتے ہیں، اور بہت سے تاجروں کو نقصان بھی کسی تجارت میں ہو جاتا ہے، لیکن ایسا نقصان کہ کل کروڑ پتی تھا، اور آج ایک ایک پیسہ کی بھیک کا محتاج ہے، یہ صرف سود اور سسٹم کے بازاروں میں ہی ہوتا ہے۔

اور اہل تجربہ کے بے شمار بیانات اس بارے میں مشہور و معروف ہیں کہ سود کا مال فوری طور پر کتنا ہی بڑھ جائے، لیکن وہ عموماً پائیدار اور باقی نہیں رہتا، جس کا فائدہ اولاد اور نسلوں میں چلے، اکثر کوئی نہ کوئی آفت پیش آکر اس کو برباد کر دیتی ہے، حضرت معمرؓ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سود خور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے، کہ اس کے مال پر حاق دینی ٹھٹھا آجاتا ہے۔

اور اگر ظاہری طور پر مال منافع و برباد بھی نہ ہو تو اس کے فوائد اور برکات و ثمرات سے محرومی تو یقینی اور لازمی ہے، کیونکہ یہ بات کچھ مخفی نہیں کہ سونا چاندی خود تو نہ مقصود ہے نہ کار آمد نہ اس سے کسی کی بھوک بٹ سکتی ہے، نہ پیاس نہ سردی، نہ گرمی سے بچنے کے لئے اور نہ بچایا جاسکتا ہے، نہ وہ کپڑوں اور برتنوں کا کام لے سکتا ہے، پھر اس کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے میں ہزاروں مشقتیں اٹھانے کا منشاء ایک عقلمند انسان کے نزدیک اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ سونا چاندی ذریعہ ہیں ایسی چیزوں کے حاصل کرنے کا کہ جن سے انسان کی زندگی خوشگوار بن سکے، اور وہ راحت و عزت کی زندگی گزار سکے، اور انسان کی فطری خواہش ہوئی ہے کہ یہ راحت و عزت جس طرح اسے حاصل ہوئی اس کی اولاد اور متعلقین کو بھی حاصل ہو۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو مال و دولت کے فوائد و ثمرات کہلا سکتے ہیں، اس کے نتیجے میں یکہنا بالکل صبح ہوگا کہ جس شخص کو یہ ثمرات و فوائد حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے بڑھ گیا، اگرچہ دیکھنے میں کم نظر آئے، اور جس کو یہ فوائد و ثمرات کم حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے گھٹ گیا، اگرچہ دیکھنے میں زیادہ نظر آئے۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد سود کا کاروبار اور صدقہ و خیرات کے اعمال کا جائزہ لیجئے، تو یہ بات مشاہدہ میں آجائے گی کہ سود خور کا مال اگرچہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے کہ جیسے کسی انسان کا بدن درم وغیرہ سے بڑھ جائے، درم کی زیادتی بھی تو بدن ہی کی زیادتی ہے، مگر کوئی سمجھدار انسان اس زیادتی کو پسند نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ زیادتی موت کا پیغام ہے، اسی طرح سود خور کا مال کتنا ہی بڑھ جائے، مگر مال کے فوائد و ثمرات یعنی راحت و عزت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آج تو سود خوروں کو بڑی سے بڑی راحت و عزت حاصل ہر وہ کوٹھیوں، بنگلوں کے مالک ہیں، عیش و آرام کے سارے سامان ہتیا ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور رہنے پہننے کی ضروریات بلکہ فضولیات بھی سب اُن کو حاصل ہیں، تو کر چا کر اور شان و شوکت کے تمام سامان موجود ہیں، لیکن غور کیا جائے تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ سامانِ رت

اور راحت میں بڑا فرق ہے، سامانِ راحت تو ٹیکریوں اور کارخانوں میں بنتا اور بازاروں میں بکتا ہے وہ سونے چاندی کے عرصے حاصل ہو سکتا ہے، لیکن جس کا نام راحت ہے وہ کسی ٹیکری میں بنتی ہے، کسی منڈی میں بکتی ہے، وہ ایک ایسی رحمت ہے جو براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہو وہ بعض اوقات ہزاروں سامان کے باوجود حاصل نہیں ہو سکتی، ایک عیندگی راحت کو دیکھ لیجئے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے یہ تو کر سکتے ہیں کہ سونے کے لئے مکان کو بہتر سے بہتر بنائیں، کھانا اور روشنی کا پورا اعتدال ہو، مکان کا فرنیچر دیدہ زیب، دل خوش کن ہو، چار پائی اور گھوڑے اور بچے حسبِ منشا ہوں، لیکن کیا عیندگی کا آجانا ان سامانوں کے ہیا ہونے پر لازمی ہے؟ اگر آپ کو کسی اتفاق نہ ہوا ہو تو ہزاروں وہ انسان اس کا جواب نفی میں دیں گے جن کو کسی مارضہ سے عیند نہیں آتی، اب امریکہ جیسے مال دار متمدن ملک کے متعلق بعض رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ وہاں پچھتر فی صد آدمی خواب آور گولیوں کے بغیر سو ہی نہیں سکتے، اور بعض اوقات خواب آور دوائیں بھی جواب دیتی ہیں، عیند کے سامان تو آپ بازار سے خرید لائے، مگر عیند آپ کسی بازار سے کسی قیمت پر نہیں لاسکتے، اسی طرح دوسری راحتوں اور لذتوں کا حال ہے کہ ان کے سامان تو روپیہ پیسے کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں، مگر راحت و لذت کا حاصل ہونا ضروری نہیں۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد سود خوروں کے حالات کا جائزہ لیجئے تو ان کے پاس آپ کو سب کچھ ملے گا مگر راحت کا نام نہ پائیں گے، وہ اپنے کروڑ کروڑ پڑے کر ڈر اور ڈیڑھ کر ڈر کو دو کر ڈر بنانے میں ایسے مست نظر آئیں گے، کہ ان کو اپنے کھانے پہننے کا ہوش ہے، نہ اپنی بیوی بچوں کا کتنی کٹی میل چل رہے ہیں، دوسرے ملکوں سے جہاز آرہے ہیں، ان کی ادھیڑ بن ہی میں صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے، افسوس ہے کہ ان دیوانوں نے سامانِ راحت ہی کا نام راحت سمجھ لیا ہے، اور حقیقت میں راحت سے کوسوں دور ہیں۔

یہ حال تو ان کی راحت کا ہے، اب عزت کو دیکھ لیجئے، یہ لوگ چونکہ سخت دل اور بے رحم ہو جاتے ہیں، ان کا پیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ مفلسوں کی مفلسی سے یا کم یا یہ لوگوں کی کم ہنگامی سے فائدہ اٹھائیں، ان کا خون چوس کر اپنے بدن کو پالیں، اس لئے ممکن نہیں کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی کوئی عزت و وقار ہو، اپنے ملک کے بانیوں اور ملک شام کے یہودیوں کی تاریخ پڑھ جائیے، ان کے حالات کو دیکھ لیجئے، ان کی تجربات کتنے ہی سونے چاندی اور جواہرات سے بھری ہوں، لیکن دنیا کے کسی گوشہ میں انسانوں کے کسی طبقہ میں ان کی کوئی عزت نہیں، بلکہ ان کے اس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب مفلس لوگوں کے دلوں میں ان کی طرف سے بغض و نفرت پیدا ہوتی ہے، اور آج کل تو دنیا کی ساری جنگیں اسی بغض و نفرت

کی مظاہر ہیں، محنت و سرمایہ کی جنگ نے ہی دنیا میں اشتراکیت اور اشتعالیت کے نظریے پیدا کئے، کیونکہ سرمایہ کی تحریکی سرگرمیاں اس بغض و نفرت کا نتیجہ ہیں، جن سے پوری دنیا قتل و قتل اور جنگ و جدال کا جہنم بن کر رہ گئی ہے، یہ حال تو اپنی راحت و عزت کا ہے، اور تجربہ شاید ہے کہ سود کا مال سود خور کی آنے والی نسلوں کی زندگی کو بھی خوشگوار نہیں بناتا، یا ضائع ہو جاتا ہے، یا اس کی خواست سے وہ بھی مال و دولت کے حقیقی ثمرات سے محروم و ذلیل رہتے ہیں، لوگ یورپ کے سود خوروں کی مثال سے شاید فریب میں آئیں کہ وہ لوگ تو سب کے سب خوش حال ہیں، اور ان کی نسلیں بھی پھولتی پھلتی ہیں، لیکن اول تو ان کی خوش حالی کا اجمال خاکہ عرض کر چکا ہوں۔

دوسرے ان کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی مردم خور دوسرے انسانوں کا خون چوس کر اپنا بدن پالتا ہو اور ایسے کچھ انسانوں کا جتھہ ایک محلہ میں آباد ہو جائے، آپ کسی کو اس محلہ میں لے جا کر مشاہدہ کرائیں کہ یہ سب کے سب بڑے صحت مند اور سرسبز و شاداب ہیں، لیکن ایک عقلمند آدمی کو جو انسانیت کی فلاح کا خواہشمند ہے صرف اس محلہ کا دیکھنا نہیں، بلکہ اس کے مقابل ان بستیوں کو بھی دیکھنا، جن کا خون چوس کر ان کو ادھ مو کر دیا گیا ہے، اس محلہ اور ان بستیوں کے مجموعہ پر نظر ڈالنے والا کبھی اس محلہ کے فربہ ہونے پر خوش نہیں ہو سکتا، اور مجموعی حیثیت سے ان کے عمل کو انسانی ترقی کا ذریعہ نہیں بتا سکتا، بلکہ اس کو انسان کی ہلاکت و بربادی ہی کہنے پر مجبور ہوگا۔

اس کے بالمقابل صدقہ خیرات کرنے والوں کو دیکھئے کہ ان کو کبھی اس طرح مال کے پیچھے حیران و سرگرداں نہ پائیں گے، ان کو راحت کے سامان اگرچہ کم حاصل ہوں، مگر سامانِ دلوں سے زیادہ اطمینان اور سکون قلب جو اصلی راحت ہے ان کو حاصل ہوگی، دنیا میں ہر انسان ان کو عزت کی نظر سے دیکھے گا۔

يَمْنَعُ اللَّهُ الْمُبْرِرِينَ الْقِسْمَةَ

غلام یہ ہے کہ اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہو، یہ مضمون آخرت کے اعتبار سے تو بالکل صاف ہے ہی، دنیا کے اعتبار سے بھی اگر ذرا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بالکل کھلا ہوا ہے، یہی ہے مطلب اس حدیث کا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الزبائر ان کثر فان عاقبتہ
تصیر الی قتل

یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر انجام
نتیجہ اس کا قتل ہے۔

یہ روایت مسند احمد اور ابن ماجہ میں مذکور ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے، **وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِمٍ**، یعنی اللہ تعالیٰ پسند
نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو کسی گناہ کا کام کرنے والے کو، اس میں اشارہ فرمادیا ہے کہ
جو لوگ سود کو حرام ہی نہ سمجھیں وہ کفر میں مبتلا ہیں اور جو حرام سمجھنے کے باوجود عملاً اس میں
مبتلا ہیں وہ گنہگار فاسق ہیں۔

تیسری آیت میں مومنین صالحین جو نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں ان کے اجر عظیم اور آخرت
کی راحت کا ذکر ہے، چونکہ اس سے پہلی آیت میں سود خوردوں کے لئے عذاب جہنم اور ان
کی ذلت و خواری کا ذکر آیا تھا، شرعاً کریم کے عام اسلوب کے مطابق اس کے ساتھ ہی
ایمان و عمل صالح کے پابند نماز و زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے ثواب اور درجات آخرت کا
ذکر کر دیا گیا۔

چوتھی آیت **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الزَّيْطِ لَا تَكُنْ مِّنْ مُّؤْمِنِينَ** کا خلاصہ یہ ہے کہ سود و ربوہ کی حرمت نازل ہونے کے بعد جو سود کی بقایا
رہیں کسی کے ذمہ باقی نہیں ان کا لینا دینا بھی حرام کر دیا گیا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عام عرب میں سود کا
رواج پھیلا ہوا تھا، آیات متذکرہ سے پہلی آیتوں میں اس کی مانعت آئی تو حسب عادت تمام
مسلمانوں نے سود کے معاملات ترک کر دیئے، لیکن کچھ لوگوں کے مطالبات سود کی بقایا قبول
کے دوسرے لوگوں پر تھے، اسی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنی ثقیف اور بنی مخزوم کے آپس میں
سودی معاملات کا سلسلہ تھا، اور بنو ثقیف کے لوگوں کا کچھ سودی مطالبہ بنی مخزوم کی طرف
تھا، بنو مخزوم مسلمان ہو گئے تو اسلام لانے کے بعد انھوں نے سود کی رقم ادا کرنا جائز نہ سمجھا،
ادھر بنو ثقیف کے لوگوں نے مطالبہ شروع کیا، کیونکہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مگر
مسلمانوں سے مصالحت کر لی تھی، بنو مخزوم کے لوگوں نے کہا کہ اسلام میں داخل ہونے کے
بعد ہم اپنی اسلامی کمائی کو سود کی ادائیگی میں خرچ نہ کریں گے۔

یہ جھگڑا مکہ مکرمہ میں پیش آیا، اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی طرف سے مکہ کے امیر حضرت معاذؓ اور دوسری روایت میں عتاب بن اسیدؓ تھے، انھوں نے
اس جھگڑے کا قضیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض دریافت حکم لکھ بھیجا،

اس پر شرعاً ان کی یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد سود
کے تمام سابقہ معاملات ختم کر دیئے جائیں، پچھلا سود بھی وصول نہ کیا جائے، صرف اس المال وصول
کیا جائے۔

یہ اسلامی قانون رائج کیا گیا تو مسلمان تو اس کے پابند تھے ہی، جو غیر مسلم قبائل بطور صلح
و معاہدہ اسلامی قانون کو قبول کر چکے تھے وہ بھی اس کے پابند ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود
جب حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کا اعلان کیا تو اس کا اظہار
فرمایا کہ یہ قانون کسی خاص شخص یا قوم یا مسلمانوں کے مالی مفاد کے پیش نظر نہیں، بلکہ پوری انسانیت
کی تعمیر اور صلاح و فلاح کے لئے جاری کیا گیا ہے، اسی لئے ہم سب کے پہلے مسلمانوں کی بہت
بڑی رقم سود جو غیر مسلموں کے ذمہ تھی اس کو چھوڑتے ہیں تو اب ان کو بھی اپنے بقایا سود کی رقم
چھوڑنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیے، چنانچہ اس خطبہ میں ارشاد فرمایا:

الا ان کل ربا کان فی الجاہلیۃ موضوع عنکم کلہ لکم دس اموالکم
لا تظلمون ولا تظلمون واول ربا موضوع ربا العباس ابن عبد المطلب کلہ،
راہن کشیر بحوالہ ابن ابی حاتم۔ یعنی زائد جاہلیت میں جو سودی معاملات کئے گئے
سب کا سود چھوڑ دیا گیا، اب ہر شخص کو اصل رستم ملے گی، سود کی زائد رقم نہ ملے گی، نہ تم زیادتی
وصول کر کے کسی پر ظلم کر سکو گے اور نہ کوئی اصل راس المال میں کمی کر کے تم پر ظلم کرے گا، اور
سب کے پہلے جو سود چھوڑا تھا وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے، جس کی بہت بھاری رقمیں
غیر مسلموں کے ذمہ بطور سود کے ماندہ ہوتی تھیں، قرآن مجید کی آیت متذکرہ میں اسی واقعہ کی طرف
اشارہ اور بقایا سود چھوڑنے کا حکم مذکور ہے۔

اس آیت کو شروع اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے **اُولَئِیۡمُ الَّذِیۡنَ کَاٰمَنُوۡا** کا حکم
سنایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے بعد اصل مسئلہ کا حکم بتلایا گیا، یہ شرعاً حکیم کا وہ خاص
طرز ہے جس میں وہ دنیا بھر کے قانون کی کتابوں سے ممتاز ہے، کہ جب کوئی ایسا قانون بنایا جاتا
ہے جس پر عمل کرنے میں لوگوں کو کچھ دشواری معلوم ہو تو اس کے آگے پیچھے خدا تعالیٰ کے سامنے
پیشی اعمال کے حساب اور آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر کر کے مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں
کو اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اس کے بعد حکم سنایا جاتا ہے، یہاں بھی پچھلے
عام شدہ سود کی رقم کا چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر بار ہو سکتا تھا، اس لئے پہلے **اَتَّقُوا اللَّهَ**
فرمایا، اس کے بعد حکم دیا **وَمَا بَقِيَ مِنَ الزَّيْطِ**، یعنی چھوڑ دو بقایا سود کو، آیت کے آخر میں
فرمایا **اِنَّ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیۡنَ**، یعنی اگر تم ایمان والے ہو، اس میں اشارہ کر دیا کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے

کہ حکم خداوندی کی اطاعت کی جائے، اس کی خلاف ورزی ایمان کے منافی ہے، یہ حکم چونکہ لمباح پر مبنی تھا، اس لئے حکم سے پہلے اِنْفَعُوا لِلّٰہِ اور حکم کے بعد اِنْ کُنْتُمْ مِّنْ مُّؤْمِنٰتٍ کے ارشاد ملا دیتے گئے۔

اس کے بعد پانچویں آیت میں اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ من لو، یہ وعید شدید ایسی ہے کہ کفر کے سوا اور کسی بڑے سے بڑے گناہ پر قرآن میں ایسی وعید نہیں آئی پھر اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے:

وَ اِنْ کُنْتُمْ فَلَکُمْ رُؤُوسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَغْلِبُوْنَ وَلَا تَغْلَبُوْنَ، یعنی اگر تم توبہ کرو اور آئندہ کے لئے سود کی بقایا رقم چھوڑنے کا عزم کر لو تو تمہیں تمہارے اصل راس المال مل جائیں گے، نہ تم اصل راس المال سے زائد حاصل کر کے کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ کوئی اصل راس مال میں کمی یا دیر کر کے تم پر ظلم کرنے پائے گا، اس میں اصل راس المال دینے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ تم توبہ کر لو اور آئندہ کو سود چھوڑنے کا عزم کر لو، تب اصل راس المال ملے گا۔

اس سے بظاہر اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر سود چھوڑنے کا عزم کر کے توبہ نہ کی تو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان ہو جانے کے باوجود سود کو حرام نہ سمجھے، اس لئے سود چھوڑنے کے لئے توبہ نہیں کرتا تب توبہ شخص اسلام سے خاچ اور مرتد ہو گیا، جس کا حکم یہ ہے کہ مرتد کا مال اس کی ملک سے بھل جاتا ہے، پھر جو زمانہ اسلام کی کمائی ہے وہ اس کے مسلمان وارثوں کو مل جاتی ہے، اور جو کفر کے بعد کی کمائی ہے تو وہ بیت المال میں جمع کر دی جاتی ہے، اس لئے سود سے توبہ نہ کرنا اگر حلال سمجھنے کی بنا پر ہو تو اس کو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، اور اگر حلال تو نہیں سمجھتا مگر عملاً باز نہیں آتا اور اس کے ساتھ جتھ بنا کر حکومت اسلامیہ کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ باغی ہے، اس کا بھی سب مال ضبط کر کے بیت المال میں امانت رکھا جاتا ہے، کہ جب یہ توبہ کر لے تب اس کا مال اس کو واپس دیدیا جائے، شاید اس قسم کی جزئیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بصورت شرط فرمایا گیا،

وَ اِنْ کُنْتُمْ فَلَکُمْ رُؤُوسُ اَمْوَالِکُمْ، یعنی اگر تم توبہ نہ کرو گے تو تمہارے راس المال بھی ضبط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد چھٹی آیت میں سود خوری کی انسانیت سوز حرکت کے بالمقابل پاکیزہ اخلاق اور غریبوں اور ناداروں کے ساتھ مہارت کے سلوک کی تعلیم دی جاتی ہے، ارشاد

ہوتا ہے، وَ اِنْ کَانَ ذُو عُسْرٍ فَاِیَّ مِیْسَہٗ ۙ وَ اِنْ لَّصَدَقَہٗ فَاِخْتِارٌ لَّکُمْ، یعنی اگر تمہارا مدیون تنگ دست ہو، تمہارا تضرع ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک ہمت دی جائے، اور اگر تم اس کو اپنا قرض معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

سود خوروں کی عادت توبہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مدیون مفلس ہے اور میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہیں کر سکتا تو سود کی رقم اصل میں جمع کر کے سود رسد کا سلسلہ چلا دیتے ہیں، اور سود کی مقدار بھی اور بڑھا دیتے ہیں۔

یہاں حکم الحاکمین نے یہ قانون بنادیا کہ اگر کوئی مدیون واقعی مفلس ہے، ادائے قرض پر قادر نہیں تو اس کو تنگ کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کو اس وقت تک ہمت دینی چاہئے جب تک کہ وہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو جائے، ساتھ ہی اس کی ترغیب بھی دیدی کہ اس غریب کو اپنا قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

یہاں معاف کرنے کو تشرآن نے بلفظ صدقہ تعبیر فرمایا ہے، جس میں اشارہ ہو کہ یہ معافی تمہارے لئے بحکم صدقہ ہو کر موجب ثواب عظیم ہوگی، نیز یہ جو فرمایا کہ معاف کر دینا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، حالانکہ بظاہر تو ان کے لئے نقصان کا سبب ہو کہ سود تو چھوڑا ہی تھا اصل راس المال بھی گیا، مگر تشرآن نے اس کو بہتر فرمایا، اس کی دود وجہ ہیں، اول توبہ کہ یہ بہتری اس دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد مشاہدہ میں آجائے گی، جب کہ اس حقیر مال کے بدلہ میں جنت کی دائمی نعمتیں اس کو ملیں گی۔

دوسرے شاید اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ دنیا میں بھی تمہیں اس عمل کی بہتری کا مشاہدہ ہو جائے گا، کہ تمہارے مال میں برکت ہوگی، برکت کی حقیقت یہ ہے کہ تھوڑے مال میں کام بہت بھل جائیں، یہ ضروری نہیں کہ مال کی مفت داری یا تعداد بڑھ جائے، سو یہ مشاہدہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنے والوں کے مال میں بے شمار برکت ہوتی ہے، ان کے تھوڑے مال سے اتنے کام نکل جاتے ہیں کہ حرام مال والوں کے بڑے بڑے اموال سے وہ کام نہیں نکلتے اور جس مال میں بے برکتی ہوتی ہے اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لئے خرچ کرتا ہے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، یا غیر مقصود چیزوں میں مثلاً دوا، علاج اور ڈاکٹروں کی فیسوں میں ایسے مالداروں کی بڑی بڑی رقمیں خرچ ہو جاتی ہیں، جس کا غریبوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑتا، اول تو اللہ تعالیٰ ان کو تندرستی کی نعمت عطا فرماتے ہیں، کہ علاج میں کچھ خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ ہے، اور اگر کبھی بیماری آتی بھی تو معمولی اخراجات سے تندرستی

حاصل ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے مدیون مفلس کو مسترض معاف کر دینا جو بظاہر اس کے لئے نقصان نظر آتا تھا، اس مسترائی تعلیم کے پیش نظر وہ ایک مفید و نافع کام بن گیا۔

مدیون مفلس کے ساتھ نرمی و مہلت کی تعلیم کے لئے احادیث صحیحہ میں جو ارشادات وارد ہوئے ہیں، ان کے چند جملے سنئے، طہرائی کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے سر پر اس روز اللہ کی رحمت کا سایہ ہو جبکہ اس کے سوا کسی کو کوئی سایہ سر چھپانے کے لئے نہ ملے گا تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مقروض کے ساتھ نرمی اور مہلت کا معاملہ کرے، یا اس کو معاف کر دے۔

اسی مضمون کی حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے، اور سند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مفلس مدیون کو مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اتنی رستم کے صدقہ کا ثواب ملے گا، جتنی اس مدیون کے ذمہ واجب ہے، اور یہ حساب میعاد و قرض پورا ہونے سے پہلے مہلت دینے کا ہے، اور جب میعاد قرض پوری ہو جائے اور وہ شخص ادا کرنے پر قادر نہ ہو اس وقت اگر کوئی مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اس کی دو گنی رقم صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دعا قبول ہو یا اس کی مصیبت دور ہو تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مدیون کو مہلت دیدے۔

اس کے بعد آخری آیت میں پھر روز قیامت کا خوف اور محشر کے حساب کتاب اور ثواب و عذاب کے ذکر پر احکام سود کی آیات کو ختم کیا، ارشاد فرمایا:

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۚ (یعنی ڈرو اس روز جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اپنے اپنے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیت ہے، اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اس کے اکتیس روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور بعض روایات میں صرف نو دن بعد وفات ہونا مذکور ہے۔

یہاں تک رہا کہ احکام سے متعلقہ سورۃ بقرہ کی آیات کی تفسیر آئی ہے، رہا کہ حرمت و مانعت پر استرآن کریم میں سورۃ بقرہ میں مذکورہ سات آیتیں اور سورۃ آل عمران میں ایک آیت، سورۃ نساء میں دو آیتیں آئی ہیں، اور ایک آیت سورۃ روم میں بھی ہے، جس کی تفسیر میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اس کو بھی سود بیاج کے مفہوم پر محمول کیا ہے، بعض نے دوسری تفسیر بیان کی ہے، اس طرح مسترائی حکیم کی دس آیتیں ہیں، جن میں سود و رہا کے

احکام مذکور ہیں۔

سود کی پوری حقیقت بتلانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان باقی آیات کا ترجمہ اور تفسیر بھی اسی جگہ لکھ دی جائے جو سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء اور سورۃ روم میں آئی ہیں، تاکہ تمام آیات یک جا ہو کر رہا کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو۔

آل عمران کے تیرہویں رکوع کی ایک سو تیسویں آیت یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا
الرِّبَا أضعافاً مضاعفةً ۚ
وَاللَّهُ يضاعف لكم ضعفه ۚ
وَاللَّهُ يضاعف لكم ضعفه ۚ

”یہاں ایمان والو! سود مت کھاؤ جسے
زائد، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، امید ہے
کہ تم کا میاب ہو“

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ جاہلیت عرب میں سود خوردی کا عام طور پر یہ طریق تھا کہ ایک خاص میعاد معین کے لئے ادھار سود پر دیا جاتا تھا، اور جب وہ میعاد آگئی اور قرضدار اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دی جاتی تھی کہ سود کی معتد اور بڑھادی جائے، اسی طرح دوسری میعاد پر بھی ادائیگی نہ ہوتی تو سود کی معتد اور بڑھادی، یہ واقعہ عام کتب تفسیر میں بالخصوص لباب النقول میں بروایت مجاہد مذکور ہے۔

جاہلیت عرب کی اس ملت گش رسم کو مٹانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اسی لئے اس آیت میں اضعافاً مضاعفةً (یعنی کئی حصے زائد) فرما کر ان کے مرد و عورت و بچہ کی مذمت اور ملت گشی و خود غرضی پر تنبیہ فرما کر اس کو حرام قرار دیا، اس کے معنی یہ نہیں کہ اضعافاً مضاعفہً نہ ہو تو حرام نہیں، کیونکہ سورۃ بقرہ اور نساء میں مطلقاً رہا کی حرمت صاف صاف مذکور ہے، اضعافاً مضاعفہً ہونا نہ ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن کریم میں جاہل فرمایا گیا کہ:

لَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا (یعنی میری آیتوں کے بدلہ میں تھوڑی سی قیمت مت لو)۔

اس میں تھوڑی سی قیمت اس لئے فرمایا کہ آیات الہیہ کے بدلہ میں اگر ہفت قلم کی سلطنت بھی لے لے تو وہ تھوڑی ہی قیمت ہوگی، اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کی آیات کے بدلے میں تھوڑی قیمت لینا تو حرام ہے اور زیادہ لینا جائز، اسی طرح اس آیت میں اضعافاً مضاعفةً کا لفظ ان کے شرمناک طریقہ پر فکر کرنے کے لئے لایا گیا، حرمت کی شرط نہیں۔

اور اگر سود کے مرد و عورتوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب سود خوردی کی عادت پڑ جائے تو پھر وہ سود تنہا سود ہی نہیں رہتا، بلکہ لازماً اضعافاً مضاعفہً ہو جاتا ہے، کیونکہ جو رستم سود سے حاصل ہو کر سود خورد کے مال میں شامل ہوئی تو اب اس سود کی زائد رقم کو بھی سود پر چلائے گا تو سود مضاعف ہو جائے گا، اور یہی سلسلہ آگے چلا تو اضعافاً مضاعفہً

ہو جائے گا، اس طرح ہر سوراخات مضاعفہ بن کر رہے گا۔

اور سورۃ نثار میں دو آیتیں سورۃ کے متعلق یہ ہیں:

فَيُظْلِمُونَ الَّذِينَ الَّذِينَ هَادُوا وَآخَرُونَ
عَلَيْهِمْ طَبِيبَاتُ أُحْلَتْ لَهُمْ
وَبَصَدِّ هُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
كَثِيرًا وَأَخَذَهُمُ الرِّبَا
وَقَدْ نُفِّرَ عَنْهُمْ وَأَمْلَاهُمْ
أَمْوَالُ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ
أَعَدَّ نَارَ الْكَافِرِينَ مِنْهُمْ
عَنْ أَبِي الْيَمَانِ (١٦١ - ١٦٠)

یعنی یہود کے انہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں ان پر حرام کر دیں اور بسبب اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو رشد کی راہ سے مانع بن جاتے تھے، اور بسبب اس کے کہ وہ سرد لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو ان کے عبادت گاہیں تھیں اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھا جاتے تھے، اور ہم نے

ان دوہوں کیلئے جو اُن میں کافر ہیں دردناک سزا کا سامان معتمد کر رکھا ہے۔
ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ شریعت موسویہ میں بھی سود حرام تھا، اور یہود
نے جب اس کی مخالفت کی تو دنیا میں بھی اُن کو یہ مناسب سزا دی گئی کہ انھوں نے
حرص دنیا کی خاطر حرام کھانا شروع کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر بعض حلال چیزیں بھی
حرام فرمادیں۔

اور سورۃ رزم کے چوتھے رکوع کی اُنتالیسویں آیت میں ہے:

وَمَا أَسْأَلُكُمْ مِنْ رَبٍّ لِيَرْبُوا
فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلْيَرْبُوا
عِنْدَ اللَّهِ وَمَا أَسْأَلُكُمْ مِنْ
زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ
قَالَ لَيْكَ هُمُ الْمُسْعِفُونَ ۝ (٣٩)

”یعنی جو چیز تم اس لئے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ دو گے جس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو تو ایسے لوگ خدا کے پاس بڑھاتے رہیں گے۔“

بعض حضرات مفسرین نے لفظ ربا اور زیادتی پر نظر کر کے اس آیت کو بھی سود بیاچ پر محمول فرمایا ہے، اور یہ تفسیر نسراۓ کے لئے ہے کہ سود بیاچ کے لینے میں اگرچہ بظاہر مال کی زیادتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ زیادتی نہیں، جیسے کسی شخص کے بدن پر درم ہو جائے تو بظاہر وہ اس کے جسم میں زیادتی ہے، لیکن کوئی عقلمند اس کو زیادتی سمجھ کر خوش نہیں ہوتا، بلکہ اس کو ہلاکت کا مقدمہ سمجھتا ہے، اس کے بالمقابل زکوٰۃ و صدقات دینے میں اگرچہ بظاہر مال میں کمی آتی ہے، مگر درحقیقت وہ کمی نہیں بلکہ ہزاروں زیادتیوں کا موجب ہے۔

جیسے کوئی شخص مادہ فاسدہ کے اخراج کے لئے مہل بیستا ہے، یا فصد کھلو کر خون نکلاتا ہے، تو بظاہر دہرہ کز در نظر آتا ہے اور اس کے بدن میں کمی محسوس ہوتی ہے، مگر جاننے والوں کی نظر میں یہ کمی اس کی زیادتی اور قوت کا پیش خیمہ ہے۔

اور بعض علماء تفسیر نے اس آیت کو سود بیاج کی مانعت پر محمول ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ جو شخص کسی کو اپنا مال احتلاص و نیک فیتی سے نہیں، بلکہ اس نیت سے دے کہ میں اس کو یہ چیز دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلہ میں اس سے زیادہ دے گا، جیسے بہت سی برادریوں میں فوتہا کی رسم ہے کہ وہ ہدیہ کے طور پر نہیں بلکہ بدلہ لینے کی غرض سے دی جاتی ہے، یہ دینا چونکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی غرض کے لئے ہے اس لئے آیت میں فرمایا کہ اس طرح اگرچہ ظاہر میں مال بڑھ جائے مگر وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، ہاں جو زکوٰۃ صدقات اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دیئے جائیں ان میں اگرچہ بظاہر مال گھٹتا ہے، مگر اللہ کے نزدیک وہ دوگنا اور چوگنا ہوتا جاتا ہے۔

اس تفسیر پر آیت مذکورہ کا رد مضمون ہو جائے گا جو دوسری ایک آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے، وَلَا تَقْمِضُنْ قَسَمًا (۱۱۰:۴۲) یعنی آپ کسی پراچن اس نہت سے نہ کریں کہ اس کے بدلہ میں کچھ مال کی زیادتی آپ کو حاصل ہو جائے گی۔

اور سورۃ روم کی اس آیت میں بظاہر یہ دوسری تفسیر ہی رائج معلوم ہوتی ہے، اول تو اس لئے کہ سورۃ روم بھی ہے، جس کے لئے اگرچہ ضروری نہیں کہ اس کی ہر آیت کئی ہو، مگر غالب گمان بھی ہونے کا ضرور ہے، جب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملے، اور آیت کے ملنے کی صورت میں اس کو حرمیت سود کے مفہوم پر اس لئے محمول نہیں کیا جاسکتا کہ حرمیت سود مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ اس آیت سے پہلے جو مضمون آیا ہے اس سے بھی دوسری تفسیر ہی کا رجحان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ارشاد ہے :

فَاتَىٰ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْيَتَامَىٰ ذَلَّتْ سَبِيلِي ذَلَّتْ خَيْرُ لَدَيْنَيْنِ يَكْرَهُنَّ ذُلًّا
وَجَعَلَ اللَّهُ ذَا الْقُرْبَىٰ دَارَكَوْاسٍ كَاتِقٍ دَاكِرًا دَارِكِينَ اُوْر مَسَافِرَ كَرِهِي اِيْهَانُ لَوَاكِلٍ كَلَّ لِي
بِهْتَرَجَ جَوَالِدُكَ رَضَاكَ طَالِبِي ۝

اس آیت میں رشتہ داروں اور مساکین اور مسافروں پر خرچ کرنے کے ثواب ہونے کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی ہو، تو اس کے بعد والی آیت مذکورہ میں اس کی توضیح اس طرح کی گئی کہ اگر مال کسی کو اس غرض سے دیا جائے کہ اس کا بدلہ اس کی طرف سے زیادہ ملے گا تو یہ رضا جوئی حق تعالیٰ کے لئے خرچ نہ ہوا

اس لئے اس کا ثواب نہ ملے گا۔

بہر حال ممانعتِ سود کے مسئلہ میں اس آیت کو چھوڑ کر بھی مذکورۃ الصد بہت سی آیتیں آئی ہیں جن میں سے سورۃ آل عمران کی ایک آیت میں اضاعت مضاعت سود کی حرمت بیان کی گئی ہے، اور باقی سب آیتوں میں مطلق سود کی حرمت کا بیان ہے، اس تفصیل سے یہ تو واضح ہو گیا کہ سود خواہ اضاعت مضاعت اور سود در سود ہو یا اکہر اسود، بہر حال حرام ہے، اور حرام بھی ایسا شدید کہ اس کی مخالفت کرنے پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سنا یا گیا ہے۔

مسئلہ سود و ربا

کی کچھ مزید

تشریح و تفصیل

آج کل ربا چونکہ عام نظامِ تجارت کا رکنِ اعظم اور مذہبِ نبویؐ ہے، اس لئے جب کتاب و سنت کی آیات و روایات میں اس کی حرمت و ممانعت ملنے آتی ہے تو عام طبائع اس کی حقیقت کو سمجھنے سمجھانے کے وقت اس کی حرمت سے ہچکچاتی ہیں، اور جیلہ جونی کی طرف مائل ہوتی ہیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بحث کا تجزیہ کر کے اس کے ہر پہلو پر علیحدہ علیحدہ غور و فکر کرنا چاہئے، غلط ملط کرنے کا نتیجہ بحث کے اُلجھنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بحث کے تین حصے ہیں:

اول یہ کہ قرآن و سنت میں ربا کی کیا حقیقت ہے اور وہ کن کن صورتوں پر حاوی ہے؟

دوسرے یہ کہ اس ربا کی حرمت و ممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے؟

تیسرے یہ کہ سود و ربا کتنا ہی بُرا ہی، لیکن آج کل کی دنیا میں وہ نظامِ معاشیات و تجارت کا رکنِ اعظم بن چکا ہے، اگر تشریعی احکام کے ماتحت اس کو چھوڑ دیا جائے تو نظامِ بنک و تجارت کیسے چلے گا؟

اصل ربا کی تعریف میں کبھی کوئی ابہام نہیں رہا اب سنئے کہ لفظ ربا و رباوی زبان کا معروف لفظ ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مخالطہ کا جواب۔

بعثت اور نزولِ قرآن سے قبل جاہلیتِ عرب میں بھی یہ لفظ متعارف تھا، اور نہ صرف متعارف بلکہ ربا کا لین دین عام طور پر جاری تھا، بلکہ سورۃ نسا کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ربا کا لفظ اور اس کے معاملات زمانہِ تورات میں بھی معروف تھے اور تورات میں بھی اس کو حرام

مسترار دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا لفظ جو زمانہِ قدیم سے عرب اور اس کے قرب و جوار میں معروف چلا آتا ہے اور اس پر لین دین کا رواج چل رہا ہے، اور تشریحات اس کی حرمت و ممانعت بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی خبر دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت پر بھی سود و ربا حرام کیا گیا تھا، اس لفظ کی حقیقت کوئی ایسی مبہم چیز نہیں ہو سکتی جس کے سمجھنے سمجھانے میں دشواریاں پیش آئیں۔ یہی وجہ ہو کہ جب ششہ ہجری میں سورۃ بقرہ کی آیات ربا کی حرمت کے متعلق نازل ہوئیں تو صحابہ کرامؓ سے کہیں منقول نہیں کہ ان کو لفظ ربا کی حقیقت سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ معاملات کی طرح اس کی تحقیق کی نوبت آئی ہو بلکہ جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کیا، اسی طرح ربا کی حرمت نازل ہوتے ہی ربا کے سب معاملات ترک کر دیئے، پچھلے زمانہ کے معاملہ میں مسلمانوں کا جو ربا غیر مسلموں کے ذمہ واجب الاداء تھا وہ بھی مسلمانوں نے چھوڑ دیا اور جو غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ذمہ واجب الاداء تھا، اور مسلمان نزولِ ممانعت کے بعد اس کو دنیا نہیں چاہتے تھے اس کا جھگڑا امیرِ مکہ کی عدالت میں پیش ہوا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس کا فیصلہ سورۃ بقرہ کی آیات میں آسان سے نازل ہوا کہ پچھلے زمانہ کے بقایا ربا کا لین دین بھی اب جائز نہیں۔

اور اس میں چونکہ غیر مسلموں کو یہ شکایت کا موقع مل سکتا تھا کہ ایک سلامی حکم شرعی کی وجہ سے ہمارا روپیہ کیوں مارا جائے، تو اس کے ازالہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ واضح کر دیا کہ اس حکم شرعی کا اثر صرف غیر مسلموں پر نہیں، بلکہ مسلمانوں پر بھی یکساں ہے، اور سب سے پہلے جو سود کی رقم چھوڑی گئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکمِ محترم حضرت عباسؓ کی کثیر التعداد رقم تھی۔

الغرض ربا کی ممانعت ہونے کے وقت ربا کا مفہوم کچھ مخفی نہ تھا، عام طور پر معروف تھا ہی ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے، اور اس کا لین دین کرتے تھے، قرآن نے حرام کیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صرف اخلاقی انداز میں نہیں، بلکہ قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ فرمایا، البتہ بعض ایسی صورتوں کو بھی آپؐ نے ربا میں شامل قرار دیا جس کو عام طور پر ربا نہیں سمجھا جاتا تھا، انھیں صورتوں کی تعیین میں حضرت فاروق اعظمؓ کو اشکال پیش آیا، اور انہی میں ائمہ مجتہدین کے نظریات میں اختلاف ہوا، درنہ اصل ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے نہ اس میں کسی کو اشتباہ کا موقع تھا، نہ اس میں کسی اختلاف ہوا۔

اب سنے عرب کا مروجہ ربا کیا تھا؟ امام تفسیر ابن جریر نے حضرت مجاہد سے نقل کیا ہے کہ جو ربا جاہلیت میں جاری تھا اور قرآن نے اسے منع کیا وہ یہ تھا کہ کسی کو ایک میعاد معین کے لئے قرض دے کر اس پر اصل راس المال سے زائد معسرہ زیادتی لیتے تھے، اور اگر میعاد معسرہ پر وہ قرض ادا نہ کر سکا تو مزید میعاد اس شرط پر بڑھا دیتے تھے کہ سود میں اضافہ کیا جائے، یہی مضمون حضرت قتادہ اور دوسرے حضرات ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے (تفسیر ابن جریر ص ۶۲ ج ۳) اندلس کے مشہور امام تفسیر ابو حیان عسکری کی تفسیر بحر تحف میں بھی جاہلیت کے ربا کی یہی صورت لکھی ہے کہ ادھار دے کر اس پر نفع لینے اور جتنی مدت ادھار کی بڑھ جائے اتنا ہی سود اس پر بڑھا دینے کا نام ربا تھا، اسی جاہلیت عرب کے لوگ یہ کہتے تھے کہ جیسے بیع و شراء میں نفع لینا جائز ہے اسی طرح اپنا روپیہ ادھاڑنے کے نفع لینا بھی حلال ہونا چاہئے، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، اور بیع و ربا کے احکام کا مختلف ہونا واضح فرمایا۔ یہی مضمون تمام مستند کتب تفسیر ابن کثیر، تفسیر کبیر اور روح المعانی وغیرہ میں معتبر روایات کے ساتھ منقول ہے۔

ابن عسکری نے احکام القرآن میں فرمایا: اَلرِّبَا فِي اللُّغَةِ التَّيَّارَةِ وَالْمُرَادُ بِهِ فِي الْاَيَةِ كُلُّ زِيَادَةٍ لَا يَكُونُ مَعَ الْوَقْتِ (ص ۲۷۱-۲۷۰) یعنی ربا کے معنی اصل لغت میں زیادتی کے ہیں، اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو، بلکہ محض ادھار اور اس کی میعاد ہو، امام رازی نے اپنی تفسیر میں سنرایا کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک معاملات بیع و شراء کے اندر ربا، دوسرے ادھار کا ربا، اور جاہلیت عرب میں دوسری قسم ہی راجع اور معروف تھی کہ وہ اپنا مال کسی کو عین میعاد کے لئے دیتے تھے، اور ہر مہینہ اس کا نفع لیتے تھے، اور اگر میعاد عین پر ادا نہیں نہ کر سکا، تو میعاد اور بڑھا دی جاتی تھی، بشرطیکہ وہ سود کی رقم اور بڑھا دیتے، یہی جاہلیت کا ربا تھا، جس کو قرآن نے حرام کیا۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں ربا کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں:

هُوَ الْقَرْضُ مِنَ الْمَتِّ وَطَفِيفِهِ
الْاَجَلُ وَزِيَادَةُ مَالٍ عَلَى
الْمُسْتَقْرِضِ

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا کی تعریف یہ فرمائی ہے:
”یعنی جو قرض نفع حاصل کرے
ربا“
دہ ربا ہے۔

یہ حدیث جامع صغیر میں ہو اور عزیزی نے اس کو حسن کہا ہے۔
مُخْلَصًا یہ ہے کہ ادھار دے کر اس پر نفع لینے کا نام ربا ہے جو جاہلیت عرب کے زمانہ میں رائج اور معروف تھا، جس کو قرآن کریم کی آیت مذکورہ نے صراحت حرام قرار دیا، اور ان آیات کے نازل ہوتے ہی صحابہ کرام نے اس کو چھوڑ دیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی خصوصیات میں اس کو نافذ فرمایا، اس میں نہ کوئی ابہام تھا نہ اجمال نہ اس میں کسی کو کوئی اشتباہ و اشکال پیش آیا۔

البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا کے مفہوم میں بیع و شراء کی چند صورتوں کو بھی داخل سنرایا جن کو عرب ربا نہ سمجھتے تھے، مثلاً چھ چیزوں کی بیع و شراء میں یہ حکم دیا کہ اگر ان کا تبادلہ کیا جائے تو برابر برابر ہونا چاہئے، اور نقد دست بدست ہونا چاہئے، اس میں کمی بیشی کی گئی یا ادھار کیا گیا تو وہ بھی ربا ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گہوڑے، جَو، بکجور اور انگور ہیں۔

اسی اصول کے ماتحت عرب میں معاملات کی جو چند صورتیں مزاجانہ اور محالہ کے نام سے رائج تھیں آیات ربا نازل ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ربا میں شامل قرار دے کر منع فرمایا (ابن کثیر بحوالہ مستدرک حاکم، ص ۳۲۴ ج ۱)

اس میں یہ بات قابل غور تھی کہ ان چھ چیزوں کی خصوصیت ہے، یا ان کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ان کے حکم میں ہیں، اور اگر ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے، کس کس صورت کو داخل ربا سمجھا جائے، یہی اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کو پیش آیا، جس کی بنا پر فرمایا:-

اِنَّ اَيَّةَ الرِّبَا مِنْ اَخْرِ مَا نَزَلَ مِنْ
الْقُرْآنِ وَانَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
قَبْضَ قَبْلِ اَنْ يَبْدِيَهُ لَنَا فَاذْ عَوَّا لِرَبِّنَا
وَالرِّبَا

(احکام القرآن، جصاص، ص ۵۵۱)
(تفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن کثیر، ص ۳۲۸ ج ۱)

یعنی آیت ربا قرآن کی آخری آیتوں میں ہے
اس کی پوری تفصیلات بیان فرمانے سے
پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
ہو گئی، اس لئے اب احتیاط لازم ہے ربا کو
چھوڑنا ہی ہے جس صورت میں ربا کا شبہ
بھی ہو اس کو بھی چھوڑ دینا چاہئے۔

عہ مزاجانہ یہ ہر کہ درخت پر لگے ہوئے پھل کو ٹوٹے ہوئے پھلوں کے بدلے میں اندازہ سے فروخت کیا جائے، اور محالہ یہ کہ کھڑے کھیت کے غلہ گندم چنا وغیرہ کو خشک صاف کئے ہوئے غلہ گندم یا چنے سے اندازہ لگا کر فروخت کیا جائے، اندازہ میں چونکہ کمی بیشی کا امکان رہتا ہے، اس لئے اس کو منع کیا گیا ۱۲ منہ

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مراد معاملات بیع و شراء کی وہ صورتیں اور ان کی تفصیلات ہیں جو جاہلیت عرب میں ربا نہیں سمجھی جاتی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ربا میں داخل و شرا دے کر حرام فرمایا، باقی اصل ربا جو تمام عرب میں معروف و مشہور تھا اور صحابہ کرام نے اس کو چھوڑا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قانون نافذ فرمایا، اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کا اعلان کیا، اس میں فاروق اعظم کو کوئی اشکال یا اشتباہ ہوئے کا کوئی امکان نہیں، پھر جب فاروق اعظم کو ربا کی جن خاص صورتوں میں اشتباہ پیش آیا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ جن صورتوں میں ربا کا شبہ بھی ہو ان کو بھی چھوڑ دیا جائے مگر حیرت ہے کہ آج بعض وہ لوگ جو یورپ کی ظاہری شیطاپ اور دولت مندوں اور موجودہ نظام تجارت وغیرہ میں سود کے رکن بن جانے سے مرعوب ہیں، انہوں نے فاروق اعظم کے اس ارشاد کا یہ نتیجہ نکالا کہ ربا کا مفہوم ہی مجمل رہ گیا تھا، اس لئے اس میں ربا کی گنجائش ہو جس کے غلط ہونے کا کافی مواد سامنے آچکا ہے، احکام القرآن میں ابن عربی نے ان لوگوں پر سخت انکار کیا ہے جنہوں نے اس فاروقی ارشاد کی بناء پر آیات ربا کو مجمل کہا تھا۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا:

إِنَّ مَنْ زَعَمَ أَنَّ هَذِهِ الْأَيَّاتِ مُجْمَلَةٌ فَلَمْ يَفْقَهُمْ مَعَاظِمَ النَّاسِ يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَرْسَلَ رَسُولًا إِلَى قَوْمٍ هُوَ مِنْهُمْ بَلَّغَهُمْ وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ كِتَابَهُ نَبِيًّا رَأَيْنَاهُ بِلِسَانِهِ وَلِسَانِهِمْ وَالزَّبَانِي اللَّغَةِ الرَّبَاقَةِ وَالْمَرَادِيهِ فِي الْأَيَّاتِ كُلِّ زِيَادَةٍ لَا يُقَابِلُهَا عَوْنٌ

یعنی جس نے یہ کہا کہ یہ آیت مجمل ہے، اس نے شریعت کی تصریحات کو نہیں سمجھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی قوم کی طرف بھیجا کہ وہ خود اسی قوم میں سے تھے انہی کی زبان میں سمجھا، ان پر اپنی کتاب آسانی کے لئے انہی کی زبان میں نازل فرمائی اور لفظ ربا کے معنی ان کی زبان میں زیادتی کے ہیں اور مراد آیت میں وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں مال نہیں بلکہ میعاد ہے۔

اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک ادھار کا ربا دوسرے نقد بیع میں زیادہ لینے کا ربا، پہلی قسم وہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی، اور اہل جاہلیت اس کا لین دین کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ ہے جو حدیث نے بیان کی، کہ فلاں فلاں چیزوں کی بیع و شراء میں کسی زیادتی ربا میں داخل ہے۔ اور احکام القرآن جصاص میں ہے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک بیع و شراء کے اندر

دوسری بیع و شراء کے اور زمانہ جاہلیت کا ربا وہی دوسری قسم کا تھا، اور اس کی تعریف یہ ہو کہ وہ شرا میں جس میں بحساب میعاد کوئی نفع لیا جائے، اور یہی مضمون ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے، اور شرا میں ادھار پر نفع لینے کے ربا کا حرام ہونا مسترآن، سنت اور اجماع امت سے ثابت کیا ہے۔

امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ شرا میں جو ربا مذکور ہے اس سے جلی اور واضح طور پر وہ ربا مراد ہے جو شرا میں ادھار پر لیا جاتا تھا، اور اسی کو زمانہ جاہلیت میں ربا کہا جاتا تھا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور آپ کی سنت سے دوسری قسم کے ربا کا علم ہوا، جو خاص خاص اقسام بیع و شراء میں کسی زیادتی یا ادھار کرنے کا نام ہے، اور اس ربا کے حرام ہونے پر بھی اجماع و سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم متواتر آتی ہیں، مگر اس قسم کے ربا کی تفصیلات پوری واضح نہ ہونے کے سبب اس میں بعض صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا، اور فقہاء کے اختلافات ہوئے (معانی الآثار ص ۲۲۲ ج ۲)۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تجلۃ اللہ الباقیہ میں مندرمایا ہے کہ ربا ایک حقیقی ہے اور ایک وہ جو بحکم ربا ہے، حقیقی ربا شرا میں ادھار پر زیادتی لینے کا نام ہے، اور بحکم ربا وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں زیادتی لینے کو ربا کہا گیا ہے، اور ایک حدیث میں جو آیا ہے (لا با الا فی النسیئۃ در ولا البخاری) یعنی ربا صرف ادھار میں ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور اصلی ربا جس کو عام طور پر ربا سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ ادھار پر نفع لینے کا نام ہے اس کے سوا حقیقی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں وہ سب کھار بوا میں داخل ہیں۔

اس تفصیل سے چند چیزیں واضح ہو گئیں

اول یہ کہ نزول شرا سے پہلے ربا ایک متعارف چیز تھی، قرض ادھار پر بحساب میعاد زیادتی لینے کو ربا کہا جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ شرا میں حرمت ربا نازل ہوتے ہی سب صحابہ کرام نے اس ربا کو ترک کر دیا، اس کے معنی سمجھنے سمجھانے میں کسی کو نہ اشکال پیش آیا نہ اشتباہ۔

تیسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چیزوں کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ ان کی باہمی بیع و شراء میں برابری شرط ہے، کسی بیشی ربا میں داخل ہے، اور ان میں ادھار

کرنا بھی رہا میں داخل ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گہیوں، جو، کھجور، انگور ہیں، اور اسی قانون کے تحت عرب میں مروجہ اقسام بیع مزائینہ، میاقہ وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں چھ چیزوں کی بیع و شراء میں کمی بیشی اور ادھار کو تو حرام رہا میں داخل کر کے حرام قرار دیدیا تھا، لیکن اس میں یہ بات محل تفقہ و اجتہاد تھی کہ یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا دوسری اشیاء میں بھی ہے، اور اس کا ضابطہ کیا ہے؟ اس ضابطہ میں فقہاء نے اپنے اپنے غور و فکر اور اجتہاد سے مختلف صورتیں تجویز کیں، اور چونکہ یہ ضابطہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمایا تھا اس میں اشتباہ رہنے کے سبب حضرت فاروق اعظمؓ نے اس پر اظہارِ افسوس کیا کہ کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کا کوئی ضابطہ بیان فرمادیتے تو مشتبہ حالات میں اطمینان پیدا ہو جاتا، اور پھر یہ ارشاد منسرایا کہ جہاں رہا کا شبہ بھی ہو اس سے بچنا چاہئے۔

چچہ تھے یہ معلوم ہوا کہ اصلی اور حقیقی رہا جس کو فقہاء نے ربوا القرآن یا ربوا القرض کے نام سے موسوم کیا ہے وہی ہے جو عرب میں منعارف تھا یعنی قرض ادھار پر بھجبا میعاد نفع لینا، دوسری قسم کے رہا جو حدیث میں بتلائے گئے وہ سب اسی رہا کے ساتھ ملحق اور اسی کے حکم میں ہیں، اور جو کچھ خلاف و اختلاف امت میں ہوا وہ سب اسی دوسری قسم کے معاملات رہا میں ہوا، پہلی قسم کا رہا جو ربوا القرآن کہلاتا ہے اس کے حرام ہونے میں پوری امت متحدہ میں کسی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

اور آجکل جو رہا انسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے، اور مسئلہ سود میں جو زیر بحث ہے وہ یہی رہا ہے جس کی حرمت قرآن کی سات آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

رہا کی دوسری قسم جو بیع و شراء کے ضمن میں ہوتی ہے نہ اس کا رواج عام ہے نہ اس میں کوئی بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن و سنت میں رہا کی حقیقت کیا ہے جو مسئلہ سود کی پہلی بات ہے۔

حرمت سود کی مصلحت اس کے بعد دوسری بحث اس کی پر کہ رہا کی حرمت و ممانعت کس بحمت و مصلحت پر مبنی ہے، اور اس میں وہ کونسی روحانی یا معاشی مضرتیں ہیں، جن کی وجہ سے اسلام نے اس کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

اس جگہ پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا کی ساری مخادقات اور ان کے معاملات

میں ایسی کوئی چیز نہیں جس میں کوئی بھلائی یا فائدہ نہ ہو، سانپ، بھتو، بھیڑیا، شیر اور سنکھیا جیسے زہر قاتل میں بھی انسان کے لئے ہزاروں فوائد ہیں۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

چوری، ڈاکہ، بدکاری، رشوت، ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں کچھ نہ کچھ فائدہ نہ ہو، مگر ہر مذہب و ملت اور ہر مکتب فکر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس چیز کے منافع زیادہ اور مضرتیں کم ہیں ان کو نافع و مفید کہا جاتا ہے، اور جن کے مفاسد و مضرت زیادہ اور منافع کم ہیں ان کو مضر اور بیکار سمجھا جاتا ہے، قرآن کریم نے بھی شراب اور قمار کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کا اعلان فرمایا کہ ان میں بڑے گناہ بھی ہیں، اور لوگوں کے کچھ منافع بھی، مگر ان کے گناہ کا وبال منافع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اس لئے ان چیزوں کو اچھا یا مفید نہیں کہا جاتا بلکہ ان کو نہایت مضر اور تباہ کن سمجھ کر ان سے جہتناب لازم ہے۔

رہا، یعنی سود کا بھی یہی حال ہے، اس میں سود خور کے لئے کچھ وقتی نفع ضرور نظر آتا ہے، لیکن اس کا دنیوی اور اخروی وبال اس نفع کے مقابلہ میں نہایت شدید ہے۔

ہر چیز کے نفع و نقصان یا مفاسد و مصالح کا موازنہ کرنے میں یہ بات بھی ہر عقلمند کے نزدیک قابل نظر ہوتی ہے کہ اگر کسی چیز میں نفع محض وقتی اور ہنگامی ہو اور نقصان اس کا دیر پا یا دائمی تو اس کو کوئی عقلمند مفید اشیاء کی فہرست میں شمار نہیں کر سکتا، اسی طرح اگر کسی چیز کا نفع شخصی اور انفرادی ہو اور اس کا نقصان پوری ملت اور جماعت کو پہنچتا ہو تو اس کو بھی کوئی ہوشمند انسان مفید نہیں کہہ سکتا، چوری اور ڈاکہ میں چور ڈاکو کا تو نفع کھلا ہوا ہے، مگر وہ پوری ملت کے لئے مضر اور ان کے امن و سکون کو برباد کرنے والا ہے، اسی لئے کوئی انسان چوری اور ڈاکہ کو اچھا نہیں کہتا۔

اس تمہید کے بعد مسئلہ سود پر نظر ڈالتے تو اس میں ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سود خور کے وقتی اور ہنگامی نفع کے مقابلہ میں اس کا روحانی اور اخلاقی نقصان اتنا شدید ہے کہ وہ اس کو انسانیت سے نکال دیتا ہے، اور یہ کہ اس کا جو وقتی نفع ہے وہ بھی صرف اس کی ذات کا نفع ہے، اس کے مقابلہ میں پوری ملت کو نقصان عظیم اور معاشی بحران کا شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ جب اس میں کوئی چیز رواج پا جاتی ہو تو اس کی خرابیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور صرف اس کے فوائد سامنے رہ جاتے ہیں، اگرچہ وہ فوائد کتنے ہی حقیر و ذلیل اور ہنگامی ہوں اس کے نقصانات کی طرف دھیان نہیں جاتا اگرچہ وہ کتنے ہی شدید اور عام ہوں۔

رسم و رواج طبائع انسانی کے لئے ایک کلور و فارم ہے جو اس کو بے حس بنا دیتا ہے، بہت کم افراد ہوتے ہیں جو چلے ہوئے رسم و رواج پر تحقیقی نظر ڈال کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس میں فائدے کتنے ہیں اور نقصان کتنا، بلکہ اگر کسی کے متنبہ کرنے سے اس کے نقصانات سامنے بھی آجائیں، تو پابندی رسم و رواج اس کو صحیح راستہ پر نہیں آنے دیتی۔

سود و ربا اس زمانہ میں ایک دہائی مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کا رواج ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، اس نے انسانی فطرت کا ذائقہ بدل دیا ہے کہ کرڈر کو میٹھا سمجھنے لگی، اور جو چیز پوری انسانیت کے لئے معاشی بربادی کا سبب ہے، اس کو معاشی مسئلہ کا حل سمجھا جانے لگا، آج اگر کوئی مفکر محقق اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو اس کو دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن وہ ڈاکٹر اکثر نہیں بلکہ انسانیت کا ڈاکو ہے جو کسی ملک میں دبا پھیل جانے کو اور علاج کے غیر مؤثر ہونے کا مشاہدہ کرنے کی بناء پر اب یہ طے کرے کہ لوگوں کو یہ سمجھائے کہ یہ مرض مرض ہی نہیں، بلکہ عین شفا اور عین راحت ہے، ماہر ڈاکٹر کا کام ایسے وقت میں بھی یہی ہے کہ لوگوں کو اس مرض اور اس کی مصرت سے آگاہ کرتا رہے، اور علاج کی تدبیریں بتاتا رہے۔

انبیاء علیہم السلام اصلاح خلق کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں، وہ کبھی اس کی پروا نہیں کرتے کہ کوئی ان کی بات سننے لگا یا نہیں، وہ اگر لوگوں کے سننے اور ماننے کا انتظار کیا کرتے تو ساری دنیا کفر و شرک ہی سے آباد ہوتی، کلمہ لا الہ الا اللہ کا ماننے والا اس وقت کون تھا جب کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تبلیغ و تعلیم کا حکم منجانب اللہ ملا تھا؟ سود و ربا اگرچہ آج کی معاشیات میں ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے، لیکن حقیقت وہ ہے جو آج بھی بعض حکمائے یورپ نے تسلیم کی کہ وہ معاشیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہو جانے والا ایک کیڑا ہے، جو اس کو کھا رہا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ آجکل کے اہل علم و فن بھی کبھی رسم و رواج کے تنگ دائرہ سے آزاد ہو کر اس طرف نظر نہیں کرتے، اور سیکڑوں برس کے تجربے بھی ان کو اس طرف متوجہ نہیں کرتے کہ سود و ربا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام خلق خدا اور تمام ملت فقر و فاقہ اور معاشی بحران کا شکار ہو، اور وہ غریب غریب تر ہوتے چلے جائیں، اور چند سرمایہ دار پوری ملت کے مال سے فائدہ اٹھا کر، یا یوں کہتے کہ ملت کا خون چوس کر اپنا بدن بڑھاتے اور پالتے چلے جائیں، اور حیرت ہے کہ جب کبھی ان حضرات کے سامنے اس حقیقت کو بیان

کیا جاتا ہے، تو اس کے جھٹلانے کے لئے ہمیں امریکہ، اور انگلینڈ کے بازاروں میں لے جا کر سود کی برکات کا مشاہدہ کرانا چاہتے ہیں، اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ سود و ربا کی بدولت کیسے پھلے اور پھولے ہیں، لیکن اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی مردم خوروں کی کسی قوم اور ان کے عمل کی برکات کا مشاہدہ کرانے کے لئے آپ کو مردم خوروں کے محل میں لے جا کر یہ دکھلائے کہ یہ کتنے موٹے تانے اور تندرست ہیں، اور اس سے یہ ثابت کرے کہ ان کا یہ عمل بہترین عمل ہے۔

لیکن اس کو کسی سمجھ دار آدمی سے سابقہ پڑے تو وہ کہے گا کہ تم مردم خوروں کے عمل کی برکات مردم خوروں کے محل میں نہیں دوسرے مخلوق میں جا کر دیکھو جہاں سیکڑوں ہزاروں مرد بے پڑے ہوئے ہیں جن کا خون اور گوشت کھا کر یہ درندے پلے ہیں، اسلام اور اسلامی شریعت کبھی ایسے عمل کو درست اور مفید نہیں مان سکتی جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت اور ملت تباہی کا شکار ہو، اور کچھ افراد یا ان کے جتنے پھولتے پھلتے چلے جائیں۔

سود و ربا کی معاشی خرابیاں

سود و ربا میں اگر کوئی دوسرا عیب بھی اس کے سوا نہ ہوتا کہ اس کے نتیجہ میں چند افراد کا نفع اور پوری انسانیت کا نقصان ہے تو یہی اس کی مانعت اور قابل نفرت ہونے کے لئے کافی تھا، حالانکہ اس میں اس کے علاوہ اور بھی معاشی خرابیاں اور روحانی تباہ کاریاں پائی جاتی ہیں پہلے اس کو سمجھئے کہ سود کے ذریعہ ملت کی تباہی اور خاص افراد کا نفع کیونکر ہو سکتا ہے؟ سود و ربا کے مہاجنی اور منسوسودہ طریقہ میں تو ایسا سمجھنا اپنا تھا کہ عام ملت کا ضرر اور کسی خاص فرد کا نفع ہر موٹی عقل دلے کو بھی سمجھ میں آجاتا تھا، مگر آجکل کی نئی روشنی جس کو نئی اندھیری کہنا زیادہ موزوں ہے، اس نے جس طرح شراب کو مشینوں میں صاف کر کے چوری اور ڈاکہ کی نئی نئی صورتیں ایجاد کر کے بدکاری و بے حیائی کے نئے نئے ڈھنگ نکال کر کے سب کو ایسا ہمدرد بنایا ہے کہ سطحی نظروں کو اس کی اندرونی خرابیاں نظر نہ آئیں، اسی طرح ربا اور سود کے لئے بجائے شخصی دکانوں کے مشترک کمپنیاں بنائی ہیں جن کو بینک کہا جاتا ہے، اور اب دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے یہ بتلایا جاتا ہے کہ ربا کے اس جدید طریقہ سے پوری ملت کا فائدہ ہے، کیونکہ عوام جو اپنے روپے سے تجارت کرنا نہیں جانتے یا قلت سرمایہ کی بناء پر نہیں کر سکتے ان سب کا روپیہ بینکوں میں جمع ہو کر ان میں سے ہر ایک کو گو قلیل ہی بھی کچھ نہ کچھ نفع سود کے نام سے مل جاتا ہے، اور بڑے تاجروں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ بینکوں سے سودی قرض لے کر بڑی تجارت کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس طرح سود ایسی مبارک چیز بن گئی کہ

ساری ملت کے افراد کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے۔

لیکن ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو یہ وہ اہل مندرجہ ہے جو شراب کی گندی بھٹیوں کو صاف ستھرے بوتلوں میں اور عصمت مندرجہ کے اڈوں کو سنیاءوں اور شبیہ نگاروں میں تبدیل کر کے زہر کو تریاق اور مضر کو مفید بنا کر دکھلانے کے لئے عمل میں لاتی گئی ہے اور جس طرح اہل بصیرت پر یہ بات روشن ہے کہ اخلاق سوز جرائم کو جدید غلات پہنانے کا نتیجہ اس کے سوا نہیں کہ یہ جرائم پہلے سے زیادہ ہو گئے، اور ان کا زہر پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا، اسی طرح سودور باکی اس نئی شکل نے سود کے چند آنے فی سیکڑہ عوام کے منہ کو لگا کر ایک طرف ان کو اپنے جرم کا شریک کر لیا، اور دوسری طرف اپنے لئے اس جرم کے ارتکاب کا غیر محدود میدان منسرا ہم کر لیا۔

کون نہیں جانتا کہ یہ چند آنے فی سیکڑہ کا سود جو سیونگ بینکوں اور ڈاکخانہ جات سے لوگوں کو ملتا ہے یہ کسی طرح ان کے معاش کی کفالت نہیں کر سکتا، اس لئے وہ مجبور ہیں کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی مزدوری یا ملازمت تلاش کریں، تجارت کی طرف اول تو ان کی نظر خود نہیں جاتی، اور اگر کسی کو اس طرف توجہ بھی ہو جائے تو پوری ملت کا سرمایہ بینکوں میں جمع ہو کر جو صورت تجارت کی بن گئی ہے اس میں کسی چھوٹے سرمایہ والے کو داخل ہونا خود اپنی موت کو دعوت دینے سے کم نہیں، کیونکہ بینک کوئی بڑا سرمایہ قرض پر صرف اسی کو دے سکتے ہیں جس کی بازار میں اپنی ساکھ ہو اور بڑا کاروبار ہو، دس لاکھ کے مالک کو ایک کروڑ قرض مل سکتا ہے، وہ اپنے ذاتی روپے کی نسبت دس گنا زیادہ کی تجارت چلا سکتا ہو اور تھوڑے سرمایہ والے کی نہ کوئی ساکھ ہوتی ہے نہ بینک اس پر اعتماد کرتے ہیں، کہ ان کو دس گنا زیادہ قرض دیدیں، ایک ہزار کی مالیت والے کو دس ہزار تو کیا ایک ہزار ملنا بھی مشکل ہے، اور جب کہ ایک شخص جو ایک لاکھ کی ملکیت رکھتا ہو تو لاکھ بینک کا سرمایہ لگا کر دس لاکھ کی تجارت کرتا ہے، اور قرض کر لیتے کہ اس کو ایک روپیہ فی صد نفع ہوتا ہے تو گویا اس کو اپنے ایک لاکھ پر دس فی صد نفع ہوا، اس کے بالمقابل اگر کوئی شخص صرف اپنے ذاتی روپے سے ایک لاکھ کی تجارت کرتا ہے اس کو ایک لاکھ پر صرف ایک ہی فی صد کا نفع ہوگا، جو اس کے مزدوری اخراجات کے لئے بھی کافی نہ ہوں گے، اُدھر مارکیٹ میں بڑے سرمایہ والے کو تمام سانا جس نفع اور رعایت کے ساتھ ملتا ہے وہ چھوٹے سرمایہ والے کو میسر نہیں آسکتا، اس لئے چھوٹے سرمایہ والا مفلوج اور محتاج ہو کر رہ جاتا ہے، اور اگر اس کی شامت آتی، اور اس نے بھی کسی ایسی تجارت میں ہاتھ ڈال دیا تو بڑے سرمایہ والا اس کو اپنی خدائی کا شریک

سمجھ کر کچھ اپنی گرہ سے نقصان اٹھا کر بھی بازار کو ایسا ڈاؤن کر دیتا ہے کہ چھوٹے سرمایہ والا اصل اور نفع سب ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تجارت صرف ان چند افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے جو بڑے سرمایہ دار ہیں۔

۱۔ یہ ملت پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ ساری ملت اصلی تجارت سے محروم ہو کر صرف بڑے سرمایہ داروں کی دست نگر بن جائے، ان کو وہ جتنا نفع دینا چاہیں بخشش کے طور پر دیدیں۔

۲۔ اور دوسرا اس سے بڑا نقصان جس کی زد میں پورا ملک آ جاتا ہے یہ ہے کہ ایسی صورت میں اشیاء کے نرخ پران بڑے سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے، وہ گراں سے گراں فروخت کر کے اپنی گرہ مضبوط کر لیتے اور پوری ملت کی گرہیں کھول دیتے ہیں، اور قیمت بڑھانے کے لئے جب چاہیں مال کی فروخت بند کر دیتے ہیں، اگر ساری ملت کا سرمایہ بینکوں کے ذریعہ کچھ کران خود غرض لوگوں کی پردریش نہ کی جاتی اور یہ مجبور ہوتے کہ صرف اپنے ذاتی سرمایہ سے تجارت کریں، تو نہ چھوٹے سرمایہ والوں کو یہ مصیبت پیش آتی، اور نہ یہ خود غرض درندے پوری تجارت کے ناخدا بننے، چھوٹے سرمایہ والوں کی تجارت کے منافع سامنے آتے تو دوسروں کا حوصلہ بڑھتا، تجارت کا کاروبار عام ہوتا، جس سے ہر ایک کا اسٹاٹ ملحد ہوتا، جس سے ہزاروں حاجتمندوں کی روزی پیدا ہوتی، اور تجارتی نفع بھی عام ہوتا، اور اشیاء کی ارزانی پر بھی یقینی اثر پڑتا، کیونکہ باہمی مقابلہ (کمپٹیشن) ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی اس پر تیار ہوتا ہے کہ اپنا نفع کم کرے، اس عیارانہ طریق کار نے پوری قوم کو ایک ہلک بیماری لگا دی اور دوسرے اس کی ذہنیست خراب کر دی کہ اس بیماری ہی کو شفا کچھو ۳۔ بینکوں کے سود سے ملت کا ایک تیسرا معاشی نقصان اور دیکھتے کہ جس شخص کا سرمایہ دس ہزار ہے، اور وہ بینک سے سودی قرض لے کر ایک لاکھ کا بیوپار کرتا ہے، اگر کہیں اس کا سرمایہ ڈوب گیا، اور تجارت میں اس کو نقصان پہنچ گیا، اور وہ دیوالیہ ہو گیا، تو غور کیجئے کہ نقصان صرف دس فی صد تو اس پر پڑا، باقی نوے فی صد نقصان پوری ملت کا ہوا، جن کا سرمایہ بینک سے لیکر اس نے لگایا تھا، اگر بینک نے دیوالیہ کے نقصان کو سر دست خود ہی برداشت کر لیا، تو یہ ظاہر ہے کہ بینک تو قوم کی جیب ہے، اس کا نقصان انجام کار قوم پر عائد ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ سرمایہ دار کو جب تک نفع ہوتا رہا تو نفع کا وہ تہنہ مالک تھا، اس میں ملت کے لئے کچھ نہ تھا یا برائے نام تھا، اور جب نقصان آیا تو نوے فی صد نقصان پوری ملت پر پڑ گیا۔

۴۔ سود سے ایک معاشی نقصان یہ بھی ہے کہ سود خور جب گھاسے میں آجائے تو پھر وہ پینے کے قابل نہیں رہتا، کیونکہ اتنا سرمایہ تو تھا نہیں جس کے نقصان کو یہ برداشت کر سکے، نقصان کے وقت اس پر دوسری مصیبت ہوتی ہے، ایک تو اپنا نفع اور سرمایہ گیا، اور دوسرے سے بنگ کے قرض میں دب گیا، جس کی ادائیگی کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اور بے سود کی تجارت میں اگر سارا سرمایہ بھی کسی وقت چلا جائے تو فقیر ہی ہوگا مقرر قرض تو نہ ہوگا۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان میں روٹی کے بیوپار پر شراعتی ارشاد کے مطابق محاق کی آفت آئی اور حکومت نے کروڑوں روپے کا نقصان اٹھا کر تاجروں کو سنبھالا، مگر کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ وہ سب سود کی خواست تھی، کیونکہ کاٹن کے تاجروں نے اس کا روبا میں بیشتر سرمایہ بینکوں کا لگایا ہوا تھا، اپنا سرمایہ برائے نام تھا، بقضائے خداوندی روٹی کا بازار اتنا گر گیا کہ اس کے دام ایک سو بچیس سے گر کر دس پر آگئے، تاجر اس قابل نہ رہے کہ بینکوں میں مارجن پوری کرنے کے لئے روپیہ واپس دیں، مجبور ہو کر مارکیٹ بند کر دی گئی، اور حکومت سے فریاد کی، حکومت نے دس کے بجائے نوے کے دام لگا کر خود مال خریدا اور کروڑوں روپیہ کا نقصان برداشت کر کے ان تاجروں کو دیوالیہ ہونے سے بچالیا، حکومت کا روپیہ کس کا تھا وہی بچاری غریب ملت و قوم کا، غرض بینکوں کے کاروبار کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ پوری ملت کے سرمایہ سے چند افراد نفع اٹھاتے ہیں اور جہاں نقصان ہو جاتا ہے تو وہ پوری قوم و ملت پر پڑے۔

خوش پروری اور ملت کشی کی ایک اور حال

سود و ربا کی ملت کشی اور افراد پروری کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس کے ساتھ ایک اور ہوشیاری اور چالاک دیکھئے کہ سود خوروں نے جب اپنے تجربہ سے بھی اس چیمز کو محسوس کیا جو قرآن کا ارشاد ہے **يَمْحُجُّ اللَّهُ ذُنُوبَ بَعْضِ الْبَازِئِرِ** یعنی سود کے مال میں محاق کی آفتیں آنا لازمی ہیں، جس کے نتیجے میں دیوالیہ ہونا پڑتا ہے، تو ان آفتوں سے بچنے کے لئے دو مستقل ادارے بنائے، ایک بیمہ (انشورنس) دوسرے سسٹم کا بازار، کیونکہ تجارت میں نقصان آنے کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، ایک کوئی آسانی آفت کہ ہمارا ڈوب گیا، یا جل گیا یا کوئی اور ایسی ہی آفت آگئی، دوسرے کہ سامان کا نرخ اس کی قیمت خرید سے کم ہو گیا، ان دونوں صورتوں میں لگا ہوا سرمایہ چونکہ اپنا نہیں بلکہ ملت کا مشترکہ سرمایہ ہے، اس لئے ان کا نقصان کم اور ملت کا زیادہ ہے، مگر انھوں نے اس تھوڑے سے نقصان کو بھی ملت ہی کے سر پر

ڈالنے کے لئے، ایک طرف تو بیمہ کمپنیاں کھولیں، جس میں بینکوں کی طرح پوری ملت کا سرمایہ جمع رہتا ہے، اور جب کسی سماوی آفت سے ان سود خوروں پر کوئی نقصان آتا ہے تو بیمہ کے ذریعہ وہ پورا نقصان بھی ملت کے مشترک سرمایہ پر ڈال دیتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ بیمہ کمپنیاں خدا کی رحمت ہیں، ڈوبتے کو سہارا دیتی ہیں، لیکن انکی حقیقت کو دیکھیں اور سمجھیں تو یہاں بھی وہی فریب ہو کہ ناگہانی حوادث کے وقت امداد کا لالچ دے کر ملت کا سرمایہ جمع کیا گیا، مگر اس سے بھاری رقموں کا فائدہ تو صرف اونچے سرمایہ داروں کو ملتا ہے جو بعض اوقات خود ہی اپنی منسوودہ موٹر کو آگ لگا کر یا کہیں ٹکرا کر اور بیمہ کمپنی سے رقم لے کر نئی موٹر خریدنا چاہتے ہیں، تنو میں ایک رو کوئی غریب بھی ایسا ہوتا ہوگا جس کو ناگہانی موت کے سبب کچھ پیسے مل جاویں۔

اور دوسری قسم یعنی نرخ گھٹ جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے سسٹم کا بازار گرم کیا، اس سسٹم کے ذریعہ تمام افراد ملت کو متاثر کیا گیا، تاکہ جو نقصان ان کو قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے ہونے والا تھا وہ پھر ملت پر منتقل کر دیں۔

اس مختصر بیان میں آپ نے اتنا سمجھ لیا ہوگا کہ بینکوں کا سود اور اس کی تجارت پوری انسانیت کے لئے فقر و فاقہ اور معاشی تنگدستی کا موجب ہے، ہاں چند مال دار افراد کے اموال میں اس سے اضافہ بھی ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت بگڑتی ہے اور چند افراد بگڑتے ہیں، اور ملک کا سرمایہ سمٹ کر ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے، عام حکومتوں نے اس عظیم مفسدہ کو محسوس کیا، لیکن اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ بڑے سرمایہ داروں کے لئے انکم ٹیکس کی شرح بڑھا دی یہاں تک کہ آخری شرح ایک روپیہ میں سے ساڑھے پندرہ آنے کر دی گئی، تاکہ سرمایہ ان کے پاس سے منتقل ہو کر پھر قومی خزانے میں پہنچ جائے۔

لیکن سب کو معلوم ہے کہ اس قانون کے نتیجے میں عام طور پر کارخانوں کے حساب فزنی اور جعل بننے لگے، اور بہت سا سرمایہ حکومت سے چھپانے کے لئے پھر دفتروں کی شکل میں منتقل ہونے لگا۔

خلاصہ یہ ہو کہ دولت سمٹ کر قوم کے چند افراد میں مقید ہو جانے کی انتہائی معتر ملک کے معاشی اور اقتصادی حالات کے لئے سب پر واضح ہے، اسی لئے انکم ٹیکس کی شرح اتنی زیادہ بڑھائی جاتی ہے، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ یہ تدبیر مرض کا علاج ثابت نہ ہوتی، جس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ مرض کے اصلی سبب کو نہیں پہچانایا گیا، اس لئے علاج کی مثال یہ ہوگئی کہ ۵

در بہ بست و دشمن اندر حسانہ بود

دولت بڑے سرمایہ داروں کی طرف سمنے کا پہلی سبب صرف سودی کاروبار اور قومی سرمایہ سے خاص خاص انفرادی بے جانف اندوزی ہے، جب تک اسلام کی تعلیمات کے مطابق اسکو بند نہ کیا جائے اور اس کاروبار نہ دیا جائے کہ ہر شخص صرف اپنے سرمایہ سے تجارت کرے اس وقت تک اس مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب | اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بینکوں کے ذریعہ پوری قوم کا سرمایہ جمع ہو کر کچھ نہ کچھ تو فائدہ عوام کو بھی ملا، وگرنہ ہی قلیل ہو اور بڑے سرمایہ داروں نے اس سے زیادہ فائدہ حاصل کر لیا ہو، لیکن اگر بینکوں میں سرمایہ جمع کرنے کا طریقہ نہ ہو تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو پہلے زمانہ میں تھا، کہ لوگوں کا سرمایہ دفینوں اور خزیں کی شکل میں زمین کے اندر رہا کرتا تھا، جس سے نہ ان کو فائدہ ہوگا نہ کسی دوسرے شخص کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح سود کو حرام قرار دے کر اس کا دروازہ بند کیا ہے کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر خاص خاص سرمایہ داروں میں محدود ہو جائے اسی طرح زکوٰۃ کا فریضہ سرمایہ کی صورت میں عائد کر کے ہر مال دار کو اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو منجھد حالت میں نہ رکھے، بلکہ تجارت اور کاروبار میں لگائے، کیونکہ زکوٰۃ سرگٹیکس کی صورت میں ہونے کی بنا پر اگر کوئی شخص اپنا روپیہ یا سونا چاندی دفینہ کر کے رکھتا ہے تو ہر سال اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکلتے نکلتے سرمایہ فنا ہو جائے گا، اس لئے ہر سمجھدار انسان اس پر مجبور ہوگا کہ سرمایہ کو کام میں لگا کر اس سے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے، اور اسی نفع میں سے زکوٰۃ ادا کرے۔

فریضہ زکوٰۃ ایک حیثیت | اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فریضہ زکوٰۃ ادا کرنے میں جیسے یہ عظیم الشان فائدہ معنوی ہے کہ قوم کے فقراء و مساکین کی امداد ہو، اسی طرح مسلمانوں کے معاشی حالات کو درست کرنے کے لئے بھی یہ فریضہ تجارت کی ترغیب کا ایک بہترین ذریعہ ہے کیونکہ ہر انسان جب یہ دیکھے گا کہ نقد سرمایہ کو بند رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ نفع تو کچھ ہوا نہیں، اور سال کے ختم پر چالیسواں حصہ کم ہو گیا، تو ضرور اس کو اس طرف توجہ کرنا پڑے گی کہ اس مال کو کسی تجارت پر لگائے، اور دوسری طرف چونکہ سود ہے، روپیہ چلانا حرام ٹھہرا تو تجارت کی یہ صورت نہ رہے گی، کہ لاکھوں انسانوں کے سرمایہ سے صرف ایک انسان تجارت کرے بلکہ ہر مالدار خود تجارت میں آنے کی فکر کرے گا، اور جب کہ بڑے سرمایہ دار بھی صرف اپنے

سرمایہ سے تجارت کریں گے تو چھوٹے سرمایہ داروں کو تجارت میں وہ مشکلات پیش نہ آئیں گی جو بینکوں سے سودی روپیہ لے کر بڑی تجارت چلانے کی صورت میں پیش آتی ہیں، اس طرح پورے ملک میں تجارت اور اس کے منافع عام ہوں گے، اور اس کے نتیجہ میں ملک کے غریب و فقراء کو فائدہ پہنچے گا۔

سودی روہانی بیماریاں | یہاں تک سود کی معاشی اور اقتصادی تباہ کاری کا ذکر تھا اب سنئے کہ سودی کاروبار انسان کے اخلاق اور روحانی کیفیات پر کیسے خراب اثرات ڈالتا ہے۔

۱۔ انسانی اخلاق میں سب سے بڑا جو ہر ایشیاد و سخاوت کا ہے کہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچانے کا جذبہ ہو، سود کے کاروبار کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ فنا ہو جاتا ہے، سود خور اپنے پاس سے کسی کو نفع پہنچانا تو کیا دوسرے کو اپنی کوشش اور اپنے سرمایہ سے اپنے برابر آتا نہیں دیکھ سکتا۔

۲۔ وہ مصیبت زدہ پر رحم کھانے کے بجائے اس کی مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتا ہے۔

۳۔ سود خوری کے نتیجہ میں مال کی حرص اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مست ہو کر اپنے بھلے اور بڑے کو بھی نہیں پہچانتا، اس کے انجام بد سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔

کیا سود کے بغیر کوئی ارباب کی حقیقت اور اس کی دینی و دنیوی خرابیوں کا بیان کسی قدر تفصیل سے آچکا ہے، اب ہمیں یہ تجارت نہیں چل سکتی؟ بحث یہ باقی ہو کر باقی معاشی اور روحانی خرابیاں اور قرآن و سنت میں اس کی شدید حرمت و ممانعت تو واضح ہو گئی، لیکن موجودہ دور میں جبکہ رہا ہی تجارت کا رکن اعظم بنا ہوا ہے، ساری دنیا کے کاروبار اسی پر چل رہے ہیں، اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہو؟ بینک سسٹم کو ترک کر دینا اس زمانہ میں گویا تجارت کو بند کر دینا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی مرض عام ہو کر دوبارہ کی صورت اختیار کر لے تو علاج معالجہ دشوار ضرور ہو جاتا ہے، لیکن بے کار نہیں ہوتا، اصلاح حال کی کوششیں انجام کار کامیاب ہوتی ہیں، البتہ صبر و استقلال اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا یہ بھی ارشاد ہے:

مَّا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ
مِنْ حَرَجٍ ۚ (۲۲:۷۸)
یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی سہی نہیں ڈالی ہے
اس لئے ضرور ہے کہ ربا سے چستاب کا کوئی ایسا راستہ ضرور ہوگا جس میں معاشی اور

اقتصادی نقصان بھی نہ ہوا، اندرونی اور بیرونی تجارت کے دروازے بھی بند نہ ہوں اور با سے نجات بھی ہو جائے۔

اس میں پہلی بات تو یہی ہے کہ سطحی نظر میں بینکنگ کے موجودہ اصول کو دیکھتے ہوئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینک سسٹم کا مدار ہی سود پر ہے، اس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لیکن یہ خیال قطعاً صحیح نہیں رہا کے بغیر بھی بینک سسٹم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، بلکہ اس سے بہتر اور نافع و مفید صورت میں آسکتا ہے، البتہ اس کے لئے ضرورت ہو کہ کچھ حضرات ماہرین شریعت اور کچھ ماہرین بینک کے مشورہ اور تعاون سے اس کے اصول از سر نو تجویز کریں، تو کامیابی کچھ دور نہیں، اور جس دن بینک سسٹم شرعی اصول پر آگیا تو انشاء اللہ دنیا دیکھ لے گی کہ اس میں پوری قوم و ملت کی کیسی فلاح ہے، ان اصول و قواعد کی تشریح کا یہ موقع نہیں، جن کی بناء پر بینک سسٹم کو بغیر با کے چلایا جاسکتا ہے۔

ربا اور سود کی ایک ضرورت کچھ تجارتی اغراض کے لئے ہوتی ہے اس کا انتظام تو بینک کے موجودہ اصول میں ترمیم کے ذریعہ ہو جائے گا، اور دوسری ضرورت سود و ربا میں مبتلا ہونے کی فقیر و محتاج لوگوں کی ہنگامی اور وقتی ضرورتیں ہوا کرتی ہیں، اس کا بہترین علاج اسلام میں پہلے سے بصورت زکوٰۃ و صدقات واجبہ موجود ہے، لیکن دین اور علم دین سے بیکری اور بے پردائی کا نتیجہ جو جس آجکل نظام زکوٰۃ بھی معطل کر دیا ہے، بے شمار مسلمان ہیں جو نماز کی طرح زکوٰۃ کے پاس نہیں جاتے، اور جو لوگ نکالتے بھی ہیں ان میں اکثر بڑے سرمایہ والے حضرات حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور جو لوگ پوری زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں تو وہ بس زکوٰۃ کا نکالنا ہی جانتے ہیں کہ اپنی جیب سے نکال دیں، حالانکہ حکیم الہی زکوٰۃ کے نکالنے کا نہیں، بلکہ ادا کرنے کا ہے اور ادا کرنا جب صحیح ہو سکتا ہے جب اس کے مستحقین کو پہنچا کر ان کو مالکا نہ قبضہ دیدیا جائے، اب غور کیجئے کہ ایسے مسلمان کتنے ہیں جو مستحقین کو تلاش کرنے کی فکر کریں، پھر ان کو پہنچانے کا اہتمام کریں، مسلمان قوم کتنی ہی کم سرمایہ سہی، لیکن اگر ہر مسلمان جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ زکوٰۃ پوری ادا کرے، اور ادا کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کرے کہ مستحقین کو پہنچائے اور ادا کرنے کا اہتمام کرے، تو یقیناً کسی مسلمان کو اس کی ضرورت نہ رہے، کہ وہ قرض کی ضرورت سے سود و ربا میں مبتلا ہو، اور اگر شرعی قاعدہ کے مطابق

ماہ احقر نے چند علماء کے مشورے سے سود و بیکاری کا مسودہ وضع ہوا تھا، مگر کچھ دبا تھا اور بیکاری کے بعض ماہرین نے موجودہ دور میں قابل عمل تسلیم بھی کر لیا تھا، اور بعض حضرات نے اس کو شروع بھی کرنا چاہا مگر ابھی تک عام نا جروں کی توجہ اس طرف ہوئی ہے بسبب اور حکومت کی طرف اس کو منظور حال نہ ہونے کے سبب چل نہیں سکا، فانی مثلاً ہشتکیؒ

اسلامی حکومت عادلہ بن جائے اور اس کے تحت شرعی بیت المال قائم ہو جائے، اور تمام مسلمانوں کے اموال ظاہر کی زکوٰۃ اس میں جمع ہوا کرے تو اس بیت المال سے ہر ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، اور کسی بڑی رقم کی ضرورت پڑ جائے تو بطور قرض بھی بغیر سود کے دیا جاسکتا ہے، اور اس طرح بیکار پھرنے والوں کو چھوٹی و کانیں کر اگر یا کسی صنعت میں لگا کر بھی کام میں لگایا جاسکتا ہے، کسی یورپین ماہر نے صحیح کہا کہ مسلمانوں کا نظام زکوٰۃ ایسی چیز ہے کہ اگر مسلمان اس کے پابند ہو جائیں تو اس قوم میں کوئی مفلس اور مصیبت زدہ نظر نہ آئے۔

الغرض اس زمانے میں سود و ربا کے معاملات و با کی طرح پھیل جانے سے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ موجودہ زمانہ میں سود کا کاروبار چھوڑ دینا معاش و اقتصادی خود کشی کے مرادف ہے، اور اس زمانہ کا آدمی سودی کاروبار کرنے میں معذور ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک پوری قوم یا اس کی کوئی معتد بہ جماعت یا کوئی اسلامی حکومت پوری توجہ کے ساتھ اس کام کا ہتھ نہ کرے افراد و احاد کے لئے دشواری ضرور ہے، مگر معذور پھر بھی نہیں کہا جاسکتا۔

اس وقت ہمارے اس بیان کے دو مقصد ہیں، اول یہ کہ مسلمانوں کی جماعتیں اور حکومتیں جو اس کام کو صحیح طور پر کر سکتی ہیں اس طرف متوجہ ہوں اور مسلمانوں کو بلکہ پوری دنیا کو سود کے مخوس اثرات سے نجات دلائیں۔

دوسرے یہ کہ کم از کم علم سب کا صحیح ہو جائے، مرض کو مرض تو سمجھنے لگیں، حرام کو حلال سمجھنے کا دوسرا گناہ جو پہلے گناہ سے زیادہ عظیم ہے، کم از کم اس کے تو مرتکب نہ ہوں علی گناہ میں کچھ نہ کچھ ظاہری فائدہ بھی ہے، لیکن یہ دوسرا علی اور عقیدہ کا گناہ کہ اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، پہلے سے عظیم تر بھی ہے، اور لغو و فضول بھی، کیونکہ سود کو حرام سمجھنے اور اپنے گناہ کا اعتراف کرنے میں تو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہوتا، کوئی تجارت بھی بند نہیں ہوتی، ہاں اعتراف جرم کا نتیجہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جانے سے اس سے بچنے کی تدبیر سوچیں۔

اس وقت اسی مقصد کے پیش نظر آخر میں چند روایات حدیث اور ارشاد است رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کرتا ہوں جو اپنی آیات قرآنی کا بیان ہے جن میں سود و ربا کی شدید ممانعت اور اس پر سخت عذاب کی وعیدیں آتی ہیں، تاکہ گناہ کے گناہ ہونے کا احساس تو بیدار ہو، اور اس سے بچنے کی فکر ہو، کم از کم یہ صورت تو نہ رہے کہ

اس حرام کو حلال بنا کر ایک گناہ کے دو گناہ بنالیں، اور بڑے بڑے صالح دیندار مسلمان جو رات کو ہتھکڑیاں لگا کر اللہ میں گزاریں صبح جب دکان یا کارخانہ میں پہنچیں تو انھیں یہ خیال بھی نہ آئے کہ ہم سود و قمار کے معاملات میں مبتلا ہو کر کچھ گناہ کر رہے ہیں۔

سود کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

① رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات ہلک چیزوں سے بچو! صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا، ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ (عبادت میں یا اس کی مخصوص صفات میں) کسی غیر اللہ کو شریک کرنا، دوسرے چادو کرنا، تیسرے کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، چوتھے سود کھانا، پانچویں یتیم کا مال کھانا، چھٹے جہاد کے وقت میدان سے بھاگنا، ساتویں کسی پاک دامن عورت پر ہتھ باندھنا (یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں ہے)

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے کج رات دو شخصوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے، اور مجھے بیت المقدس تک لے گئے، پھر ہم آگے چلے تو ایک خون کی ہنردیکھی جس کے اندر ایک آدمی کھڑا ہوا ہے، اور دوسرا آدمی اس کے کنارہ پر کھڑا ہے، جب یہ ہنر والا آدمی اس سے باہر آنا چاہتا ہے تو کنارہ والا آدمی اس کے منہ پر تھماتا ہے، جس کی چوٹ سے بھاگ کر پھر وہ وہیں چلا جاتا ہے جہاں کھڑا تھا، پھر وہ نکلنے کا ارادہ کرتا ہے، تو پھر یہ کنارہ والا آدمی بھی معاملہ کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ان دونوں ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ انھوں نے بتلایا کہ خون کی ہنر میں قید کیا ہوا آدمی سود کھانے والا اپنے عمل کی سزا پا رہا ہے (یہ حدیث صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے)

③ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے پر بھی لعنت فرمائی، اور سود دینے والے پر بھی، اور بعض روایات میں سودی معاملہ پر گواہی دینے والے اور اس کا وثیقہ لکھنے والے پر بھی لعنت آئی ہے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں، اور بعض روایات میں شاہد کا تب پر لعنت اس صورت میں ہے جبکہ ان کو اس کا علم ہو کہ یہ سود کا معاملہ ہے۔

④ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چار آدمی ایسے ہیں کہ ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ ان کو جنت میں نہ داخل کرے، اور جنت کی نعمت

نہ پہنچنے دے، وہ چار یہ ہیں، شراب پیئے کا عادی اور سود کھانے والا اور یتیم کا مال ناحق کھانے والا اور اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی جو سود کا ایک درہم کھاتا ہے وہ چھتیس مرتبہ بدکاری کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جو گوشت مال حرام سے بنا ہوا اس کے لئے آگ ہی زیادہ مستحق ہے، اسی کے ساتھ بعض روایات میں ہے کہ کسی ملن کی آبروریزی سود سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ (یہ روایت مسند احمد طبرانی وغیرہ میں ہے)

⑥ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ پھل کو قابل استعمال ہونے سے پہلے فروخت کیا جائے، اور نہ فرمایا کہ جب کسی بستی میں بدکاری اور سود کا کاروبار پھیل جائے تو اس نے اللہ تعالیٰ عذاب کو اپنے اوپر دعوت دیدی۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑦ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں سود کے لین دین کا رواج ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ضروریات کی گرانی مسلط کر دیتا ہے، اور جب کسی قوم میں رشوت عام ہو جائے تو دشمنوں کا دعب غلبہ ان پر ہو جاتا ہے (یہ روایت مسند احمد میں ہے)

⑧ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں جب ہم ساتویں آسمان پر پہنچے تو میں نے اپنے اوپر عدد و برق کو دیکھا، اس کے بعد ہم ایک ایسی قوم پر گزرے جن کے پیٹ رہائشی مکانات کی طرح پھولے اور پھیلے ہوئے ہیں، جن میں سانپ بھرے ہیں جو باہر سے نظر آتے ہیں، میں نے جبرئیل امینؑ سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ سود خور ہیں (یہ روایت مسند احمد کی ہے)

⑨ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت بن مالکؓ سے فرمایا کہ ان گناہوں سے بچو جو معاف نہیں کئے جاتے، ان میں سے ایک مال غنیمت کی چوری ہے، اور دوسرے سود کھانا اور طرانی،

⑩ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو تم نے قرض دیا ہو اس کا ہدیہ بھی قبول نہ کرو (ایسا نہ ہو اس نے یہ ہدیہ قرض کے عوض میں دیا ہو، جو سود ہے، اس لئے اس کے ہدیہ قبول کرنے سے بھی حتماً باط چاہئے)

رباہ کی تعریف اور اس کی حقیقت اور اس کی دنیوی تباہ کاری کے متعلق قرآن مجید کی سات آیتیں اور احادیث نبویہ کے دس ارشادات اس جگہ بیان ہو چکے ہیں، سوچنے سمجھنے والے مسلمان کیلئے اتنا کافی ہے، اور اس مسئلے کے باقی ماندہ پہلوؤں پر بحث اور مکمل تحقیق کے لئے احقر کی ایک مستقل کتاب بنام (مسئلہ سود) شائع ہو چکی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا آتَاكُمُ الْبَيْتُ بِدِينٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّتَمٍّ فَاسْتَبُوهُ ۖ
 اے ایمان والو جب تم آپس میں معاملہ کرو اُدھار کا کسی وقت مقرر تک تو اس کو لکھ لیا کرو
 وَلْيَكْتُب بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا
 اور چاہئے کہ لکھ دے ہمارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف اور انکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ لکھ دیوے جیسا
 عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ
 سکھایا اسکو اللہ نے سوا سکھو چاہئے کہ لکھ دے اور بتلا جائدہ شخص کہ جس پر قرض ہو اور ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے
 وَلَا يَبْخَسَ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ
 اور کم نہ کرے اس میں سے کچھ پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہو بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا
 لَا يَسْطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ لِیُّهِ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِیدَیْنِ
 آپ نہیں بتلا سکتا تو بتلا دے کار گزار اس کا انصاف اور گواہ کرد دو شاہد اپنے
 مِنْ بَرِّ جَالِکُمْ ۖ فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتُهُ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ
 مردوں میں سے پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند
 مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ وَلَا
 کرتے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے تو یاد دلا دے اس کو دوسری اور انکار
 يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا وَلَا تَسْمَؤْا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ
 نہ کریں گواہ جس وقت بلائے جاویں اور کالی نہ کر داس کے لکھنے سے چھوٹا ہو معاملہ یا
 کَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ
 بڑا اس کی میعاد تک اس میں پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت درست رکھنے والا ہر گواہی کو
 الْأَقْرَبُ تَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ
 اور نزدیک ہر کہ شہر میں نہ چڑھ کر سودا ہو انھوں ہاتھ لینے دیتے ہو اس کو آپس میں تو تم پر
 فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهَدُوا إِذَا أَتَا بِعْتُمْ مِ
 کچھ گناہ نہیں اگر اس کو نہ لکھو اور گواہ کر لیا کرو جب تم سودا کرو،

وَلَا يُضَارَسَ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ فَسَوْفٌ بِكُمْ
 اور نقصان نہ کرے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر ایسا کرو تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر
 وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَیَعْلَمَ اللَّهُ شَیْءَ كُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۳۸﴾ وَإِنْ كُنْتُمْ
 اور ڈرتے ہو اللہ سے اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے اور اگر تم
 عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنِ مَقْبُوضَةً ۖ فَإِنْ أَفَانِ بَعْضُكُم
 سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گورد ہاتھ میں رکھنی چاہئے پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے
 بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي فِيهِ إِيْمَانٌ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا
 کا تو چاہئے کہ پورا کرے وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا اپنی امانت کو اور اگر نہ ہو اللہ سے جو رب اس کا اور مت چھپاؤ
 الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِیْمٌ ﴿۳۹﴾
 گواہی کو اور جو شخص اس کو چھپاؤ تو بے شک گنہگار ہو دل اس کا اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے

حُلاصۃ تفسیر

اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو اُدھار کا رخواہ وام اُدھار ہوں یا جو چیز خریدنا ہے
 وہ اُدھار ہو جیسے بیع سلم میں ایک میعاد معین تک (کے لئے) تو اس کی یادداشت و دستاویز
 کو لکھ لیا کرو اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں (جو کوئی لکھنے والا ہو وہ) انصاف کے ساتھ
 لکھے یعنی کسی کی رعایت کر کے مضمون میں کمی بیشی نہ کرے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے
 جیسا کہ خدا نے اس کو دکھنا سکھایا ہے اس کو چاہئے کہ لکھ دیا کرے اور (کاتب کو) وہ شخص
 (بتلا دے اور) لکھو دے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو کیونکہ دستاویز کا حاصل اقرار حق کا ہوتا
 ہے تو جس کے ذمہ حق ہے اسی کا اقرار ضرور پھر (اور) لکھاتے وقت (اللہ تعالیٰ سے جو اس کا
 پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس (حق) میں سے ذرہ برابر (بتلانے میں) کمی نہ کرے پھر جس شخص کے
 ذمہ حق واجب تھا وہ اگر ضعیف العقل (یعنی معتوہ یا مجنون) ہو یا ضعیف البدن (یعنی نابالغ یا
 پیر فرتوت) ہو یا (اور کسی اتفاقی امر سے) خود بیان کرنے کی اور) لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو
 مثلاً گونگا ہے اور لکھنے والا اس کا اشارہ نہیں سمجھتا یا مثلاً دوسرے مالک کا رہنے والا ہو اور
 زبان غیر رکھتا ہے اور لکھنے والا اس کی بولی نہیں سمجھتا تو (ایسی حالت میں) اس کا کارکن

ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوانے اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کر لیا کرو اور شرعاً اصل مدار ثبوت دعویٰ کا یہی گواہ ہیں گو دستاویز نہ ہو، اور خالی دستاویز بدو گواہوں کے لیے معاملات میں حجت اور معتبر نہیں دستاویز بکھنا صرف یادداشت کی آسانی کے لئے رہے کہ اس کا مضمون دیکھ کر اور منکر طبعی طور پر اکثر تمام واقعہ یاد آجاتا ہے، جیسا عنقریب قرآن ہی میں آتا ہے) پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسٹر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنائی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو (اور ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لئے تجویز کی گئیں) تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی (شہادت کے کسی حصہ کو خواہ وہ یا شہادت کے وقت بیان کرنے سے) بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلادے، (اور یاد دلانے کے بعد شہادت کا مضمون محل ہو جائے) اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب (گواہ بننے کے لئے) بلائے جایا کریں (کہ اس میں اعانت ہے اپنے بھائی کی) اور تم اس (دین) کے (بار بار) لکھنے سے آگے مت کرو خواہ وہ (معاملہ دین کا) چھوٹا ہو یا بڑا ہو، یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزا دار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو (اس لئے لکھ ہی لےنا اچھلے) مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام (اور مفرت) نہیں اور اتنا اس میں بھی ضرور کیا کرو کہ اس کے خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو (شاید کل کو کوئی بات نکل آئے مثلاً بائع کہنے لگے کہ مجھ کو دام ہی وصول نہیں ہوئے، یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی، یا مشتری کہنے لگے کہ میں نے تو داپسی کا اختیار بھی لے لیا تھا یا ابھی تو بیع پوری میرے پاس نہیں پہنچی) اور جس طرح ہم نے اوپر کاتب اور گواہ کو منع کیا ہے کہ کتابت اور شہادت سے انکار نہ کریں اسی طرح ہم تم کو بھی تاکید کرتے ہیں کہ تمہاری طرف سے کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو (مثلاً اپنی مصلحت کے لئے ان کی کسی مصلحت میں غلط ڈالاجائے) اور اگر تم ایسا کرو گے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا اور خدا تعالیٰ سے ڈرو اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے وہ مت کرو (اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ) تم کو (احکام مفیدہ کی) تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں (تو وہ) مطیع اور عاصی کو بھی جانتے ہیں ہر ایک کو مناسب جزا دیں گے) اور اگر تم (دین کا معاملہ کرانے کے وقت) کہیں سفر میں ہو اور (دستاویز لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ (سو ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ) دہن رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو (مدیون کی طرف سے صحیح حق کے) قبضہ میں دیدی جائیں اور اگر (ایسے وقت میں بھی) ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو

اور اس لئے رہن کی ضرورت نہ سمجھے، تو جس شخص کا اعتبار کر لیا گیا ہے (یعنی مدیون) اس کو چاہئے کہ دوسرے کا حق (پورا پورا) ادا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے (اور اس کا حق نہ مارے) اور شہادت کا انخفاء مت کر دے اور جو شخص اس کا انخفاء کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں (سو اگر کوئی انخفاء کرے گا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہے سو وہ سزا دیں گے) :

معارف ومسائل

قرض اور ادھار کے لئے اقرارنامہ | آیات مذکورہ میں قانونِ معاملات جن کو آجکل کے قانون
 فحش کی ہدایت اور متعلقہ احکام | میں معاہدات کہا جاتا ہے اس کے اہم اصول کا بیان ہے
 اور اس کے بعد ضابطہ شہادت کے خاص اصول کا ذکر ہے۔

آجکل تو زمانہ لکھنے لکھانے کا ہے، اور تحریر ہی انسان کی زبان کی قائم مقام بن گئی ہے، لیکن آپ چودہ سو سال پہلے زمانہ کی طرف مڑا کر دیکھتے تو اس وقت دنیا کا سب کا رو بار صرف زبانی ہوتا تھا، لکھنے لکھانے اور دستاویز جیسا کرنے کا اصول نہ تھا، سب سے پہلے قرآن نے اس طرف توجہ دلائی اور منسرایا،

إِذَا تَنَافَسْنَا فِي الْأَرْضِ فَاسْتَعِينُوا بِرَبِّكُمْ وَأَقْرِبُوا إِلَيَّ يَوْمَ

اس میں ایک اصول تو یہ بتلا دیا کہ ادھار کے معاملات کی دستاویز لکھنی چاہئے، تاکہ بھول چوک یا انکار کے وقت کام آئے۔

دوسرا مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ ادھار کا معاملہ جب کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے، غیر معین مدت کے لئے ادھار دینا ناجائز نہیں، کیونکہ اس سے جھگڑے فساد کا دروازہ کھلتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ میعاد بھی ایسی معتبر ہونا چاہئے جس میں کوئی ابہام نہ ہو، جہینہ اور تاریخ کے ساتھ معین کی جائے، کوئی مبہم میعاد نہ رکھیں، جیسے کہیسی کھتے کے وقت، کیونکہ وہ موسم کے اختلاف سے آگے پیچھے ہو سکتا ہے، اور چونکہ لکھنا اس زمانے میں عام نہ تھا، اور آج بھی عام ہونے کے بعد دنیا کی بیشتر آبادی دیہی ہے جو لکھنا نہیں جانتی تو یہ ممکن تھا کہ لکھنے والا کچھ کا کچھ لکھ دے جس سے کسی کا نفع اور کسی کا نقصان ہو جائے، اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَلْيَكُنْ بِبَيْنِكُمْ الْإِخْوَانُ بِالْعَدْلِ، یعنی یہ ضروری ہے کہ تمہارے درمیان کوئی کھٹے

والا انصاف کے ساتھ لکھے۔

اس میں ایک تو اس طرف ہدایت کی گئی کہ کاتب کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو، بلکہ غیر جانبدار ہو، تاکہ کسی کو مشبہ اور غلبان نہ رہے، دوسرے کاتب کو ہدایت کی گئی کہ انصاف کے ساتھ لکھے، دوسرے کے فانی نفع کے لئے اپنا دائمی نقصان نہ کرے، اس کے بعد کاتب کو اس کی ہدایت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ ہنر دیا ہے کہ وہ کچھ لکھ سکتا ہے اس کا شکر ادا یہ ہے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔

اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی کتابت کس کی طرف سے ہو تو فرمایا: **وَلْيُسْئَلْ اَلَّذِي عَلَيْهِ الْبَيْعُ**، یعنی لکھوادے وہ آدمی جس کے ذمہ حق ہے، مثلاً سزا خرید اور قیمت کا ادھار کیا تو جس شخص کے ذمہ ادھار ہے وہ دستاویز کا مضمون لکھوانے کیونکہ یہ اس کی طرف سے اقرار نامہ ہوگا، اور لکھوانے میں بھی یہ احتمال تھا کہ کوئی کمی بیشی کر دے، اس لئے فرمایا: **وَلَا يَنْتَقِصُ مِنْهُ شَيْئًا**، یعنی اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا ہے اور حق کے لکھوانے میں ذرہ برابر کمی نہ کرے، معاملات میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص پر حق ماند ہر وہ خیف لعل یا سٹھیا ہوا بوڑھا یا نابالغ بچہ یا گویا ہو یا کوئی دوسری زبان بولنے والا ہو جس کو کاتب نہیں سمجھتا، اس لئے دستاویز لکھوانے پر اس کو قدرت نہیں ہوتی اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کی طرف سے ان کا دلی لکھوادے مجنون اور نابالغ کی طرف سے تو دلی کا ہونا ظاہر ہے کہ ان کے سائے معاملات دلی ہی کی معرفت ہوا کرتے ہیں، اور اگر گئے یا دوسری زبان بولنے والے کا دلی بھی یہ کام کر سکتا ہے، اور اگر وہ کسی کو اپنا وکیل بنائے تو بھی ہو سکتا ہے، قرآن میں اس جگہ لفظ دلی دونوں معنی پر حاوی ہے۔

ضابطہ شہادت کے یہاں تک معاملات میں دستاویز لکھنے اور لکھوانے کے اہم اصول کا بیان چند اہم اصول تھا آگے یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی صرف تحریر کو کافی نہ سمجھیں، بلکہ اس پر گواہ بھی بنالیں کہ اگر کسی وقت باہمی نزاع پیش آجائے تو عدالت میں ان گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محض تحریر حجت شرعی نہیں جب تک کہ اس پر شہادت شرعی موجود نہ ہو خالی تحریر پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، آجکل کی عام عدالتوں کا بھی یہی دستور ہے کہ تحریر پر زبانی تصدیق و شہادت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر رہیں۔

گواہی کیلئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہیں اس کے بعد ضابطہ شہادت کے چند اہم اصول بتلائے گئے، مثلاً (۱) گواہ دو مرد یا ایک مرد و دو عورتیں ہونا ضروری ہیں، ایک

اکیلا مرد یا صرف دو عورتیں عام معاملات کی گواہی کے لئے کافی نہیں۔

گواہوں کی شرائط (۲) دوسرے یہ کہ گواہ مسلمان ہوں، لفظ میں ترجمان میں اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے (۳) تیسرے یہ کہ گواہ ثقہ اور عادل ہوں جن کے قول پر اعتماد کیا جاسکے، فاسق و فاجر نہ ہوں، **وَمِنْ ثَمَرَاتِ الْحَقِّ** آئے میں یہ حکم مذکور ہے۔

گواہی دینے سے بعد مذکورہ اس کے بعد لوگوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب ان کو کسی معاملہ میں گواہ انکار کرنا گناہ ہے بنانے کے لئے بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں، کیونکہ شہادت

ہی احیائے حق کا ذریعہ اور جھگڑے چکانے کا طریقہ ہے، اس لئے اس کو اہم قومی خدمت سمجھ کر تکلیف برداشت کریں، اس کے بعد پھر معاملات کی دستاویز لکھنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو لکھنا چاہئے، اس میں اکتائیں نہیں، کیونکہ معاملات کا قلمبند کر لینا انصاف کو قائم رکھنے اور صحیح شہادت دینے اور شک و شبہ سے بچنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے، ہاں اگر کوئی معاملہ دست بدست ہوا دھار نہ ہو اس کو اگر نہ لکھیں تب بھی کچھ حج نہیں مگر اتنا اس میں بھی کیا جائے کہ معاملہ پر گواہ بنالیں کہ شاید کسی وقت فریقین میں کوئی نزاع و اختلاف پیش آجائے، مثلاً بائع کہے کہ قیمت وصول نہیں ہوئی، یا مشتری کہے کہ مجھے مبیعہ پوری وصول نہیں ہوئی، تو اس جھگڑے کے فیصلہ میں شہادت کام آئے گی۔

اسلام میں صلہ و انصاف قائم کرنے کا اہم اصول آیت کے شروع میں لکھنے والوں کو یہ ہدایت کہ گواہوں کو کوئی نقصان یا تکلیف نہ پہنچنے کی گئی ہے کہ وہ لکھنے یا شہادت دینے سے

انکار نہ کریں، تو یہاں یہ احتمال تھا کہ لوگ ان کو پریشان کریں گے، اس لئے آخر آیت میں فرمایا **وَلَا يَصْنَعُ الْكَافِرُ وَلَا الشَّاهِدُ**، یعنی کسی لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچایا جائے، یعنی ایسا نہ کریں کہ اپنی مصلحت اور فائدہ کے لئے ان کی مصلحت اور فائدہ میں خلل ڈالیں پھر فرمایا **وَاِنْ تَفْعَلُوا فَاِنَّكُمْ فُسُوْنَ بِكُفْرِكُمْ**، یعنی اگر تم نے لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچایا تو اس میں تم کو گناہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اسی لئے فقہائے فرمایا کہ اگر لکھنے والا اپنے لکھنے کی مزدوری مانگے یا گواہ اپنی آمد و رفت کا ضروری خرچ طلب کرے تو یہ اس کا حق ہے، اس کو ادا نہ کرنا بھی اس کو نقصان پہنچانے میں داخل اور ناجائز ہے، اسلام نے اپنے نظام عدالت میں جس طرح گواہ کو گواہی دینے پر مجبور کیا ہے اور گواہی پھیلنے کو سخت گناہ قرار دیا ہے، اس طرح اس کا بھی انتظام کیا کہ لوگ گواہی سے بچنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اسی دو طرفہ احتیاط کا یہ اثر تھا کہ ہر معاملہ میں سچے بے غرض گواہ

بل جاتے اور فیصلے جلد اور آسان حق کے مطابق ہو جاتے، آج کی دنیا نے اس فستراکی اصول کو نظر انداز کر دیا ہے تو سارا نظام عدالت برباد ہو گیا، واقعہ کے اصلی اور سچے گواہ ملنا تقریباً مغفور ہو گیا ہر شخص گواہی سے جان چرانے پر مجبور ہو گیا، وجہ یہ کہ جس کا نام گواہی میں آ گیا اگر معاملہ پولیس اور فوجداری کا ہے تو روز وقت بے وقت تھا نیدار صاحب اس کو بلا بھیجے ہیں، اور بعض اوقات گھنٹوں بھٹاتے رکھتے ہیں، دیوانی عدالتوں میں بھی گواہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی مجرم ہے، پھر روز روز مقدمہ کی پیشیاں بدلتی ہیں، تاریخیں لگتی ہیں، گواہ بچا رہ اپنا کاروبار اور مزدوری اور ضروریات چھوڑ کر آنے پر مجبور ہو، ورنہ وارنٹ کے ذریعہ گرفتار کیا جاتا اس لئے کوئی شریف کاروباری آدمی کسی معاملہ کا گواہ بننا اپنے لئے ایک عذاب سمجھے اور مقدمہ اس سے بچنے پر مجبور کر دیا گیا، صرف پیشہ ور گواہ ملتے ہیں، جن کے ہاں جھوٹ سچ میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، فستراک حکیم نے ان بنیادی ضروریات کو اہمیت کے ساتھ بتلا کر ان تمام خرابیوں کا انسداد فرمایا، آیت کے آخر میں ارشاد ہے: **وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ** یعنی ڈرو اللہ سے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اصولی صحیح کی تعلیم دیتا ہے (یہ اس کا احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے، چونکہ اس آیت میں بہت سے احکام آئے ہیں، بعض فقہاء نے اس اہم مسائل فقہی اس آیت سے نکالے ہیں، اور فستراک کریم کی عام عادت ہے کہ قانون بیان کرنے سے آگے اور پیچھے خوب خدا اور خوب روز جزاء دلا کر لوگوں کے ذہنوں کو تعمیل حکم کے لئے آمادہ کرتا ہے، اسی طریقہ کے مطابق اس آیت کا خاتمہ خوب خداوندی پر کیا اور یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، اگر تم کسی ناجائز حیلہ سے بھی کوئی خلافت ورزی کرو گے تو خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

دوسری آیت میں دو اہم مضمون بیان فرمائے گئے، ایک یہ کہ اُدھار کے معاملہ میں اگر کوئی یہ چاہے کہ اعناد کے لئے کوئی چیز گردی رکھ لے تو اس کی بھی اجازت ہے، مگر اس میں لفظ مقبوضۃ سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شے مرہونہ سے نفع اٹھانا اس کے لئے جائز نہیں، مگر تن کو صرف اتنا حق ہے کہ اپنے قرض وصول ہونے تک اس کی چیز پر اپنا قبضہ رکھے، اور منافع اس کے وہ سب اصل مالک کا حق ہیں۔

دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو کسی نزاعی معاملہ کا صحیح علم ہو وہ شہادت کو نہ چھپائے، اور اگر اس نے چھپایا تو اس کا دل گہنگار ہے، دل کو اس لئے گہنگار فرمایا کہ کوئی شخص اس کو خالی زبان ہی کا گناہ نہ سمجھے کیونکہ اقل ارادہ تو دل ہی سے ہوا ہے، اس لئے اول گناہ دل ہی کا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا اَمْرًا مِنْۢ بَيْنِ اَمْرَيْنِ اِذَا جَاءَ مِنْكُمْ اَمْرٌ مِّمَّا بَيْنَ يَدَيْكُمْ اَمْرٌ مِّمَّا بَيْنَ يَدَيْكُمْ

اے ایمان والو! جو کچھ کہ آسانوں اور زمین میں ہے اور اگر ظاہر کر دو گے اپنے جی کی بات

اَوْ تَخْشَوْنَ يَحْاسِبْكُمْ بِهٖ اللّٰهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ ذٰكِرٌ

یا پھپھاڑ گئے اس کو حساب لے گا اس کا تم سے اللہ پھر بخشنے کا جس کو چاہے اور عذاب کرے گا جس کو

يَّشَاءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلاصہ تفسیر

اللہ ہی کی ملک میں ہیں سب (مخلوقات) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، (جیسے خود زمین و آسمان بھی اسی کی ملک میں ہیں) اور جب وہ مالک ہیں تو ان کو اپنی ملک و اشیاء میں ہر طرح قانون بنانے کا حق ہے، اس میں کسی کو مجال کلام نہ ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک قانون یہ ہے کہ جو باتیں عقائد فاسدہ یا اخلاق مذمومہ یا گناہوں پر پختہ عزم و ارادہ کی تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم زبان و جوارح سے ظاہر کر دو گے (مثلاً زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا یا اپنے بکبر، حسد وغیرہ کا خود اظہار کر دیا یا کسی گناہ جس کا قصد تھا اس کو کھپ کر ڈالا) یا کہ (دل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالتوں میں) حق تعالیٰ تم سے (مثل دوسرے معاصی کے ان کا) حساب لیں گے پھر (حساب لینے کے بعد پھر کفر و شرک کے) جس کے لئے (بخشنا) منظور ہوگا بخش دیں گے اور جس کو سزا دینا منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں شہادت کے اظہار کا حکم اور چھپانے کی ممانعت مذکور تھی آیت میں اسی مضمون کا تکرار ہے انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ شہادت کا چھپانا حرام ہے، اگر تم نے معاملہ کو جاننے ہوئے چھپایا تو رب علیم و خیر تم سے اس کا حساب لے گا، حضرت ابن عباس، عکرمہ، شعبی اور مجاہد سے یہی تفسیر منقول ہے (قرطبی)

اور عربی الفاظ کے اعتبار سے عام ہے، اور تمام اعتقادات، عبادات اور معاملات کو شامل ہے، حضرت عبداللہ بن عباس کا مشہور قول اس آیت کی تفسیر میں بھی ہے، اور معنی آیت

کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کے تمام اعمال کا محاسبہ فرمائیں گے، وہ عمل بھی جس کو وہ کر گذرے ہیں اور وہ بھی جن کا دل سے بچتہ ارادہ کر لیا، اور اس کو دل میں چھپا کر رکھا، مگر عمل کی نوبت نہیں آئی، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابن عمر منقول ہے، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مومن قیامت کے روز اپنے رب جل وعلیٰ سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کے ایک ایک گناہ کو یاد دلائیں گے، اور سوال کریں گے کہ توجانتا ہے کہ تو نے یہ گناہ کیا تھا، بندہ مومن اقرار کرے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی، اور تیرا گناہ لوگوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا، اور میں آج اس کو معاف کرتا ہوں، اور حسنات کا اعمالنامہ اس کو دیدیا جائے گا، لیکن کفار اور منافقین کے گناہوں کو صحیح نام میں بیان کیا جائے گا۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے جس میں پوشیدہ چیزوں کا جائزہ لیا جائے گا، اور دلوں کے پوشیدہ راز کھولے جائیں گے، اور یہ میرے کاتب اعمال فرشتوں نے تو تمہارے صرت وہ اعمال لکھے ہیں جو ظاہر تھے، اور میں اُن چیزوں کو بھی جانتا ہوں جن پر فرشتوں کو اطلاع نہیں، اور نہ انھوں نے وہ چیزیں تمہارے نامہ اعمال میں لکھی ہیں، اور اب وہ سب تمہیں بتلاتا ہوں، اور ان پر محاسبہ کرتا ہوں، پھر جس کو چاہوں گا بخش دوں گا اور جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا، پھر مومنین کو معاف کر دیا جائے گا اور کفار کو عذاب دیا جائے گا۔ (قرطبی)

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔

إِنَّ اللَّهَ حَيَّ وَرَعْنُ أَعْيُنِي عَمَّا

حَقَّقْتُ أَنَّ أَعْيُنَهُمَا مَا لَمْ يَكُنْ مَعَهُمَا

أَوْ يَكُونُ مَعَهُمَا (قرطبی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے ارادہ پر کوئی عذاب و عتاب نہیں ہے، آما قرطبی نے فرمایا کہ یہ حدیث احکام دنیا کے متعلق ہے، طلاق، حلق، بیع، ہبہ وغیرہ محض دل میں ارادہ کر لینے سے منع نہیں ہو جاتے، جب تک اُن کو زبان سے یا عمل سے نہ کیا جائے، اور آیت میں جو کچھ مذکور ہو رہا آخرت سے متعلق ہے، اس لئے کوئی تعارض نہیں، اور دوسرے حضرات علماء نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے، کہ جس حدیث میں دل کی چھپی ہوئی چیزوں کی معافی مذکور ہے اس سے مراد وہ وساوس اور غیر اختیاری خیالات ہیں جو انسان کے دل میں بغیر قصد و ارادہ کے آجاتے ہیں، بلکہ اُن کے خلاف کا ارادہ کرنے پر بھی وہ آتے رہتے ہیں، ایسے غیر

اختیاری خیالات اور وساوس کو اس امت کے لئے حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے، اور آیت مذکور میں جس محاسبہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ارادے اور نیتیں ہیں جو انسان اپنے قصد و اختیار سے اپنے دل میں جانتا ہے، اور اس کے عمل میں لانے کی کوشش بھی کرتا ہے، پھر اتفاق سے کچھ موافق پیش آنے کی بنا پر اُن پر عمل نہیں کر سکتا، قیامت کے دن ان کا محاسبہ ہوگا پھر حق تعالیٰ جس کو چاہیں اپنے فضل و کرم سے بخش دیں، جس کو چاہیں مذاب دیں، جیسا کہ مذکورہ حدیث بخاری و مسلم میں گلد چکا ہے، اور چونکہ آیت مذکورہ کے ظاہری الفاظ میں دونوں قسم کے خیالات داخل ہیں خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری، اس لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام کو سخت فکر و غم لاحق ہو گیا، کہ اگر غیر اختیاری خیالات و وساوس پر بھی مواخذہ ہونے لگا تو کون نجات پائے گا، صحابہ کرام نے اس فکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، تو آپ نے سب کو یہ تلقین فرمائی کہ جو کچھ حکم ربانی نازل ہوا اس کی تعمیل و اطاعت کا بچتہ قصد کرو اور کہو: سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا، یعنی ہم نے حکم سن لیا اور تعمیل کی، صحابہ کرام نے اس کے مطابق کیا اور اس پر یہ جملہ قرآن کا نازل ہوا، لَا يَكُفُّ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَشَعَهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی قدرت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر اختیاری وساوس اور خیالات پر مواخذہ نہیں ہوگا، اس پر صحابہ کرام کا اطمینان ہو گیا، یہ حدیث صحیح مسلم میں بروایت ابن عباس نقل کی گئی ہے (قرطبی) یہ پوری آیت آگے آرہی ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ انسان پر جو اعمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کئے گئے ہیں یا حرام کئے گئے ہیں وہ کچھ تو ظاہری اعضاء و جوارح سے متعلق ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام معاملات اسی قسم میں داخل ہیں، اور کچھ اعمال و احکام وہ بھی ہیں جو انسان کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں، ایمان و اعتقاد کے تمام مسائل تو اسی میں داخل ہیں، اور کفر و شرک جو سب سے زیادہ حرام و ناجائز ہیں ان کا تعلق بھی انسان کے قلب ہی ہے، اخلاق صحیحہ و آفہانہ، معتبر، قناعت، سخاوت وغیرہ، اسی طرح اخلاق رذیلہ کبر، حسد، بغض، حسد و دنیا چرخی وغیرہ سب چیزیں ایک درجہ میں حرام قلعی ہیں، ان سب کا تعلق بھی انسان کے اعضاء و جوارح سے نہیں بلکہ دل سے اور باطن سے ہے۔

اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ کا حساب قیامت میں لیا جائے اسی طرح اعمال باطنہ کا بھی حساب ہوگا، اور خطا پر بھی مواخذہ ہوگا، یہ آیت سورہ بقرہ کے اخیر میں لائی گئی، اس میں بڑی حکمت ہے، کیونکہ سورہ بقرہ ستر آں کریم کی ایسی بڑی اور ہم سورہ

ہے جس میں احکام الہیہ کا بہت بڑا حصہ آگیا ہے، اس سورۃ میں اصولی اور فردی معاش و معاد کے متعلق اہم ہدایات، نماز، زکوٰۃ، روزہ، قضا، حج، جہاد، طہارت، طلاق، عدت، خلع، رضاعت، حرمت شراب، ربا اور قرض، لین دین کے جائز و ناجائز طریقوں کا تفصیل بیان آگیا ہے، اسی لئے حدیث میں اس سورت کا نام تسنیم القرآن بھی آیا ہے، یعنی مسترآن کا سب سے بلند حصہ، اور ان تمام احکام کی تعمیل میں سب کی روح اخلاص ہے، یعنی کسی کام کو کرنا یا اس سے بچنا دونوں خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہوں، ان میں نام و نمود و یاد و سرسری نفسانی اغراض شامل نہ ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ اخلاص کا تعلق انسان کے باطن اور قلب سے ہے سب کی درستی اسی پر موقوف ہے، اس لئے سورت کے آخر میں اس آیت کے ذریعہ انسان کو تنبیہ کر دی گئی کہ فرائض کی ادائیگی یا محرمات سے پرہیز کے معاملہ میں مخلوق کے سامنے توجیل جوئی کے ذریعہ بھی راہ فرار اختیار کی جاسکتی ہے، مگر حق تعالیٰ عظیم و خیر ہے، اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، اس لئے جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ رقیب حقیقی میرے سب ظاہری اور باطنی حالات کو لکھ رہا ہے، اور سب کا حساب قیامت کے روز دینا ہے، یہی وہ روح ہے جو قرآن مجید انسانوں میں پیدا کرتا ہے کہ ہر قانون کے اول یا آخر میں خوب خدا اور فکر آخرت کا ایسا محافظان کے قلوب پر بٹھاتا ہے کہ وہ راست کی اندھیری میں اور خلوتوں میں بھی کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا ڈرتا ہے۔

أَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ لَمَكُلٌ آمَنَ

ماں لیا رسول نے جو کچھ آتا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی سب نے مانا

بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نَقُولُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ

اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو کہ ہم جدا نہیں کرتے

رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا إِنَّكَ رَبَّنَا وَرَبُّ لِكُلِّ الْمُضِلُّ

کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے اور کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب تیری ہی طرف توجہ کرنا

لَا يَكِلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو گرج جس قدر اس کی گنجائش ہے، اسی کو ملتا ہے جو اس نے کیا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا

رَبَّنَا لَا تَوَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا

اے ہمارے رب نہ بکڑھ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چڑکیں، اے رب ہمارے اور نہ رکھ ہم پر بوجھ

إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ

بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس

لِنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا إِنَّكَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ وَأَمَّا حَمَانُ فَإِنَّكَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا

کی بھوپاقت نہیں اور درگزر کر ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم پر تو ہی ہمارا رب ہر مدد کر ہماری

عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۸﴾

کافروں پر

حُلاصۃ تفسیر

اعتقاد رکھتے ہیں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز کے حق ہونے کا جو ان کے پاس لکھ رہا

کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور (دوسرے) مؤمنین بھی اس کا اعتقاد رکھتے ہیں،

آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس کس چیز کے عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا

کہا جائے گا، سب کے سب (رسول بھی اور دوسرے مؤمنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے حق

کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات و صفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ

کہ وہ موجود ہیں اور ملکہ ہوں سے پاک ہیں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں، اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کا اصل میں سب سچ ہیں)

اور اس کی پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور سچے ہیں اور پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا ان کا اس طور پر ہے کہ کہتے ہیں کہ ہم

اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھنے میں) تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں کسی کو

نہ سمجھیں) اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور (اس کو) خوشی سے مانا، ہم

آپ سے بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) فوٹنا ہے،

یعنی ہم نے جو پہلی آیت میں کہا ہے کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہوگا اس سے مراد

امور غیر اختیار کی نہیں بلکہ صرف امور اختیار کی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو احکام شرعیہ میں

مکلف نہیں بناتا یعنی ان امور کو واجب یا حرام نہیں فرماتا، مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور

اختیار میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا

جو ارادہ کرے (اور جو وسعت سے باہر ہے اس کا مکلف نہیں کیا گیا اور جس کے ساتھ قصد اور

ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب اور وسوسہ طاقت سے خارج ہیں تو ان کے آنے کو

حرام اور ان کے نہ آنے دینے کو واجب نہیں کیا، اور نہ ان پر عذاب رکھا) اے ہمارے رب

ہم پر وار نہ کر نہ فرما یہ اگر ہم بھول جاویں یا چوک جاویں، اے ہمارے رب (ہماری یہ بھی درخشا

ہے کہ ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے، اے ہمارے رب اور ہم یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ ہم پر کوئی ایسا بار (تکلیف کا دنیا یا آخرت میں) نہ ڈالے جس کی ہم کو سہار نہ ہو اور درگزر کیجئے ہم سے اور بخش دیجئے ہم کو اور رحم کیجئے ہم پر آپ ہمارے کارساز ہیں اور کارساز طرہ دار ہوتا ہے، سو آپ ہم کو کارسازوں پر غالب کیجئے۔

معارف و مسائل

ان دو آیتوں کے خاص فضائل | یہ سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں، احادیث صحیحہ معتبرہ میں ان دو آیتوں کے بڑے بڑے فضائل مذکور ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے رات کو یہ دو آیتیں پڑھ لیں تو یہ اس کے لئے کافی ہیں۔

اور ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دو آیتیں جنت کے خزانوں میں سے نازل فرمائی ہیں جسکو تمام مخلوق کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے خود رحمن نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا، جو شخص ان کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھ لے تو وہ اس کے لئے قیام اللیل یعنی تہجد کے قائم مقام ہو جاتی ہیں، اور مستدرک حاکم اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے سورۃ بقرہ کو ان دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے جو مجھے اس خزانہ خاص سے عطا فرمائی ہیں جو عرش کے نیچے ہے، اس لئے تم خاص طور پر ان آیتوں کو سیکھو، اور اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاؤ، اسی لئے حضرت فاروق اعظم اور علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ کوئی آدمی جسکو کچھ بھی عقل ہو وہ سورۃ بقرہ کی ان دونوں آیتوں کو پڑھے بغیر نہ سوتے گا، ان دونوں آیتوں کی معنوی خصوصیات تو بہت ہیں لیکن ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سورۃ بقرہ میں اکثر احکام شرعیہ اجمالاً و تفصیلاً ذکر کر دیئے گئے ہیں، اعتقادات، عبارات، معاملات، اخلاق، معاشرت وغیرہ آخری دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں اطاعت شعار مؤمنین کی مدح کی گئی ہے، جنہوں نے اللہ جل شانہ کے تمام احکام پر لبس یک کہا، اور تعمیل کے لئے تیار ہو گئے، اور دوسری آیت میں ایک شبہ کا جواب دیا گیا جو ان دو آیتوں سے پہلی آیت میں صحابہ کرامؓ کو پیدا ہو گیا تھا، اور ساتھ ہی اپنے فضل و رحمت بے حساب کا ذکر فرمایا گیا، وہ یہ تھا کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی **قُلْ إِيَّاكُمْ أَنفُسُكُمْ أَفْزَعُكُمْ أَوْ تُخَفُّونَ بِهَا يَذَّابُنَا اللَّهُ**؛ جو کہ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کر دیا چھپاؤ، ہر حال میں اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لیں گے، آیت کی اصل مراد تو یہ تھی کہ اپنے خستیاں و ارادہ سے جو کوئی عمل اپنے دل میں کر دے اس کا

حساب ہوگا، غیر خستیاں و دوسرے اور بھول چوک اس میں داخل ہی نہ تھی، لیکن الفاظ قرآن بظاہر عام تھے ان کے عموم سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کے دل میں غیر خستیاں ہی طور پر کوئی خیال آجائے گا تو اس کا بھی حساب ہوگا، صحابہ کرامؓ یہ سن کر گھبرا اٹھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی یا رسول اللہ اب تک تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہم جو کام اپنے ارادہ و اختیار سے کرتے ہیں، حساب اُن ہی اعمال کا ہوگا، غیر خستیاں و خیالات جو دل میں آجائے ہیں ان کا حساب نہ ہوگا، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر خیال پر جو دل میں آئے حساب ہوگا، اس میں تو عذاب سے نجات پانا سخت دشوار ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ آیت کی صحیح مراد معلوم تھی، مگر الفاظ کے عموم کے پیش نظر آپؐ نے اپنی طرف سے کچھ کہنا پسند نہ فرمایا بلکہ وحی کا انتظار کیا، اور صحابہ کرامؓ کو یہ یقین دسرایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آئے خواہ آسان ہو یا دشوار، مومن کا کام یہ نہیں کہ اس کے ماننے میں ذرا بھی تاامل کرے تم کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام سن کر یہ کہو **يَسْمَعُونَ وَأَلْمَعْنَا غُفْرًا** اُنکے رَبَّنَا وَآلَمَعْنَا غُفْرًا یعنی اے ہمارے پروردگار ہم نے آپ کا حکم سنا اور اس کی اطاعت کی، اے ہمارے پروردگار اگر حکم کی تعمیل میں ہم سے کوئی کوتاہی یا فروگزاشت ہوئی ہو تو اس کو معاف فرمادے کیونکہ ہمارا سب کا آپ ہی کی طرف ٹوٹنا ہے، صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ایسا ہی کیا اگرچہ ان کے ذہن میں یہ خیال کھٹک رہا تھا کہ بے اختیار دل میں آنے والے خیالات اور دسارے سے بچنا تو سخت دشوار ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ بعترہ کی آخری دو آیتیں نازل فرمائیں جن میں سے پہلی آیت میں مسلمانوں کی مدح، اور دوسری میں اس آیت کی اصلی تفسیر بتلائی گئی جس میں صحابہ کرامؓ کو اشتباہ پیش آیا تھا، اب پہلی آیت کے الفاظ دیجئے:

أَمَّا الرَّسُولُ فَمَا نَزَّلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا تَفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرًا إِنَّكَ رَبَّنَا وَلِيُّ آلِ لَيْلَى الْتَمِصْ يَدَهُ یعنی ایمان رکھتے ہیں رسول اس چیز پر جو ان کے پاس نازل ہوئی اُن کے رب کی طرف سے، اس میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح فرمائی اور اس میں بجا ہے آپؐ کا نام مبارک لینے کے لفظ رسولؐ فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تشریف کو واضح کر دیا، اس کے بعد فرمایا **وَالْمُؤْمِنُونَ**، یعنی جن طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی وحی پر ایمان و اعتقاد ہے، اس طرح عام مؤمنین کا بھی اعتقاد ہو، اور جو طریق بیان اس جملہ میں خستیاں فرمایا کہ پہلے پورا جملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان

ہے کہ حساب و کتاب اور جزاء و سزا ان اعمال اختیار کے ساتھ مخصوص ہیں ان اعمال غیر اختیاریہ کا نہ انسان مکلف ہے نہ ان پر اس کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ اعمال جن کا تعلق باطن یعنی دل کے ساتھ ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری ہے کفر و شرک کا عقیدہ جس کو قصد و اختیار کے ساتھ دل میں جمایا ہے، یا سوچ سمجھ کر ارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جس کو تکبر کہا جاتا ہے یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا، اور دوسرے غیر اختیاری، مثلاً بغیر قصد و ارادہ کے دل میں کسی بڑے خیال کا آجانا، ان میں بھی حساب و کتاب اور جزاء و جزا صرف اختیاری اعمال پر ہو، غیر اختیاری پر نہیں۔

اس تفسیر سے جو خود قرآن نے بیان کر دی صحابہ کرام کو اطمینان ہو گیا کہ غیر اختیاری دسارے و خیالات کا حساب و کتاب اور ان پر عذاب و ثواب نہ ہوگا، اسی معنوں کو آخر میں اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا ہے، اَلْهٰمَّا مَا كُنْتُمْ وَعَلَيْهٖمَا مَا اَكْتَسَبْتُمْ، یعنی انسان کو ثواب بھی اس کام کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور عذاب بھی اس کام پر ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے۔

اور مراد یہ ہے کہ ابتداءً بلا واسطہ اس عمل کا ثواب یا عذاب ہوگا جو قصد و ارادہ سے کرے، کسی ایسے عمل کا ثواب و عذاب بلا واسطہ ہو جانا جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا اس کے منافی نہیں، اس سے اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ بعض اوقات آدمی کو بلا قصد و ارادہ بھی ثواب یا عذاب ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن شریف کی دوسری آیات اور بہت سی روایات حدیث سے ثابت ہو کر جو آدمی کوئی ایسا نیک کام کرے جس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس نیک کی توفیق ہو جائے تو جب تک لوگ یہ نیک کام کرتے رہیں گے اس کا ثواب اس پہلے دے دے کو بھی ملتا رہے گا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی طریقہ گناہ کا جاری کیا تو آئندہ جتنے لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوں گے اس کا وبال اس شخص کو بھی پہنچے گا جس نے اول یہ برائے طریقہ جاری کیا تھا، اسی طرح روایات حدیث سے ثابت ہو کر کہ کوئی شخص اپنے عمل کا ثواب دوسرے آدمی کو دینا چاہے تو اس کو یہ ثواب پہنچتا ہے، ان سب صورتوں میں بغیر قصد و ارادہ کے انسان کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ یہ ثواب عذاب بلا واسطہ اس کو نہیں پہنچتا، بلکہ دوسرے کے واسطے سے پہنچتا ہے، اس کے علاوہ جو واسطہ بنا ہے اس میں اس کے لئے عمل اور اختیار کو بوجہ ضرور ہے، کیونکہ جس شخص نے کسی کا ایجا کیا ہو اچھا یا بُرا طریقہ اختیار کیا اس میں پہلے شخص کے عمل اختیار کا دخل ضرور ہو اگرچہ اس نے اس خاص اثر کا ارادہ نہ کیا ہو، اس طرح کوئی کسی کو ایصالِ ثواب بھی کرتا ہے جب اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہو، اس لحاظ سے یہ دوسرے کے

کے ذکر میں لایا گیا، اس کے بعد مؤمنین کے ایمان کا علیحدہ تذکرہ کیا گیا اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ نفسِ ایمان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمان شریک ہیں لیکن درجہ ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مشاہدہ اور سماع کی بناء پر ہے، اور دوسرے مسلمانوں کا علم ایمان بالغیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کی بناء پر۔

اس کے بعد اس ایمان بھل کی تفصیل بتلائی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مؤمنین میں شریک تھا کہ وہ ایمان تھا اللہ تعالیٰ کے موجود اور ایک ہونے پر اور تمام صفات کاملہ کے ساتھ متصف ہونے پر، اور فرشتوں کے موجود ہونے پر، اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور سب رسولوں کے سچے ہونے پر۔

اس کے بعد اس کی وضاحت فرمائی کہ اس امت کے مؤمنین پچھلی امتوں کی طرح ایسا نہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں میں باہمی تفرقہ ڈالیں کہ بعض کو نبی مانیں اور بعض کو نہ مانیں، جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانا مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہ مانا، اس امت کی یہ مدح فرمائی کہ یہ اللہ کے کسی رسول کا انکار نہیں کرتے اور پھر صحابہ کرام کے اس جملہ پر ان کی تعریف کی گئی، جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق زبان سے کہا تھا، تَبِعْنَا وَآلَحَقْنَا عَفْوَكَ رَبَّنَا وَكَيْفَ التَّصْيُّو۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ایک خاص انداز سے وہ شبہ دور کیا گیا جو پچھلی آیت کے بعض جملوں سے پیدا ہو سکتا تھا کہ دل میں چھپے ہوئے خیالات پر حساب ہوا تو عذاب سے کیسے بچیں گے، ارشاد فرمایا لَا يَكْلَفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زاد کام کا حکم نہیں دیتے، اس لئے غیر اختیاری طور پر جو خیالات دوسرے دل میں آجائیں اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں، حساب اور مواخذہ صرف ان اعمال پر ہوگا جو اختیار اور ارادہ سے کئے جائیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اعمال و افعال جو ہمتہ ہر آنکہ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو اعمال ظاہرہ کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری جو ارادہ اور اختیار سے کئے جاتیں، جیسے ارادہ سے بولنا، ارادہ سے کسی کو مارنا، دوسرے غیر اختیاری جو بلا ارادہ سرزد ہو جاتیں، جیسے زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ اور نکل گیا کچھ، یا ریشہ سے بلا اختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی، اس سے کسی کو تکلیف پہنچ گئی، ان میں سب کو معلوم

عمل کا ثواب و عذاب بھی درحقیقت اپنے ہی عمل کا ثواب یا عذاب ہے۔

بالکل اخیر میں قرآن کریم نے مسلمانوں کو ایک خاص دعا کی تلقین فرمائی جس میں بھول چوک اور بلا واسطہ خطا کسی فعل کے سرزد ہونے کی معافی طلب کی گئی، فرمایا، رَبَّنَا لَا تُؤْخِذْنَا فِي شَيْءٍ نَّسِيْنَا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ اور خطا پر ہم پروردگار بھول چوک اور خطا پر ہم سے مؤاخذہ نہ فرما، پھر فرمایا رَبَّنَا وَلَا تُخِزْنَا بِمَنْحَرِ الْإِسْلَامِ ۚ إِنَّكَ عَلِيمٌ بِذُنُوبِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُخِزْنَا بِمَنْحَرِ الْإِسْلَامِ ۚ إِنَّكَ عَلِيمٌ بِذُنُوبِنَا ۚ یعنی اے ہماری پروردگار ہم پر بھاری اور سخت اعمال کا بوجھ نہ ڈالنے جیسا ہم سے پہلے لوگوں (بنی اسرائیل) پر ڈالا گیا ہے، اور ہم پر ایسے فرائض عائد نہ فرما جسے جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔

اس سے مراد وہ سخت اعمال ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد تھے کہ کپڑا پانی سے پاک نہ ہو، بلکہ کاٹنا یا جلانا پڑے، اور قتل کے بغیر توبہ قبول نہ ہو، یا مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہم پر عذاب نازل نہ کیا جائے جیسا کہ بنی اسرائیل کے اعمال بدل کر کیا گیا، اور یہ سب دعائیں حق تعالیٰ نے قبول فرمانے کا اظہار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کر دیا۔

سورہ بقرہ تمام ہوئی و الحمد للہ و آخرہ و ظاہرہ و باطنہ و ہوا المستعان

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۲۵ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ

دیباچہ طبع اول

اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر ہے کہ "معارف القرآن" کی جلد اول جس میں سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر، مکمل شائع ہو چکی ہے، اور مجدد اللہ قریب سے زائد مقبولیت کے آثار محسوس کئے گئے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کے نام پر جلد دوم طبع کی جا رہی ہے، جس میں سورہ آل عمران اور سورہ نساء کی مکمل تفسیر ہے، تفسیر کی خصوصیات وہی ہیں جن کا ذکر پہلی جلد کے شروع میں کیا گیا ہے، البتہ جلد دوم میں بعض نئی چیزیں زور کا التزام کیا گیا جو اللہ اللہ فائدے کے لحاظ سے بہت اہم ثابت ہوگا۔

ایک نوید کہ زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا پورا لے لیا گیا ہے، جو دراصل شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے یہ کہ "خلاصہ تفسیر" میں اس کا التزام کیا گیا ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر "بیان القرآن" میں جو شروع میں خلاصہ تفسیر مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کو پورا کا پورا لیا گیا ہے، البتہ اس خلاصہ میں جو جو مشکل الفاظ تھے ان کی تشریح اپنی عبارت میں کر دی گئی ہے۔ تیسرے یہ کہ اس خلاصہ تفسیر میں حضرت نے یہ التزام کیا ہے کہ ترجمہ قرآن کے ساتھ ہی کچھ الفاظ تفسیر کے بڑھا کر مختصر جامع تفسیر اس طرح لکھی ہے کہ اصل ترجمہ کے اوپر خط کھینچ کر ممتاز کر دیا ہے، اور تفسیری نوٹ کو بغیر خط کے بین القوسین لکھا ہے۔

اس طرح سے اس خلاصہ تفسیر میں پورا ترجمہ حضرت حکیم الامتؒ کا بھی آگیا، اور ضروری تفسیر بھی، اس التزام کے ساتھ ناظرین "معارف القرآن" کے لئے دو مستند ترجمے مستقبل سامنے آجائیں گے ایک زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا، دوسرا خلاصہ تفسیر کے ضمن میں حضرت حکیم الامتؒ کی سورہ کا باقی خصوصیات تفسیر وہی ہیں جو پہلی جلد میں ملحوظ رہی ہیں، واللہ المستعان وعلیہ التکلیل

بندہ محمد شفیع

دارالعلوم کراچی نمبر ۱۲

شعبان ۱۳۸۸ھ

۱۔ دوسرے ایڈیشن میں جلد اول کو بھی ان امور کے مطابق کیا گیا ہے، اس لئے یہ جلد دوم کی خصوصیات نہیں رہیں۔ اب معارف القرآن کی تمام جلدوں کا ایک ہی طرز ہے۔ (صحیح)